

خاطراتِ محبتِ حدیث



مولانا محمد محترم ہاشم عثمانی



دارالکتب

1693

حفاظت و حجیت حدیث

از قلم

مولانا محمد محترم فہیم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد محترم فہیم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند کے معروف علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، ان کے والد مولانا محمد مسلم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فاضل دارالعلوم دیوبند، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں استاذ حدیث رہے، پاکستان بننے کے بعد جامعہ اسلامیہ لاہور کی بنیاد رکھی۔ مولانا محمد محترم فہیم عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کتب علوم اسلامیہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں ماہر اساتذہ سے پڑھیں۔ مولانا کی علمی خدمات کا تعارف کرواتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ: ” اللہ تعالیٰ نے تحریر و انشاء کا بھی خاص سلیقہ بخشا تھا۔ چنانچہ قلم کے ذریعے بھی انہوں نے دین کی بڑی خدمت انجام دی۔ ابتداء میں انہوں نے دینی رسائل میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ پھر رفتہ رفتہ متعدد ضخیم کتابیں بھی لکھیں ” حجیت حدیث “ کے موضوع پر ان کی مفصل کتاب ” حفاظت و حجیت حدیث “ (جو تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے) شاید اپنی جامعیت کے لحاظ سے اس موضوع پر اردو میں مفصل ترین کتاب ہے جس میں انہوں نے مکررین حدیث کے تمام دلائل و اعتراضات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ نماز کے احکام و مسائل پر انہوں نے جو کتاب تالیف فرمائی ہے وہ

بھی اپنے موضوع پر اردو کی شاید جامع ترین کتاب ہے اور پھر خود ہی اس کا انگریزی ترجمہ کر کے اس کی افادیت کو عالمگیر بنادیا ہے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی کتاب ”احکام حج“ کا انگریزی ترجمہ بھی برادر موصوف ہی نے کیا ہے جو ”How to perform hajj“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے ایک درجن سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں تالیف فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک مواد کی صحت و جامعیت اور شگفتہ اسلوب تحریر کے لحاظ سے اردو کے ذخیرہ کتب میں بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پچھلے دنوں ملک میں عورت کی دیت کا مسئلہ اٹھا تو برادر موصوف نے اس مسئلے پر بھی ایک مفصل مقالہ تحریر فرمایا جو چند ہی ماہ پہلے ابلاغ میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ احقر نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی قدس سرہ کی کتاب ”اظہار الحق“ کا اردو ترجمہ اپنی شرح و تحقیق کے ساتھ شائع کیا تھا، حضرت مولانا کی ایک دوسری کتاب ”اعجاز عیسوی“ کی تحقیق و ترتیب پر بھی احقر نے کام شروع کیا، لیکن مصروفیات کی بنا پر اسکی تکمیل نہ کر سکا۔ اس کی تکمیل کیلئے احقر نے برادر موصوف سے درخواست کی۔ چنانچہ وہ چند ماہ سے اس کام میں مشغول تھے اور اس کا معتد بہ حصہ مکمل کر چکے تھے۔ اسکے علاوہ انکے والد ماجد قدس سرہ نے طحاوی شریف کی ایک شرح تالیف فرمائی تھی جس کا مسودہ انکے پاس محفوظ تھا، وہ اس مسودے کی تمییز و ترتیب میں مشغول تھے اور شاید اس کا قابل لحاظ حصہ کتابت بھی کرا چکے تھے “ [نقوش رفتگاں ۲۱۳]

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے نقوش رفتگاں از مفتی محمد تقی عثمانی صفحہ ۲۱۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
مَنْ يَطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ طَاعَ اللَّهَ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی

حفاظت و حُجَّتِ حدیث

جس میں

حدیث کی حفاظت اور اس کی حُجَّت سے متعلق تمام شکوک و
شُبہات کا نہایت اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے۔

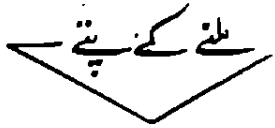
از

مولانا محمد محترم، شیم عثمانی

دارالکتب

مسجد مقدس دھوبی منڈی پُرانی انارکلی لاہور

باراڈل _____ دسمبر ۱۹۷۹ء
 باہتمام _____ چوہدری محمد شمس
 کتابت _____ کفایت اللہ خوشنویس
 طباعت _____ نشر کتب پرنٹنگ پریس لاہور
 ناشر _____ دارالکتب مسجد مقدس صوبی منڈی
 پرائی انارکلی لاہور
 تعداد _____ ایک ہزار
 قیمت _____ آفٹ مجلد - / ۱۰ روپے



- ۱۔ دارالکتب مسجد مقدس صوبی منڈی، پرائی
انارکلی لاہور۔
- ۲۔ ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور۔
- ۳۔ المکتبۃ العلمیۃ لیک روڈ لاہور۔
- ۴۔ مکتبہ عزیزیہ ۱۳۔ اردو بازار لاہور۔
- ۵۔ دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ۱

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۴	حفاظتِ سیدۃ نبویؐ تک	۱۱	عرضِ ناشر
۵۶	حفاظتِ صحابہؓ تک	۱۲	حرفِ اوّل از مولف
۵۸	حفاظتِ تاقیامت		جزو اوّل حفاظتِ حدیث
۶۰	حدیث کے بغیر قرآن فہمی	۲۱	حدیث کا انکار اور منکرینِ حدیث
۶۰	قرآن فہمی اور عجزِ انسانی	۲۲	رسوایی
۶۳	قرآن فہمی اور پیغمبر	۲۴	منافقت
۶۶	قرآن اور اسوۂ نبوی	۲۵	انجامِ حجت
۶۸	حدیث کے بغیر قرآن فہمی	۲۷	انکارِ حدیث کی اصل وجہ
۷۳	قطعہ طلب آیات اور احادیث	۲۹	خواہشاتِ نفس کی پیروی
۷۶	حدیث کے بغیر دین نامکمل ہے	۳۰	شیطان کی باواسطہ مدد
۷۶	ارکانِ دین اور حدیث	۳۱	دشمنانِ اسلام کو تقویت
۷۸	انکارِ حدیث ابطالِ دین کے مترادف ہے	۳۲	اصل روپ
۸۰	انکارِ حدیث اور حلال و حرام کی تمیز	۳۴	حدیث کی حفاظت میں شک کا اظہار
۸۵	حفظِ حدیث اور صحابہؓ	۳۷	حدیث اور حفاظتِ خداوندی
۸۷	اعتماد کی بنیاد	۳۷	قرآن اور حدیث دونوں اللہ کی حفاظت میں
۸۸	تحریر اور اعتماد	۳۸	چند سوال
۹۰	قوتِ حافظہ	۴۰	قرآنِ صریح الفاظ کا نام نہیں
۹۱	حفظِ حدیث کا اہتمام	۴۲	حدیثِ نبویؐ قرآن کا بیان ہے
۹۵	لقائے محبت	۴۶	قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں بجانب اللہ
۹۹	لقائے عظمت	۴۷	قرآن فہمی کے لیے صریح زبان دانی کافی نہیں
۱۰۴	صحابہ کی غیر معمولی قوتِ حافظہ	۵۱	حدیث کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور
۱۰۴	قوتِ حافظہ اور عرب	۵۳	حفاظت کے عینِ مرتط

۱۰۷	حکیم نبوی	۱۷۵	حضرت عائشہ رضی کی مرویات کا مکتوب ذخیرہ
۱۱۱	نفسائے الہی	۱۷۶	حضرت عبداللہ بن عمر رضی کی مرویات کے تحریری نسخے
۱۱۳	حفظ حدیث کے عوامل اور اعتماد کی بنیاد	۱۷۸	حضرت جابر رضی کے صحیفے
۱۱۴	حفظ حدیث میں صحابہ کا ضعف	۱۸۰	حضرت انس رضی کا تحریری مجموعہ
۱۲۳	حدیث کی زندہ کتابیں	۱۸۲	صحیفہ الصادق
۱۲۵	لاکھوں زندہ کتابیں	۱۸۵	صحیفہ حضرت علی رضی
۱۲۹	ذخیرہ حدیث اور تاریخی مواد	۱۸۶	صحیفہ حضرت سعد بن عبادہ رضی
۱۳۰	کاغذی کتابوں کی ضرورت	۱۸۷	صحیفہ سمرة بن جندب رضی
۱۳۵	کتابت حدیث اور صحابہ رضی	۱۸۸	صحیفہ داہل بن حجر رضی
۱۳۶	فن کتابت اور عرب باشندے	۱۸۸	صحیفہ اہل یمن
۱۳۹	آلات کتابت کی دستیابی	۱۸۸	کتاب الصدقہ
۱۴۰	فن کتابت سے واقف صحابہ رضی	۱۸۹	صحیفہ ابو شاہ یمنی رضی
۱۴۱	کتابت سکھانے کا خصوصی اہتمام	۱۸۹	دیگر صحیفہ بڑی تحریری
۱۴۲	حدیث کی عام کتابت	۱۹۰	خطوط و وثائق
۱۴۵	کاتبین حدیث	۱۹۲	حضرت ابوبکر و عمر رضی کی طرف انکار حدیث کی نسبت
۱۴۸	کتابت حدیث کی ممانعت پر مبنی روایات	۱۹۳	منکرین حدیث کا الزام
۱۵۰	منکرین حدیث کا غیر منطقی طرز عمل	۱۹۳	حجیت حدیث اور حضرت ابوبکر رضی
۱۵۱	احادیث قلم بند کرنے کی ہدایت	۱۹۳	پہلا خطبہ
۱۵۳	ممانعت کتابت سے غلط استدلال	۱۹۵	عام دستور العمل
۱۵۷	ممانعت کتابت کی اصل وجہ	۱۹۸	احادیث کی تلاش و جستجو
۱۵۸	قرآن اور حدیث میں امتیاز	۱۹۹	روایت حدیث سے ممانعت اور
۱۶۵	مکثرین صحابہ رضی کے مکتوب ذخیرے	۲۰۱	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
۱۶۵	حضرت ابوبکر رضی کا تحریری ذخیرہ	۲۰۲	ابوبکر رضی اور روایت حدیث
۱۶۸	احادیث کی صحیح تعداد	۲۰۲	ممانعت کی اصل وجہ و رفع اختلاف
۱۶۹	دو بنیادی باتیں	۲۰۵	مجموعہ حدیث کو نذر آتش کر دینا
۱۶۹	توالف و شواہد	۲۰۵	پورا واقعہ
۱۷۲	حضرت عبداللہ بن عباس رضی کا کتابی مجموعہ		

۲۴۰	مزید اطمینان کی ایک تدبیر	۲۰۶	واقعہ کا محرک
۲۴۰	حفاظتِ حدیث اور حضرت عمرؓ	۲۰۷	دین کی سہولت پسندانہ خصوصیت کی حفاظت
۲۴۱	کثرتِ روایت میں احتیاط	۲۱۰	حضرت عمرؓ اور منکرینِ حدیث کا الزام
۲۴۲	تحقیقِ حدیث کے لیے تاخیر مزید کا مطالبہ	۲۱۰	منکرینِ حدیث کی علمی خیانت
۲۴۲	حفاظتِ حدیث اور حضرت عثمانؓ	۲۱۱	حضرت عمرؓ اور روایتِ حدیث
۲۴۷	حفاظتِ حدیث اور حضرت علیؓ	۲۱۲	عمال کو تعلیمِ حدیث کا حکم
۲۴۹	روایتِ حدیث کے طرزِ عمل میں تبدیلی	۲۱۳	عدالتی فیصلوں کی بنیاد
۲۵۲	طرزِ عمل کی تبدیلی کا پس منظر	۲۱۴	نبی کی رائے وحی الہی ہے
۲۵۵	جموں حدیثوں کا سہ باب	۲۱۵	منکرینِ حدیث کے دعوے کا اصل مدار
۲۵۶	روایتِ حدیث پر قسم کا مطالبہ	۲۱۵	روایت سے منع کرنا
۲۵۷	طرزِ عمل میں تبدیلی کے دیگر عوامل	۲۱۷	روایت میں کمی کا مشورہ
۲۵۹	مکتوبِ مجموعوں کی تیاری	۲۲۰	کثرتِ روایت سے روکنے کی وجہ
۲۶۱	حفاظتِ حدیث اور تابعین و تبع تابعین	۲۲۱	دین کے بینائی اور غیر بینائی خصوصیات امتیاز
۲۶۱	حفظِ حدیث کا اہتمام	۲۲۲	کذب سے حفاظت
۲۶۳	مذاکرۃ حدیث	۲۲۳	روایت میں احتیاط
۲۶۶	قرآن ہی کی طرح حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام	۲۲۵	روایتِ حدیث پر سزا
۲۶۸	کتابتِ حدیث میں شغف کا عالم	۲۲۸	مکتوبِ ذخیرے جلانا
۲۷۱	مکتوبِ مجرے	۲۲۸	منکرینِ حدیث کا استدلال
۲۷۱	صحیفہ ہمام ابن منہ	۲۲۹	حدیث کی مخالفت نہیں حمایت
۲۷۲	حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی مساعی	۲۳۰	قرآن اور حدیث میں امتیاز
	جز دوم: حجیتِ حدیث	۲۳۲	صحابہؓ سے مشورہ
۲۸۱	قرآن کی جامعیت	۲۳۵	حفاظتِ حدیث اور خلفائے راشدین
۲۸۱	منکرینِ حدیث کا دعویٰ اور دلائل	۲۳۵	حفاظتِ حدیث اور حضرت ابوبکرؓ
۲۸۳	قرآن مفصل ہے	۲۳۵	رفع اختلاف
۲۸۷	قرآن نے کچھ نہیں چھوڑا	۲۳۶	دین کے بینائی اور غیر بینائی حصول کا امتیاز
۲۸۹	قرآن کافی ہے	۲۳۷	اصولِ شہادت کی بنیاد
۲۹۰	حدیث کی مشغولیت گراہی ہے ؟	۲۳۹	شہادت کی اصل حقیقت

۳۳۲	اطاعتیں دو مگر مطاع ایک	۲۹۳	قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم
۳۳۳	رسول کے لفظ سے قرآن مراد لینا	۲۹۴	حدیث رسول کی احتیاج
۳۳۴	اطاعت کو موافقت کے معنی میں لینا	۲۹۵	بعثت کے تین اہم مقاصد
۳۳۴	اطاعت رسول کو اطاعتِ الہیہ کی	۲۹۶	تعلیم و ترویج قرآن
۳۳۴	تفسیر قرار دینا	۲۹۸	مجلات کی تفصیل
۳۳۵	اطاعت رسول کے لیے حیات نبوی کی شرط	۳۰۲	بیہات کی توضیح
۳۳۶	اقوال کی اطاعت	۳۰۲	مشکلات کی تیسیر
۳۳۸	اطاعت رسول کی مستقل حیثیت اور قرآن	۳۰۳	اشارات کی تشریح
۳۴۰	رسول کا ہر عمل وحی الہی کی اتباع میں ہے	۳۰۴	مقابلین میں تخصیص
۳۴۰	وحی متلو وغیرہ مستند	۳۰۵	قیاسی ملحقات کی تعیین
۳۴۰	قرآن کے علاوہ وحی کا نزول	۳۰۶	جامعیت قرآن کی مزید وضاحت
۳۴۱	حکمۃ کا صحیح مفہوم	۳۰۷	متن اور شرح کی نسبت
۳۴۲	وحی کے نزول کی تین صورتیں	۳۰۸	قرآنی احکام کے لیے فیصل
۳۴۴	صرف ایک قسم کی وحی قرآن ہے	۳۱۱	حدیث کی مستقل حیثیت
۳۴۵	عام انسانوں سے اللہ کی ہم کلائی اور وحی	۳۱۳	قرآن کی جامعیت اور اسوۂ رسول
۳۴۷	قرآن کے علاوہ وحی کے نزول پر قرآنی شہادتیں	۳۱۶	حدیث کی تشریحی حیثیت
۳۵۲	وحی پر ہمارے ایمان کی اصل بنیاد	۳۱۶	احادیث کی تین قسمیں
۳۵۶	معاہدہ کے درمیان حدیث کی تشریحی حیثیت	۳۱۸	مزید قرآن احادیث کی حجیت
۳۵۹	عہد رسالت کے فیصلوں میں رد و بدل کا الزام	۳۱۸	موضح قرآن احادیث کی حجیت
۳۶۰	جیش اسامہ کی روانگی	۳۱۸	مرادات قرآنی کا صحیح تعین اور ہم
۳۶۲	طلاق غلاشہ کے مسئلے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ	۳۲۰	بیان قرآن کی ذمہ داری اور رسول
۳۶۳	مفتوحہ اراضی کی تقسیم	۳۲۳	بیان قرآن بھی منزل من اللہ ہے
۳۶۴	مولفہ القلوب اور حضرت عمرؓ کا استدلال	۳۲۵	بیان قرآن کے نزول کی صورت
۳۶۷	خبر واحد کی حجیت	۳۲۶	مستقل تشریحی حیثیت کی حامل احادیث
۳۶۸	اصولی غلطی	۳۲۷	رسول کا حکم قرآن ہی کا حکم ہے
۳۶۸	یقینیات کی شرط اور دنیوی معاملات	۳۳۰	اطاعت رسول کے وجوب کی مستقل حیثیت
۳۷۱	یقینیات کی شرط اور مذہبی معاملات	۳۳۱	مرجع نزاع

۴۶۰	جہلی اور وہبی علوم	۳۷۳	خبر واحد کی حجیت اور قرآن کریم
۴۶۲	بلند ترین اخلاقی صفات	۳۸۱	خبر واحد کی حجیت اور عہد رسالت
۴۶۳	غلطیوں اور لغزشوں سے حفاظت	۳۸۷	خبر واحد کی حجیت اور عہد صحابہ
۴۶۶	منصب رسالت اور حیات طیبہ	۳۹۴	خبر واحد کی حجیت عہد صحابہ کے بعد
۴۶۸	اطاعت رسول اور حیثیت امامت	۳۹۶	منکرین حدیث کے دلائل
۴۶۹	ایمان کی حقیقت سمجھنے میں غلطی	۳۹۷	ظن کے صحیح مفہوم کی تحقیق
۴۷۳	قرآنی مدارقوں کا انکار	۴۰۷	ظن کی حجیت
	اطاعت رسول کا قرآنی حکم اور امام وقت		زوالیدین کی بات تسلیم کرنے میں
۴۷۳	یا مرکز ملت -	۴۱۲	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تاقی
۴۷۴	اطاعت کے لیے حیات جسمانی کی قید	۴۱۵	بعض صحابہ کے طرز عمل سے غلط استدلال
۴۷۹	مرکز ملت کی طرف حق اطاعت کی منتقلی	۴۲۱	منصب رسالت اور مرکز ملت کا تصور
	کیا اللہ و رسول کی اطاعت سے		کیا منصب رسالت صرف قرآن پہنچانے
۴۸۰	امام وقت کی اطاعت مراد ہے	۴۲۳	تک محدود ہے -
	رسول کی اطاعت اور امام کی	۴۲۴	تبلیغ کتاب اور تعلیم و تربیت افراد
۴۸۱	اطاعت میں بنیادی فرق	۴۲۶	توضیح و تشریح کتاب
	اطاعت رسول کے خصائص مرکز ملت	۴۲۷	عملی نمونہ
۴۸۳	کی اطاعت پر صادق نہیں آتے	۴۲۸	حاکم و فرماں روا
	اطاعت رسول سے امام وقت یا مرکز	۴۳۰	حکم اور فیصل
۴۸۸	ملت کی اطاعت مراد لینے کے لازمی نتائج	۴۳۶	شخصی اور پیغمبرانہ حیثیت کا فرق
۴۹۱	چند بے بنیاد اعتراضات اور ان کا تجزیہ	۴۳۳	منکرین حدیث کے موقف کا جائزہ
۴۹۱	بے بنیاد اعتراضات	۴۳۵	رسالت و امامت کی تفریق
	۱: موضوع احادیث کی موجودگی سے غلط	۴۴۲	اجتہاد و لغزشوں سے غلط استدلال
۴۹۳	استدلال	۴۴۷	فرائض نبوت کی انجام دہی اور غلطیوں کا سد
۴۹۵	نقد روایت حدیث	۴۵۰	حضور کی بشریت سے غلط استدلال
۴۹۸	تنقیح متن حدیث	۴۵۲	قیام دین سے متعلق اشکالات اور ان کا تجزیہ
۴۹۹	خدا واد ملاحیت	۴۵۷	رسالت و نبوت کی حقیقت
۵۰۳	محمدین کی مساعی کے ثمرات	۴۵۹	نبی کی پیدائش سے پہلے ہی نبوت کیلئے اسکا انتخاب

۵۶۳	کھب کی خاصیت	۵۰۵	وضع حدیث اور عہد رسالت
۵۶۶	۱۵۔ باہم متعارض روایات	۵۰۸	عجیب استدلال
۵۶۸	۱۶۔ روایت بالمعنی	۵۰۹	مختلف روایات کا جائزہ
	۱۷۔ حضرت ابوہریرہؓ اور صحابہؓ	۵۱۲	کذب علی النبی سے متعلق ایک واقعہ
۵۷۱	کی تنقید	۵۱۷	وضع حدیث کا اصل نقطہ آغاز
۵۷۳	حضرت ابوہریرہؓ صحابہ کی نظر میں		وضع حدیث کے سدباب میں صحابہؓ
۵۷۶	منکرین حدیث کا استدلال	۵۲۰	کی احتیاطی تدابیر
۵۷۷	بدگمانی نہیں اظہار تعجب	۵۲۵	امام بخاریؒ کی چھ لاکھ حدیثوں کی اصل حقیقت
۵۷۸	کثرت روایت کا ایک اور سبب		۲۔ خلاف عقل و روایت روایات
۵۷۹	ایک اور حقیقت	۵۳۰	کی اصل حقیقت
	۸۔ امام ابوحنیفہؒ پر حدیث	۵۳۳	سورج کی سجدہ ریزی
۵۸۳	سے بے نیازی کا الزام	۵۳۷	سردی و گرمی اور دوزخ کی دو پھونکیں
۵۸۵	امام ابوحنیفہؒ کا سرمایہ حدیث	۵۳۹	گرگٹ کی پھونکیں
۵۸۷	استنباط کا ملکی احادیث	۵۴۱	۳۔ احادیث نبویؐ اور عریاں مضامین
۵۸۸	امام صاحبؒ کا مسلک	۵۴۱	چند بنیادی باتیں
		۵۴۳	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زبردست اشارہ
		۵۴۵	چند روایات کا جائزہ
		۵۴۹	بوسہ ناقص و ضو نہیں
		۵۴۹	غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہے؟
		۵۵۰	عورتوں سے مخصوص ایک شرعی حکم
			جنابت اور حیض کے بارے میں قدیم تعصبات
		۵۵۱	کا ازالہ -
		۵۵۵	متعہ کے مختلف پہلو
		۵۵۶	حج و عمرہ سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ
		۵۵۸	۴۔ خلاف علم و تجربہ روایات
		۵۵۹	تسو سال بعد دنیا کا خاتمہ
		۵۶۲	عجوبہ کجھور کی تاثیر

انتساب

اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد مسلم عثمانی قدس اللہ سرہ
کے نام

کہ وہ میرے والد ہی نہیں میرے استاد و معلم، شیخ و مربی اور
ہادی و رہنما بھی کچھ تھے۔ میں جو کچھ ہوں سب انہی کی بدلت ہوں۔

عرضِ ناشر

اس کتاب کے مؤلف و مصنف مولانا محمد محترم فہیم شامانی کا نام علمی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اس سے پہلے مولانا کی متعدد کتابیں دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ جتنے ماے جانتے ہیں کہ مولانا کا اسلوبِ نگارش محققانہ اور عالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ جذب و تاثیر میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے مگر شاید کم ہی لوگوں کو یہ بات معلوم ہو کہ مولانا ایک بلند پایہ مصنف ہی نہیں ایک تادار الکلام خلیب بھی ہیں۔ دراصل حفاظت و حجیتِ حدیث کا یہ موضوع مولانا نے ابتداءً اپنے جمعہ کے خطبات میں ہی شروع کیا تھا۔ مگر دُر چار تقریروں کے بعد ہی اس کی افاریت کے پیشِ نظر مولانا کے مداحین کی طرف سے یہ اصرار شروع ہو گیا کہ اسے کتبِ صورت میں شائع کیا جائے۔

اس کی طباعت و اشاعت کو بروئے کار لانے کی ذمہ داری خوش قسمتی سے میرے حیتے میں آئی اس سے پہلے مولانا کی چند تقریروں کا مجموعہ میں شائع بھی کر چکا تھا۔ مولانا نے اس موضوع پر اپنی تقریروں کو صرف ”حفاظتِ حدیث“ تک ہی محدود رکھا تھا مگر جب ٹیپ ریکارڈ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے مولانا کو یہ تقریریں نظر ثانی کے لیے دی گئیں تو ساتھ ہی یہ درخواست بھی کر دی گئی کہ حجیتِ حدیث کے موضوع کا اس میں اضافہ کر دیا جائے مولانا نے کمال مہربانی سے یہ درخواست بھی منظور کر لی اور اس طرح یہ کتاب دو حصوں میں حفاظت و حجیتِ حدیث کے نام سے مرتب ہو گئی اور اب کتابت و طباعت کے مراحل سے گزر کر تیارین کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ مولانا کی اس کتاب کو زیرِ طبع سے آراستہ کرنے کی جو ذمہ داری میں نے اپنی خوشی سے مستول کی تھی اس کو باحسن و جہ پورا کرنے کی توفیق اس نے مجھے عطا فرمائی۔ مجھے یقین ہے اس کی بارگاہ میں میری یہ حقیر خدمت دینِ شرف قبولیت سے ہم کنار ہوگی۔

محمد شوق 463 شادمان کالونی لاہور

حرفِ اوّل

یہ بات قہرِ سم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اسلام کی صحیح تصویر قرآن اور حدیث دونوں سے مل کر ہی تیار ہوتی ہے اسلام کی صحیح تعلیمات کا علم قرآن اور حدیث کی باہمی توضیح و تطبیق ہی کی بنیاد پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں ایک کو مانیں اور ایک کا انکار کریں وہ صراطِ مستقیم سے دور ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام میں جتنے گمراہ فرقے پیدا ہوئے وہ وہی ہیں جنہوں نے قرآن کو حدیث سے یا حدیث کو قرآن سے علیحدہ کرنا چاہا۔ خوارج کی گمراہی کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ انہوں نے قرآن کو مانا اور حدیث سے انحراف کیا جبکہ ان کے مقابل فرقے نے قرآن کو محرف بنا کر چھوڑا اور صرف اپنے ناموں کی سنت کی پیروی کا دعویٰ کیا، اسی طرح معتزلہ نے قرآن کی آیات میں دو راز کار باویلات کا سہارا لے کر احادیث سے اعتراض کیا نتیجتاً متون گمراہیوں کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔

تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے جو کچھ پہلے ہوا تھا آج بھی ہوتا ہے۔ دینِ حق عقل کے اندھوں کا تختہ مشق بنا ہوا ہے جو چیز ان کی عقل کے خود ساختہ معیار پر پوری نہیں اترتی اُسے بے کمی تاویلات کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے حدیث سے انکار کر کے اپنے زعم میں اسلام کے چہرے سے خلاف عقل ہونے کا داغ مٹانا چاہتے ہیں لیکن ہو یہ رہا ہے کہ داغ سمجھ سمجھ کر اسلام کی صحیح تصویر کے اصل نقوش مٹاتے چلے جا رہے ہیں۔

حدیث کے بغیر قرآن فہمی کے یہ دعویدار جو قرآن پاک کو ہر ضرورت، ہر حکم اور ہر مسئلے کا حامل سمجھتے ہیں اور اپنی عقل و فہم کو قرآن کی تفسیر و تشریح کیلئے کافی خیال کرتے ہیں دراصل چاہتے ہیں کہ احادیث اور فقہ کا سارا دفتر مٹ جائے اور ان کی جگہ ان کے خود ساختہ اجتہادات اور بے بنیاد استنباطات قرآن پاک کا حقیقی ایڈیشن اور اسلام کی تعلیمات کا مستند مخزن قرار پا جائیں۔ انہوں نے تو زیادہ اس بات کا کہ یہ سب کچھ دشمنان اسلام کی پیروی میں ہو رہا ہے مستشرقین یورپ کے سفیہانہ اعتراضات کی اندھا دھند تقلید سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ ڈھاتی سو برس بعد احادیث کے قلم بند ہونے کی باتیں اور اس طرح حدیث کے ذخیرے کو ساقط الاعتبار ثابت کرنے کی سکیمیں، یہ رجال حدیث کی ثقاہت پر اعتراضات اور یہ عقلی حیثیت سے احادیث پر شکوک و شبہات کا اظہار یہ سب کچھ مستشرقین یورپ کے آثار میں جن کو منکرین حدیث پہن پہن کر اتراتے ہیں۔ ان کے گروہ میں سے ہر کوئی اس قدر بے باک ہو گیا ہے کہ جس کا جہاں تک بس چلتا ہے دین کا حلیہ بگاڑنے میں مصروف ہے، کوئی نماز کے اوقات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھانا چاہتا ہے تو کوئی نماز کے ارکان میں کتر بیعت کرنے پر تلا ہوا ہے، کوئی روزوں کی تعداد کم کرنے کے درپے ہے تو کوئی حج کے مناسک پر قنچی چلا رہا ہے، کوئی قربانی کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اسے سرے سے ہی حذف کر دینا چاہتا ہے، کچھ لوگ ہیں جو سمت قبلہ ہی کو تبدیل کرنے پر مصہر ہیں کچھ ہیں جو وضو کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں، مسلمانوں کے اصول وراثت میں رد و بدل ہو رہے ہیں غرض یہ منکرین حدیث کا گروہ لوگوں کو ایک نئے اسلام کی دعوت دینا چاہتا ہے اور اس کے لئے حدیث کا انکار ان کی مجبوری بن گیا ہے۔

تاہم انکار حدیث کا یہ فتنہ جس قدر پرانا ہے اسی قدر قدیم ان مساعی کی داستان ہے جو علمی سطح پر اس فتنے کا سد باب کرنے کے لئے علمائے حق نے اپنے اپنے زمانے

میں انجام دیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے امام شافعیؒ نے اپنی تالیف ”الرسالۃ“ میں اور اس کے بعد ”کتاب الام“ کی ساتویں جلد میں ان لوگوں کے خیالات کا بڑے ہی پرزور انداز میں رد کیا جو اپنے فساد مزاج کی بنا پر اخبار متواترہ کے سوا البقیہ تمام احادیث کا سرے ہی سے انکار کرتے تھے اور بہت سی قرآنی آیات میں اپنے مذاق کے مطابق تاویلیں کرتے تھے یہ لوگ معتزلہ تھے جن کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا۔ انکار حدیث کی ابتدا اصل انہی لوگوں سے ہوئی ان لوگوں نے حشر و نشر رویت باری تعالیٰ، صراطِ مینان، جنتِ جنیم اور اسی قسم کی دیگر احادیث کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ امام شافعیؒ نے سب سے پہلے ان لوگوں کے خیالات کی اپنی تالیفات میں تردید کی۔ ان کے بعد امام احمدؒ نے بھی اطاعتِ رسول کے اثبات میں ایک مستقل جزو تصنیف کیا جس کا ایک حصہ حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کچھ عرصہ بعد امام غزالیؒ، ابن حزمؒ اور حافظ محمد بن ابراہیم میدان میں آئے اور انکار حدیث کے خلاف انتہائی پر مغز اور مدلل مقالات لکھے۔ تاخرین میں علامہ سیوطیؒ نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل جزو تصنیف کیا۔ قریب کے دور میں ڈاکٹر مصطفیٰ سبائیؒ نے ”السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي“ لکھ کر اور ڈاکٹر صبحی صالحؒ نے ”علوم الحديث ومصطلحات“ ترتیب دیکر اس موضوع پر کام کرنے کا حق ادا کر دیا۔ ان دونوں میں بھی موجودہ دور کے علماء نے انکار حدیث کے رد میں بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے اسی سلسلے میں مولانا محمد ارسینؒ کا ندھلوی کی تصنیف ”حجیت حدیث“، مولانا مناظر حسن گیلانی کی تالیف ”تدوین حد“ نیز مولانا بدر عالم کی کتاب ”ترجمان السنۃ“ اور مولانا عبد الصمد صادم کی ”تاریخ الحدیث“ کے نام سرفہرست ہیں۔ رسائل میں ”ترجمان القرآن“ کا منصب رسالت نمبر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم سے اور ”الاعتصام“ کا حجیت حدیث نمبر مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے قلم سے قابلِ ذکر ہیں۔

غرض ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے انداز میں انکارِ حدیث کے فتنے کا خوب خوب مقابلہ کیا اور علمی سطح پر منکرینِ حدیث کو لا جواب کر کے رکھ دیا دلائل سے بھرپور ایسے مسکیت جوابات دیئے کہ ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں اور ان کے قلم ناکارہ نظر آنے لگے۔ اس لحاظ سے ضرورت تو نہ تھی کہ اس موضوع پر گفتگو کی جائے لیکن حال بھی میں منکرینِ حدیث کی سرگرمیاں از سر نو کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ علمی بساط پر مات کھانے کے بعد اب نئی چالیں چلنے لگے ہیں اور اپنی چابکدستی کا مظاہرہ کرنے کے لئے سادہ لوح نادان مسلمانوں کو نشانہ بناتے ہوئے ہیں وہ مسلمان جو بے چارے دین سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر ان کے سطحی اعتراضات کو سمجھ نہیں پاتے اور ان کے فریب کا باسانی شکار ہو جاتے ہیں۔

لاہور میں بھی بعض دوستوں سے ان کی فتنہ سامانیوں کا حال معلوم ہوا سوچ ہی رہا تھا کہ کسی مبسوط تحریر کی مدد سے ان لوگوں کا سدِ باب کروں اسی اثنا میں میرے ایک دوست حج کی غرض سے کراچی کچھ روز ٹھہرے واپسی پر ان کی زبانی ان لوگوں کی سرگرمیوں کا مزید انکشاف ہوا انھوں نے اپنے بعض سرکردہ رہنماؤں کی تقاریر ٹیپ ریکارڈ کر کے ملک کے مختلف علاقوں میں تقسیم کر دی ہیں فارغِ وقت میں یہ لوگ پارکوں، تفریح گاہوں اور ہوٹلوں جیسی عام آمد و رفت کی جگہوں پر حلقے بنا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان تقریروں کی ٹیپ چلا دیتے ہیں۔ عام سادہ لوح مسلمان وقت گزاری کے لئے ہی ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ علمِ دین سے چونکہ پوری طرح واقفیت نہیں ہوتی، اس لئے ان کی پرفریب باتیں سن سن کر بے چارے عجیب قسم کی ذہنی الجھن میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ عام لوگوں کے سامنے علمی بحثیں تو چل نہیں سکتیں ان کی سمجھ سے ہی بالاتر ہوتی ہیں یوں بھی علمی بحثوں کے لئے اب ان کے پاس رہا بھی کچھ

نہیں جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ علماء نے ان کو خاموش کر کے رکھ دیا ہے اس لئے ان ٹیپ ریکارڈ کی ہوتی تقریروں میں یہ لوگ زیادہ زور اسی بات پر دیتے ہیں کہ احادیث چونکہ محفوظ نہیں رہ سکیں اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور قرآن چونکہ محفوظ ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے مضامین میں جامع بھی ہے اس لئے قرآن اکیلا ہی کافی ہے۔ عام لوگ ان کے اس دھوکے میں آجاتے ہیں اور قسم قسم کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر میں نے اس کام میں مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی اور اللہ کا نام لے کر اس موضوع پر کام کا آغاز کر دیا۔ ابتداءً ارادہ یہ تھا کہ چونکہ منکرین حدیث حفاظت حدیث ہی کو شکوک بنا کر حقیقت حال سے بے خبر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے صرف حدیث کی حفاظت کے موضوع تک کام کو محدود رکھا جاتے مگر آغاز کار میں ہی محسوس ہونے لگا کہ جب تک حفاظت کے ساتھ ساتھ حجیت حدیث پر بھی تفصیلی بحث نہ کی جاتے کام ادھورا ہی رہیگا جوں جوں اس موضوع پر کام کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا یہ ضرورت قوی سے قوی تر ہوتی گئی بالآخر مجھے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا چنانچہ میں نے اپنے کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا پہلا حصہ حفاظت حدیث ہی کے ساتھ مختص رہا جبکہ دوسرے حصے کو میں نے حجیت حدیث کی بحث کے لئے خاص کر دیا۔

میری گفتگو کا محور زیادہ تر وہ اعتراضات رہے ہیں جو منکرین حدیث کی جانب سے حفاظت حدیث کو مشکوک بنانے اور حجیت حدیث کو مضحکہ خیز کرنے کی خاطر بڑے شد و مد سے پیش کئے جاتے ہیں میرے پیش نظر زیادہ تر یہ رہا ہے کہ علمی بساط پر علمائے حق کے ہاتھوں مات کھانے کے بعد منکرین حدیث عام سادہ لوح ناواقف مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جو نئی چالیں چلنے لگے ہیں ان کی اصل حقیقت

حال واضح کر دو تاکہ وہ لوگ جو بے چارے دین سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر ان کی چالوں کو سمجھ نہیں پاتے ان کے فریب کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔ میں نے اس کام میں جہاں تک ہو سکا اصل مآخذ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے مگر کہیں کہیں باہر مجبوری ثانوی مآخذ پر بھی انحصار کرنا پڑا اس دوران جو کتابیں میرے زیر مطالعہ رہیں ان کی ایک مختصر فہرست اس کتاب کے آخر میں میں نے دے دی ہے تاہم جن کتابوں سے مجھے اس کام میں بہت زیادہ مدد ملی وہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی تہذیب التہذیب، حافظ ابن قیم کی اعلام الموقعین اور حافظ ابن عبد البر کی جامع بیان العلم، نیز محمد عجاج الخطیب کی ”السنة قبل التدوین“ اور شیخ طاہر الجزیری کی توجہ النظر ہیں۔ علامہ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، حافظ ابن حجر کی لسان المیزان اور حافظ سیوطی کی تدریب الراوی سے بھی میں نے بھرپور استفادہ کیا۔ قریب کے فضلاء میں سے میں نے ڈاکٹر مصطفیٰ سبائی کی تصنیف ”السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي“ اور ڈاکٹر صبحی صالح کی تالیف ”علوم الحديث ومصطلحہ“ سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اردو زبان میں بھی مولانا مناظر حسن گیلانی کی ”تدوین حدیث“ اور مولانا بدر عالم کی ”ترجمان السنة“ نے میری بڑی رہنمائی کی۔

میں مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب کا شکر گزار ہوں جن کے توسط سے مجھے جامعۃ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور کے کتب خانے تک رسائی حاصل ہوئی اور مہتمم جامعۃ حضرت مولانا عبید اللہ زید مجدہ نے کمال مہربانی سے مجھے اس سے استفادہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ نیز ملک غلام علی صاحب منصورہ لاہور کا بھی ممنون ہوں کہ وہ حوالوں کی تلاش میں وقتاً فوقتاً میری مدد فرماتے رہے اور ضروری مصادروں کا بھی ہم رسائی میں مجھے ان کا مکمل تعاون حاصل رہا۔

مجھے حاجی محمد عاشق صاحب شادمان کالونی کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں

نے اس کام میں میرے ساتھ ہمہ جہتی تعاون کیا حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا دہودا نہی کے ذوق و شوق اور انہی کی کوششوں کا رہن منت ہے اللہ تعالیٰ نے خدمتِ دین کے جس جذبے سے انھیں نوازا ہے وہ قابلِ مددِ تعریف ہے میری دعا ہے کہ انھیں خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق نصیب ہو اور اس سلسلے میں ان کی تمام مناسیٰ مقبول بارگاہِ الہی ہوں۔

آخر میں ربِّ کیم سے دستِ بدعا ہوں کہ وہ میری اس حقیر کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین: دَمَا تَوْفِیْقُ إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ
الْیَدِ الْمُنِیْبُ

محتاجِ دعا
محمد محترم فہیم عثمانی

۳ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ

سر ماہِ پچ ۱۹۷۹ء

جُزْوَ اَوَّل

حفاظتِ حدیث

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ

وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ

(الحجر: ٩٠)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حدیث کا انکار اور منکرین حدیث

انکار حدیث کا فتنہ اگرچہ بہت پُرانا ہے لیکن پُرانے منکرین حدیث اور موجودہ منکرین حدیث کے طرزِ عمل میں بڑا ہی بین اور نمایاں فرق ہے وہ یہ کہ وہ لوگ احادیث نبوی کے منکر ضرور تھے مگر ان کا تمسخر نہ اڑاتے تھے، فلسفے کی بھول بھلیوں سے مرعوب ہو کر حدیث کا انکار تو کرنے لگے تھے لیکن احادیث نبوی کا مذاق اڑانے کی جرأت انہیں نہ ہوئی تھی۔ ان کے برعکس موجودہ منکرین حدیث احادیث نبوی کا مضحکہ اڑاتے ہیں، تمسخر کرتے ہیں، نہ صرف احادیث کا بلکہ حدیث کا بلیش بہا ذخیرہ ہم تک پہنچانے والے تمام صحابہ کرام کا، محدثین کا مفسرین کا سب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حیرت ہے ان لوگوں کی شرم و حیا کو کیا ہوا، یہ لوگ ایسے علماء ایسے فقہاء اور ایسے فضلاء کو اپنے استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں جو علم کی تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اپنی نظیر نہیں رکھتے، یہ لوگ امام بخاری امام مسلم اور امام مالک جیسے بلند پایہ محدثین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ضرور اڑائیں مگر اللہ کی گرفت سے بے خبر نہ ہوں۔

۴۴ یوں خدا خواہد کہ پردہ کس ذرہ میلش اندر طعنہ پاکاں نہ نہ
جب اللہ کسی کی پردہ دری کرنا چاہتا ہے کسی کو ذیل و رسوا کرنا چاہتا ہے تو اس
کے دل میں یہ رغبت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ پاک لوگوں پر یعنی اللہ کے نیک بندوں
پر طعنہ زنی کرنے لگتا ہے۔ پھر یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کا دامن اس کے بے جا
طعنوں کے باوجود پاک و صاف ہی رہتا ہے نتیجتاً وہ خود ہی رسوا ہو کر رہ جاتا ہے۔

حلم حق با او مومنا کتد یوں بہ حدش بگزر د رسوا کند
اللہ کی بردباری اسے ڈھیل دیتی رہتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس دریدہ و ہنسی پر کوئی
گرفت ہی نہیں ہے لیکن جب وہ حد سے گزر جاتا ہے تو پھر اللہ اسے رسوا کر ڈالتا ہے۔
اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے منکرین حدیث کو رسوا کر کے رکھ دیا
رسوائی ہے یہ محدثین کو ام پر زبان طعن دراز کرنے والے یہ احادیث نبوی کا مذاق
اڑانے والے فی الحقیقت رسوا ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ اپنی رسوائی کو سمجھ نہ پائیں تو علیحدہ بات
ہے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے ان کی عقلوں پر پردے پڑ گئے ہیں ورنہ ذرا
سوچیں تو سہی یہ لوگ کن لوگوں کی صف میں کھڑے ہیں۔

یہ منکرین حدیث یہ ارشادات نبوی سے منہ موڑنے والے یہ جناب
رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا مذاق اڑانے والے یہ لوگ جو کہتے ہیں ہمیں
حدیث کی ضرورت نہیں جو لوگوں کو ترغیب دلاتے پھرتے ہیں کہ حدیثوں پر اعتماد نہ
کرو حدیثوں کو نہ سنو حدیثوں کو نہ پڑھو حدیثوں پر عمل نہ کرو احادیث نبوی کے
خلاف یہ باقاعدہ تحریکیں چلانے والے خدا را غور تو کریں اپنے آپ کو کن لوگوں کی صف میں کھڑا ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے خلاف یوں محاذ بنانے والے
کون لوگ تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو نہ سننے کی ترغیب دینے والا سب سے
پہلا ابولہب تھا جو مکہ کی کلیوں میں کتا پھرتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی بات نہ سنو۔

اللہ کی لعنت ہو اس پر وہی تھا جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کا مذاق اڑاتا تھا اسی مذاق اور اسی تمسخر ہی نے تو ابولہب کی گردن میں ابدی لعنت کا طوق ڈلوادیا

تَبَّتْ يَدَا ابْنِ لَهَبٍ وَتَبَّ (لہب: ۱) | ترجمہ: ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ تباہ و برباد ہو جائے۔

آج منکرینِ حدیث کا بھی یہی کام ہے وہ بھی گلی گلی کہتے پھر رہے ہیں کہ احادیثِ نبوی قابلِ اعتماد نہیں انہیں نہ سنو کہ دین پر عمل کرنے کے لیے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ارشاداتِ نبوی کا مذاق اڑاتے ہیں تو سنیں غور سے سنیں ارشاداتِ نبوی کا مذاق اڑانے والوں کے لیے اللہ نے ابدی لعنت لکھ دی ہے۔

ان منکرینِ حدیث کی اس سے بڑھ کر رسوائی اور کیا ہوگی کہ یہ لوگ اور ابولہب جیسا قابلِ نفرین دشمنِ دین ایک ہی صفت میں کھرے نظر آتے ہیں۔

آج سے چودہ سو سال پہلے ابوہل کہتا تھا کہ ”اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ کو جھوٹا نہیں کہتا مگر آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں“۔ آج کا منکرِ حدیث بھی بالکل یہی بات کہہ رہا ہے مگر خوبصورت لفظوں کے پردوں میں پیٹ کر۔ وہ کہتا ہے کہ عقل کی کسوٹی پر ہم پرکھتے ہیں تو احادیثِ یوری نہیں اترتیں اس لیے ہم احادیث کو نہیں مانتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ابوہل کی سمجھ میں بھی نہیں آتی یقیناً اب ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ سمجھ میں آئیں کیسے قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم افراد کی سمجھ میں حق آیا ہی نہیں کرتا اور قبولِ حق کی صلاحیت اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک آئینہٴ دل سے تعصب کے پردے نہ ہٹائے جائیں، جب تک چشمِ بینا سے اغراضِ نفسانی کی عینک نہ اتاری جائے، جب تک نورِ حق کی کرنوں کے داخلے کے لیے دماغ کی ساری کھرٹکیاں کھلی نہ رکھی جائیں۔ بے چارے منکرینِ حدیث کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ان کو علمِ حدیث پر مکمل عبور حاصل نہیں۔ احادیث کی مختلف اقسام و انواع اور راویانِ حدیث سے متعلق فنِ تنقید و تحقیق سے یہ لوگ قطعاً نا بلد ہیں۔

تطبیق آیات و احادیث ایک مستقل فن ہے جس کی اوج تک سے یہ بے چارے بے خبر ہیں۔ علوم حدیث کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں، برسوں علماء و مشائخ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا پڑتا ہے اس کے بعد بھی مدتوں مسلسل اور عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے تب کہیں ہر اکرا حدیث نبوی کی صحیح عظمت و افادیت اور سنت نبویہ کے صحیح مقام کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

منافقت | منکرین حدیث کی سمجھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے اسرار و رموز نہیں آتے تو صاف کہیں کہ ہم عقل و فراست کی روشنی سے محروم ہیں۔ مشرکین عرب سب کچھ تھے، ان میں ہر قسم کی بُرائیاں موجود تھیں مگر وہ

HYPOCRATES (دوغلے، منافق) نہ تھے HYPOCRISY سے انہیں نفرت تھی۔ دوغلے پہ کوہ گالی سمجھتے تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر ہوتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں تو وہ سیدھے سادے لفظوں میں اس کا اظہار کر دیتے تھے کہ آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں

مگر منکرین حدیث سیدھی طرح اپنی عقل کے عجز کا اظہار کرتے ہوئے شرماتے ہیں کیسے

کہہ دیں کہ ارشادات نبوی کے اسرار و رموز ہماری عقل کی رسائی سے باہر ہیں،

یہ مردہ دری جو ہوتی ہے۔ دنیا کو پستہ جو لگ جاتا ہے کہ ان کے علم کی گہرائی کہاں تک

ہے۔ منکرین حدیث کی اس کمزوری کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دُور بین نگاہوں نے آج

سے تیرہ چودہ سو سال پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ حافظ ابن قیمؒ اپنی کتاب اعلام المتقین میں

نقل کرتے ہیں کہ اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَقُولُ اَصْحَابُ الرَّايِ اَعْدَاءُ الشَّيْنِ

اَعْيَتْهُمْ الْاَحَادِيثُ اَنْ يَحْفَظُوْهَا وَتَفَلَّتْ مِنْهُمْ اَنْ يَعُوْهَا وَاسْتَعْيَوْا حِيْنَ

سُئِلُوْا اَنْ يَقُوْلُوْا لَا نَعْلَمُ فَعَارَضُوْا الشَّيْنَ بِرَايِهِمْ فَاَيَاكُمْ وَاَيَا لِهٖ حضرت عمر

فرمایا کرتے تھے کہ عقل کی اتباع کرنے والے حدیث کے دشمن ہو کر رہتے ہیں حدیثیں یاد کرنے کی

انہیں توفیق نہیں ہوتی اور جب ان سے سوال کیا جاتا ہے تو یہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں کہ ہمیں

علم نہیں لہذا اپنی رائے سے جواب دیتے ہیں اور احادیث کا عقل سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں،

تم ایسے لوگوں سے بچتے رہنا۔

اتمام حجت | غرض منکرینِ حدیث کے لیے لمحہ فکرمہ ہے وہ سوچیں کہ ان کی رسوائی کیا شکل اختیار کر چکی ہے وہ کن لوگوں کی صف میں کھڑے ہیں ان کا طرزِ عمل کن لوگوں کے طرزِ عمل کا غماز ہے۔ ابو لمب اور ابو بھل کون تھے، احادیثِ بنوی کے بارے میں ان کی سوچ کا کیا اندازہ تھا اور پھر اپنی سوچ کے رخ کو بھی پہچانیں کہیں ان کی سوچ کا رخ بھی اسی جانب تو نہیں جس جانب ابو لمب اور ابو بھل کی سوچ کا تھا۔ تعصّبِ بالا تر ہو کر سوچیں اگر سوچ کا رخ غلط ہے تو اسے درست کر لیں، ابھی وقت ہے ان لوگوں کی صفوں میں شامل ہوں جو قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کو بھی حجت مانتے ہیں۔ جو جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وحیِ الہی ہے اور اسی لیے واجبِ الاتباع ہے۔

ترجمہ: اور وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں بناتے | وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحٰی ۚ (النجم: ۳-۲)
(ان کا کلام تو) تمام تروجی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے
یہ قرآن کی آیت ہے، اسی قرآن کی جسے منکرینِ حدیث حجت مانتے ہیں وہی قرآن کہہ رہا ہے کہ آپ اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں کہتے وہی کہتے ہیں جو وحی کی جاتی ہے۔ آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وحی ہے پھر کہے حجت نہ ہونے کا کیا مطلب! خدا را ذرا غور کیجئے، پلٹ آئیے اسی قرآن ہی کی طرف پلٹ آئیے جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ بس یہیں قرآن ہی کافی ہے۔ وہی قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحٰی -

سے گفتہ او گفتہ اللہ لود | گمراہی از حلقوم عبد اللہ بود
آئیے باطل کی ظلمتوں سے نکل آئیے، بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات آفتابِ نبوت و رسالت ہے۔ آنکھیں کھولیں دیکھئے قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

ترجمہ: اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے | وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ اِلَّا لِيُطَاعَ
کہ اس کی اطاعت کی جائے اسی طرح اللہ کا حکم ہے۔ (النساء - ۶۴) بِاِذْنِ اللّٰهِ

رسول بھیجا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اس کے ہر فرمان پر لبیک کہا جائے اس کے ہر فعل کی تقلید کی جائے اس کی ہر ہر ادا کی پیروی کو موجب نجات سمجھا جائے اس لیے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وحی الہی کے تحت ہوتا ہے۔ انہی لیے اللہ تعالیٰ اس کی اطاعت کو اپنی اطاعت سے تعبیر کرتا ہے۔

مَنْ يَطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ | ترجمہ: جو رسول کی اطاعت کرے اس نے درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی۔ (النساء: ۵۹)

ان قرآنی آیات کو بار بار پڑھیے ان کے معانی پر خوب غور کیجئے اور پھر ذرا اپنے اس دعوے پر نظر ڈالئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول اور کوئی فعل ہمارے لیے حجت اور واجب العمل نہیں ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے آپ اللہ کی کتاب ہم تک پہنچانے کے لیے آئے تھے وہ فریضہ ادا ہو چکا اب ہم جانیں اور ہمارا خدا جلنے۔ ذرا غور تو کیجئے محمولہ بالا آیات قرآنی کی روشنی میں آپ کا یہ دعویٰ کس قدر غیر معقول ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک قاصد اور ڈاکٹے کی سی ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ کا پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کو لوگوں سے کچھ کہنے سننے کا حق باقی نہیں رہتا، پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کی حیثیت عام انسان کی سی ہو جاتی ہے؟ خدا کے لیے ذرا سوچئے یہ کن لوگوں کے الفاظ ہیں جو آپ کی زبان سے نکل رہے ہیں کفار ہمیشہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں یہی کہتے آئے

قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا | ترجمہ: (کفار نے) کہا کہ تم تو بس ہماری ہی طرح کے انسان ہو۔ (ابراہیم: ۱۰)

یعنی ہم تمہاری کیوں نہیں اور کیوں اطاعت کریں۔ کتنے تعجب کی بات ہے دعویٰ ایمانی کے باوجود آپ کی سوچ کا انداز کفار سے ملتا جلتا ہے۔ باہر نکل آئیے ان کی صفوں سے اور مل جائیے ان لوگوں کے ساتھ جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو تمام عالم کے لیے رحمت سمجھتے ہیں اور آپ کی حدیث و سنت کو امت کے لیے حجت اور مشعل ہدایت مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا

اتباع کیمائے سعادت اور کلیدِ جنت ہے نیز آپ کا عشق اور آپ کی محبت آخرت میں موجبِ شفاعت اور رحمت میں باعثِ رفیع درجات ہے۔ آئیے ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جائیے جنہوں نے اتباعِ سنتِ نبوی کے سہارے اللہ کے ان محبوب بندوں کی فرست میں اپنا نام لکھوایا جن پر اللہ نے خاصِ انعام فرمایا ہے

وَمَنْ يَطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ
مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ مِنَ النَّبِيِّينَ
وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالْقَالِينَ
حَسَنَ أَوْلِيَّكَ زَيْفَقَاهُ (النساء - ۶۹)

ترجمہ: اور جو اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرے تو ایسے لوگ ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اور یہ حضرات بہت ہی اچھے ساتھی ہیں۔

واقعی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں مگر یہ نعمت رسول کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ آئیے رسول کی اطاعت کا عہد کریں تاکہ اس نعمت سے محرومی نہ رہے۔

انکارِ حدیث کی اصل وجہ | منکرینِ حدیث کو یہ دعوت اتمامِ حجت کے لیے ہے

در نہ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے یہ پیکار ان کے لیے صد الجحرا سے زیادہ نہیں۔ ان لوگوں کے انکارِ حدیث کی وجہ کوئی علمی مخالفت نہیں ہے کہ اس کے دورہ ہونے کے بعد ان کو شرح صدر ہو جائے گا اور وہ اپنی غلطی سے رجوع کر لیں گے اگر یہ بات ہوتی تو علماء حق ان کے شرح صدر کا کافی سامان مہیا کر چکے ہیں اب تک انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہوتا۔ لیکن یہ ابھی تک انکارِ حدیث کے موقف کو بدستور حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر ان کی گاڑی نہیں چلتی۔ دراصل دین کی پابندی ان کے نفس کی برداشت سے باہر ہے۔ احادیثِ نبویہ اور سنتِ محمدیہ قدم قدم پر شہواتِ نفس میں مزاحم ہیں۔ احادیث کو مانتے ہیں تو آزادی جاتی ہے۔ نفسِ یوہپ کی بے حیا تہذیب اور بے لکام تمدن پر فریفتہ ہے۔ یہی فریفتگی انہیں انبیاء و مرسلین کے تہذیب و تمدن سے متنفر اور بیزاد کیے ہوئے ہے۔ اتنی اخلاقی جرأت

نہیں کہ صاف برائت کا اعلان کر دیں اس لیے ان منکرینِ حدیث نے درمیان کی راہ نکال لی ہے کہ حدیث کا انکار کر دیا جو ان کی آزادی میں اصل سدا راہ تھی اور مسلمان کھلانے کے لیے قرآنِ کریم کا اقرار کر لیا کیونکہ قرآنِ کریم کی حیثیت ایک اصولی اور قانونی کتاب کی ہے وہ ایک دستورِ اساسی ہے جو زیادہ تر اصول اور کلیات پر مشتمل ہے جن میں ایجاز و اختصار کی بنا پر تاویل کی گنجائش نکل آتی ہے جبکہ احادیث بنویہ ان اصول اور کلیات کی شرح اور تفصیل ہیں ان میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔

اب یہ بے چارے احادیث کا انکار نہ کریں تو کیا کریں، آخر انہیں قرآنِ کریم کے مجملات اور موجز کلمات میں ایسی من مانی تاویلات کرنی ہیں جس سے ان کے اسلام اور ان کے نفس کی بے قید عیش پرستی میں کوئی منافیات نہ رہے۔

اسی لیے تو یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انکارِ حدیث کے بغیر ان بے چاروں کی کاڑھی نہیں چلتی، انکارِ حدیث ان کی مجبوری ہے۔ جس عیش پرستی کے یہ لوگ غلامی ہو چکے ہیں حدیث کو حجت ماننے کی صورت میں اس عیش و آرام کو انہیں خبر باد کہنا پڑتا ہے۔ صادق و مصدوق بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس فتنے کی خبر دی تو ان کی اس کمزوری کی طرف بھی اسی وقت اشارہ فرما دیا تھا کہ انکارِ حدیث کے فتنے کی اصل وجہ عیش پسندی ہوگی۔ دیگر فتنے کی طرح فتنہ انکارِ حدیث کی خبر دیتے ہوئے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ترجمہ : میں تم میں سے کسی کو اپنی منہوں پر سہارا لگائے ہوئے (اس حالت میں) نہ پاؤں کہ جب میرا حکم اس کے پاس پہنچے جس میں کسی کام کے کرنے کو میں نے کہا ہو یا کسی کام سے روکا ہو تو (تکبر اور نخوت سے) یہ کہہ کر میں نہیں جانتا یہ کیا حکم ہے ہم تو جو قرآن میں پائیں گے فقط اس کی پیروی کریں گے۔

لَا الْفَيْنَ أَحَدَكُمْ مُتَكَبِّرًا عَلَىٰ أَمْرِكُمْ
يَأْتِيهِ الْأَمْرُ مِنْ أَمْرِي فَمَا أَمَرْتُ
بِهِ أَوْ نَهَيْتُمْ عَنْهُ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي
مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللَّهِ اتَّبَعْنَا
(ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

دیکھ لیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی کیسی حروف بہ حروف منکرین حدیث پر صادق آتی ہے۔ آج اپنی آنکھوں مشاہدہ کر لیجئے۔ حدیث کا انکار کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ سپرنگ دار صوفیوں پر متکبرانہ شان سے بیٹھنے والے، قوم کے بنے ہوئے نرم نرم بستروں پر آرام کرنے والے۔ یہ سپرنگ دار صوفی اور یہ نرم نرم بستر ہی ان کی اصل کمزوری ہیں۔ اس راحت و آرام کی عادت نے ان کی طبیعتوں کو آزاد بنا دیا ہے۔

حدیث کا انکار اس لیے نہیں ہے کہ وہ علمی بنیادوں پر اسے حق سمجھتے ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ جس قسم کی آزاد زندگی وہ گزارنا چاہتے ہیں احادیث کا ذخیرہ ان کو اس طرح کی زندگی گزارنے نہیں دیتا۔ احادیث قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے معانی و مفہوم کو متعین کر دیتی ہیں اور اس طرح ان کو پابند بنا دیتی ہیں کہ شریعت کی منشا کے مطابق زندگی گزاریں اور یہی ان کے لیے محال ہے۔ ان کی آزاد طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآنی آیات کی من مانی تاویلیں کریں۔ احادیث ان کے اس مقصد میں فزاحم ہیں اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ احادیث سے بھیجا چھڑا لیا جائے۔

احادیث ان کی آزادی میں کس طرح مزاحم ہیں۔
خواہشاتِ نفس کی پیروی | آئیے ذرا اس کا جائزہ لیں طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک دو مثالیں ہی کافی رہیں گی۔

پانچ وقت کی نماز ان کے نفس پر بڑی شاق ہے۔ کتنی عجیب پابندی ہے یہ کہ صبح صبح نرم و گرم بستروں کو چھوڑ کر مسجد کا رخ کیا جائے یا شبیعہ محفلوں سے اٹھ کر بجائے نماز پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا جائے، دن میں بھی ہر دو ڈھائی گھنٹے بعد دنیا کے اہم ترین امور سے منہ موڑ کر بار بار نماز کے لیے دوڑا جائے۔ نفس اس پابندی سے گلو خلاصی چاہتا ہے۔ اس کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہو کر انہوں نے کہا کہ قرآن نے جہاں جہاں صلوٰۃ کا حکم دیا ہے اس سے یہ معروف نماز مراد لینا درست نہیں صلوٰۃ کے معنی نعت ہیں دعا کے ہیں اس لیے جہاں کہیں بھی اور جس طرح بھی دعا کر لی جائے اقبوا الصلوٰۃ کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔ قرآن نے تو صلوٰۃ کے قائم کرنے کا مجمل

حکم دے کر اس کی تمام تر تفصیل احادیث پر چھوڑ دی تھیں۔ احادیث ہی نے بتلایا کہ صلوٰۃ کسے کہتے ہیں۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی کیا ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں صلوٰۃ سے کیا مراد ہے وہ کس طرح ادا کی جاتی ہے اسکے اذکار کیا ہیں ہر نماز کتنی رکعات پر مشتمل ہے۔ اس کے ارکان اس کی شرائط اور اس کے فرائض و واجبات سب حدیث نے متعین کیے ہیں۔ اب منکر بن حدیث کی مشکل یہ ہے کہ احادیث کو مانتے ہیں تو نماز اپنی پوری کیفیت کے ساتھ ادا کرنی پڑتی ہے اور یہ ان کی آزادی پسند طبیعت کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ اس مشکل کا آسان حل ان بے چاروں کو یہی نظر آیا کہ احادیث کی حجیت سے ہی انکار کر دیا جائے۔

اسی طرح قرآن نے اثناء زکوٰۃ کا حکم دیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شرح و تفسیر بیان فرمائی کہ زکوٰۃ کس مال پر ہے، وہ کتنی مالیت کا ہو، اس پر کتنی مدت گزرے گی ہو پھر اس کی ادائیگی کس شرح سے ہو غرض آپ نے اس کی ساری متعلقہ تفصیلات بیان فرمائیں۔ اب احادیث کے مانع کی صورت میں زکوٰۃ کو اس کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ قبول کرنا پڑے گا جو نفسانی اغراض کے پورا کرنے میں زبردست رکاوٹ ہے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے اور زکوٰۃ کے قرآنی حکم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا سب سے آسان راستہ یہی تھا کہ احادیث کا انکار کر دیا جائے۔

انہی دو مثالوں پر شریعت کے دیگر احکام کو بھی قیاس کر لیجئے۔ قرآن کریم تو ہے ہی ایک اصولی کتاب جو زیادہ تر کلیات پر مشتمل ہے احادیث بنوید ان کلیات کی شرح اور تفصیل ہیں۔ قرآن کے اصولی احکام کو ان کی شرح و تفسیر سے الگ کر لیجئے پھر قرآن کے الفاظ کو جو معانی جی میں آئیں پہنا دیجئے نفس کی خواہشات بھی پوری ہوتی رہیں گی اور آپ اپنے آپ کو عامل بالقرآن بھی کہہ سکیں گے۔

منکر بن حدیث نے یہی کچھ کیا۔ دراصل ان لوگوں نے شیطان کی بالواسطہ مدد | شیطان کا کام بڑا آسان کر دیا، شیطان کو بڑی درد سہی کرنی پڑتی تھی ہر ہر نیک کام کے لیے فرداً فرداً ہر ایک کو روکنا پڑتا تھا، کبھی نماز سے روک رہا ہے کبھی زکوٰۃ سے جان بچانے کے حربے سکھا رہا ہے کبھی صدقہ و خیرات

سے جی چرانے کے لیے فقر و عسرت کے ڈراوے دیتا پھر رہا ہے غرض جتنے نیک کام ہیں سب سے روکنے کے لیے اسے علیحدہ علیحدہ محنت کرنی پڑتی تھی اسی طرح ہر بُرائی کی طرف رغبت دلانے کے لیے اسے ہر بار جدوجہد کرنا پڑتی تھی، اپنی ذریت کی پوری فوج اس نے لگائی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود بھی شیطان بے چارے کی مشکل یہ تھی کہ ایک انسان نے اس کے ہرکانے پر ایک بار نماز نہ پڑھی دوبارہ نہ پڑھی لیکن کبھی نہ کبھی اسے خیال آ ہی جاتا تھا کہ آخر مسلمان ہوں آخرت پر یقین رکھتا ہوں اللہ کے سامنے جوابدہی کا وقت آئے گا تو کیا کروں گا وہ پھر نماز شروع کر دیتا تھا شیطان کو پھر از سر نو اسے ہرکانا پڑتا تھا۔ بڑی مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔ بے چارہ منکرین حدیث نے اس کی مشکل حل کر دی۔ انہوں نے اس درخت کو ہی جڑ سے اکھڑ پھینکا جس سے نماز روزے زکوٰۃ اور دیگر شرعی احکام کی شاخیں پھوٹتی تھیں۔

ع وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انہوں نے احادیث کا انکار کر دیا جو قرآنی کلیات کی تفصیلات کو بیان کرتی تھیں جو قرآن کے مجمل احکام کی تفسیر تھیں جو قرآن کے ایجاز و اجمال کی شرح تھیں جو قرآنی آیات کے صحیح صحیح معانی کی تعبیر کرتی تھیں جو احکام الہی کی تعمیل کا طریقہ بتلاتی تھیں جو دین کے اصولی و امر و نہی کا مکمل ڈھانچہ تشکیل دیتی تھیں انکار حدیث کے بعد اب دین موم کی گریبا بن گیا جس طرح چاہا اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا شریعت کی ساری پابندیوں سے چشم زدن میں جان چھوٹ گئی شیطان کا کام آسان ہو گیا اب ہر ہر کام کے لیے علیحدہ علیحدہ محنت کی ضرورت نہ رہی جس کو دین سے ہٹانا مقصود ہوا اسے ورنہ بلا ہرکا کر منکرین حدیث کے پیچھے لگا دو بس پھر کام ختم ۝

دشمنانِ اسلام کو تقویت | انکار حدیث کا سب سے زیادہ فائدہ دشمنانِ اسلام کو پہونچا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ امت

مسلمہ کے لیے ایک نقطہ اتحاد کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ایسا محور و مرکز ہے کہ ہر قسم کے اختلافات یہاں پہونچ کر دم توڑ دیتے ہیں اور اس حقیقت میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ

ملتِ اسلامیہ کی قوت کا راز اسی نقطہ اتحاد اور اسی محور و مرکز میں منحصر ہے۔ انکارِ حدیث سے اس نقطہ اتحاد پر زبردست ضرب لگی انتشار کی راہیں کھل گئیں، دین کا اعلیٰ نمونہ ہی سامنے نہ رہے تو دین کی جو تعبیر چاہے کر دو۔ مرکز و محور سے ہٹنے کے بعد انتشار ہی انتشار اور افراق ہی افراق باقی رہ جاتا ہے اور دشمنانِ اسلام اسی کے خواہاں ہیں منکرینِ حدیث نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔ یہ اتحاد ہی تھا جس کی قوت کے سہارے امتِ مسلمہ نے دشمنانِ اسلام کو کبھی سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ دشمن اگر کسی چیز سے خائف رہتے تھے تو صرف اس امت کے جذبہ اتحاد سے وہ تو خدا سے چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے یہ امت انتشار کا شکار ہو جائے جو کام دشمنانِ اسلام سے صدیوں میں نہ ہو سکا وہ ان منکرینِ حدیث نے ان کے لیے انجام دے دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایک قاصد اور ڈاکے کی حیثیت دے دی گئی تو پھر وہ کیا گیا۔

ہر حال گفتگو اس پر تھی کہ انکارِ حدیث سے ان منکرینِ حدیث کا مقصد قرآنِ کریم کا اتباع نہیں ہے جیسا کہ یہ دعویٰ کرتے ہیں بلکہ ان کا مقصد محض مذہب کی گرفت ڈھیلی کرنا ہے تاکہ یہ من مانی کر سکیں اور کوئی اعتراض کی انگلی تک ان کی طرف نہ اٹھا سکے۔

علیٰ علیہ السلام پر تو اللہ تعالیٰ نے علمائے حق کے ہاتھوں ان لوگوں کو ایسا رسوا کیا کہ یہ کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہے لیکن ان لوگوں نے اب دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ اب ان کا نشانہ دین سے ناواقف سادہ لوح مسلمان ہیں۔ اپنے ذہنوں کی گندگی یہ لوگ نول صورت الفاظ کے ریشمی رومالوں میں پلیٹ پلیٹ کر پیش کرتے ہیں سادہ لوح مسلمان بے چارے چونکہ پوری طرح دین سے واقفیت نہیں رکھتے آسانی سے ان کے دھوکے میں آ جاتے ہیں :-

اصل روپ | کہتے ہیں کہ ہم سے زیادہ تو قرآن پر عمل کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں، ہم سب کچھ بس قرآن کو سمجھتے ہیں جو قرآن کہہ دے بس وہی درست ہے، قرآن کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی دوسری چیز کی ضرورت ہی نہیں، قرآن ایک جامع کتاب ہے۔ ظاہر نظر میں یہ باتیں بڑی حسین نظر آتی ہیں، عام آدمی کے سامنے جب یہ باتیں

خلیما نہ انداز میں کھجاتی ہیں تو فوراً ان کے دل دماغ کو متاثر کرتی ہیں کون مسلمان ایسا ہے جو یہ کہے گا کہ قرآن ایک جامع کتاب نہیں یا قرآن جو کہتا ہے وہ غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک سادہ لوح عام مسلمان بے چارے کو کیا پتہ کہ ان خوبصورت الفاظ کی تہ میں ان منکرینِ حدیث نے خود تراشیدہ معانی و مظاہریم کا کیسا نہ ہر گھولا ہوا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ ان الفاظ کے پردے میں دواصل یہ لوگ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کو لے کر جیسے چاہو اپنے معانی پہناؤ، بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا احکامِ قرآنی پر جس طرح عمل کر کے دکھایا قرآنی نظام پر مبنی جس طرح ایک مکمل معاشرہ قائم کر کے دکھایا ان سب کو ایک طرف رکھ دو قرآن کو سمجھنے کے لیے ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی کوئی ضرورت نہیں ہم مہبطِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے بغیر ہی قرآن کو سمجھ سکتے ہیں جس طرح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اپنی زندگی پر منطبق کر کے دکھایا اسی طرح ہم بھی اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق موجودہ زندگی پر قرآن کو منطبق کر سکتے ہیں، ان احمقوں کے ذہن میں انتہی ہات بھی نہ آسکی کہ رسول برحق کا انطباق وحی الہی کی روشنی میں تھا جس میں خطا کا کوئی امکان ہی نہیں اور تمہارا انطباق تمہاری اپنا ہی عقل کے مطابق ہو گا جو ازل سے ندیمِ ندیم پر ٹھوکر میں کھاتی چلی آ رہی ہے۔ کہتے ہیں اور ایسا کہتے ہوئے ان عامل بالقرآن کا دعویٰ کرنے والوں کو بشرم بھی نہیں آتی کہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک قاصد اور ڈاکے کی ہے، جس طرح ڈاکے اور قاصد کا کام مکتوب الیہ تک خط کا پہنچا دینا ہے اور پس اسی طرح اللہ کا پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کا کام ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد اسے لوگوں سے کچھ کہنے سنے کا حق باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کی حیثیت ایک عام انسان کی ہوتی ہے گویا نبی اور امتی سب برابر ہو جاتے ہیں۔

العباد باللہ یہ منصب نبوت کے ساتھ کیسا دیدہ دلیرانہ استہزا اور کسی قدر حقائقہ تسخر ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تو تسلیم کریں مگر آپ کے اقوال اور آپ کے افعال کو حجت نہ تسلیم کریں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ کہہ رہے ہوں کہ ہم آپ کو اپنا مقتدا اور پیشوا تو

مانتے ہیں مگر آپ کی کوئی بات ماننے کو ہم تیار نہیں آپ اللہ کی کتاب ہم تک پہنچانے آئے تھے وہ فریضہ ادا ہو چکا اب آپ کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے بھی ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہمیں بھی اللہ نے عقل دی ہے ہم خود سمجھ لیں گے۔ کيسار کيک دعویٰ ہے، کتنا بدیہی البطلان مشرب ہے۔

منصب نبوت کے ساتھ یہ یقیناً کھلا ہوا استہزاء اور تمسخر ہے مگر عام سادہ لوح مسلمانوں کے سامنے اپنے اس دعوے کو اگر حقائق و لفظوں میں کہیں تو قبول کرنا تو بہت دور کی بات ہے ان کے لعن طعن کا نشانہ بننا پڑتا ہے اس لیے ان کے سامنے وہی کچھ کہتے ہیں جو تفصیل کے ساتھ ابھی بنلا یا جا چکا ہے کہ قرآن کے بعد ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں وغیرہ وغیرہ۔

حدیث کی مخالفت میں شک کا اظہار | اسی طرح یہ منکرین حدیث عام سادہ لوح مسلمانوں کو کبھی یہ کہہ کر دھوکہ دینے کی کوشش

کرتے ہیں کہ احادیث محفوظ نہیں ہیں اس لیے قابل اعتماد نہیں رہیں مقصد اس کہنے سے بھی ان کا وہی ہے کہنا تو دراصل یہ چاہتے ہیں کہ دین کا وہ مکمل نقشہ جو قرآن اور حدیث کی روشنی میں تیار ہوتا ہے اس پر عمل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں، ہم آزادی کے دلدادہ ہیں اور قرآن حدیث کے ساتھ مل کر ہمیں ہا بند بناتا ہے، ہم موجودہ دور کے جھکیلے تقاضوں سے مرعوب ہیں اور ہم میں اتنی صلاحیت نہیں کہ ان تقاضوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں اس لیے ہم اسلام کو ان تقاضوں کے مطابق بدل دینا چاہتے ہیں۔ کتنا تو فی الحقیقت یہی سب کچھ چاہتے ہیں، یہ اور اسی قسم کے دیگر مزخرفات، مگر کھلم کھلا کیسے کیسے، اتنی جرأت کہاں سے لائیں کہ اس قسم کی باتیں کر کے لوگوں سے گالیاں کھائیں اور چند روز میں اپنی موت آپ مر جائیں لہذا ہر پھر پھر کر کے کہتے یہ ہیں کہ احادیث کتابی صورت میں ایک عرصہ دراز کے بعد مدون ہوئیں اس سے پہلے عہد نبوی میں اور صحابہ کے دور میں محض زبانی طور پر نقل در نقل کا سلسلہ رہا اور ظاہر ہے زبانی نقل در نقل کے ذریعے الفاظ حدیث کا بعینہ محفوظ رہنا فطرۃ اور عادتہ محال ہے اور جب الفاظ محفوظ نہیں تو معانی کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں اس لیے احادیث کے ذخیرہ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور نا قابل اعتماد مراد پر دین کی بنیاد نہیں

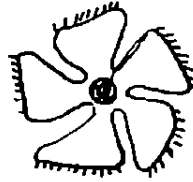
رکھی جاسکتی نتیجتاً حدیث کا سارا ذخیرہ مسترد۔

دیکھا آپ نے کیسا خوبصورت طرز استدلال ہے سیدھے سادے مسلمان بے چارے
 کیا جانیں کہ یہ سب لفاظی ہے خلات واقعہ ہے اور محض خود فریبی اور دھوکہ دہی ہے۔
 حیرت کی بات ہے کہ تاریخ کے ذخائر اور مختلف فنون سے متعلق تجربات و تحقیقات تو
 ان کے لیے قابل اعتماد ہیں جو ناقص ترین ذرائع اور کمزور ترین وسائل کے ذریعے ان
 تک پہنچتے ہیں لیکن فخر دو جہاں سرور کون و مکان کے وہ فرمودات اور وہ اعمال و افعال
 ان کے نزدیک اتنا قابل اعتماد نہیں جن کو قرآن اپنی زبان میں اسوۂ حسنہ کے الفاظ سے
 تعبیر کرتا ہے جن پر بے قیل و قال عملی کرنا صحابہ باعثِ فخر سمجھتے رہے ہیں جن کو چودہ سو
 سال سے پوری امت مسلمہ حرزِ جاں بنائے ہوئے ہے جن کا عملی نمونہ برے بڑے اولیاء
 امت، محدثین، مفسرین اور ہر رکنِ دین کی زندگیوں کی شکل میں ہر دور میں موجود رہا
 ہے کتنی عجیب بات ہے کہ رطب دیا بس کا وہ مجموعہ تو ان کے نزدیک معتد بھڑے جو کسی
 مورخ نے سنی سنائی باتوں اور قیاسات پر مبنی شہادتوں کی بنیاد پر صدیوں بعد صفحہ مرقاں
 پر منتقل کیا ہو اور احادیث کا وہ ذخیرہ غیر معتد قرار پائے جو ایسے طریقوں اور ایسے
 راستوں سے ہم تک پہنچا ہو جو انتہائی ثقہ اور قابل اعتماد ہیں جو نقد و جرح کی ایسی
 چھلنیوں سے چھن کر ہمارے ہاتھوں تک آیا ہو کہ اس سے بہتر نقد و جرح کا کوئی معیار
 مقرر کرنے سے انسانی فکر عاجز ہے جس کو ہر زمانے میں ایسی جماعت روایت کرتی چلی
 آئی ہو جن کا عقلاً بھی جھوٹ پر متفق ہونا محال ہے۔

ع۔ بریں عقل و دانش بباہر گریست

انتہائی لغو ہے منکر بن حدیث کا یہ دعویٰ کہ احادیث کا ذخیرہ محفوظ نہیں رہا۔ عام
 سیدھے سادے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ احادیث بھی
 الحمد للہ حجتِ دین کے اعتبار سے اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح قرآن محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ
 نے جس طرح قرآن کریم کی حفاظت فوق العقل طریقے سے کی اسی طرح احادیث کی
 حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ہی ایسا اہتمام فرمایا جو فی الواقع عقل کے لیے انتہائی حیران کن

ہے۔ اس کے بعد بھی جو شخص حفاظتِ حدیث میں شک کرتا ہے اس کی عقل میں کلام ہے حفاظتِ حدیث کا انکار فی الحقیقت حفاظتِ قرآن کا انکار ہے اور حفاظتِ قرآن کا منکر وعدہ الہیہ کا منکر ہے کیوں کہ اللہ کا وعدہ ہے - **إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ** (ہم ہی نے ذکر اتارا اقدس ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور ذکر کے مفہوم میں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث بھی شامل ہے جہاں یہ آیت قرآن کریم کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کو بیان کرتی ہے وہاں یہ آیت یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ احادیثِ نبوی کی حفاظت کو بھی اللہ نے اپنی ذمہ داری میں لیا ہوا ہے جیسا کہ انشاء اللہ ابھی ثابت ہوا جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں گفتگو کی ابتدا حفاظتِ حدیث ہی کے موضوع پر ہونے لگی ہے مناسب یہی ہے کہ سب سے پہلے حفاظتِ حدیث کا یقینی ہونا واضح کر دیا جائے حدیث کے بارے میں دیگر تمام شکوک و شبہات کا تفصیلی جائزہ انشاء اللہ بعد میں لیا جائے گا۔



حدیث اور حفاظتِ خداوندی

قرآن کی یہ آیت جس کا ابھی حوالہ دیا گیا یا اسی قسم کی دیگر آیات جن میں حفاظتِ قرآن کا ذکر ہے وہ صرف قرآن ہی پر صادق نہیں آتیں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث پر بھی صادق آتی ہیں اللہ نے جس طرح قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اسی طرح حدیث کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے جو شخص یہ کہتا ہے کہ احادیث محفوظ نہیں وہ گویا یہ کہتا ہے کہ قرآن محفوظ نہیں اور جو قرآن کی حفاظت کا انکار کرتا ہے وہ فی الحقیقت ان آیات قرآنی کا منکر ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے ناکیدی انداز میں یہ فرمایا کہ میں نے یہ کلام اتارا ہے اور میں ہی اس کا محافظ ہوں اور منکر قرآن کے بارے میں ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا حکم لگایا جاسکتا ہے ایسے لوگ ہمارے مخاطب نہیں، وہ جانیں اور اللہ جانے، ہمارا خطاب دراصل ان ناواقف مسلمان بھائیوں سے ہے جو منکرین حدیث کے دھوکے میں آکر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ احادیث واقعی محفوظ نہیں اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ جس طرح قرآن کو اللہ نے محفوظ رکھا ہے اسی طرح حدیث کو بھی اللہ ہی نے محفوظ رکھا ہے تو اُمید ہے وہ حق کو پہچان کر اس کو قبول کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔

قرآن اور حدیث دونوں اللہ کی حفاظت میں | اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد

اِنَّا نَحْنُ نُنَزِّلُ الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں الذکر کے معنی قرآن کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ الذکر کو قرآن کے معنی میں لینے پر ان لوگوں کا بھی اتفاق ہے جو حدیث کے منکر ہیں، اختلاف یہاں اگر

ہوتا ہے کہ ہم کہتے ہیں الذکر کے مفہوم میں حدیث بھی شامل ہے کیونکہ قرآن کی حفاظت اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک حدیث کی حفاظت نہ ہو اس لیے جب قرآن یہ کہتا ہے کہ قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمہ ہے تو فی الحقیقت یہ کہتا ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں کی حفاظت اللہ کے ذمے ہے۔ منکرین حدیث اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ الذکر سے مراد صرف قرآن ہے اور صرف اسی کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے چنانچہ وہ ہم تک محفوظ پہنچ گیا حدیث کی حفاظت کا ذمہ ہی اللہ نے نہیں لیا اس لیے وہ محفوظ نہ رہ سکی۔

اب ہمیں ثابت یہ کرنا ہے کہ الذکر کے مفہوم میں قرآن اور حدیث دونوں کی ایک ساتھ حفاظت شامل ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے منکرین حدیث ذرا چند

سوالوں کا جواب دیں :

چند سوال | سب سے پہلے منکرین حدیث یہ بتائیں کہ احادیث تو غیر محفوظ ہونے کی بنا پر قابلِ اعتماد نہیں رہیں تو پھر آپ کو یہ یقین کس ذریعے سے حاصل ہوا کہ قرآن محفوظ ہے بلکہ اس سے بھی پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ ذرا سوچئے آپ کے پاس ان دونوں سوالوں کا اس کے سوا کیا جواب ہے کہ حدیث کے ذریعے سے معلوم ہوا مگر حدیث تو آپ کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن بھی قابلِ اعتماد نہیں؟ خدا را کچھ تو سوچئے آپ حدیث کو نہیں مانتیں گے تو قرآن کو کیسے مانتیں گے۔

۱۔ اس موقع پر بعض منکرین حدیث منوثر اور غیر منوثرہ کی بحث میں پناہ لینے کی کوشش کیا کرتے ہیں مگر انشاء اللہ اس پناہ گاہ سے بھی انہیں راہ فرار اختیار کرنا پڑے گی ہم حجیت حدیث کے موضوع کے تحت اس پر بھی انشاء اللہ تفصیلی روشنی ڈالیں گے اور ان کے اس فریب کا پردہ بھی ہٹا کر دیں گے۔

خدا یہ بھی بتلائیے کہ قرآن کریم جس صورت اور جس شکل میں اس وقت میرے
 اور آپ کے ہاتھ میں نظر آرہا ہے کیا آسمان سے یہ اسی کتابی صورت میں نازل ہوا
 تھا؟ ظاہر ہے آپ کہیں گے ”نہیں“ ہم بھی کہتے ہیں ”نہیں“ تو یہ ”نہیں“ کس علم کی بنیاد
 پر ہے۔ یہ بات آپ کس علم کے ذریعے سے بتاتے ہیں کہ قرآن اس کتابی صورت
 میں آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا بلکہ قصور اقصیٰ کر کے تینیس سال کی مدت میں
 نازل ہوا۔ یہ تینیس سال میں نزول قرآن کی تکمیل کی مدت کس آیت قرآنی سے معلوم
 ہوئی، اس مدت کا ذکر اور نزول کی اس کیفیت کا بیان قرآن میں کس جگہ ہے۔ کیا یہ
 حقیقت نہیں کہ یہ سب کچھ ہمیں، آپ کو اور پوری دنیا کو احادیث سے اور صرف
 احادیث سے پتہ لگا پھر احادیث کو محفوظ و معتمد مانے بغیر ان باتوں کی صحت کا
 یقین آپ کہاں سے حاصل کریں گے۔ اسی طرح ذرا سوچئے کیا قرآنی آیات اسی ترتیب
 سے آسمان سے نازل ہوئی تھیں جس ترتیب سے اب تلاوت کی جاتی ہیں اور کتاب اللہ
 میں ہمیں ملتی ہیں، یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ قرآنی آیات کی نزولی ترتیب یہ نہ تھی
 قرآن کی سورتوں اور قرآن کی آیتوں کی موجودہ ترتیب بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ
 وسلم کے حکم سے قائم کی گئی آپ کے اس عمل کا پتہ کس ذریعے سے لگا آپ کو کیسے
 معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی بھی نازل ہوتی آپ اسے کاتبین وحی
 کے ذریعے لکھوا لیا کرتے، آپ نے کیسے جانا کہ وہ کاتبین وحی کون کون لوگ تھے، آپ
 کے علم میں یہ بات کس طرح آئی کہ قرآن کریم ابتدا میں متفرق اجزاء پر لکھا ہوا تھا،
 پھر کچھ ٹکڑوں پر درختوں کے پتوں پر جانوروں کی ہڈیوں پر اور سوکھی ہوئی کھالوں کے
 قطعات پر۔ یہ سب باتیں آپ کو کس واسطے سے پہونچیں، اگر یہ واسطہ حدیث کا
 نہیں تھا جس کو آپ غیر محفوظ سمجھتے ہیں تو ذرا بتلایا جائے پھر وہ کونسا واسطہ تھا جو
 آپ کے نزدیک حدیث کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہے۔

اے ممکن ہے بعض منکرین حدیث کہیں کہ یہ تاریخی امور ہیں اور تاریخی امور میں حدیث

یہ تمام سوال ہمارے اس دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ احادیث کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تاہم اصل بحث کی طرف لوٹتے ہوئے ہم یہ ثابت کرنے لگے ہیں کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اللہ نے حدیث کی حفاظت کا ذمہ بھی خود ہی لیا ہے ۛ

قرآن صرف الفاظ کا نام نہیں | محولہ بالا آیت میں الذکر سے مراد قرآن ہے تو آیت ذرا اس کا جائزہ لیں کہ قرآن کسے کہتے ہیں کیا

قرآن صرف الفاظ کا نام ہے یا الفاظ اور معانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ صرف الفاظ قرآنی کا نام ہے اور نہ صرف معانی قرآنی کا بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے۔ آپ خود ہی سوچئے اگر کوئی شخص قرآن کریم کے متفرق الفاظ اور جملے کر ایک مقالہ یا رسالہ یا کوئی کتاب اپنے کسی پسندیدہ موضوع پر لکھ دے مثلاً سیاست پر تاریخ پر فلسفہ پر یا کسی بھی مذہبی یا غیر مذہبی موضوع پر کوئی تحریر مرتب کرے اور اس میں یہ اہتمام کرے کہ اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے الفاظ تمام کے تمام

گزشتہ سے پیش کرتا ہوں ہمارے نزدیک بھی حجت ہو سکتی ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ باتیں تاریخی امور ہونے کے باوجود احادیث بنیادی ہیں کہ ان کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کیے بغیر خود قرآن کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ ممکن نہیں جو صرف تاریخی امور ہی کا نہیں تمام احکام دین کا منبع ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا اصل سوال تو یہ ہے کہ یہ احادیث بھی انہی اسانید کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں جن کے ذریعے سے ہم تک وہ احادیث پہنچی ہیں جو حلال و حرام والی آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح کرتی ہیں اگر یہ اسانید قابل اعتماد نہیں تو دونوں جگہ انہیں قابل اعتماد نہ ہونا چاہیئے اور اگر یہ اسانید قابل اعتماد ہیں تو ان کے ذریعے سے پہنچی ہوئی بعض احادیث کو غیر محفوظ کہنے کا کیا مطلب؟

ود استعمال کرے جو قرآن نے استعمال کیے ہیں کوئی ایک لفظ بھی قرآن سے باہر کا نہ آنے دے تو ایسے کسی مقالے یا رسالے کو یا کسی کتاب کو کیا آپ قرآن کہنے پر تیار ہوں گے؟ یا اسی طرح کسی ایسی کتاب کو کیا آپ قرآن کہہ سکیں گے جو تمام تر مضامین قرآنیہ پر مشتمل ہو لیکن اس کے الفاظ اور ان کی ترتیب بناوٹ اس کتاب کی اپنی ہو جیسا کہ اسلامی تصانیف کے ان میں عموماً معانی اور مضامین قرآن ہی کے بیان کیے جاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ نہ پہلی قسم کی کتاب قرآن کہلائی جاسکتی ہے نہ دوسری قسم کی تصانیف کو ہم قرآن کہہ سکتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ قرآن نہ صرف الفاظ کا نام ہے نہ صرف معانی کا، قرآن نام ہے اس مصحف ربانی کا جو الفاظ اور معانی دونوں کا مجموعہ ہے۔

فقہاء جب فقہ کے ماخذ بیان کرتے ہوئے قرآن پر بطور ماخذ فقہ بحث کرتے ہیں تو قرآن کی تعریف بتلاتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ قرآن نظم اور معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ مسائل فقہ کا استنباط کرنے کے لیے قرآن کے نظم اور معنی یعنی قرآن کے الفاظ اور ان کے معانی دونوں کا لحاظ رکھنا لازمی ہے اس کے بغیر مسائل کا استنباط ممکن ہی نہیں۔

اس کے علاوہ ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ الذکر کا لفظ جس سے ہم قرآن مراد لے رہے ہیں لغت میں کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لغت پر منکرین حدیث کو بہت زیادہ اعتماد ہے۔ اسی لغت کی طرف ذرا رجوع کیجئے، الذکر کے لغوی معنی نصیحت کے بھی ہیں۔ قرآن میں بھی جا بجا یہ لفظ نصیحت کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً وَهَذَا ذِكْرُ مُبَارَكٍ أَنْزَلْنَاهُ (۶۰-۵۰) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل کیا یا سورہ ص کی پہلی آیت ہے ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے وَارْتَدَّ لَذِكْرُكَ يُغْنِيكَ عَنْهُ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ اور تمہاری قوم کے لیے نصیحت ہے۔

اب یہ بتلایئے کہ کیا الفاظ کے کسی ایسے مجموعے سے نصیحت حاصل کی جاسکتی ہے جس کے کوئی معنی نہ ہوں۔ معمولی سے معمولی عقل رکھنے والا بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ نصیحت کا حصول انہی الفاظ سے ممکن ہے جو معانی رکھتے ہوں، لہذا الفاظ حصول نصیحت کے لیے مفید نہیں۔ اگر یہ بات درست ہے اور یقیناً درست ہے تو اللہ تعالیٰ کا قرآن کو ذکر کے لفظ سے تعبیر کرنا

خود بنیاد رہا ہے کہ قرآن الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعے کا نام ہے یہ تو ایک حقیقت ہے جس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک عام آدمی بھی اتنی بات سمجھتا ہے کہ محض الفاظ کوئی حقیقت نہیں رکھتے، الفاظ اور معانی کا پوری دامن کا ساتھ ہے، الفاظ اور معانی جسم اور جان کی طرح ہیں۔ جس طرح روح کے بغیر جسم بیکار ہے اور جسم کے بغیر روح کا وجود متصور نہیں ہو سکتا اسی طرح معانی کے بغیر الفاظ بے کار ہیں اور الفاظ کے بغیر معانی کا کوئی وجود نہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ الفاظ اور معانی قرآن کے دو رکن ہیں اور ایسے لازم و ملزوم دو رکن کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ حقیقت سمجھ لینے کے بعد کہ قرآن الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعے کا نام ہے اتنی بات اور ذہن نشین رکھیے کہ قرآن کے معانی الفاظ قرآنی سے جدا ایک علیحدہ حقیقت کے بھی حامل ہیں وہ اس طرح کہ قرآن کے معانی سمجھانے کے لیے ظاہر بے منکمل کو ایسے نئے الفاظ استعمال کرنا پڑیں گے جو الفاظ قرآنی کے علاوہ ہوں یہ ناممکن ہے کہ قرآنی الفاظ کے معانی سمجھانے کے لیے آپ پھر انہی الفاظ کو دہرا دیں اور آپ کا مخاطب معانی پر مطلع ہو جائے مثال کے طور پر کوئی شخص کہتا ہے کہ سورہ فاتحہ کی آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کے معانی بتلائیے تو آپ اس شخص کے جواب میں اسی آیت کو دہرا کر دو بارہ تلاوت کر کے مخاطب کو مطمئن نہیں کر سکتے آپ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آپ نے آیت کے معانی بتلا دیے جب تک کہ آپ اس مقصد کے لیے قرآنی آیت کے علاوہ کوئی اور کلام نہ کریں اور اپنے الفاظ میں آیت کے معانی اپنے مخاطب کو نہ سمجھائیں۔

حدیث نبوی قرآن کا بیان ہے | ان دو مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد کہ قرآن الفاظ و معانی کے مجموعے کا نام ہے اور

قرآنی الفاظ کے معانی بیان کرنے کے لیے منکمل کو اپنے الفاظ کی ضرورت ہے اس مسئلہ حقیقت کو ذہن میں آ جا کر کیجیے کہ حدیث نبوی قرآنی الفاظ کے معانی ہی کا نام ہے، حدیث نبوی قرآن کا بیان ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال و افعال اور وہ تقریرات جن کو محدثین کی

لے محدثین نے احادیث نبوی کو بنیادی طور پر تین قسموں پر منقسم کیا ہے، قولی، فعلی، اور تقریری (باقی اگلے صفحہ پر)

اصطلاح میں حدیث یا سنت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے دراصل مجملات قرآنی کی تفصیل ہیں۔ حدیث بنوی یا سنت بنوی فی الحقیقت مبہمات قرآنی کی وضاحت ہے، مشکلات قرآنی کی تفسیر ہے، مخفیات قرآنی کے لیے اظہار کے مقام پر ہے اور کفایات قرآنی کے لیے تصریح کا کام دیتی ہے۔

ان وضاحتوں کے بعد ہمارے اس دعوے کی حقانیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا ہے۔ معانی قرآنی کی حفاظت کے بغیر الفاظ قرآنی کی حفاظت بے معنی ہے یعنی حدیث کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت ممکن ہی نہیں۔ اس لیے جب ہمیں یہ خبر دی جاتی ہے کہ قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمے ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنی الفاظ اپنے معانی سمیت اللہ کی حفاظت میں ہیں یعنی قرآن احادیث بنوی سمیت اللہ کی زیر حفاظت ہے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن تو محفوظ ہے مگر حدیث محفوظ نہیں تو گویا وہ یہ کہتا ہے کہ قرآن کے الفاظ تو محفوظ ہیں اس کے معانی محفوظ نہیں اور الفاظ کی حفاظت معانی کے بغیر بے کار ہے تو قرآن محفوظ کہاں رہا اسی لیے ابتدا میں جو کہا گیا تھا وہ بالکل درست تھا کہ حدیث کی حفاظت کا انکار کرنے والا دراصل قرآن کی حفاظت کا انکار کرتا ہے اور جو شخص حفاظت قرآن کا انکار کرتا ہے وہ فی الحقیقت ان آیات قرآنی کا منکر ہے جن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمے ہے۔

کیا منکرین حدیث کو اب بھی اس حقیقت میں کوئی شبہ ہے کہ قرآن کی طرح حدیث بھی اللہ ہی کے زیر حفاظت ہے۔ ممکن ہے منکرین حدیث اب بھی اس پر اصرار کریں کہ آپ

(گذشتہ حصے پر مبنی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا اس کی روایت حدیث قولی کہلئی، جو کچھ امت کے سامنے آپ نے کر کے دکھایا اس کی روایت کو حدیث فعلی سے تعبیر کیا گیا اور آپ کے سامنے صحابہ نے کوئی عمل کیا اور اس پر آپ نے منع نہیں فرمایا تو اس واقعہ کی روایت کہ محدثین نے حدیث تقریری کا نام دیا۔

کی یہ ساری بحث تو اس بنیاد پر ہے کہ الذکر سے قرآن اور حدیث دونوں مراد ہیں جب کہ ہم اس بنیادی بات ہی کو نہیں مانتے ہمارے نزدیک تو الذکر سے مراد قرآن ہے اور اللہ نے صرف اسی کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اس اصرار کے جواب میں منکرین حدیث کو ہم قرآن کی وہ آیات یاد دلانا چاہتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن اور شرح و بیان قرآن یعنی حدیث دونوں کو جدا جدا ذکر کر کے یہ بتلایا کہ ان دونوں کی حفاظت ہمارے فرائض ہے۔ ذرا سورۃ القیامت کی سولہویں سے بے کرانیسویں تک کی آیات کو ذہن میں تازہ کیجئے۔ ارشادِ ربانی ہے :

ترجمہ: (اے پیغمبر) اس (قرآن) کو لینے کے لیے اپنی زبان نہ ہلاؤ جلدی نہ کرو ہمارے ذمے ہے اس قرآن کا (آپ کے سینے میں) جمع کر دینا اور آپ کی زبان سے اسے پڑھوانا۔ جب ہم اس قرآن کو پڑھیں تو آپ صرف سنتے رہیں پھر ہمارے ہی ذمے اس قرآن کا بیان بھی ہے۔

لَا تَحْرُوكَ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۖ
إِنَّ عَلَيْنَا جُمُعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ فَإِذَا
قُرْأَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ ثُمَّ إِنَّ
عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۚ

(القيمة : ١٤ - ١٩)

ابتداءً زمانہ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ نزول وحی کے وقت وحی الہی کے الفاظ کو یاد رکھنے کے لیے ہار بار زبان مبارک سے رٹتے جاتے اور تکرار فرماتے جاتے تاکہ ذہن میں الفاظ وحی جم جائیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مشقت سے بچانے کے لیے پہلے تو فرمایا کہ اس تکرار سانی سے کام نہ لیجئے پھر تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کلام کا آپ کے ذہن میں محفوظ کر دینا اور پھر آپ کی زبان پر اس کو جاری کر دینا یہ ہمارے دے ہے آپ اس فکر میں نہ پڑئیے کہ کہیں کوئی لفظ یاد سے محو نہ ہو جائے آپ تو بس اطمینان سے سنا کیجئے

۔ یہاں تک تو الفاظ وحی کے بارے میں اطمینان دلایا گیا کہ ان کو بلا کم و کاست سیدہ نبوت میں اتار دینا اور محفوظ کر دینا اللہ کی ذمہ داری میں ہے ظاہر ہے پیغمبر کو حرکت زبان سے منع کرنا حق تعالیٰ کا قرأت قرآن کو اپنی طرف منسوب کرنا اور پیغمبر کا اسے سننے رہتا ان تمام باتوں کا تعلق الفاظ ہی سے ہو سکتا ہے معنی اسے نہیں، معنی نہ رٹنے کا چیز ہے نہ قرأت کی اولاد سننے کی۔

اس کے بعد الفاظ وحی کے معانی و بیان اور ان کی اصل مراد کو واضح کر دینے کے بارے میں تسلی دی کہ ان کا ذمہ بھی خود اللہ تعالیٰ ہی نے لیا ہے۔ فرمایا
 ثُمَّ اِنْ عَلَيْنَا بَيَانٌ لِّغَيْرِهِمْ اَوْ اِنْ عَلَيْنَا بَيَانٌ لِّغَيْرِهِمْ اَوْ اِنْ عَلَيْنَا بَيَانٌ لِّغَيْرِهِمْ
 آپ خود غور کیجئے یہ بیان قرآن کیا چیز ہے؟ ظاہر ہے یہ اس قرأت کے علاوہ ہی کوئی چیز ہو سکتی ہے جس کا ذمہ اس آیت سے متصل سابقہ آیات میں لیا گیا تھا ورنہ اس آیت کے اضافے کی ضرورت ہی نہ تھی یہاں یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ
 ثُمَّ اِنْ عَلَيْنَا بَيَانٌ لِّغَيْرِهِمْ اَوْ اِنْ عَلَيْنَا بَيَانٌ لِّغَيْرِهِمْ اَوْ اِنْ عَلَيْنَا بَيَانٌ لِّغَيْرِهِمْ
 اس سے مراد انہی الفاظ قرآنی کو سنا دینا ہے، اس لیے کہ

۱۔ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے بیان قرآن کی حیثیت کو الفاظ قرآنی سے علیحدہ کر کے
 اِسِي طَرَحٍ وَّاضِحٍ كَمَا نَزَّلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ
 النحل : ۱۰۴ (ہم نے تمہاری طرف یہ ذکر یعنی قرآن) اتارا تاکہ تم لوگوں کے لیے
 کھول کھول کر بیان کر دو جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا تاکہ وہ غور کر سکیں) اس آیت میں
 ذکر یعنی قرآن اور اس کا بیان دونوں جدا جدا حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک اور مقام پر اس سے
 بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بیان قرآن کی علیحدہ حیثیت واضح کی گئی۔ ارشاد ہے وَمَا نَزَّلْنَا
 عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لَتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ۔
 النحل : ۶۴

(ہم نے آپ پر کتاب بس اسی لیے نازل کی ہے کہ جس امر میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں آپ اس کو ان پر واضح کر دیں) ظاہر ہے یہ جھگڑا یا تو خود قرآن کے بارے میں ہو گا کہ کسی آیت کے معنی میں اختلاف پڑ جائے یا معاملات میں ہو گا جس میں ہر فرقہ خود کو حق ہی بجا ثابت کرنے کے لیے قرآن ہی سے سند لانا ہو دونوں کا علاج بیان رسول بتلا یا گیا جو دو مختلف جہتوں میں صحیح جہت کو متعین کر دے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ بیان رسول اس قرآن سے الگ ہو اگر وہ بعینہ وہی قرآن ہو تو جب لوگوں نے خود اسی میں جھگڑا ڈالا ہو اسے تو اسی کو دوبارہ سنا دینے سے جھگڑا کیسے طے ہو سکے گا لہذا نبی کے بیان کو قرآن کے علاوہ ہی ایک حقیقت ماننا پڑے گا۔

الفاظ کے سنا دینے کو بیان نہیں کہتے قرأت کہتے ہیں جس کی حفاظت کی ذمہ داری پہلے ہی مبلغہ بیان کر دی گئی ہے۔ بیان تو کسی پوشیدہ بات کے کھول دینے یا کسی مبہم بات کی وضاحت کر دینے یا کسی غیر معلوم بات کو علم میں لے آنے کا نام ہے اور الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں پہلے ہی آچکے جیسا کہ سابقہ آیات میں بتلادیا گیا اس کے بعد الفاظ کے معانی اور ان کی مرادات ہی ہیں جو الفاظ سن لینے کے بعد غفی رہ سکتے ہیں۔ لہذا یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ بیان کا لفظ معانی و مطالب کے لیے لایا گیا ہے جیسا کہ لغتاً اور محاورتاً بھی یہ معانی ہی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ حاصل یہی نکلا کہ الفاظ قرآنی کے ساتھ ساتھ ان کے معانی و بیان کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے ہی لیا ہے اور الفاظ قرآنی کے معانی و بیان ہی کا نام حدیث یا سنت ہے۔

قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں من جانب اللہ | ان صریح آیات کے بعد بھی اگر منکرین حدیث

اپنے اس اصرار پر جمے رہیں کہ اللہ نے صرف قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے حدیث کا نہیں تو ہر ذی عقل اسے ضد بے جا سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دے گا۔

بیان قرآنی کو اپنی ذمہ داری میں لینے کی خبر دے کر اللہ تعالیٰ نے ایک اور

اہم حقیقت پر اپنے بندوں کو مطلع فرمایا کہ یہ کہ قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی دونوں من جانب اللہ ہیں، جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ قرآنی کے صرف نقل کرنے والے ہیں اسی طرح معانی قرآنی کے بھی آپ صرف ناقل ہی ہیں نہ قرآن کے الفاظ آپ کے اپنے ہیں نہ ان الفاظ کے معانی آپ نے اپنی طرف سے متعین کر لیے، الفاظ کا نزول بھی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوا اور معانی و مطالب کی تعین بھی اللہ تعالیٰ ہی نے فرمائی۔ چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ آیات قرآنی کو سامنے رکھ کر غور فرماتے ہوں کہ اس آیت کے کتنے مطالب محتمل ہیں اور ان میں سے کونسا مطلب الفاظ پر زیادہ چسپاں ہے اس لیے یہی مراد خداوندی ہوگا بلکہ قرآن کے مجملات کی تفصیل، مبہمات کی تفسیر اور مشکلات کی تیسیر سب کچھ وحی الہی کی مدد سے از خود زبان نبوی پر جاری ہو جاتا اسی موہبت و رحمتی کو

قرآن وَمَا يَنْسُطُ عَنْهُ لَهْوٌ اَوْ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى (وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں کرتے ان کا کلام تو تمام ترویج ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے) اسے تعبیر کرتا ہے :

قرآن فہمی کے لیے صرف زبان دانی کافی نہیں | اس سلسلہ میں یہ گمان کرنا کہ قرآن کے اولین مخاطب

عرب تھے جو خود اہل زبان تھے اور اس لیے قرآن فہمی کے لیے انہیں علیحدہ سے کسی بیان رسول کی ضرورت نہ تھی بنیادی طور پر ہی غلط ہے اس لیے کہ اول تو کسی کتاب کی مراد سمجھنے کے لیے صرف زبان دانی کافی نہیں ہوتی، بسا اوقات مصنف کی مراد محاورات کی

وسعتوں، اشتراک و مترادف کے جملوں اور مجاز و کنایات کے پردوں میں پوشیدہ رہ جاتی ہے بلکہ جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ شرح و تفسیر کی متقاضی ہوتی ہے اس کے علاوہ سب انسان یکساں فہم و فراست اور مساوی علم و قابلیت کے مالک نہیں ہوتے، سب کی ضرورتیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں اس لیے یہ ناممکن ہے کہ کلام الہی کی ہر ہر آیت کو سننے ہی ہر ایک صحابی اُس آیت کے کلی جزئی تمام احکام سے باخبر ہو جاتا ہو اور اسے قطعاً کسی شرح و بیان اور کسی وضاحت و تفسیر کی ضرورت نہ ہوتی ہو۔

کُتب حدیث میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو بھی قرآن فہمی میں شبہات پیش آ جاتے تھے مثال کے طور پر ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کر دینا مناسب رہے گا، اگرچہ منکرین حدیث کے سامنے احادیث سے کوئی بات ثابت کرنا بے سود ہے مگر ان مثالوں سے غرض ان احکام کا اثبات نہیں جو ان میں مذکور ہیں بلکہ صرف تاریخی حیثیت سے یہ بتلانا منظور ہے کہ صحابہ کرام اہل زبان ہونے کے باوجود قرآن کریم کی صحیح مراد سمجھنے میں شبہات پیش آتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے الفاظ میں ان شبہات کو حل فرماتے تھے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے درمیان جو سوال جواب ہوئے ان کی کثیر تعداد کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب اعلام المتوہمین میں ان کا جو ذکر کیا ہے وہ پورے ایک سو دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کہیں

صحابہ کرام کو کسی قرآنی آیت کی نفس مراد ہی سمجھنے میں دقت پیش آگئی ہے کہیں صحابہ کو یہ مشکل درپیش ہے کہ قرآن نے ایک بات مجمل طور پر کہی ہے جب تک اس کی تفصیل نہ معلوم ہو اس مجمل آیت کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا کبھی صحابہ فروری مسائل میں بعض الجھنوں سے دوچار ہیں عرض صحابہ کو قرآن فہمی میں مختلف قسم کے شبہات پیش آتے ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی الہی کی رہنمائی میں ان سب شبہات کا تشفی بخش جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ تمام سوال و جواب کا احاطہ کرنے کی قوت نہ نظر نظر پر ہیں نہ ضرورت ہے نہ مقصود۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ صحابہ کو بھی اہل زبان ہونے کے باوجود قرآن فہمی میں شبہات پیش آتے تھے چنانچہ ایک مثالیں پیش خدمت ہیں :

(۱) سورہ نساء کی ایک آیت مَنِ لَّحَلَ سَوْءٌ بِعَذَابٍ مُّجْتَرِبٍ (جو شخص کوئی بُرائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا۔ النساء: ۱۲۳) کی نفس مراد سمجھنے میں بعض صحابہ

کو یہ شبہ پیش آگیا کہ ایسا تو کوئی انسان بھی نہیں جس سے کبھی بھی کوئی قصور نہ ہوا ہو لہذا اس آیت کی رو سے تو ہر شخص کا عذاب میں گرفتار ہونا ضروری ہے بڑی فکر لاحق ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو فرمایا کہ یہاں بدلے کو جہنم کے عذاب میں منحصر سمجھنا صحیح نہیں بلکہ ہر وہ تکلیف جو انسان کو اس دُنیا میں پہنچتی ہے وہ بھی اس کی برائی کا بدلہ بن جاتی ہے (ترمذی)

(۲) جب یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِينَ يَكْتُمُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُوهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (جو لوگ سونا اور چاندی چھپاتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔ (برآۃ: ۳۴))

تو بعض صحابہ نے سمجھا کہ اس آیت نے مطلقاً مال جمع کرنے کو حرام قرار دے دیا ہے۔ صحابہ کی اکثریت اگرچہ غریب تھی مگر کچھ لوگ مالدار بھی تھے ان کے پاس سونا چاندی جمع بھی رہتا تھا وہ یہ آیت سن کر بڑے فکر مند ہوئے۔ آپ سے استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا آیت کا وہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھے ہو سونا

چاندی جھج کرنا اس وقت صادق آتا ہے جب زکوٰۃ ادا نہ کی جائے۔ جس مال کی زکوٰۃ دے دی جائے وہ کتنا اور خزانے کی تعریف میں نہیں آتا صحابہ چونکہ پریشان تھے اسی لیے ان کی پریشانی دُور کرنے کے لیے تسلی آمیز انداز میں فرمایا :-

إِنَّ اللَّهَ لَمْ يُفْرِضِ الزَّكَاةَ إِلَّا
لِيُطَيِّبَ بِهَا مَا لِقِيَ مِنْ أَهْوَالِكُمْ ۖ | اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ اسی لیے تو لازم کی ہے تاکہ تمہارا باقی مال پاک مہلات ہو جائے۔

یہ سن کر صحابہ کرام کا شبہ حل ہو گیا اور مال جمع کرنے کی حدود کا انہیں علم ہو گیا۔

(۳) عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو بڑا مشہور ہے جب روزے کے احکام کے بارے میں سورہ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی حَتَّىٰ يَلْبِغُوا لَكُمْ ۖ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ (کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سیاہ و سفید دھاتے میں نہیں مرس معلوم ہوے

لگے۔ بقرہ: ۱۸۴) لو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے دو دھاگے ایک سیاہ اور ایک سفید لے کر اپنے تکیہ میں رکھ لیے اور سحری ختم ہونے کے وقت ان دھاگوں کو قریب قریب رکھ کر دیکھتے رہے جب دونوں دھاگوں کا رنگ الگ الگ واضح نظر آنے لگا تو کھانا پینا بند کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عدیؓ کے اس عمل کا حال معلوم ہوا تو آپؐ نے ازراہ مزاح فرمایا اے عدی تمہارا تکیہ بڑا لمبا چوڑا معلوم ہوتا ہے جس میں رات اور دن دونوں سما جاتے ہیں اور پھر اس آیت کی اصل مراد سمجھاتے ہوئے فرمایا یہاں سیاہ اور سفید دھاگے مراد نہیں بلکہ رات کی تاریکی کی سیاہی اور دن کی روشنی کی سفیدی مراد ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے مزید وضاحت کے لیے آیت کے آخر میں مِنَ الْفَجْرِ کے الفاظ اور نازل ہو گئے (بخاری)

(۴) سورہ الشقاق کی آیت فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابًا بِرَبِّهِ فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حَسَابًا يَلْسُوًا (جس شخص کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہوگا۔

انشقاق: ۷-۸) کا صحیح مفہوم سمجھنے میں ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ جیسی فقیہہ کو مغالطہ لگ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے دن جس کا بھی حساب لیا گیا سمجھ لو کہ بس وہ ہلاک

ہو گیا حضرت عائشہ نے محولہ بالا آیت کے حوالے سے عرض کیا کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا گیا وہ ہلاک نہ ہو گا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہو گا، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ یہ حساب یسیر یہاں عرض یعنی پیش کرنے کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ اعمال نامہ ان کے سامنے رکھ کر صرف ان کو جتلا دیا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں عمل کیا ہے مگر اس بہانے سے باندھیں نہ ہو گی اس کے علاوہ اگر کسی سے یہ سوال کر لیا گیا کہ یہ کام کیوں کیا تھا تو بے شک اس کی نیر نہیں وہ یقیناً ہلاک ہو گیا (بخاری)

(۵) بعض صحابہ کرام سورہ انعام کی آیت **الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمَنُ وَهُمْ مُّهْتَدُونَ** (جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے اپنے ایمانوں میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

انعام: ۸۲) سن کر پریشان ہو گئے اور دربار رسالت میں عرض کیا کہ ہم میں سے کون شخص ایسا ہے جس نے ایمان لانے کے بعد کوئی ظلم اور محصیت نہ کی ہو اس آیت کے تحت تو ہم میں سے کوئی بھی مستحق امن و سلامتی اور ہدایت یافتہ نہیں رہتا آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے محصیت مراد نہیں ہے بلکہ خاص شرک مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ظلم کو شرک ہی سے تعبیر کیا گیا ہے **إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ** (شرک بہت بڑا ظلم ہے)۔ یہ چند مثالیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں ان پر ذرا دوبارہ نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ صحابہ کرام کو اہل زبان ہونے کے باوجود الفاظ قرآنی کے صحیح معانی اور ان کا اصل مفہوم متعین کرنے میں کیسی کیسی مشکلات پیش آتی رہی ہیں ان میں ایسے سوال بھی ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہے ایسے بھی ہیں جن کا تعلق آخرت سے ہے اور ایسے سوال بھی ہیں جو عبادات سے متعلق ہیں اور یہاں یہ جتلانے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ یہ تمام امور اتنے اہم ہیں کہ نجات اور عدم نجات کا ان پر مدار ہے۔

بہر حال یہ خیال کرنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ صحابہ چونکہ اہل زبان تھے اس لیے انہیں قرآن فہمی کے لیے کسی بیان رسول کی ضرورت ہی نہ تھی۔ طوالت کے خوف کی وجہ

سے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے اس قسم کی مثالیں کثیر تعداد میں ہیں۔

ان مثالوں میں صحابہ کی جانب سے کیے گئے سوالات پر ذرا اس حیثیت سے بھی نظر ڈالیے کہ کیا ان سوالات کے جواب میں انہی متعلقہ آیات کا دوبارہ تلاوت کر دینا کافی ہوتا اور کیا انہی آیات کو بار بار سنا دینے سے صحابہ کی تسفی ممکن تھی؟ ان مثالوں پر اس نقطہ نظر سے بھی غور کیجئے کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ بھی کوئی اور شخص ان سوالات کے وہی جواب دے سکتا تھا جو آپ نے دئے۔ کیا کوئی شخص

صرف زبان عربی کی مدد سے یہ متعین کر سکتا ہے کہ سوال اول میں جزا سے دنیوی تکالیف مراد ہیں یا چوتھے سوال میں حساب لیسر کے معنی اعمال نامہ سامنے رکھ دینے کے ہیں یا اسی طرح صرف زبان دانی کی بنیاد پر کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ پانچویں سوال میں ظلم سے شرک مراد ہے۔

حدیث کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور اگر یہ امر واقعہ ہے کہ صحابہ کرام کو بھی اہل زبان ہونے کے باوجود

قرآن نہی میں مشکلات پیش آتی رہی ہیں اور اگر یہ درست ہے کہ قرآن نہی میں پیش آمدہ مشکلات کے حل کے لیے متعلقہ آیات کا دوبارہ تلاوت کر دینا کافی نہیں ہے نیز اگر یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی شخص قرآنی آیات کا صحیح مفہوم ربانی متعین کرنے کا اہل نہیں تو پھر اس حقیقت سے بھی حمال انکار نہیں ہو سکتا کہ احادیث نبوی کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور بے معنی ہے اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قرآن کی شرح و تفسیر یعنی حدیث کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے۔ یہ آیات دوبارہ پڑھیے :

ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کا (اے پیغمبر آپ کے سینے میں)
جمع کر دینا اور (آپ کی زبان سے) اسکا پڑھو دینا جب ہم
اس قرآن کو پڑھیں تو (اے پیغمبر) آپ صرف سنتے رہیے
پھر ہم اسے ہی ذمہ اس قرآن کا بیان بھی ہے۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۖ
فَإِذَا قُرِئَهُ فَخَاتَمَ قُرْآنَهُ ثُمَّ
إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۖ

(القيمة : ۱۷ - ۱۹)

اور غور کیجئے یہ قرآن ہی تو ہے جو حدیث کے محفوظ من اللہ ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ جو شخص عامل بالقرآن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اگر اپنے دعوے میں سچا ہے تو ان صریح آیات قرآنی کے بعد اس کے لیے انکار حدیث کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ان آیات کے مفہوم پر بار بار غور کریں یہ آیات کیسے واشکاف انداز میں اس حقیقت کا اظہار کر رہی ہیں کہ قرآن کو بیان کی ضرورت ہے اس لیے کہ بیان کے بغیر مرادات خداوندی کا علم ممکن نہیں۔ یہ آیات کتنی صراحت کے ساتھ اس بات کی اطلاع دے رہی ہیں کہ قرآن کی حفاظت کا حق صرف اس کے الفاظ کی حفاظت سے ادا نہیں ہو سکتا بلکہ قرآن مع بیان ہی کی حفاظت سے ادا ہو سکتا ہے۔ قرأت اور بیان کو علیحدہ علیحدہ ذکر کر کے یہ آیات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ قرآن کریم میں ایک درجہ الفاظ و تعبیرات کا ہے جس کا تعلق قرأت خداوندی کی اتباع میں قرات بنوی سے ہے اور ایک درجہ معانی و مطالب اور مرادات و بانی کلمہ جس کا تعلق بیان خداوندی کی پیروی میں بیان بنوی سے ہے پس قرآن کے محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے الفاظ و تعبیرات بھی محفوظ ہیں اور معانی و مرادات بھی محفوظ ہیں اگر الفاظ کی حفاظت ہو جاتی ہے اور معانی و مطالب کی حفاظت نہیں ہوتی تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ نصف قرآن کی حفاظت ہوئی اور نصف غیر محفوظ رہ گیا۔ اسی طرح اگر معانی و مطالب محفوظ ہوں اور الفاظ محفوظ نہ ہوں تب بھی نصف قرآن کی حفاظت ہوئی نصف کی نہیں ہوئی۔ اگر قرآن کے صرف الفاظ ہی محفوظ ہوں تو ہر ملحد و زندیق اپنی اغراض نفسانی کے تحت جو معنی چاہے انہیں پہنارے اور اگر صرف معانی محفوظ ہوں تو انتشار معانی کو سمیٹنے کا کوئی قطعی ذریعہ باقی نہ رہے۔ پورا قرآن اسی وقت محفوظ سمجھا جائے گا جب الفاظ و معانی دونوں محفوظ ہوں الفاظ کی گرفت سے معنی باہر نہ جاسکیں اور معنی کے لحاظ سے الفاظ میں رد و بدل نہ ہو سکے محض الفاظ کی حفاظت سے قرآن کی حفاظت کا وعدہ خداوندی پورا نہیں ہوتا اتنی حفاظت تو شاید تورات و انجیل کو بھی کسی حد تک حاصل رہی لیکن کیا محض الفاظ کی حفاظت سے یہودیت و نصاریت محفوظ رہ گئیں؟ کیا اجبار و رہبان نے تحریف مخفی کر کے دین کو

کچھ سے کچھ نہیں بنا دیا؟ اگر راج قول کے مطابق یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تورات و انجیل میں لفظی بحریف بھی ہوئی ہے تو پھر یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ تحریف معنوی تحریف لفظی سے زیادہ خطرناک اثرات کی حامل ہوتی ہے پس قرآن کے الفاظ کو محفوظ نہ کر لے دین کی حفاظت کا دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ غرض قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے قرآن کی حفاظت کو مکمل صرف اسی صورت میں سمجھا جاسکتا ہے جب الفاظ اور معانی یعنی قرآن و بیان دونوں محفوظ مانے جائیں۔ الفاظ محفوظ ہوں بیان محفوظ نہ ہو تب بھی قرآن کی حفاظت ناقص اور بیان محفوظ ہو الفاظ محفوظ نہ ہوں تب بھی ناقص۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں ہی کی حفاظت کا ذمہ لیا کہ ایک کے بغیر دوسرے کا محفوظ رہنا ممکن ہی نہ تھا۔

حفاظت کے تین مرحلے | اب یہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے الفاظ و تعبیرات اور اس کے معانی و مطالب دونوں کی حفاظت کس طور پر پوری فرمائی تو اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن اور بیان دونوں کی حفاظت کے تین مرحلے ہیں : پہلے مرحلے میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام کے الفاظ اور اس کی مرادات کو اپنی حفاظت کے ساتھ سینہ نبوت میں اتار کر جمع اور محفوظ کیا۔

دوسرے مرحلے میں اس کے رسول نے اسی حفاظت خداوندی کی مدد سے قرآن کے الفاظ کو تلاوت کے ذریعے اور اس کے بیان کو اپنے اقوال اپنے افعال اور اپنی تقریرات کی مدد سے صحابہ کی طرف منتقل فرمایا۔ اور پھر

تیسرے مرحلے میں اسی حفاظت خداوندی کے تحت قرآن اور اس کا بیان دونوں صحابہ سے تابعین کی طرف تابعین سے تبع تابعین تک اور پھر تبع تابعین سے آئمہ اہل بیت کی جانب سینہ بہ سینہ اور سفینہ بہ سفینہ منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچے اتنی بات سمجھ لینے کے بعد اب آئیے ہم ان تینوں مرحلوں کا سلسلہ وار جائزہ لیں کہ قرآن اور اس کے بیان کی یہ ربانی حفاظت کس طرح وقوع پذیر ہوئی ؟

حفاظت سیدہ نبوی تک

بہاں تک پہلے مرحلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات کا تعلق ہے تو اس کے لیے آپ کی

توجہ سورہ قیامتہ کی اتنی آیات کی طرف دوبارہ مبذول کرنا ضروری ہے جن کا ابھی کچھ

دیر پہلے حوالہ دیا گیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن اور بیان دونوں چیزوں

کی حفاظت کی ذمہ داری عِلْمًا کے کلمہ سے فرمائی ہے جو لوگ عربی زبان سے واقف

ہیں وہ ابھی طرح جانتے ہیں کہ عِلْمًا کا کلمہ اپنے اوپر لازم کر لینے کے معنی میں آتا ہے۔

اب آپ دیکھیں کہ جب قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا ذکر کیا جا رہا ہے تب بھی عِلْمًا کا لفظ

استعمال ہوا ہے اور جب قرآن کے بیان کی حفاظت کا ذکر ہوا تب بھی عِلْمًا ہی لایا گیا

گویا اللہ تعالیٰ نے دونوں کی حفاظت اپنے اوپر لازم کر لی ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُوَ

قُرْآنَہ سے قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا وعدہ ہوا قرآن کے معنی میں پڑھے

جانے کی چیز اور پڑھے جانے کی چیز ظاہر ہے الفاظ ہی ہیں معنی نہیں ہو سکتے پھر

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا نَبِیَّہٗ فرما کر قرآنی الفاظ کے معانی و مطالب کھول دینے کا وعدہ

فرمایا کیونکہ بیان کے معنی کھول دیتے اور واضح کر دینے کے ہیں اور وضاحت

معانی ہی کی ہوا کرتی ہے جو الفاظ کے پردوں میں چھپے ہوئے اور لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں عربی زبان حضرات ایک اور اہم نکتہ کی طرف توجہ فرمائیں

دونوں آیتوں کے درمیان ثُمَّ کا لفظ کیا بتلا رہا ہے؟ ثُمَّ کا لفظ اس امر کی دلیل

ہے کہ الفاظ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اور بیان قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری

دونوں علیحدہ علیحدہ حیثیتوں کی حامل ہیں۔ ایک ذمہ داری کا دوسری سے کوئی تعلق

نہیں اگر یہ بات نہ ہو تو پھر ثُمَّ کا لانا بھی بے کار ٹھہرے گا عِلْمًا کی تکرار بھی عبث

ہوگی اور ان دو آیتوں کے درمیان فصل بھی بلا ضرورت قرار پائے گا اور یہ کلام الہی

میں محال ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ یہ دو علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں ہیں ایک الفاظ قرآن

کی حفاظت کی اور ایک بیان قرآن کی حفاظت کی۔

قرآن کے الفاظ تَوْفَادُ اقْرَأْہٗ فَاَنْتَ مِّنْ قُرْآنَہٗ کی صورت میں سیدہ نبوی میں

ڈالے گئے رہا وہ بیان جو قرآن کی مرادات کے بارے میں سینہ نبوی میں ڈالا گیا اس کے ڈالے جانے کی کیفیت سے ہمیں بحث نہیں وہ خواہ کسی طرح بھی ڈالا گیا ہو اتنی بات یقینی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں اس نے بالآخر کسی محفوظ ہی کی شکل اختیار کی ہوگی، بیان کی یہ آخری شکل ہی حدیث نبوی ہے جس کا مضمون تو اللہ کی جانب سے ہے اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے۔

تَعْدِرَانَّ عَلَيْنَا بَيَانٌ کہہ کر اسی بیان کو جس کی آخری شکل حدیث نبوی ہے سینہ نبوی میں محفوظ کر دینے کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے فرمائی ہے پس اگر قرآن اپنے الفاظ کی صورت میں اللہ کی حفاظت میں ہے ضائع نہیں ہو سکتا تو قرآن اپنے بیان یعنی حدیث کی صورت میں بھی اللہ کی حفاظت میں ہے ضائع نہیں ہو سکتا۔

بسیا کہ ابھی عرض کیا گیا قرآن کے الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول تکذیبہ قرآنہ پر نچائے چنانچہ کہیں مَاذَا قَرَأْتَ فرما کر اپنے کو پڑھنے والا بتلایا اور کہیں تَنَزَّلُوا عَلَيْنَا ارشاد فرما کر خود کو تلاوت کرنے والا ظاہر فرمایا۔ دوسری چیز یعنی معانی و مرادات قرآنی کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بذریعہ تعلیم پہنچایا گیا اتنی بات تو ظاہر ہی ہے کہ علم الفاظ کے پہنچانے کو نہیں کہتے بلکہ الفاظ کے معانی و مطالب سمجھنے کو کہتے ہیں اور معانی و مطالب کا سمجھنا ہی تعلیم ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی تعلیم کی بابت ارشاد فرمایا

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (النساء : ۱۱۳)

اور ہم نے تم کو وہ باتیں تعلیم کیں جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل تھا۔

گویا اللہ تعالیٰ الفاظ قرآن کے لیے تباری ہے تو بیان قرآن کے لیے معلم رسول بھی ہے اسی تعلیم کو ایک مقام پر ہدایت کے لفظ سے تعبیر فرمایا اور ہدایت کا تعلق بھی ظاہر ہے الفاظ سے نہیں معانی ہی سے ہے۔ ارشاد ہے۔

مَا كُنْتُ تَدْرِئِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ

آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ کتاب کیا چیز ہے نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے لیکن ہم نے اس

من نشار من عبادنا ط | قرآن کو ایک نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم
(شوریٰ: ۵۲) | اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک مقام پر الفاظ قرآن کو کتاب کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ
نے بیان قرآن کو حکمت کے لفظ سے تعبیر فرمایا اور دونوں کا منزل من اللہ ہونا بتلایا۔ فرمایا
وَ أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَ
الْحِكْمَةَ (نبار: ۱۱۳) | اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت
نازل کی۔

اسی حکمت کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کی راہوں میں صحیح اور غلط کا فرق
واضح کیا اسی کی مدد سے آپ نے انسانی زندگی کے تمام مسائل حل کیے اور اسی کی روشنی
میں کام کر کے آپ نے اخلاق و روحانیت تہذیب و تمدن، میثقت و معاشرت اور
قانون و سیاست کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ یہی ہے وہ بیان قرآن جس کو ہم
حدیث نبوی اور سنت نبوی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بیان قرآن کو بھی اللہ تعالیٰ نے
سینہ نبوی میں اسی طرح محفوظ فرمایا جس طرح الفاظ قرآن کو حجج اور محفوظ فرمایا۔
غرض نبی کریم صلی اللہ کی ذات کی حد تک الفاظ قرآنی تلاوت خداوندی کے
ذریعے اور معانی و مرادات قرآن تعلیم خداوندی اور ہدایت ربانی کے ذریعے بحفاظت تمام
پہنچ گئے اور اس طرح قرآن اور اسکے بیان کی حفاظت کا پہلا مرحلہ پورا ہو گیا۔

حفاظت صحابہ تک | ان دونوں کی حفاظت کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور اس کے بیان کو بحکم
خداوندی پوری حفاظت کے ساتھ صحابہ کی طرف منتقل فرمایا۔

اتنی بات تو مسلمہ ہے کہ قرآن اتارنے کا مقصد قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت
ہے اس لیے محض سینہ نبوت میں قرآن کے الفاظ اور اس کا بیان محفوظ کر دینے سے یہ
عظیم مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جب تک یہ دونوں چیزیں ساری امت تک اسی حفاظت
سے نہ پہنچ جائیں جس حفاظت سے رسول تک پہنچیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ان دونوں کو
امت تک یہ حفاظت پہنچانے کا ذمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر عائد فرمایا کہ وہ

امت کے لیے تلاوت آیات بھی کریں تاکہ الفاظ قرآنی امت تک پہنچ جائیں اور تعلیم و ہدایت کا سلسلہ بھی قائم فرمائیں تاکہ معانی و مرادات قرآنی بھی امت تک بہ حفاظت پہنچ جائیں اور اس طرح قرآن اور اس کے بیان کا آگے تک بہ حفاظت پہنچتے رہے اس کا سلسلہ قائم ہو جائے چنانچہ ارشاد ہوا

اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا جب ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کو پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (ال عمران: ۴۶)

اس آیت کے الفاظ میں غور فرمائیں اس میں تلاوت آیات اور تعلیم آیات دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جا رہا ہے اور تبارک و تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تلاوت آیات اور تعلیم آیات فرمائی اسی طرح اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے امتیوں کے لیے تلاوت اور تعلیم فرمائیں گے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر دونوں چیزوں کو جدا جدا بیان کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنی الفاظ کے معانی و مطالب کھول کر بیان کر دینے کی ذمہ داری تفویض فرمائی۔ ارشاد ہے

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴) | اور آپ پر ہم نے یہ قرآن اتارا تاکہ جو مضامین آپ پر اتارے گئے آپ انہیں کھول کھول کر بیان کریں۔

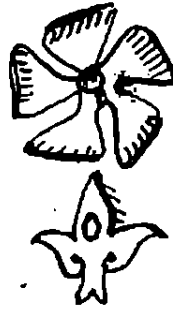
چنانچہ آپ نے اپنے اقوال اپنے افعال اور اپنی تقریرات سے منزل من اللہ مضامین کو واقعی کھول کھول بیان فرما دیا۔ آپ نے ہر ہر آیت کی وہ مراد متعین فرمادی جو مقصود خداوندی تھی۔ آپ نے اگر قرآن کے الفاظ بلا کم و کاست تلاوت کے ذریعے صحابہ کی طرف منتقل کیے تو ان الفاظ کے معانی و مطالب بھی بلا کم و کاست صحابہ کی امانت میں دے دیے کبھی اپنے ارشادات کے ذریعے کبھی اپنی تمذگ کے ایک لمحے کو قرآنی سانچے میں ڈھال کر اور کبھی اپنی نگرانی میں صحابہ کے ایک ایک عمل کی جانچ پڑتال کر کے۔ آپ ایک

طرف قرآنی آیات کی تلاوت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان آیات کا عملی نمونہ خود پیش کرنے اور صحابہ کی شکل میں ہزاروں عملی نمونے و حالات میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کسی آیت کے مختلف محتملات میں سے کسی ایک صحیح محتمل کو متعین فرما رہے ہیں، کبھی کسی آیت کے مبہم حکم کو مشخص فرما رہے ہیں اور کبھی کسی آیت کے اجمال کی تفصیل بیان فرمائی جا رہی ہے۔ کبھی اس پر کلام ہو رہا ہے کہ فلاں آیت کے حکم کی کیا توجیہ ہے اور کبھی اس کا بیان ہے کہ فلاں آیت کی کئی ہیں کون کونسا جزئیہ شامل ہے، کبھی کسی آیت کے حکم کی علت سے بحث ہے تو کبھی کسی قرآنی حکم کے خواص و آثار کا ذکر ہے کبھی صحابہ کرام کو کسی قرآنی آیت کی نفس مراد سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آگئی ہے، اس کو دور کیا جا رہا ہے تو کبھی صحابہ کے ان سوالات کا جواب دیا جا رہا ہے جو قرآن کی بعض تفصیلات کے متعلق آپ سے کیے گئے ہیں کبھی بعض فرعی مسائل سے متعلق سوالات کے جواب میں صحابہ کی تفسیر کا سامان ہے اور کبھی قرآنی اشارات کی وضاحت کا اہتمام۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور اس کے بیان کو تباہ صحابہ تک پہنچایا اس طرح ان دونوں کی حفاظت کا دوسرا مرحلہ بھی پورا ہو گیا۔

حفاظت تا قیامت | قرآن اور اس کے بیان کی حفاظت کا تیسرا مرحلہ وہ ہے جس میں یہ دونوں چیزیں صحابہ سے ہم تک منتقل ہوتی ہوئی پہنچیں۔ یہ تیسرا مرحلہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ منکرین حدیث کو حفاظت حدیث کے سلسلہ میں زیادہ تر کلام اسی مرحلے میں ہے۔ قرآن کا اپنے الفاظ کی نسبت سے محفوظ رہنے کا بہانہ تک تعلق ہے چونکہ اس میں منکرین حدیث کا بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے اس تیسرے مرحلے میں ہماری تمام تر گفتگو صرف قرآنی بیان یعنی حدیث کی حفاظت تک منحصر رہے گی مگر اس گفتگو کی ابتدا کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذرا اس بات کا جائزہ لیتے چلیں کہ اس تیسرے مرحلے میں حفاظت حدیث کی ضرورت تھی بھی یا نہیں۔ کیونکہ منکرین حدیث کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن کے معانی و مطالبات جیسا طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے اور حالات کے مطابق سمجھے اور صحابہ کو سمجھائے اسی طرح یہ

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم قرآن کے معانی و مطالب اپنے زمانے اور اپنے حالات کی روشنی میں سمجھیں اور سمجھائیں۔ اسی لیے ان کا دعویٰ ہے کہ حدیث کی حفاظت کی ضرورت ہی نہ تھی اور اسی لیے اللہ نے اسے محفوظ رکھا بھی نہیں ۞



حدیث کے بغیر قرآن فہمی

آئیے اب ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ کیا حدیث کی مدد کے بغیر قرآن فہمی ممکن ہے نیز یہ کہ کیا منکرین حدیث کے اس دعویٰ میں کوئی وزن ہے کہ قرآن کے معانی و مطالب جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے اور اپنے حالات کے مطابق سمجھے اور سمجھائے اسی طرح آنے والے زمانوں میں آنے والے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانوں اور اپنے حالات کی روشنی میں قرآن کے معانی و مطالب کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی اپنی زندگیوں کے لیے مخصوص لائحہ عمل مرتب کریں۔ منکرین حدیث کے اس دعوے کا چونکہ لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کی صحیح مرادات متعین کرنے میں ایک عام آدمی اور نبی برابر ہوتا ہے اس لیے لازماً ہمیں پہلے اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ کیا وحی آسمانی کی مدد کے بغیر جو صرف ایک نبی ہی پر نازل ہوتی ہے قرآن کی صحیح مرادات تک پہنچنا ممکن ہے؟

قرآن فہمی اور عجز انسانی | یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن اسلام کا صرف بنیادی قانون، دستور اساسی اور

مجموعہ ہدایت ہی نہیں اپنی ذات میں ایک مجرہ بھی ہے جو اپنے الفاظ اور معانی دونوں ہی کے لحاظ سے اعجازی شان رکھتا ہے جس طرح مخلوق اس بات سے عاجز ہے کہ الفاظ کی تراکیب اجزائے کلام کی ترتیب اور انداز بیان کی فصاحت کے لحاظ سے قرآن کی مثل لاسکے اسی طرح مخلوق کے لیے یہ بھی ناممکن ہے کہ ہدایت کے کمال، احکام کی جامعیت علوم و معارف کی گہرائی اور مضامین کی ہمہ گیری کی نسبت سے قرآن کی نظیر بنا سکے۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ

آج چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود قرآن کی ایک چھوٹی سے چھوٹی آیت کا بھی مثل وجود میں نہ آسکا قرآن کی معنوی وسعتوں اور ہمہ گیر گہرائیوں نے دنیا کو تھکا دیا کہ وہ اس جیسی جامع علوم و معارف اور حاوی احکام و اصول کتاب یا اس کے کسی جزو جیسا کوئی جزو پیش کر سکے۔

اس مسلمہ حقیقت کو سامنے رکھ کر ذرا سوچئے کہ آخر قرآن جیسا کلام جن انسانوں کی طرف سے آیا ہے اور ان کے علم و ادراک میں وہ لامحدودیت اور ہمہ گیری نہیں ہے جو ایسے اعجازی کلام کے لیے درکار ہے بس فہم و عقل میں اسی لامحدودیت اور ہمہ گیری کے فقدان کی بنا پر ان میں یہ سکت بھی نہیں ہے کہ وہ قرآن کے معجزانہ اصولی اور کلی جملوں سے نکلنے ہوئے توفیق و حقائق کا ادراک بلا کسی رہنمائی کے انہ خود کر سکیں قرآنی کلمات کی ایک ایک تہ اور ایک ایک شکن میں صد ہا علوم پیلے ہوئے ہیں جو بیچودہ سو سال سے مسلسل نکلنے چلے آ رہے ہیں اور ہنوز ان کی انتہا کا کوئی پتہ نہیں ظاہر ہے اتنے بے شمار علوم اور لفظ لفظ میں سموئے ہوئے معارف کا قرآنی کلمات میں سے نکال لانا نبوت کی رہنمائی کے بغیر ناممکن تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن اکیلا نازل نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک نبی بھی بھیجا جو وحی الہی کی روشنی میں قرآنی علوم و معارف لوگوں کو سمجھا سکے۔

اسی حقیقت کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں لامحدود ہے جبکہ انسان ہر لحاظ سے محدود و متناہی ہے۔ انسان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ محدود رہتے ہوئے لامحدود ذات و صفات والے کو پہچان سکے اور اس سے صادر ہونے والے کلام کے رموز و اسرار کو جان سکے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور بندوں کے درمیان ایک ایسا طبقہ پیدا فرمایا جو ایک لحاظ سے ذات حق سے قریب تر تھا اور ایک لحاظ سے بندوں میں شامل تھا یہ طبقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا جنہوں نے لامحدود ذات و صفات کی حامل ہستی کو پہچان کر سکے

کلام کے علوم و معارف پر اطلاع پائی اور پھر وحی الہی کی روشنی میں عامہ خلافت کو اس سے بہرہ ور کیا۔

بنی کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو ایک عام آدمی کے بس کی یہ بات ہی نہیں کہ وہ قرآنی علوم پر اطلاع پاسکے اور یہ ایک بالکل فطری بات ہے اگر یہ درست ہے کہ عالم کی عالمانہ بحثیں ایک علم آشنا ہی سمجھ سکتا ہے اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق کی مرتبہ صرف عشق آشنا ہی جان سکتا ہے تو پھر یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ کلام رب کی صحیح مراد صرف رب آشنا ہی پاسکتا ہے۔ ایسا کلام جو انتہائی ہمہ گیر اعلیٰ درجہ کا جامع اور بے مثال وسیع العلم ہو جو ماضی کی خبروں، مستقبل کی اطلاعیوں اور حال کے احکام کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو اس کی صحیح مراد بات تک پہنچنا خدائی نہ ہائی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

قرآن کی ہمہ گیری، جامعیت اور وسعت علم کا اندازہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس کو حضرت علی نے ایک بار ایک سائل کے جواب میں نقل فرمایا ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر تمسک بالقرآن کی تاکید کے ضمن میں کتاب اللہ کی صفات گنتاے ہوئے فرمایا :

اس میں تم سے پہلوں کی باتیں ہیں اور پچھلوں کی خبریں ہیں اور درمیانی حال کے احکام ہیں وہ یقینی چیز ہے مذاق نہیں جس میں شک کرنے سے چھوٹا خدا ہے اس کی گردن توڑ دی اور جس نے اس کے علاوہ ہدایت ڈھونڈی اس کو خدا نے گمراہ کر دیا وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے وہ ہیکمانہ یادداشت ہے وہ صیدِ حارۃ ہے وہ وہ چیز ہے کہ اس سے دلوں کے میلانات ٹیڑھے نہیں ہوتے اور زبانیں مشتبہ نہیں ہوتیں اور

فِيهِ نَبَأٌ مَا قَبْلَكُمْ وَخَيْرٌ مَّا بَعْدَكُمْ وَحُكْمٌ نَّابِتٌ لَّكُمْ وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَارٍ قَصَمَهُ اللَّهُ وَمَنْ ابْتَغَى الْهُدَى فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللَّهُ وَهُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ وَهُوَ الَّذِي لَا يَزِلُّ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَلْسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ

اس سے علماء کبھی سیر نہیں ہوتے وہ کثرت تلاوت سے

پُرانا نہیں پڑتا اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے وہی ہے کہ جب جنات نے اسے سنا تو انہیں یہی کہتے بن پڑا کہ ہم نے عجیب کلام سنا ہے جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے ہم تو اس پر ایمان لے آئے (حقیقت یہ ہے کہ جو اسے زبان پر لایا اس نے سچ کہا جس نے اس پر عمل کیا اسے اجر ملا جس نے اس کے ساتھ حکم کیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف بلایا اسے سیدھے راستے کی ہدایت ہوئی۔

مِنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَقْضِي
عَجَابَهُ هُوَ الَّذِي لَمْ تَنْتَهِ الْجَنُّ
إِذْ سَمِعَتْهُ سَحَتِي قَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا
قَرَأْنَا عَجَابًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ
فَأَمَّنَّا بِهِ مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ
عَمِلَ بِهِ أُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدْلٌ
وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هَدَى إِلَى صِرَاطٍ
مُسْتَقِيمٍ

(ترمذی: فضل القرآن)۔

اس حدیث پاک کو بار بار پڑھیے اور سوچئے کہ جس کلام کا یہ عالم ہو کہ وہ ماضی کی تجروں، مستقبل کی اطلاعوں اور حال کے احکام کا احاطہ کیے ہوئے ہو، جس کے علوم علماء کبھی سیر نہ ہوتے ہوں، جس کے عجائبات لامتناہی ہوں، جس کے الفاظ کو زبان سے ادا کرنا مجسم سچائی کی تعبیر لیے ہوئے ہو، جس پر عمل کرنا باعث اجر ہو جس کی روشنی میں کیا ہوا فیصلہ عین عدل کہلائے اور جس کی طرف دعوت دینا ہدایت ہی ہدایت بن جائے ایسے ہمہ گیر اور اتنے جامع کلام کی صحیح صحیح مرادات کو پالینا کیا خدائی رہنمائی کے بغیر ممکن ہے؟ جو ذرا سی بھی عقل سلیم کا مالک ہو گا وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا کہ نبی کے واسطے کے بغیر جو مؤید من اللہ ہے کلام الہی کی اصل مرادات کو پالینا ناممکن ہے؟ کیا یہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی تعبیرات اصولیت اور کلیت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں، جس کے لفظ لفظ سے حقائق و معارف کے دریا بہہ رہے ہیں، جس کے ایک

قرآن فہمی اور پیغمبر

ایک اشارے میں معارف الہیہ پوشیدہ ہیں جس کا ایک ایک لفظ اعجازی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے، جس کی آیات کا حال یہ ہے کہ ان میں کوئی خفی ہے کوئی مجمل ہے کوئی مشکل ہے اور کوئی کنایہ کا پہلو لیے ہوئے ہے اس کتاب کے مضامین میں تنوع کا یہ عالم ہے کہ دینیات کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ سیاست، معیشت، معاشرت، معاملات، اخلاق اور نفسیات کے علوم کو بھی حاوی ہے اور ان سب کے پہلو یہ پہلو اس میں باطنی کیفیات کے تمام سامان بھی موجود ہیں۔ ایسی مجسرات حقول کتاب اور ایسے اعجازی کلام کے معانی معلوم کرنا، مطالب اخذ کرنا اور اس کی مرادات کو معلوم کرنا حتیٰ یہ ہے کہ صرف نبی ہی کا کام ہے۔ کوئی دوسرا شخص وہ خواہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو کلام الہی کی مرادات تک صرف اپنے فہم اور اپنی عقل و دانش کے سہارے نہیں پہنچ سکتا۔

یہ بات تو اس قدر واضح ہے کہ کسی دلیل کی بھی محتاج نہیں۔ قسراں تو پھر کلام الہی ہے، فانی اور محدود العقل انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی مرادات سمجھنے میں بسا اوقات محاورات، مجازات اور کنایات سدا رہ بن جاتے ہیں۔ جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اسی قدر شرح و تفصیل کی زیادہ محتاج سمجھی جاتی ہے۔ کسی کتاب کی مرادات سمجھنے کے لیے صرف زبان دانی ہی کافی نہیں ہوتی۔

دیوان غالب ایک فانی انسان کے کہے ہوئے اشعار کا مجموعہ ہے، غالب جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کوئی بہت بڑا عالم یا کوئی عظیم فلسفی بھی نہ تھا البتہ شعراؤ کی سب سے پہلی صفات میں اس کا شمار ضرور ہے۔ دیوان بھی کسی اجنبی زبان میں نہیں اردو زبان میں ہے جس کی معنوی باریکیوں سے ہم سب اسی طرح باخبر ہیں جس طرح کوئی عربی زبان کی باریکیوں سے ہو سکتا ہے۔ غالب کی صحیح مراد اپنے اشعار سے کیا تھی وہ تو غالب ہی کو معلوم ہو گا لیکن دُنیا سے اس کے رخصت ہو جانے کے بعد اس کے دیوان کی شرح لکھنے والوں نے کیسی کیسی طبع آزمائی کی ہے، ہر ایک نے اپنے مزاج کے مطابق اس کے دیوان کی شرح لکھی۔ جو صوفی منش تھا اس نے چن چن کر غالب کے اشعار میں تصویف بھر دیا جو رند طبع تھا

اسے شراب کی مستی و کیفیت کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ عاشق مزاج نے اس کے دیوان کو عشق و محبت کی داستان بنا دیا اور فلسفی نے اس کے اشعار سے فلسفیانہ مسائل کا استنباط کیا۔
اپنا کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ غالب نے اپنے دیوان کی خود کوئی شہرہ نہیں لکھی اور نہ ہی اپنے کسی قابلِ شاگرد کو اپنے اشعار کی اصل مراد کا پتہ دیا۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ جب ایک فانی اور محدود العقل انسان کے کلام کا یہ حال ہے تو اس رستی کے کلام کا کیا حال ہو گا جو اپنی ذات میں بھی لا محدود اور اپنی صفات کمال میں بھی لا محدود ہے؟ ایسی ہمتی کا کلام بھی یقیناً لا محدود و متقانی لا محدود، مجاہد اور لا محدود مطالب کا حامل ہو گا، ان لا محدود و متقانی و معارف اور ان لا محدود و معانی و مطالب پر خود صاحب کلام کے بنائے بغیر اطلاع پانا کیسے ممکن ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی اگر قرآن کو بھی انسانی تالیفات کی طرح لوگوں کی طبع آزمائی کا میدان بنا دیا جلتے تو اس کا کیا حشر ہو۔
قرآن کا اعجاز صرف اس کے الفاظ تک محدود نہیں اس کے معانی میں بھی موجود ہے وہ ہمارے پاس ایسے علوم لے کر آیا ہے جو قبل انسانی کو آخری معراج تک پہنچانے کے ضامن ہیں، ہمارے ہر قسم کے نزاعات میں اس کی حیثیت حکم کی ہے گویا ہماری سیاست، معیشت، معاشرت، معاملات، اخلاق، دین، مذہب، غرض ہمارے زندگی کا ہر گوشہ براہِ راست اسی کی روشنی کا محتاج ہے۔ ایسی صورت میں ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا قرآن کو صرف زبانِ دانی اور عام انسانی فہم پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ رسول کی ذات درمیان سے علیحدہ کر لی جائے تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد کو پہونچنے کا اہل ہے؟ حدیث کی مدد کے بغیر اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد تک پہونچنے کا واحد راستہ ہے کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ راہِ ہدایت صحیح طور پر اس کے ہاتھ آگئی۔ دیوان غالب والی مثال میں غالب کے اشعار کی شرحیں اگر مختلف ہوئیں تو غالب کو مزید داد ملی مگر قرآن کا اگر یہی حال بنا دیا جائے تو انصاف سے بتائیے قرآن محض اہامات کا ایک مجموعہ بن کر نہ رہ جائے؟ کلام الہی شاعری نہیں، جو نازک خیالیوں اور مبالغہ آمیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، کتاب اللہ تو حقیقت اور ٹھیک ٹھیک حقیقت کا پتہ دینے آئی ہے، جو معاشرت و معاشیات کی مقنی بن کر نازل ہوئی ہے، مبداء و

معاذ کی فخر ہے اسرار غیب اور روحانی حقائق کی معلّم ہے۔ اگر ایسی کتاب بھی محض رائے ذنی اور دماغی مشاق کا میدان بنادی جلتے تو حقیقت کا سراغ لگنا کتنا ناممکن بن جائے۔ اللہ کا دین جیسا پہلے مجہول تھا کتاب اللہ کے نزول کے بعد اس سے زیادہ مجہول بن جائے اور کوئی شخص بھی یہ نہ بتلا سکے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق کیا عقائد لے کر تشریف لائے تھے، عبادات کا کونسا نظام آپ نے ترتیب دیا تھا تمدن و معاشرت کن اصولوں پر قائم فرمائی تھی اور معیشت و سیاست کے کیا اصول مقرر فرمائے تھے، غرض یہ دین جس کو قرآن نے کامل کہا ہے ناقص ترین دین ہو کر رہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے کہ اپنے کلام کی مرادات کی تلاش ہمارے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ہم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جس سے اس کلام کو پہلے صاحب کلام سے خود پڑھا اس کے معانی و مطالب کو صاحب کلام سے خود سمجھا اور پھر صاحب کلام ہی کی خاص ہدایت اور خاص حفاظت میں وہ کلام اپنے امتیوں کو پڑھایا، سمجھایا اس کی مرادات کو متعین کیا اور اس کے احکام پر عمل کر کے دکھلایا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے رسول کے ذریعے ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یقیناً "مدت العمر قرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے اگر قرآن کی مراد کی تعین عام انسانی عقل پر چھوڑ دی جاتی تو یہ کتاب جو خالصتاً عمل کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی صرف دماغی کہو کاوش کا مشغلہ بن کر رہ جاتی اور اللہ کی مخلوق جہل کی ظلمتوں سے کبھی باہر نہ نکل سکتی۔

قرآن اور اسوۂ نبوی | اس کے علاوہ یہ بھی نو دیکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم صرف ایک علمی کتاب ہی تو نہیں جس کا مقصد صرف

علمی طور پر اس کو حل کر لینا ہو، قرآن نبی نوع انسان کے لیے ایک دستور العمل بھی ہے جو زندگی کے ہر ہر شعبے کے لیے مکمل ضابطہ حیات لے کر آیا ہے اس لیے قرآن کے معانی و مطالب سمجھ لینے کے بعد بھی ایک اہم ضرورت اور باقی رہتی ہے اور وہ ہے ان معانی و مطالب کی روشنی میں عملی زندگی کے راستے متعین کرنا اور زندگی کے ہر ہر شعبے میں ان معانی و مطالب کو رو بہ عمل لانا اور یہ کام کسی معلّم کی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ

تو بالکل ہمارے مشاہدے کی بات ہے، دینی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو عملی تجربوں کے بغیر سمجھ ہی میں نہیں آتے مثلاً طب اور لڈاکرٹی کا علم انجینئرنگ کا فن یا دیگر سائنسی علوم و فنون کہ ان کے حقائق علمی طور پر بھی پوری طرح اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتے جب تک کہ عملی طور پر ان کو استعمال ہوتا ہو ورنہ دیکھا جائے بلکہ خود ان کو عمل میں لا کر تجربہ نہ کر لیا جائے صرف ان کا پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے قطعاً کافی ہے۔ عملی تجربے کے بغیر اولیٰ تو یہ علوم و فنون سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو اس وقت تک ان کو صحیح طور پر عمل میں نہیں لایا جاسکتا جب تک ان کا عملی نقشہ سامنے نہ ہو۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ جب انسانی علوم کا یہ حال ہے تو ربانی علم تو پھر ربانی علوم ہیں ان کی دقتیں اور نزاکتیں اپنی تمام تر انواع اقسام کے ساتھ کسی ربانی معلم کی تعلیم کے بغیر کیسے سمجھ میں آ سکتی ہیں۔

اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر اللہ تعالیٰ نے ہماری انتہائی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اگر ہماری یہ ضرورت پوری نہ کی جاتی تو کفر کی ظلمتوں سے باہر نکلنا محال تھا اور اسلام کے پاکیزہ عقائد اور خالص اعمال سے ہمارا مزین ہونا ناممکن تھا۔ قرآن بھیجا تو اس کو سمجھانے اور اس پر عمل کرانے کے لیے ایک معلم بھی بھیجا اور اس کو قرآن کی مجسم تفسیر بنا دیا اور ہمیں بتا دیا کہ اس عملی تفسیر کی روشنی میں قرآن کو سمجھتے اور اس کے احکام پر عمل کرتے چلے جاؤ۔

اَلْقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ
اَسْوَا حَسَنَةٍ (الاحزاب: ۲۱)۔

تمہارے لیے اللہ کا رسول بہترین نمونہ ہے۔

کہ اس نمونے کو سامنے رکھ کر کارگاہ حیات میں اپنے اعمال کو ڈھالتے چلے جاؤ جہاں کہیں کوئی عملی الجھن پیش آئے اس عمل نقشہ عمل کو دیکھ کر دور کر لو۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو صرف کسی خاص شعبہ حیات کا ہی نمونہ نہیں بنایا گیا بلکہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا وہ سب آپ کی زندگی میں دکھلادیا گیا۔ کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا آپ کے اخلاق کیا تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے

جواب میں فرمایا کہ اَنْ خَلَقَهُ الْقُرْآنَ یہ قرآن ہی آپ کا خلق تھا، خلق میں سب کچھ آگیا اقرال، افعال، تقریرات۔ مطلب یہ کہ آپ کا کوئی قول کوئی فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو۔ آپ کے اسی خلق کو پورے عالم کے لیے اسوۂ حسنہ کہا گیا، اسی خلق کا نام حدیث ہے، اسی خلق نبوی کو ہم سنت نبوی کے نام سے جانتے ہیں اس خلق نبوی کی مدد کے بغیر ہم قرآن کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اسکی مرادات پر صحیح صحیح عمل کر سکتے ہیں۔

حدیث کے بغیر قرآن فہمی | کتنے کوتاہ فہم ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ حدیث کی مدد کے بغیر بھی قرآن کی مرادات معلوم کی جاسکتی ہیں حدیث کے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کرتے والوں کے سامنے ہم چند آیات قرآنی پیش کرتے ہیں وہ ہمیں حدیث کے ذخیرے سے مدد لیے بغیر ان آیات کا صحیح صحیح مطلب سمجھا کر دکھائیں۔

قرآن کریم کی ایک آیت ہے

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِ | ہم نے آپ کو سبع مثانی مرحمت فرمائیں اور
وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (الحجر: ۸۷) | قرآن عظیم دیا۔

حدیث کے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والے ذرا بتلائیں کہ اس آیت میں سبع مثانی سے کیا مراد ہے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ بھی کوئی ذریعہ ہے جس کی مدد سے آپ یہ بتلا سکیں کہ بار بار دہرائی جانے والی یہ سات چیزیں کیا ہیں کیا صرف اپنی عقل کی مدد سے کوئی شخص اس آیت کی صحیح مراد متعین کر سکتا ہے؟ یہ حدیث ہی تو ہے جس نے ہمیں بتایا کہ سبع مثانی سے قرآن کی سات آیات مراد ہیں پھر ان سات آیات کی تعبیر بھی ہمیں حدیث ہی سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ وہ سات آیات ہیں جن پر سورہ فاتحہ مشتمل ہے۔

اب ذرا تھوڑی دیر کے لیے تصور میں لائیے کہ حدیث کو علیحدہ کر کے اگر اس آیت کی مراد متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو کیا حال ہو۔ ہر شخص کی سوچ مختلف ہوتی ہے

جیسی سوچ ہوتی بسع مثانی کی مراد بھی اسی طرح کی متعین کی جاتی کیا یہ حقیقت نہیں کہ جتنے جتنے ہوتے اتنی ہی اس سلسلے میں باتیں کی جاتیں ہر کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ ہدایت پر نظر کرتے ہوئے سات حکمتیں بیان کرتا تو کوئی آپ کی جنگی فتوحات کو دیکھتے ہوئے سات بڑے بڑے غزوات گنوتا، ممکن تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ کو سامنے رکھتے ہوئے بسع مثانی کی تشریح کرتے ہوئے سات عالم تلاش کیے جاتے یا بعد کے زمانے میں بسع مثانی کی تفسیر میں صحابہ کے دور کے سات مفتوحہ ممالک شمار کرائے جاتے۔ یہ سب اور اسی قسم کی لاتعداد خیال آرائیاں عین ممکن تھیں پھر ان سب کو درست قرار دینے کے لیے نہ معلوم کتنی مزید حاشیہ آرائیاں ہوتیں، مثانی کے لفظ کی جو مکرر کے معنی میں ہے نہ جانے ان تمام خیالی آرائیوں کے ضمن میں کیا کیا تو جہات پیش کی جاتیں۔ پھر ہر کوئی اپنی بیان کی ہوئی مراد اپنی پیش کی ہوئی تشریح و تفسیر اور اپنی اختیار کی ہوئی توجہ کو درست قرار دینے پر اصرار کرتا اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس ایسا نہ ہوتا جس سے ہم کسی ایک کو صحیح یا غلط قرار دے سکتے۔ خوش قسمتی سے اگر بسع مثانی سے سات قرآنی آیتیں مراد لے بھی لی جاتیں تو پھر یہ جھگڑا چلتا کہ یہ سات آیتیں کونسی ہیں اور پھر اس بارے میں خیال آرائیاں ہوتیں، حاشیہ لگائے جاتے غرض تشریحات و توجہات کا انبار ہوتا اور ہم پھر اس کو ملگو کی حالت میں ہوتے کہ کس کو صحیح جانیں اور کس کو غلط سمجھیں۔

ذرا غور تو کیجئے کہ حدیث کی مدد کے بغیر صرف ایک لفظ کی تفسیر میں کیسی ہزار انسان تیار ہوتی اور قرآن کی اصل مراد ان داستانوں میں لپی دفن ہوئی کہ قیامت تک سراغ نہ ملتا۔

اسی طرح قرآن کریم کی ایک اور آیت کے ضمن میں اس حقیقت کو بولتا ہوا دیکھئے کہ حدیث کے بغیر قرآنی آیات کی صحیح مراد کا متعین ہونا ممکن ہی نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے :

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا | اِیسا ہی ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم
تَشْكُرُوا ۖ اَشْهَدَا عَلَی النَّاسِ وَیَكُونَنَّ | لوگوں پر گواہ رہو اور تمہارا رسول تمہارے لیے
الرَّسُولُ عَلَیْكُمْ شَهِيدًا (بقرہ: ۱۴۲) | گواہی دے۔

اس آیت کے الفاظ سے ازل تو یہی پتہ نہیں لگتا کہ یہ گواہی کا واقعہ کب اور کہاں واقع ہوگا، حدیث کی مدد کے بغیر اس کی تعین میں جو کچھ خیال آرائیاں وقوع میں آسکتی ہیں ان کا اندازہ کچھ مشکل نہیں در ستر بالغرض والجمال بغیر کسی اختلاط کے یہ متعین کر بھی لیا جائے کہ یہ گواہی قیامت میں واقع ہوگی اگرچہ اس کا کوئی امکان نہیں کہ اختلاط کے بغیر ایسی کوئی تعین وجود میں آجائے تاہم کچھ دیر کے لیے فرض کیے لیتے ہیں کہ اس پر سب متفق ہو گئے کہ یہ گواہی حشر کے روز ہوگی تو حدیث کی مدد کے بغیر یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس گواہی کی نوعیت کیا ہوگی، امتی کس بات کی گواہی دیں گے اور ہم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس سلسلے میں گواہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ الناس کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ یہ گواہی پوری مخلوق انسانی کے لیے ہوگی۔ ایک نبی کا پوری مخلوق انسانی کے لیے گواہ ہونا تو کچھ سمجھ میں بھی سکتا ہے مگر ایک عام مسلمان ایسے لوگوں پر کیسے گواہ بن سکتا ہے جن کو اس نے نہیں پایا۔ یہ گتھی ذرا حدیث کی مدد کے بغیر کوئی سلجھا کر تو دکھائے۔ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن نہی فادعویٰ کرنے والے اپنی عقل سے جتنے گھوڑے دوڑائیں گے دھول ہی دھول اڑائیں گے منزل مقصود تک قیامت تک نہ پہنچ سکیں گے۔

اس گتھی کو اگر کبھی نے سلجھایا ہے تو صرف حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے حدیث نے ہمیں بتایا کہ میدان حشر میں جب تمام انبیاء علیہم السلام کی امتیں اپنے اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے مکر جائیں گی اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی اور نہ کوئی نبی ہی ہمارے پاس کوئی ہدایت لے کر آیا تو رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہارا کوئی گواہ ہے وہ کہیں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت۔ اس وقت پہلے امت محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ بلاشبہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائی تھیں۔

یہاں تک تو حدیث سے یہ معلوم ہوا ہے کہ متذکرہ گواہی کا واقعہ میدان حشر میں ہوگا مگر ابھی اس گتھی کا سلجھنا باقی ہے کہ ایک عام مسلمان ان لوگوں کے بارے میں کیسے گواہی

دے سکتا ہے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں، یہ گتھی بھی حدیث ہی سلجھاتی ہے،
سنئے!

حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ امت محمدیہ کی جانب سے گواہی دئے جانے پر دوسری
آئینیں جرح کریں گی کہ ان لوگوں کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا ان کی گواہی
ہمارے مقابلے میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے، اس جرح کے جواب میں امت محمدیہ
کہے گی کہ ہمیں ایک صادق مصدق رسول نے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر
دی تھی، ان کی خبر کو ہم مسائے اور مشاہدے سے زیادہ سچا مانتے ہیں اس لیے
ہم حق بجانب اور سچے ہیں اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے اس
قول کی توثیق کریں گے اور گواہی دیں گے کہ بے شک انہوں نے درست کہا ہے۔
دیکھ لیجئے وہ گتھی جس کو عقل سلجھانے سے عاجز تھی، حدیث کی مدد سے
کیسی آسانی سے سلجھ گئی۔ محشر کے اس واقعے کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی اور
مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملًا اور مفصلًا مذکور ہے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً شی حق کو تو یہ دو بھی بہت
کافی ہیں تاہم معاندین کی تسلی کے لیے ایک دو مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم
نے قیامت کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

يَوْمَ تَبْدَلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ
وَالسَّمَوَاتُ (ابراہیم : ۴۸)

یا اسی طرح سورہ زمر میں ہے
وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ
وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ (الزمر : ۶۷)

اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں
ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں پٹے ہونگے۔

ان آیات کے مفہوم پر نظر کرتے ہوئے تو ہمیں یہ سوال ابھرتا ہے کہ قیامت کے روز
جب آسمان اور زمین دونوں اپنی حالت پر نہ ہوں گے، ایک طرف زمین اپنی موجودہ
حالت سے بدل دی جائے گی اور اللہ کی مٹھی میں ہوگی دوسری طرف آسمان بھی پیٹ

دئے جائیں گے تو یہ ساری مخلوق آخر اس وقت کہاں ہوگی۔

حدیث کے بغیر قرآن نہی کے مدعی ذہن میں آ بھرنے والے اس فطری سوال کا جواب دیں یہ بہانہ قابل تسلیم نہ ہوگا کہ اس قسم کے سوالوں کے جوابات معلوم کرنے کی ہمیں ضرورت ہی کیا ہے اس لیے کہ اول تو یہ سوال محاد سے متعلق ہے اور محاد سے متعلق سوال بھی اگر غیر ضروری ہے تو پھر ضروری کسے کہیں گے علاوہ ازیں قرآن نہی کے سلسلے میں پیدا ہونے والے سوالات خواہ وہ کسی قبیل سے ہوں ہر حالت میں جواب کے متقاضی ہیں ورنہ قرآن نہی ناقص ٹھہرتی ہے۔

حدیث کے بغیر اس سوال کا جو جواب بھی دیا جائے گا اس کی حقیقت اندھیرے میں پھینکے جانے والے تیر سے زیادہ نہ ہوگی۔ یقینی جواب یقیناً یہ تو حدیث کا رخ کیے بغیر چارہ نہیں۔ حدیث ہی ہمیں بتلاتی ہے کہ اسی قسم کی آیات کے سلسلے میں صحابہ نے ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایسی صورت میں جب زمین و آسمان پلیٹ دئے جائیں گے تو مخلوق خدا کہاں ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پل صراط پر۔ انصابت سے کہئے یہ جواب محض عقل کی بنیاد پر دیا جانا ممکن ہے یہ یقین و اذعان سے بھرا ہوا جواب یقیناً منزل من اللہ ہے، ایسا جواب صرف ایسی ہستی ہی کی زبان سے نکل سکتا ہے جو مؤید من اللہ ہو۔

حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنے والوں سے آخرت ہی سے متعلق ایک اور سوال ہے اپنی عقل و دانش پر ناکہ کرتے والے ذرا حدیث کے بغیر اس سوال کا جواب دے کر دکھائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قیامت میں حق تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔

وَجُوهٌ يُّوْهَىٰ نَاصِرَةٌ اِلٰى سَبِيْهَا | اس دن بہت (لوگوں کے) آمنہ تر و تازہ ٹٹلکی
فَاِظْهَرَةٌ (القیمة : ۲۳-۲۲) | لگائے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا دیدار ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں مگر یہ دیدار کس طور پر ہوگا اس کی تفصیل سمجھنے میں وقت پیش آتی ہے کیونکہ دنیا میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ اجتماع کے وقت کسی ایک شخص کو اطمینان سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا تو قیامت کے میدان میں جہاں

اولین و آخرین کا اتنا بڑا اجتماع ہو گا کہ جمع ہونے والوں کی تعداد حد شمار سے باہر ہوگی جہاں ایکے خدا کا دیدار باطمینان کیلئے ممکن ہو گا کیا یہ لا تعداد انسانوں کا اجتماع ایک دوسرے کی گردنیں پھلانگتا پھرے گا کیا دیدار الہی کی کوشش میں وہاں اربوں انسانوں کے کا ندھے ایک دوسرے سے چھل رہے ہوں گے اور اس پر بھی کیا یقین سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب اہل محشر دیدار الہی سے فیض یاب ہو سکیں گے؟ یہ تخیلات یہ سوالات ہر اس مومن کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں جو عشق کے جذبے سے دیدار الہی کا مشتاق ہے۔

عقل کے سہارے جو جواب بھی ان تفصیلات کا دیا جائے گا قیاس سے زیادہ اس کی کوئی ضخیمت نہ ہوگی لیکن زبان بنوی سے اس کا جواب سنتے ہی آپ کی تشفی ہو جائے گی صحابہ کے ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو آفتاب اور چاند تمہارے سامنے ہیں جس طرح بغیر کسی رکاوٹ کے ایک وقت کروڑوں انسان ان دونوں کو دیکھا کرتے ہیں اس سے زیادہ صفائی اور اطمینان کے ساتھ تم اپنے رب کو محشر میں دیکھو گے۔ دیکھ لیجئے اس جواب سے تخیلات کے بادل کیسے ہوا میں اڑ گئے، محض محض پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ بادل گہرے سے گہرے ہوتے جاتے اور گھٹا ٹوپ اندھیروں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ کہاں تک مثالیں دی جائیں جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس ضمن میں قرآن سے بڑی مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر یہ مثالیں اسی پر اثر کریں گی جو حق کا متلاشی ہو۔ جس نے حق کو جان کر بھی نہ ماننے کی قسم کھائی ہوئی ہو اس کا اطمینان تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ ہاں خدا ہی ہدایت عطا فرما دے تو الگ بات ہے۔ بہر حال ہمارا کام پہنچا دینا ہے اسی لیے

علاہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

قصہ طلب آیات اور احادیث | حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کا دعویٰ کرنے والوں سے ایک اور بات دریافت

طلب ہے۔ قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں کسی نہ کسی خاص قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اکثر و بیشتر ان واقعات کا متعلقہ آیات قرآنی سے اس انداز گہرا تعلق ہے کہ جب تک وہ پروردگار تعالیٰ معلوم نہ ہو ان آیات کا پورا مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا، احادیث میں

ان قصوں کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اگر احادیث سے مدد لیتے ہیں مکررین حدیث کو عار آتی ہے تو وہ اپنی عقل سے ان آیات کا پورا پورا صحیح مفہوم واضح کر کے دکھائیں۔ ہم ان آیات میں سے چند ایک صرف نمونے کے طور پر پیش کیے دیتے ہیں شاید مکررین حدیث اپنی غلطی کی حقیقت سمجھ کر سیدھے راستے پر لوٹ آئیں سورۃ توبہ میں ہے۔

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا النِّحْلَ | اور ان تینوں پر بھی (توبہ فرمائی) جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا (توبہ: ۱۱۸)

حدیث سے مدد لے بغیر ذرا اس آیت کا پورا پورا مفہوم سمجھا کر دکھلائیے۔ یہ بتلائیے کہ یہ تین شخص کون ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے ان کا کیا قصہ تھا ان کے معاملے کو ملتوی کیوں رکھا گیا۔ اسی آیت میں آگے آتا ہے کہ ان پر زمین باوجود کثا دگی کے تنگ ہو گئی تھی، حدیث کے بغیر یہ معمرہ حل کیجئے کہ ان پر ایسی کیا مصیبت آ پڑی تھی جس کی وجہ سے اللہ کی اتنی وسیع زمین انہیں تنگ نظر آتے لگی؟

اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے ان تمام سوالوں کا جواب ضروری ہے اور وہ حدیث سے مدد لے بغیر ممکن نہیں۔ یہ آیت کو اسی طرح تشنہ چھوڑ دیجئے یا ہر کہ و مہ کی رائے پر چھوڑ دیجئے وہ جو چاہے ان سوالوں کے جواب میں اپنے طور پر قرار دے لے یا پھر مانئے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن فہمی ممکن نہیں۔ بتلائیے ان میں سے کونسی بات قرین عقل اور لقائے انصاف ہے؟ یقیناً آخری بات ماننے بغیر چارہ نہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا ناممکن ہے۔

ممکن ہے مکررین حدیث کہیں کہ اس قسم کی آیات کی تفسیر کی حد تک تو ہم حدیث کی اہمیت کو ماننے میں تو ہم کہیں گے کہ ان آیات سے متعلقہ احادیث بھی انہی سندوں اور انہی طریقوں سے روایت ہو کر ہم تک پہنچی ہیں جن سے وہ دیگر احادیث روایت ہوئی ہیں جن کو ماننے میں ان کو اعتراض ہے اگر یہ سندیں صحیح ہیں تو ان کو دونوں جگہ درست مانئے اور اگر غلط ہیں تو دونوں جگہ غلط قرار دیجئے۔ یہ دو رنگی کیسی ابھرا اپنا مطلب پورا ہوتا نظر آئے اقرار کر لیا اور جہاں مطلب برآری نہ ہوا نکال کر دیا۔ کچھ تو انصاف سے کام لیجئے۔

اسی طرح قرآن پاک کی ایک اور آیت کا حوالہ پیش خدمت ہے۔ منکرینِ حدیث احادیث کے ذخیرے سے مدد لیے بغیر اس آیت کا پورا مفہوم واضح کر کے دکھائیں۔ سورہ احزاب میں ہے۔

اور جن اہل کتاب نے ان کی مدد کی تھی (اللہ نے) انہیں ان کے قلعوں سے اتار دیا اور ان کے دلوں میں (تمہارا) رعب بٹھا دیا (بھر) بعض کو قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کر لیا اور تمہیں مالک بنادیا ان کی زمین کا اور ان کے گھر مل کا اور ان سے اموال کا اور اس زمین کا بھی جس پر تم نے (ابھی تک) قدم نہیں رکھا ہے۔

وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوا مِنْهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا وَأُخْرَىٰ تَكْمُرُ أَرْضَهُمْ وَمَا يَدَارُهُمْ إِلَّا أَمْوَالُهُمْ وَأَرْضُهُمْ أَلْهَوْهُمْ (الاحزاب: ۲۷-۲۸)

حدیث کے بغیر اگر قرآن کو سمجھا جاسکتا ہے تو پھر ذرا بتلائیے یہ مدد کرنے والے کون لوگ تھے انہوں نے دشمنانِ اسلام کی مدد کس طور پر کی تھی؟ وہ قلعے کہاں تھے جہاں سے ان مدد کرنے والوں کو اللہ نے نکال باہر کیا؟ ان کے قتل اور قید کیے جانے کی تفصیلات کیا ہیں وہ زمین اور وہ جائیداد کہاں تھی جس کو مسلمانوں کے قبضے میں دے دیا گیا نیز ان دوسری زمینوں کا اتہ پنتہ بھی بتائیے جہاں اس وقت تک مسلمانوں کے قدم نہیں پہنچے تھے مگر ان کے وارث بنا دیے گئے۔

انصاف سے بتلائیے احادیث سے قطع نظر کر کے کیا ان تمام باتوں کا جواب دیا جاسکتا ہے؟ کیا احادیث سے انکار کر کے اس آیت قرآنی اور اس قسم کی لاتعداد آیات قرآنی کا واضح اور متعین مفہوم سمجھنا ممکن ہے؟ کیا صرف قرآن سے ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے؟ کیا احادیث کی طرف رجوع کے علاوہ کوئی دوسری صورت بھی ان تمام باتوں کے معلوم کرنے کی ہے؟ جو شخص بھی جویلے حق اور طالبِ ہدایت ہوگا وہ بر ملا کہہ اٹھے گا کہ صرف اور صرف احادیث ہی وہ ذریعہ ہیں جو اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں۔

منکرین حدیث کو اگر ذرا بھی حق کی طلب ہے تو ان چند مثالوں سے ہی انہیں اپنے اس دعوے کی غیر معقولیت کا اندازہ ہو جانا چاہیے کہ حدیث کے بغیر قرآن فہمی ممکن ہے۔ اس قسم کی مثالیں قرآن مجید سے اور بھی بہت سی پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہمارا مقصود ان مثالوں کا احاطہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے اور یہ مقصود ان چند مثالوں سے بھی پورا ہو جاتا ہے ۛ

حدیث کے بغیر دین نامکمل ہے | حدیث درحقیقت چونکہ قرآن ہی کی دوسری ایک مفصل شکل ہے، جیسا کہ ہم نے ابتدا

میں عرض کیا وہ قرآن کے مجملات کی تفصیل، اس کی مشکلات کا بیان اور اس کے مختصر اشارات کی شرح ہے اس لیے صرف اتنا ہی نہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن کی چند آیات کا مفہوم سمجھ میں نہ آتا ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے بغیر دین کا پورا خاکہ ہی تیار نہیں ہو سکتا اور اس لحاظ سے حدیث کے بغیر دین ہی نامکمل رہتا ہے۔

حدیث کا انکار کرنے والے اگر سمجھتے ہیں کہ حدیث سے مدد لیے بغیر دین کی تکمیل ممکن ہے تو ہم ان کو دعوت دیتے ہیں آگے بڑھیں اور فقط قرآن کریم سے دین اسلام کے عقائد و عبادات، حلال و حرام کے احکام، معاشیات و معاشرت کی تفصیلات، نکاح و طلاق کے مسائل، تجارت و سیاست کے ضابطے اور احکام بھاد و خراج وغیرہ کا مکمل نقشہ تیار کر کے دکھائیں۔ دین کا مکمل نقشہ تو بہت دور کی بات ہے وہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ان چار ارکان دین ہی کے تفصیلی احکام صرف قرآن سے متعین کر کے دکھادیں۔

ارکان دین اور حدیث | مثال کے طور پر قرآن نے جا بجا نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ حدیث کے ذخیرے سے مدد لیے بغیر ذرا بتلائیے

تو سہی کہ نماز ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے اللہ کے اس تاکید حکم کی تعمیل آخر کس طریقہ پر کی جاتے ایسا تاکید حکم کہ قرآن میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کا کسی نہ کسی پیرائے میں

ذکر کیا گیا ہو۔ ذرا بتلائیے، صرف قرآن کی مدد سے بتلائیے کہ نماز پڑھنے والا نماز کے لیے ابتدا میں ہاتھ اٹھاتے تو کس طرح، ہتھیلیوں کا رخ کس جانب ہو، ہاتھ کہاں تک اٹھائے اٹھاتے وقت کیا کہے، پھر ہاتھ چھوڑ دے یا ہاندھ لے، یا نہ لے تو کیسے اور کہاں، کھڑے ہونے کی حالت میں کیا پڑھے، رکوع میں کیا کہے، رکوع ایک کرے کہ دو، سجدے میں کیا پڑھے، سجدوں کی تعداد کتنی ہو، نماز میں رکعت پہلے ہے کہ سجدہ، قیام پہلے ہے کہ قعدہ، قعدہ میں کیا دعائیں پڑھے، نماز سے باہر کس طرح آئے، سلام پھیرے تو پہلے دائیں طرف پھیرے کہ بائیں طرف، یہ اور اسی قسم کی تمام تفصیلات قرآن نے تو کہیں بیان نہیں کیں، قرآن نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نمازوں کے اوقات کی صحیح صحیح تعیین کیا ہے، کونسی نماز کا وقت کس وقت شروع ہوتا ہے اور کس وقت ختم ہو جاتا ہے، قرآن نے رکعات نماز بھی متعین کر کے کہیں نہیں بتلائی۔ قرآن سے آپ کو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکے گا کہ نماز میں بھول ہو جائے تو کیا کیا جائے، کن کن صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے، نماز کا وقت قصداً ہو جائے تو کیا کرے کن کن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور کن اوقات میں حرام۔ یہ تمام تفصیلات آپ کو حدیث ہی کے ذخیرے سے ملیں گی۔ اسی طرح روزے کے تفصیلی احکام محض قرآن سے معلوم نہیں کیے جاسکتے گے۔ صرف قرآن سے کوئی بتا سکتا ہے کہ کن کن حالات میں روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور کن صورتوں میں کفارہ لازم آتا ہے۔ کیا حدیث کی مدد کے بغیر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کن لوگوں کے لیے روزہ رکھنے کے بجائے فدیہ دے دینے کی اجازت ہے، وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر روزہ نہ رکھنا جائز ہے وہ کونسی صورتیں ہیں جن میں رکھا ہوا روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے؟ اسی قسم کی جتنی تفصیلات روزے سے متعلق ہیں وہ قرآن نے تو کہیں بیان نہیں کیں۔

نماز اور روزے ہی پر آپ دو دوسکرا کہان جج اور زکوٰۃ کو بھی قیاس کر لیجئے۔ جج اور زکوٰۃ کا حکم تو آپ کو قرآن میں مل جائے گا مگر مناسک جج اور مسائل زکوٰۃ معلوم کرنے کے لیے آپ کو حدیث ہی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ قرآن آپ کو یہ نہیں بتائے گا کہ

حج ادا کرنے کے کتنے طریقے ہیں، احرام میں کتنے کپڑے ہوتے ہیں حدود مہیات کیا کیا ہیں، مناسک حج کس ترتیب سے ادا کیے جاتے ہیں، طواف میں کتنے چکر ہیں اور سہی کتنے شوط کی ہے، رمل کسے کہتے ہیں اور کس طرح کیا جاتا ہے، رمی کرنے کا طریقہ کیا ہے، قربانی کب اور کس طرح دینی ہے، حج کی بنیاد کیا کیا ہیں۔ غرض حج سے متعلقہ تفصیلی احکام قرآن میں آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ اسی طرح قرآن میں زکوٰۃ کا حکم تو ملے گا مگر زکوٰۃ کا نصاب، اس کی شرح اور اس کی مدت وغیرہ معلوم کرنے کے لیے حدیث سے رجوع کیے بغیر چارہ نہیں۔ صرف قرآن کی مدد سے کوئی نہیں بتا سکتا کہ مختلف قسم کے اموال پر زکوٰۃ کے مختلف نصاب کیا کیا ہیں اور ہر ایک مال پر زکوٰۃ کس کس شرح سے ادا کی جاتی ہے، حیوانات کی کیا زکوٰۃ ہے اور زمین کے پیداوار کی کیا ہے، عنثر اور خراج کے مسائل کیا ہیں۔ ان تمام تفصیلات کے لیے حدیث کا ذخیرہ ہی ہمارا رہنما بن کر رہا ہے۔

ان ارکانِ دین نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی پر موقوف نہیں حدیث کی مدد کے بغیر دین کا کوئی شعبہ بھی مکمل نہیں ہوتا، معاشرت ہو یا معیشت، سیاست کے امور ہوں یا تجارت کے معاملات، اخلاق کی بات ہو یا حقوق و فرائض کی دین کے ہر ہر شعبے کا پورا نقشہ عمل تیار کرنے کے لیے ہم حدیث کے محتاج ہیں۔

حدیث کا انکار کرنے والوں سے کوئی پوچھے کہ حدیث کو چھوڑ کر آپ دین کو آخر کیا شکل دینا چاہتے ہیں کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ نماز نماز نہ رہے اور روزہ روزہ نہ کہلا سکے حج اور زکوٰۃ اپنا وجود کھو بیٹھیں، دین کا پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ منتشر ہو کر رہ جائے۔ ہر شخص قرآن کی ایک الگ تفسیر اور دین کا ایک علیحدہ ڈھانچہ لیے پھرے اور کوئی کسی کو غلط یا درست کہنے والا نہ رہے۔

انکار حدیث البطلان دین کے مترادف ہے | حدیث سے قطع نظر کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ حدیث کا

انکار کر کے قرآن کی تفسیر قرآن کی تحریف بن جائے گی۔ ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق قرآن

کی مرادات متعین کرے گا اور پھر اس پر اصرار کرے گا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہی درست ہے،
دین ایک کھیل بن جائے گا۔

ان منکرین حدیث نے دین کو واقعی ایک کھلونا سمجھا ہوا ہے۔ حدیث کے بغیر ان کی قرآن نہیں
کا ایک شاہکار ملاحظہ کیجئے۔ دیکھئے اور عبرت پکڑ لیتے۔

شیخ عبداللہ چکڑاوی صاحب نے جن کو منکرین حدیث کے یہاں امام کا درجہ حاصل ہے
ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ”برہان القرآن علی صلوٰۃ القرآن“ یہ کتاب تقریباً چار سو صفحات پر
مشتمل ہے اس کتاب میں شیخ صاحب نے حدیث کی مدد کے بغیر نماز کے تفصیلی احکام متعین کرنے کی
کوشش کی ہے۔ شیخ صاحب کی اس کوشش کا سب سے مزید پہلو یہ ہے کہ اپنی متعین
کردہ نماز کی جس کو وہ صلوٰۃ القرآن کہتے ہیں جو ترکیب انہوں نے لکھی ہے وہ اس کو قرآن سے
ثابت نہیں کر سکے، پہلے ہی قدم پر حدیث کی احتیاج کا شہ وہ دیدہٴ عبرت نگاہ سے بہرہ ور ہوتے۔
اس کے علاوہ اپنی نماز میں انہوں نے بجائے تسبیحات کے آیات قرآنیہ رکھی ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ
تکبیر اولیٰ کی جگہ وان اللہ صوالحی الکیبر پڑھا جائے، مثلاً یعنی سبحنک کی بجائے انی وجہت
وجہی للذی الخ پڑھیں، اسی طرح ہر موقع پر انہوں نے مختلف آیات قرآنی تجویز کی ہیں مگر
مزے کی بات یہ ہے کہ یہ نہ بتلا سکے کہ ان آیات کا تعلق انہوں نے قرآن کی کس آیت کے حکم
کے تحت کیا ہے۔ پھر صرف ایک نماز ہی کے معاملے میں ان کے آپس کے اختلافات کا عالم
دیکھئے۔ شیخ چکڑاوی صاحب کو قرآن سے پانچ وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے جبکہ ان کے شاگردوں
کو قرآن میں صرف دو وقت کی نماز نظر آتی ہے، شیخ صاحب کے نزدیک رکعات نماز کی تعداد دو بھی
ہے تین بھی اور چار بھی مگر شیخ صاحب کے مریدین مصر ہیں کہ قرآن سے تعداد رکعات صرف دو
ثابت ہوتی ہیں۔ اذان کے سلسلے میں بھی ان کے اختلافات کی بولچھی اچھ اس سے زیادہ ہی ہے۔ شیخ
عبداللہ چکڑاوی صاحب اذان کے منکر تھے اس کو کفر و شرک خیال کرتے تھے لیکن ان کے خلیفہ
شیخ حسنت علی نے اپنے شیخ کے علی الرغم ایک اذان اپنی طرف سے ترتیب دے لی اس کے لیے انہوں
نے چند آیات قرآنی سَبَّأْنَا سَمْعًا مَّنَادًا یُنَادِیْ وَغَیْرہ جمع کیں اور ان کو ایک خاص ترتیب
سے یکجا کر کے اس مجموعہ کا نام اذان رکھ دیا مگر وہ بے چارے بھی یہ نہ بتلا سکے کہ مختلف آیات کا

یہ تعین اور یہ ترتیب قرآن کی کس آیت سے ثابت ہوتی ہے۔ جب آیات کے تعین اور ترتیب کے لیے کوئی دلیل ہی نہیں تو عین ممکن ہے کل کلاں کو شیخ حثمت علی صاحب کے خلیفہ اٹھیں اور اذان کے لیے کسی دوسری آیات کا انتخاب کریں اور اپنی مرضی کی ترتیب انہیں عطا فرمائیں۔ خود فرمایا آپ نے حدیث سے قطع نظر کرتے کے بعد قرآن کی تفسیر کا یہ حال ہوتا ہے قرآن کے صرف دو لفظوں کی تفسیر میں اس قدر اختلافات رہتا ہو گئے اور وہ بھی اُستاد اور شاگرد کے درمیان آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ذرا اس دعوے پر بھی غور کیجئے کہتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ ہے قرآن کو مزید کسی تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔ اُنیما الصلوٰۃ کا ترجمہ کرتے کرتے تو شیخ چکرالہوی صاحب اس کی تشریح میں چار سو صفحات لکھ گئے اور دعویٰ یہ کہ قرآن کو کسی تشریح کی ضرورت نہیں؟ قرآن کے صرف ایک فقرے کو سمجھانے کے لیے چار سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تیار کرنی پڑی کیا اسی طرح قرآن میں سب کچھ موجود ہے؟ اگر ان احادیث کو جمع کیا جائے جو نماز سے متعلق ہیں تو اس سے نصف صفحات کی کتاب بھی مرتب نہ ہو۔ کاش منکرین حدیث کچھ تو عقل سے کام لیتے مگر نہیں! یہ لوگ عقل ہی سے تو کام لے کر اپنی اغراض نفسانی پورا کرنے کی راہیں نکال رہے ہیں۔ کاش ان کو عقل سلیم نصیب ہوتی جو وہی کی روشنی میں چکا چوند ہونے کے بجائے اور چمک اٹھی اور ان کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتی :

انکار حدیث اور حلال و حرام کی تمیز | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ منکرین حدیث اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں، ان کو اتنا

بھی احساس نہیں کہ حدیث کو درمیان سے نکال دیا جائے تو دین کا وجود ہی اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتا، حدیث کو ماخذ دین نہ مانا جائے تو نہ محتملات اپنی جگہ پر برقرار رہتے ہیں نہ عبادات نہ معاملات، دین کا سارا نظام ٹپٹ ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر اغراض کے بندوں کے ہاتھوں دین کا ایسا حلیہ بگڑتا ہے کہ اکثر حالات میں حلال و حرام تک کی تمیز باقی نہیں رہ سکتی۔ ہم نہیں سمجھتے کہ منکرین حدیث اس قدر جاہل ہوں گے کہ اتنی بات بھی نہ سمجھیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ماخذ دین ہونے کی حیثیت سے حدیث کا انکار کر دیا جائے تو بیشتر حالات میں حلال و حرام خلط ملط ہو کر رہ جائیں۔ اس سلسلے میں بھی چند مثالیں ملاحظہ کرتے چلیے :

(۱) ذرا بتلائیے! دین اسلام میں پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنا حلال ہے یا حرام؟ ہر کوئی کہے گا کہ حرام ہے، ایک بیوی کے ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص دوسرا نکاح کرنا چاہے تو وہ اپنی موجودہ بیوی کی بھتیجی یا اس کی بھانجی سے نکاح نہیں کر سکتا، شریعت نے ان دونوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے مگر حدیث کو دین کا ماخذ نہ ماننے والوں سے آپ پوچھیں گے تو انہیں یہی کہتے ہیں پڑے گی کہ حلال ہے۔ آپ تعجب کا اظہار نہ کریں یہ بالکل درست ہے، مگر حدیث کو یہ اقرار کیے بغیر چارہ نہیں کہ پھوپھی اور خالہ بھانجی کو ایک ساتھ اپنے نکاح میں رکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں ان دونوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام نہ لکھا ہو قرآن نے تو صرف دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے۔

بچے بیٹھے بٹھائے ایک حرام چیز حلال ہو گئی۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے تو واقعی دو بہنوں کو ہی ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے مگر اس کی علت یہ ہے کہ اس وجہ سے ان میں زنا بت کا جذبہ بیدار ہو گا اور فطری طور پر ان دونوں کے درمیان قطع رحمی پیدا ہو جائے گی جبکہ شرعاً دونوں بہنوں کے درمیان صلہ رحمی واجب تھی۔ حدیث نے اس علت کے پیش نظر ان رشتوں کا بھی اسی حکم میں داخل ہونا بتلا دیا جن میں اس صلہ رحمی کے قطع ہونے کا خطرہ تھا یعنی جہاں کہیں بھی وہ علت موجود تھی جو دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کی اصل وجہ تھی حدیث نے وہاں وہاں ہی ان رشتوں کو یکجا جمع کرنا حرام قرار دے دیا۔ گویا جمع بین الاختین کی حرمت کا حکم دے کر قرآن نے ایک اصول بتلایا اور حدیث نے اس اصول کا اطلاق ہمیں سکھایا اور واضح کیا کہ خدا کی مراد صرف یہ دو ہی رشتے نہیں بلکہ اس قسم کے اور رشتے بھی جہاں قطع رحمی کا خطرہ ہو وہی حکم رکھتے ہیں۔

(۲) اسی طرح شیر بھڑیا، بچہ وغیرہ تمام درندے حرام ہیں، شکاری پرندے باز، شکرہ وغیرہ کو بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی جاہل سے جاہل مسلمان سے بھی آپ پوچھیں گے تو وہ ان جانوروں کا گوشت کھانے کو حرام ہی کہے گا مگر حدیث کا انکار کرنے والوں سے پوچھئے انہیں ان حرام جانوروں کو بھی حلال ماننا پڑتا ہے۔ حدیث سے قطع نظر کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ دراصل قرآن

نے حلال اور حرام سے متعلق ایک تاعدہ کلیہ بتلادیا ہے کہ جو چیزیں طہبات ہیں وہ حلال

ہیں اور جو نجاست ہیں وہ حرام ہیں۔

وَيُحِلُّ لَكُمْ لَحْمَ الطَّيْرِ وَمَحْمَرُ عَلَيْهِمُ الدِّمَاءُ (اعراف : ۱۵۸) اور ان کے لیے پاکیزہ

چیزیں جائز بتانا ہے اور ان پر گندی چیزیں حرام رکھنا ہے (لیکن اب درندوں اور شکاری پرندوں کے بارے

یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان کو طہبات میں داخل سمجھا جائے یا نجاست میں شامل کرنا جائے۔ حدیث

نے اس مذہب کو رفع کیا اور قرآن کے اس حکم کی تشریح کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ذِي نَابٍ مِّنَ السَّيِّئَاتِ (کچلیاں رکھنے والے درندے) اور ذِي مَخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ (بچوں والے

شکاری پرندے) کے الفاظ سے درندوں اور شکاری پرندوں کا نجاست کے حکم میں درج ہونا

بتلایا لیکن منکرین حدیث کو تو حدیث سے مدد لینا باعث عار ہے اس لیے ان کے پاس اس

کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ درندوں اور شکاری پرندوں کو حلال جانیں یا پھر حدیث کا اقرار کریں۔

اس مثال میں آپ اس حیثیت سے بھی غور کریں کہ اگر طہبات اور نجاست کی تشریح

کو منکرین حدیث کی فحاشی کے مطابق صرف عقل کے سپرد کر دیا جائے تو بات صرف وہندوں

اور شکاری پرندوں کے حلال ہو جانے تک ہی محدود نہیں رہتی۔ حرام کھانے کے عادی لوگ

تمام نجاست کو طہبات کہہ کر حلال بنا ڈالیں اور کوئی بھی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو۔

(۳) ایک اور مثال پیش خدمت ہے شاید منکرین حدیث پر اپنی غلطی واضح ہو جائے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ شراب اور اسی قسم کی دوسری نشہ آور چیزیں حرام ہیں ان میں تھوڑی

اور زیادہ کا بھی کوئی فرق نہیں شراب کا جس طرح ایک پیگ یا ایک بوتل پینا حرام ہے

اسی طرح ایک گھونٹ پینا بھی حرام ہے خواہ اس گھونٹ سے نشہ بھی نہ ہوتا ہو شراب

بخس جو ہوں قرآن کے الفاظ ہیں اَلْمَاسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَنزَلُ لَمْ يَجْسُرُوا (شراب خوا

اور انصاف اور انعام سب بخس ہیں) تو بخس چیز تھوڑی ہو یا زیادہ بخس ہی ہوتی ہے۔ پیشاب

کا ایک قطرہ بھی ناپاک ہی ہوتا ہے غرض نشہ آور چیزوں میں تھوڑی اور زیادہ کا

کوئی فرق نہیں لیکن قرآن نے اس امر کی وضاحت کہیں نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے

جو چیزیں نشہ آور نہیں وہ حلال فرمائی ہیں اور جو نشہ آور ہیں وہ حرام کی ہیں یہ وضاحت

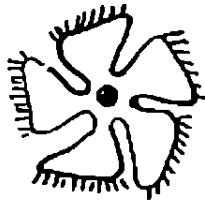
کہ جو چیزیں زیادہ مقدار میں استعمال کرنے سے نشہ پیدا کرتی ہیں ان کو تھوڑی مقدار میں استعمال کرنا بھی حرام ہے صرف حدیث نے کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
 مَا شَكَرَ كَثِيرَةً فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ (جن کی زیادہ مقدار نشہ لائے وہ تھوڑی بھی حرام ہیں)
 حدیث سے قطع نظر کی جائے تو یہ وضاحت نہیں ملے گی اور شراب کے رسیا گھونٹ گھونٹ کر کے شراب کو حلال قرار دینے رہیں گے۔ آپ خود بھی دیکھ رہے ہیں موجودہ دور میں شراب کو حلال ہی نہیں مفید صحت قرار دیا جا رہا ہے اور منکرین حدیث ان کی تقویت کا باعث بن رہے ہیں۔

غرض حدیث کے بغیر قرآن فہمی انتہائی نامعقول بات ہے اور اس سے زیادہ غیر معقول یہ دعویٰ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے زمانے میں اپنے اپنے حالات کی روشنی میں تفسیر ان کے معانی و مطالب سمجھ سکتا ہے۔ حتیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا احسان کیا ہے کہ اپنے کلام کی مرادات کی تلاش عقل انسانی کے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ہم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جس نے وحی الہی کی روشنی میں کلام الہی کی مرادات متعین کر کے ہمیں بتلا دیں نہ صرف بتلا دیں بلکہ ان پر عمل کر کے ان کا عملی نمونہ ہم پہنچا دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے رسول کے ذریعے ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا اور مرادات قرآنی کی تعبیر کر ہماری عقل پر چھوڑ دیتا تو ہم یقیناً مدت العمر قرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بالکل صحیح فرمایا کہ لَوْلَا السُّنَّةُ مَا فَهِمْنَا أَحَدٌ مِّنَّا الْقُرْآنَ (اگر حدیث نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کو نہ سمجھتا) حدیث کے بغیر نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی کے احکام و مسائل مستور و مجہول نہ رہتے بلکہ نکاح، خلع، طلاق، بھاد و قتال اور صلح و جنگ وغیرہ کی حقیقت بھی ہم پر کبھی منکشف نہ ہو سکتی اور دین ایک کھلونا بن کر رہ جاتا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ قرآن جو ہدایت انسانی کے لیے نازل ہوا تھا نبی نوع انسان کی گمراہی کا سبب بن جاتا۔

مگر اللہ کو تو اپنے بندوں کی ہدایت منظور ہے وہ ان کو گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتا کیے چھوڑ دیتا اس نے قرآن کی اس طرح حفاظت کی کہ اس کے الفاظ کو بھی محفوظ رکھا اور اس کے معانی و مطالب اور اس کی مرادات کی بھی حفاظت کی اور یہی ہے وہ حفاظت جس کا

قرآن میں وعدہ کیا گیا تھا۔ صرف الفاظ محفوظ ہوتے تو یہ وعدہ پورا نہ ہوتا اسی طرح صرف معانی کی حفاظت سے اس وعدے کا ایسا صادق نہ آتا۔

غرض منکرینِ حدیث کے اس دعوے میں کوئی وزن نہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن فہمی ممکن ہے۔ تاریخین پر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ حدیث کے بغیر صرف یہی نہیں کہ قرآن فہمی ناممکن ہے بلکہ حدیث کے بغیر قرآن ہدایت کے بجائے گمراہی کا سبب بن جاتا ہے اسلام کی صحیح تصویر قرآن اور حدیث سے مل کر تیار ہوتی ہے، اسلام کی سچے تعلیم قرآن اور حدیث کی باہمی توفیق و تطبیق سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن پاک اور حدیث دونوں مل کر ہی سہر حقیقہ ہدایت ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں ایک کو مانیں اور ایک کا انکار کریں وہ صراطِ مستقیم سے دور ہیں :-



حفظِ حدیث اور صحابہ

گذشتہ گفتگو کے نتیجے میں یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن فہمی ناممکن ہے۔ صرف قرآن فہمی ہی ناممکن نہیں بلکہ حدیث کے بغیر دین نامکمل ہے اسلام کی پوری تصویر قرآن اور حدیث دونوں سے مل کر ہی تیار ہوتی ہے جو شخص قرآن کی اس آیت پر یقین رکھتا ہے کہ

<p>یہج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پہلے نبی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے پسند کر لیا۔</p>	<p>الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَانْمَعْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (المائدہ: ۳)۔</p>
--	---

اور یہ ماننا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دین کا نفل کر دیا اس کو یہ ماننے بغیر
بچارہ نہیں کہ انکار حدیث ابطال دین کے مترادف ہے اور اسی طرح جو شخص قرآن حکیم کی
اس آیت پر ایمان رکھتا ہے کہ

<p>محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور (سب) نبیوں کے ختم پر ہیں۔</p>	<p>مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (الاحزاب: ۴۰)</p>
--	--

اور یہ یقین رکھتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری نبی ہیں اب دوسرا کوئی نبی آنے
والا نہیں آپ پر نبوت ختم ہو گئی قیامت تک یہی نبوت قائم رہے گی تو اسے یہ بھی ماننا پڑے
گا کہ حدیث کی حفاظت انہی ہی ضروری ہے جتنی قرآن کی۔ اگر حدیث کی حفاظت نہ ہو تو دین غیر
محفوظ قرار پاتا ہے اور دین کا قیامت تک کے لیے محفوظ رہنا ضروری ہے کیونکہ اب نبوت کا
دروازہ تو بند ہو گیا کہ ایک نبوت کے ختم ہونے اور ایک شریعت کے گم ہو جانے پر نئی
نبوت اور نئی شریعت اس کے قائم مقام ہو جائے۔

حدیث کی ضرورت ثابت ہو جانے کے بعد اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ حدیث کی حفاظت کا تیسرا مرحلہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح انجام دیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اب تک میں عرض کیا گیا تھا کہ حفاظت کا یہ تیسرا مرحلہ جس میں احادیث نبوی صحابہ سے چل کر تابعین، تبع تابعین اور پھر بعد کے آنے والے محدثین کے واسطوں سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ منکرین حدیث کو حفاظت حدیث کے سلسلے میں زیادہ تر کلام اسی مرحلے میں ہے۔

حفاظت حدیث کے سلسلے میں منکرین حدیث کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو قلم بند ہوئیں نہیں بلکہ صحابہ کے عہد میں بھی ان کو قید تحریر میں نہیں لایا گیا محض زبانی طور پر نقل در نقل کا سلسلہ جاری رہا۔ کتابی شکل میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث عہد نبوی سے تقریباً دو سو سال بعد مدون ہوئیں اب جو چیز اس قدر عرصہ دراز کے بعد تحریر میں آئی ہو اس کا محفوظ رہنا فطرۃً اور عادتاً محال ہے لہذا احادیث کے ذخیرے کو محفوظ تصور نہیں کیا جاسکتا اور اس لیے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ منکرین حدیث کے اس اعتراض کا ہمیں درخیمتوں سے جائزہ لینا ہے اول یہ کہ کیا یہ

امر واقعہ ہے کہ احادیث عہد نبوی کے دو سو سال بعد تحریر میں آئیں یا یہ محض افتراء پر بازی ہے دوم یہ کہ کیا احادیث کو غیر معتد قرار دینے کے لیے بس اتنی ہی دلیل کافی ہے کہ وہ ایک عرصہ دراز کے بعد قلم بند ہوئیں کیا کتابت و تحریر کے علاوہ دوسرا کوئی ذریعہ نہیں جو حفاظت حدیث کا ضامن ہو سکے۔ کیا حفظ کے راستے سے احادیث کی سینہ بہ سینہ منتقلی ان کی حفاظت کی ضمانت نہیں بن سکتی؟

جہاں تک احادیث کے قید تحریر میں آنے کا تعلق ہے منکرین حدیث کے اس دعوے میں قطعاً کوئی وزن نہیں کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں احادیث کو تحریر کی شکل میں محفوظ نہیں کیا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ احادیث کے موجودہ ذخیرے کا غالب ترین حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے عہد میں ہی قید تحریر میں آچکا تھا جیسا کہ انشاء اللہ دلائل کی روشنی میں یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آ جائے گی مگر یہ موضوع چیز کہ ذرا تفصیل طلب ہے اس لیے

اس کو زیر بحث لانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان قرآن کا جائزہ لیں جو حفاظت حدیث کے سلسلے میں کتابت و تحریر سے زیادہ اہم ہیں اور جن کو اگر نظر میں رکھا جائے تو اس بات کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہتی کہ احادیث کتابی شکل میں کب مدون ہوئیں :-

اعتماد کی بنیاد | ہمیں اس سلسلے میں منکرین حدیث سے سب سے پہلے یہ پوچھنا ہے کہ کیا ان کے نزدیک یہ اصول مسلم ہے کہ ہر لکھی ہوئی چیز محفوظ اور قابل اعتماد ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جو تحریر میں نہ آئی ہو غیر محفوظ اور ناقابل اعتماد ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ چلتے چلتے کوئی تحریر آپ کو زمین پر پڑی ہوئی مل جاتی ہے جو کسی خبر یا کسی اطلاع پر مشتمل ہے تو کیا آپ اس خبر اور اس اطلاع پر صرف اس لیے یقین کر لیں گے کہ وہ لکھی ہوئی ہے یا اس ذریعے کا پتہ لگانے کی کوشش کریں گے جس نے اس خبر اور اس اطلاع کو ہم پہنچایا ہے تاکہ اس کے ثقت یا غیر ثقت ہونے کا فیصلہ آپ کر سکیں ظاہر ہے اگر آپ عقل کی دولت سے بہرہ ور ہیں تو آپ دوسرا راستہ اختیار کریں گے صرف اس بنا پر اس خبر کی سچائی کو آپ کبھی بھی قبول کرنے کو تیار نہ ہوں گے کہ وہ آپ کو تحریر کی صورت میں ملی ہے کسی اطلاع کو آپ اس وقت تک سچ نہ مانیں گے جب تک آپ کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس اطلاع کا ہم پہنچانے والا سچا ہے۔ اخبار کا دینا ہی کی مثال لے لیجئے کوئی خبر اس وقت تک قابل اعتماد نہیں سمجھی جاتی جب تک کسی معتد علیہ شہور یا معتمد نے اسے جاری نہ کیا ہو معلوم ہوا محض تحریر شدہ ہونے کی بنا پر کسی خبر کے بارے میں اعتماد یا عدم اعتماد کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اعتماد کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ خبر کے ذرائع قابل اعتماد ہوں۔ یہ ایک ایسا مسلمہ اصول ہے کہ جو شخص اس میں شک کرے گا اس کی عقل کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے گا تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کو محض تحریر کی شرط پر اصرار کیوں ہے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ احادیث جن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہیں وہ انتہائی قابل اعتماد ہیں تو پھر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی کہ احادیث قائم بند کب ہوئیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ حدیث کی حفاظت کے لیے جن جن ذریعوں سے کام لیا جاسکتا تھا سب سے پورا پورا ایذا دینا اور قرآن یہ بتائیں کہ وہ تمام ذرائع قابل اعتماد تھے تو احادیث کی حفاظت میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

کیا قرآن کریم جس پر منکرین حدیث کو بھی پورا اعتماد ہے آسمان سے تحریری صورت میں نازل ہوا تھا اگر اعتماد کے لیے لکھا ہوا ہونا ہی ضروری ہے تو قرآن بھی معاذ اللہ قابل اعتماد نہ رہا کیونکہ اللہ نے اسے کتابی صورت میں نازل نہیں فرمایا حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ کی جانب سے کوئی لکھی ہوئی تحریر لے کر نہ آتے تھے بلکہ قرآن کریم کے الفاظ جبریل علیہ السلام کی زبان سے نکلتے اور زبان نبوی پر جاری ہو جاتے جبریل علیہ السلام کی لائی ہوئی وحی کیا اس لیے ناقابل اعتماد قرار دی جاسکتی ہے کہ وہ لکھی ہوئی شکل میں نہیں بھی گئی ظاہر ہے کوئی بھی اس کا قائل نہیں کلام الہی کو قابل اعتماد سمجھنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کا لے والا قابل اعتماد ہے اس کی امانت داری کی خود صاحب کلام نے ضمانت دی ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (اسے امانت دار فرشتے نے اتارا۔ الشعراء: ۱۹۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے صحابہ کی طرف قرآن کی منتقلی بھی تحریری صورت میں نہیں ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی آیات صحابہ کو زبانی ہی سنائیں جنہیں صحابہ نے سُن کر اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا یا کاتبین وحی نے متفرق اجزا پر لکھ لیا صحابہ نے کبھی یہ مطالبہ کیا کہ قرآن اللہ کی طرف سے تحریری صورت میں نازل ہوا وہ تحریر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دکھائیں تو ہم قرآن کو سچا مانیں زبان نبوی سے سُنی ہوئی آیات کو محض اس لیے سچا مانا گیا کہ ان کا سنانے والا صادق و مصدوق اور امین تھا :

تحریر اور اعتماد لہذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ صرف لکھی ہوئی چیز ہی قابل اعتماد ہو سکتی ہے۔ اعتماد و عدم اعتماد کا تحریر و عدم تحریر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک چیز لکھی ہوئی ہو مگر غلط ہو کسی چیز کے بقید تحریر میں آ جانے سے اشتباہ و شکوک کے عوار سے دروازے بند نہیں ہو جاتے غلطی کا امکان ہر حال باقی رہتا ہے۔ کاتبوں کے ہاتھوں رحمت کو زحمت بنتے کس نے نہیں دیکھا عصر حاضر میں بھی طباعت اور لٹاؤں کی بے احتیاطی سے کون و آنف نہیں ذرا سی بے احتیاطی سے عبارتوں کا کچھ سے کچھ ہو جانا ردِ مزہ کا مشاہدہ ہے۔ کتابت اور طباعت کے مرحلوں سے نکل آنے کے بعد بھی پڑھنے والوں کی نگاہیں کیا لغزشوں سے بالکل محفوظ ہیں؟ خصوصاً عربی زبان کی عبارات اور پھر بالخصوص اس زمانے کی عبارات

جب عربی زبان نقاط سے محروم تھی اس زبان کی عبارات میں تو درجہ زیادہ مذکورہ بالا قسم کی غلطیوں کے امکانات ہیں آج بھی جب کہ عربی زبان نقطوں سے مزین ہے غیبی کو عین پڑھنے والے اور سزاق کو سزاق سمجھنے والے آپ کو بہت ہی جائیں گے غرض کسی چیز کا تحریر میں آجانا اس کے محفوظ ہو جانے کی ضمانت نہیں بن سکتا اس لیے کتابت تحریر اور تدوین جیسے الفاظ کی رٹ لگائے جانا بالکل بے سود ہے منکرین حدیث احادیث کے زبانی حفظ کے بارے میں جس تذکرہ کو شک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ شک و شبہات کا اظہار کتابت اور تحریر کے بارے میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے جانچنے پر کھنے والی بات یہ نہیں کہ احادیث قید تحریر میں کب آئیں بلکہ دیکھنے اور غور کرنے والی بات یہ ہے کہ احادیث ہم تک کن ذرائع سے پہونچیں اور وہ ذرائع محفوظ تھے یا غیر محفوظ۔

احادیث زبانی حفظ و یادداشت کے ذریعے سے محفوظ کی گئی ہوں یا کتابت و تحریر کے واسطے سے دیکھنا یہ ہے کہ حصول اثنار کے لیے جس حزم و احتیاط کی ضرورت تھی اس کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے یا نہیں اگر جواب اثبات میں ہے تو حفاظت حدیث پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ حفاظت حدیث کے سلسلے میں ابتداء ہی سے اگرچہ حفظ اور کتابت دونوں سے کام لیا گیا ہے لیکن اگر صرف حفظ سے ہی کام لیا گیا ہوتا جیسا کہ منکرین حدیث کہتے ہیں اور یہ ثابت ہو جائے کہ حفظ سے متعلق جس قدر ذمہ داریاں ضروری ہیں وہ باحسن و بجا پوری کی گئی ہیں اور کسی بھی قسم کی امکانی غفلت اور لاپرواہی سے کام نہیں لیا گیا تو ہر صاحب عقل حدیث کو محفوظ ماننے پر مجبور ہو گا۔

منکرین حدیث جب احادیث کی تدوین کا دوسو سال بعد و قریب میں آنے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کا انداز کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے کہنا چاہتے ہیں کہ دوسو سال تک احادیث کا ذخیرہ قمر گامی میں پڑا رہا اس سے پہلے حفاظت حدیث کی کوئی صورت نہ تھی احادیث کا کوئی چرچہ نہ تھا۔ دوسو سال بعد یک بیک کچھ لوگوں کے ذہن میں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے دوسو سال پہلے جو کچھ کہا تھا اچھو کچھ کیا تھا وہ لکھ لیا جائے چنانچہ لکھ لیا گیا اور پھر اسی بنیاد پر بڑے معصومانہ انداز میں سادہ لوح مسلمانوں سے سوال کیے گئے ہیں آپ

خود ہی بتائیے دو سو سال بعد کس کو یاد رہتا ہے کہ رسول خدا نے کیا کیا تھا اور کیا نہیں کیا تھا، کوئی کام کس طرح انجام دیا تھا اور کس طرح نہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی کثابت کے علاوہ احادیث کو حفظ کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا تو وہ حفظ کے ذریعے کو کمزور ترین ذریعہ ثابت کرنے اور زبان ی یادداشت کے واسطے کو سب سے زیادہ ناقابل اعتبار واسطہ قرار دینے کے لیے ایٹری چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیتے ہیں :

قوتِ حافظہ کیا حفظ کا ذریعہ واقعی کمزور ترین ذریعہ ہے کیا انسان کا قوتِ حافظہ واقعی اعتبار کے قابل نہیں؟ انسان کی قوتِ بینائی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

قوتِ شنوائی بھر سے کہنے قابل ہے تو کیا وجہ ہے قوتِ حافظہ ہی کیوں اعتماد کا حامل نہیں دیکھنے میں آنکھوں پر یقین ہے سنے میں کانوں پر بھروسہ ہے سونگھنے میں نالوں پر اعتماد ہے چکھنے میں زبانیں سچی ہیں تو ساری بدگمانیاں ایک یادداشت اور قوتِ حافظہ ہی کے حصے میں کیوں آتی ہیں۔ ان بدگمانیوں کی آخر دلیل کیا ہے؟ انسان کی قوتِ حافظہ کے بارے میں کم از کم امت مسلمہ کا تجربہ و مشاہدہ یہ ہے کہ دیگر انسانی قوتوں کے مقابلے میں اس کو برتری حاصل ہے ایک سات آٹھ سال کا بچہ تقریباً سات آٹھ سو صفحات پر مشتمل کتاب قرآن کریم کو اس طرح حفظ کر لیتا ہے کہ زبردستی پیش تک کی غلطی بھی باقی نہیں چھوڑتا اس کا ذہن قرآن کے اوراق اور صفحات کی حدود تک محفوظ کر لیتا ہے وہ آپ کو یہ تک بتلا سکتا ہے کہ کونسی آیت قرآن کریم میں صفحے کے وسط میں ہے، ابتدا میں ہے آخر میں ہے یا آگے پیچھے ہے کس لفظ پر قرآن کریم کا صفحہ ختم ہو جاتا ہے اور کس لفظ پر ورق کھلتا ہے۔ اس کو یہ بھی پتہ ہے کہ قرآن کریم میں کونسا لفظ کس طرح لکھا ہے اس میں کونسا حرف صرف تحریر میں آیا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا۔ یہ تمام تفصیلات ایک سات آٹھ سال کے بچے نے اپنی قوتِ حافظہ ہی سے کام لے کر اپنے ذہن میں محفوظ کی ہیں اس کے باوجود قوتِ حافظہ بدگمانیوں کا نشانہ ہے! آخر کیوں؟ شاید کہا جائے کہ قرآن کے حفظ میں تائیدِ الہی شامل ہے تو ہمارا تو دعویٰ ہے کہ حفظِ حدیث میں بھی تائیدِ الہی شامل ہے اور ہم اس کو سابقہ گفتگو میں دلائل کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں۔

ہر حال ہماری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ انسان کی قوتِ حافظہ کے بارے میں اس قدر

بدگمانی سے کام کیوں لیا جائے کہ جو چیز چند روز کے لیے اس کے پُرد ہو جائے وہ ہر قسم کے اعتماد سے محروم ہو جائے۔ منکرین حدیث شاید یہ خیال کرتے ہیں کہ ابتدائیں حدیث کو باقاعدہ حفظ کرنے کا کوئی اہتمام نہ تھا متفرق طور پر متفرق صحابیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا یا کچھ کہتے ہوئے دیکھا تھا بس کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر وہ اس کو بیان کر دیا کرتے تھے یا کبھی فرصت کے وقت میں بیٹھ کر دل بہلانے کے لیے ایک دوسرے سے اس کا تذکرہ کر لیا کرتے تھے جیسے عام دستور ہے کہ گھر کے پُرانے بڑے بڑے اپنے عہد جوانی کے قصے گرمی بزم کے لیے بیان کیا کرتے ہیں۔ منکرین حدیث سمجھتے ہیں کہ حدیث کی ابتدا الیذا باللہ کچھ اسی طرح پر ہوئی متفق علم کی حیثیت اسے بعد کو حاصل ہوئی۔

حفظ حدیث کا اہتمام | حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کا یہ خیال ایک شیطانی دوسوہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کے ساتھ حدیث کا لانا

تعلق جو گذشتہ اوراق میں ثابت کیا جا چکا ہے اس کے بعد کوئی آحق ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ احادیث نبوی صحابہ کے لیے اس قدر غیر اہم ہو سکتی ہیں کہ گزرے ہوئے عہد کے قصوں سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتداء ہی سے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کو بھی حفظ کرنے کا پورا پورا اہتمام تھا اصحاب صفہ کے نام سے کون واقف نہیں بے چاروں کا اس کے سوا کوئی کام نہ تھا کہ دن رات مسجد نبوی میں پڑے قرآن اور حدیث حفظ کرتے تھے۔ صفہ محض ایک جھوٹا ہی نہ تھا ایک باضابطہ مدرسہ اور ایک باقاعدہ تعلیم گاہ تھی جس میں طلبہ کی تعداد ایک ایک وقت میں اسی اسی تک جا پہنچتی تھی اس مدرسہ میں کن کن باتوں کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی احادیث میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے وہاں قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرائض اسلام اور قوانین شریعت بھی پڑھائے اور سکھائے جاتے تھے گویا قرآن اور سنت دونوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فرود بن ملیک جو مین سے مدینہ منورہ آئے تھے وہ بھی اس مدرسہ کے طالب علم تھے ان کے ذکر میں ابن سعد کے یہ الفاظ ہیں:

جَاءَ مِنَ الْيَمَنِ وَتَعَلَّمَ الْقُرْآنَ
وَفَنَّ الْإِسْلَامَ وَشَرَّ الْعَمَلِ

یمن سے آئے اور قرآن (کے ساتھ ساتھ) اسلام کے
فرائض اور قوانین شریعت کی تعلیم حاصل کی۔

یہ وہی فرہ بن ملیک ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے قبائل مرادزبید اور ندج کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس صفحہ بنوی کے مدرسے میں فرہ جیسے نہ جلنے کتنے شاگرد تھے جن کو تعلیم دینے کا کام ابوہریرہؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ انجام دیتے تھے اور یہ تعلیم حفظ قرآن اور حفظ حدیث کے علاوہ اور کیا تھی؟

یہ حفظ حدیث ہی کا تو اہتمام تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی کے درمیان اس معاہدے کا متقاضی ہوا جس کی رو سے بارگاہ نبوی میں حاضری کے لیے ان دونوں کے درمیان باری مقرر تھی کہ ایک روز حضرت عمر حاضر رہتے اور انصاری بھائی اپنی مشغولیتوں کی دیکھ بھال کرتے اور ایک روز انصاری صحابی حاضری دیتے تاکہ حضرت عمر اپنے کاروبار کی ذمہ داریاں نبھاسکیں۔ اور ہر روز حاضر رہنے والا اپنے غائب رفیق کو وہ سب کچھ من و عن سنا تا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنتا یا آپ کو کرتے دیکھتا بخاری میں خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی ہم دونوں امیہ بن

زید والوں کی بستی میں رہتے تھے جو مدینہ کے عوالی کی

بستوں میں سے ہے ہم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت میں باری باری سے حاضری دیتے تھے

ایک دن وہ حاضر ہوتے ایک دن میں حاضر ہوتا جس

دن حاضری دیتا اس دن کے حالات اور خبریں وحی وغیرہ

کی ان کو سنا تا اور جب وہ حاضر ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

كُنْتُ اَنَا وَجَارِي مِنْ الْأَنْصَارِ فِي بَيْتِي

أُمِّيَّةُ بْنُ زَيْدٍ وَهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِينَةِ

وَكُنَّا نَتَقَاوَبُ النَّزْلَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْزِلُ يَوْمًا وَانْزِلَ يَوْمًا

فَإِنَّا نَزَلْتُ حِجَّةً يَجْبُرُ ذَلِكَ الْيَوْمَ مِنَ

الْوَسْطَى وَغَيْرِهِ وَإِنَّا نَزَلْتُ تَعْلٌ مِثْلَ ذَلِكَ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ

ہم تم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بیان کرتے

ہیں سب کچھ آپ ہی سے ہم نے نہیں سنا ہے بلکہ ہم میں بعضوں

نے بعض سے بھی سنا ہے۔

مَا أَكَلْنَا مَعَهُ تَكْرِمَةً سَمِعْنَاهُ مِنْ رَسُولِ

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَكِنْ كَانَ يَحْدِثُ

بَعْضُنَا بَعْضًا (متدرک للحاکم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ حفظ حدیث کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

جب مجلس سے اٹھ جاتے تو ہم صحابہ آپس میں مل کر بیٹھ جاتے اور جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہوتا اسے بار بار دہراتے بعض مرتبہ صحابہ کا یہ اجتماع ساٹھ ساٹھ صحابہ پر مشتمل ہوتا۔
مجمع الزوائد میں حضرت انس ہی سے یہ روایت موجود ہے۔ فرماتے ہیں :

<p>ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھتے تھے تو اکثر (درس میں) ساٹھ ساٹھ آدمی ہوتے اور جب آپ تشریف لے جاتے تو ہم احادیث کو بار بار دہراتے اور جب ہم اُٹھتے تو ہم کو حدیثیں ایسی یاد ہوتیں جیسے انہیں ہمارے دلوں میں بودیا گیا ہو۔</p>	<p>كُنَّا تَعُوذُ اَمَامَ النَّبِيِّ فَعَسَىٰ اَنْ يَكُوْنَ سِتِيْنَ رَجُلًا يَتَعَدُّ ثَمَّ الْحَدِيثَ ثُمَّ يَدْخُلُ لِحَاجَتِهِ فَنُزِجُهُ بَيْنَنَا هَذَا ثُمَّ هَذَا فَنَقُومُ كَاَنَّمَا زَرَعَ فِي قُلُوْبِنَا</p> <p>(مجمع الزوائد جلد ۱)</p>
--	---

یہ سب کچھ حفظ حدیث ہی کا نوا ہتمام تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو کے بارے میں یہ عام عادت جو یہ ان کی جاتی ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلَاثًا (جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات دہراتے تو اس کو تین دفعہ دہراتے۔ بخاری) تو غالباً اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا کہ سننے والے کو ذہن نشین ہو جائے۔ آثار صحابہ میں متعدد اقوال اس بات کے شاہد ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین قرآن ہی کی طرح حدیث کو بھی حفظ کرنا ضروری سمجھتے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے

<p>حدیث کو بار بار دہراتے رہو اگر لیانہ کرو گے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا۔</p>	<p>اَكْثَرُ وَاِذَا كُنَّا الْحَدِيثَ فَاِنْ كُنَّا لَمْ تَقْعَلُوْا يَدْرُسُ عِلْمُكُمْ (جامع بیان العلم)</p>
---	--

اسی طرح مغربہ علوم الحدیث میں حاکم نے حضرت عبداللہ ابن مسعود کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ فرمایا کرتے :

<p>بار بار حایت کو دہراتے ہو کیونکہ اس کے زندہ رکھنے کی یہی شکل ہے۔</p>	<p>تَذَاكُرُوا الْحَدِيثَ فَاِنَّ حَيَاتَهُ هَذَا كَرَّتُهُ</p>
---	---

حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ہی نہیں اکثر صحابہ سے یہ منقول ہے کہ وہ ان لوگوں سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ان سے سننے آیا کرتے تھے یہ کہا کرتے تھے۔

اِنَّ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُحَدِّثُنَا نَحْفَظُ فَاَحْفَظُوا كَمَا كُنَّا نَحْفَظُ (جامع بیان العلم)

تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے حدیثیں بیان کرتے تھے اور ہم ان کو زبانی یاد کر لیتے تھے پس تم لوگ بھی اسی طرح حفظ کیا کرو جس طرح ہم کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ فرمایا کرتے تھے کہ میں جتنا عرصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا مجھے احادیث حفظ کرنے سے زیادہ کوئی کام پسند نہ تھا۔ آپ نے حفظ حدیث کی خاطر رات کے اوقات کو تقسیم کیا ہوا تھا خود بتلایا کرتے کہ میں رات کے تین حصے کر لیتا ایک میں سو جاتا ایک میں نماز پڑھتا اور ایک میں احادیث کو یاد کرتا۔

حقیقت یہی ہے کہ صحابہ کرام قرآن ہی کی طرح حدیث کو بھی حفظ کرتے تھے۔ اس زمانے میں جس طرح قرآن کریم کو حفظ کرنے کا رواج تھا اسی طرح حدیث کو بھی حفظ کرنے کا رواج تھا۔ اگر حفظ کرنے کی بنیاد پر قرآن کریم قابل اعتماد ہے تو یقیناً حدیث بھی اسی بنیاد پر قابل اعتماد ہے۔ قرآن کریم بھی انہی صحابہ نے حفظ کیا اور ہم تک پہنچایا اور ہم سب کے لیے قابل اعتماد ٹھہرا احادیث کے حفظ کرنے والے بھی یہی صحابہ تھے انہوں نے ہی احادیث کو باقاعدہ حفظ کیا اور ہم تک پہنچایا سمجھ میں نہیں آتا پھر یہ احادیث ناقابل اعتماد کیسے بن گئیں۔ قرآن کریم کو جو تقریباً سات لاکھ سو صفحات پر مشتمل ہے محفوظ ماننے کے لیے اگر قوتِ حافظہ پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے تو ذخیرہ حدیث کو محفوظ ماننے کے لیے اس قوت پر بھروسہ کیوں نہیں کیا جاسکتا جبکہ احادیث کا مجموعہ اگر مرکب و نکال دی برائیں قرآن کریم کی ضخامت سے کم ہی ضخیم ہوگا۔ احادیث کے بارے میں لاکھوں کی تعداد کا ذکر متابعات و شواہد اور اسناد و طرق کے اختلاف کی بنا پر ہوتا ہے ورنہ اس سے قطع نظر اگر تمام قسم کی احادیث جمع کی جائیں تو پچاس ہزار سے ان کی تعداد آگے نہیں بڑھتی۔ یہ بھی اس وقت ہے جبکہ صحیح حسن غریب ہر قسم کی احادیث کو شامل کیا جائے اور اگر صرف صحیح احادیث پر اکتفا کیا جائے تو تمام احادیث دس ہزار سے زیادہ نہیں بنتیں۔ بہر حال پچاس ہزار بھی ہوں تب بھی ان کا مجموعہ قرآن کریم سے کم ہی ضخامت پر مشتمل ہوگا اگر قرآن کریم حفظ ہو سکتا

ہے اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک سات آٹھ سال کا بچہ الحمد سے لے کر انسان تک فر فرماتا چلا جاتا ہے تو احادیث کیوں حفظ نہیں ہو سکتیں :-

تقاضائے محبت | غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتداء ہی سے قرآن کی طرح حدیث کے حفظ کرنے کا بھی اہتمام تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ زبانی رٹ لیتے آپ کا ہر قول ہر فعل اور ہر عمل صحابہ کرام کے دلوں پر نقش ہو جاتا تھا اور کیسے نہ ہوتا صحابہ کرام سنی نبوی کے پروانے تھے۔ انسان جس ہستی سے محبت کرتا ہے اس کی ایک ایک ادا اس کی آنکھوں میں روح جاتی ہے اس کی ایک ایک بات اس کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ محبوب کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو وہ ہر وقت کا وظیفہ بنا لیتا ہے ہر ایک کے سامنے فخر سے کتابچہ پیرے محبوب نے یہ کہا اور میرے پیارے نے یہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس صحابہ کرام کے لیے محبوب سے کہیں بڑھ کر تھی وہ اہتمام نہ بھی کرتے تب بھی ارشادات نبوی کا خود بخود ان کو ازبر ہو جانا فطری بات تھی یہ تشبیہ و استعارے کی بات نہیں حقیقت کا اظہار ہے کہ صحابہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانے تھے وہ اپنے ماں باپ بھائی بہن بیوی بچوں بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے وہ اپنی جان تو کیا اپنا سب کچھ آپ پر ہمہ وقت قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے ایسے محبت کرنے والوں کے بارے میں یہ خیال کرنا حماقت ہی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو محفوظ نہ رکھ سکے ہونگے۔ صحابہ کرام تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کے دیوانے تھے وہ ذریعہ تک بھی یاد رکھتے تھے کہ کونسی بات آپ نے کس طرح کس ہیئت اور کس کیفیت کے ساتھ ارشاد فرمائی تھی۔ اگر کہیں کوئی بات ارشاد فرماتے ہوئے آپ مسکرا پڑے ہیں تو صحابہ نے اس مسکراہٹ کو اس مخصوص ارشاد کا ایک لازمی حصہ بنا لیا جب کبھی وہ حدیث کسی کو سنائی اسی طرح مسکرا کر سنائی جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے تھے اور آئندہ آنے والے محدثین نے ایسی حدیث کو مسلسل بالضمک کا ایک مخصوص نام دے دیا۔ جو لوگ اصول حدیث کے علم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسی تمام احادیث کہ جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خاص خاص کیفیات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے اور ہمیشہ انہی کیفیات کے ساتھ ان کو نقل کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے سلسلیات کہلاتی ہیں۔ انہی سلسلیات میں سے ایک حدیث مسلسل بضرب السنخ (ران پر ہاتھ مارنے کی کیفیت والی) ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حدیث ارشاد فرماتے وقت اپنی ران مبارک پر ہاتھ مارا تھا اداؤں کو محفوظ رکھنے والوں نے یہ ادا بھی محفوظ کر لی۔

تباہی عشق و سرمستی میں ہر شہسوار ایسے لوگوں کے بارے میں یہ خیال کرنا کس قدر نادانی کی بات ہے کہ انہوں نے اپنے محبوب کے اقوال و افعال محفوظ نہ رکھے ہوں گے وہاں تو عالم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ارشادات کے بارے میں سننے والے کو یہ بھی یاد ہے کہ اس نے سب سے پہلی بات کونسی سنی ہے اور پھر اس نے اپنی یہ عادت بنالی ہے کہ جب کسی کو احادیث نبوی سننے کا موقع ملا ہے تو سب سے پہلے اسی حدیث کو بیان کیا ہے۔

اغراض انصافی کے متوالے عشق نبوی کے سوختہ سامانوں کا حال کیا جانیں اگر کہیں بطور عتاب بھی کوئی کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی گیا تو صحابہ نے اسے بھی نرزجاں بنایا ہے۔ ایک بار حضرت ابوذر کے متعجبانہ دوبارہ و سہ بارہ کسی سوال کے جواب میں کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہ تبیین یہ فرمادیا کہ **وَإِنَّ مَرْغَمَهُ أَفْئِدَتِي ذَرَّتْ** یعنی یہ بات میں کہہ رہا ہوں کہ اسی طرح ہے خواہ ابوذر کی ناک خاک میں گر گئی جلتے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب کبھی اس حدیث کو روایت کرے تو تنبیہ کا یہ فقرہ بھی خوب مزے لے لے کر نقل کرتے انصاف کی بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ایسے لوگوں کو نذر بلفظ یاد رہ جاتا محال اور غلات فطرت نہیں جیسا کہ منکرین حدیث کہتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو احادیث ناباد نہ رہنا محال اور غلات فطرت ہے۔

یہاں جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے گھوڑوں تک کے شجرہ نسب یاد رکھتے ہوں جانوروں میں گھوڑا ان کو سب سے زیادہ محبوب تھا اور اپنی ہر محبوب چیز کی معمولی معمولی تفصیلات تک یاد رکھنے کے وہ عادی تھے ان کے بارے میں یہ بدگمانی رکھنا کہ انہوں نے اپنے

دلوں جہاں سے زیادہ محبوب آتا کے ارشادات یاد رکھنے میں تساہل یا کسی غفلت سے کام لیا ہوگا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں میں مبعوث ہوئے ان کا عالم یہ تھا کہ جو شاعر انہیں پسند آجاتا اس کے قصائد وہ انہیں کر لیتے ہزار ہزار اشعار پر مشتمل قصائد وہ بلا لکان سنائے چلے جاتے بعثت نبوی کے بعد ان لوگوں کی تمام تر پسند کا محور اور ہمہ جہت محبت کا مرکز صرف اور صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ یہ لوگ عشق نبوی میں خود کو فنا کر چکے تھے انہوں نے اپنی ذات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اس حد تک گم کر دیا تھا کہ اپنا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا کھانا پینا ہنسنا بلونا سب کچھ انہی کے رنگ میں رنگ لیا تھا وہ ہمہ تن محبوب کے مشاہدے میں غرق تھے وہ سوتے کس طرح ہیں وہ جاگنے پر کیا غل کرتے ہیں وہ کھانا کھاتے وقت کس ہیئت پر بیٹھتے ہیں وہ پانی کس طرح پیتے ہیں وہ اپنے اللہ کو کس طرح پکارتے ہیں وہ اللہ کے بندوں سے کس طرح مخاطب ہوتے ہیں مائتوں کو ان کا کیا عالم ہوتا ہے دن ان کے کیسے گزرتے ہیں۔ صحابہ کو تلاش تھی تو انہی باتوں کی انہیں فکر تھی تو انہی عادات و اطوار پر اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو ڈھال لینے کی۔ صحابہ کرام اس شعر کی مجسم تصویر بنے ہوئے تھے۔

من تو شدم تو من شدم من تن شدم تو جاں شدم ۔۔۔ نا کس نگرید بعد از من دیگر من تو دیگر من
ایسے لوگ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی حفاظت کو ہرز جاں بنائے ہوئے تھے ان کے بارے میں کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ انہوں نے احادیث نبوی کی حفاظت میں کوئی اہتمام نہ کیا ہوگا۔ حب نبوی کا جو ثبوت صحابہ اپنی ایک ایک حرکت سے لوح جہاں پر نقش کر رہے تھے اس کی موجودگی میں کیونکر مان لیا جائے کہ انہوں نے اپنے محبوب کی باتوں کو بھلا دیا ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد صحابہ کے اس واہانہ تعلق میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی تھی عالم یہ تھا کہ وہ اپنے محبوب کا کوئی نسل کوئی قول بیان کرنے لگتے تو رو رو رہے پڑتے، کانپتے جاتے اور حدیث نبوی نقل کرتے جاتے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کے بارے میں دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حدیث بیان کرنے کا موقع آتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک زبان پر آتے ہی بدن پر کپکپی طاری

ہو جاتی -

اِرْتَعَدُوا وَاِرْتَعَدَتْ شَيَابُهُ تَنْفَعُ اَوْ دَاخِبًا | کا پھنسنے لگتے انکے کپڑوں میں تقر تھری پیدا ہو جاتی گردن کی
اَعْرَضَتْ عَيْنَاهُ (مندرک لٹاکم) | رگیں پھیل جائیں انکھیں آنسوؤں سے بھر جائیں -

اندازہ کیجئے جس کا عشق نبوی میں یہ حال ہو وہ اپنے محبوب کی باتیں کرتے میں کس قدر احتیاط سے
کام لیتا ہو گا ہم یہ یقین کرتے ہیں حق بجانب ہیں کہ ایسا شخص ایک ایک حرف کی حفاظت کرتا ہو گا
اس میدان میں حضرت عبداللہ ابن مسعود اکیلے نہیں ہیں اکثر صحابہ کا یہی حال تھا کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے وقت ان پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی -
حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارے میں ہے کہ کبھی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے تو اکثر اوقات مُنہ
سے اَوْصَانِي جُیّی اَبُو الْقَاسِمِ اَوْصَانِي خَلِیْلِی صلی اللہ علیہ وسلم (مجھے میرے محبوب نے وصیت
کی مجھے میرے دوست صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی) کے الفاظ ہی نکل پاتے اور چیخ مار کر بیہوش ہو جاتے
اسی قسم کے واقعات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذکر میں بھی ملتے ہیں -

مقصود صحابہ کرام کی محبت کے مظاہر بیان کرنا نہیں ہے بلکہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ محبت
اور عشاق کو اپنے محبوب کے ملفوظات اس کے حالات اور اس کی کیفیات کا یاد نہ رہنا محال اور
خلاف فطرت ہے محبت اور پسند کا تعلق ہو تو بغیر کوشش کے دفتر کے دفتر یاد ہو جاتے ہیں -
دُور کیوں جائیے بالکل قریب کی مثال لے لیجئے آج کل کے آزاد طبیعت اور عاشق مزاج نوجوانوں
کا ذرا جائزہ لیجئے بے شمار عشقیہ اشعار ان کو یاد ہوتے ہیں ناولوں اور کہانیوں کے صفحے کے
صفحے آپ ان سے فر فر سن لیجئے ہزلیات ایک بار ہی سننے پر ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتی ہیں
مگر یہی نوجوان فلسفہ و حساب وغیرہ کا ایک صفحہ بھی باوجود کوشش کے سارے دن میں یاد نہیں
کر پاتے - کبھی آپ نے غور کیا آخر یہ فرق کیوں؟ صرف اس لیے کہ پہلی قسم کی چیزوں میں ان کے
شوق اور ان کی رغبت کو دخل ہے جبکہ دوسری قسم کی چیزیں اس سے محروم ہیں بالکل اسی
طرح حفظ حدیث میں چونکہ صحابہ کے شوق و رغبت کو دخل تھا اور حب نبوی کا جذبہ کار فرما تھا
اس لیے فطری طور پر ان کے سینے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک لمحے کے
امین بن گئے تھے ۛ

تقاضائے عظمت جس طرح محبت اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ محبوب کی زبان سے نکلا ہو، ایک ایک لفظ و زبان سے ہوا، یہاں محمدؐ کی یہ

ان دِل میں اُتر کر رہ جائے اسی طرح ایک اور جذبہ ہے جو یعنی اسی قسم کے طرزِ عمل کا طالب ہے اور وہ ہے عظمت کا جذبہ جو جتنی عظمت کی حامل ہوتی ہے وہ اپنے ملنے والوں کیلئے فطری طور پر تابعِ اتباع و تقلید بن جاتی ہے۔ اس کے ماننے والوں کے دل میں قدرتی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو وہ ہمہ تن گوش ہو کر سنیں اور دل کی تھوڑی سی محفوظ کر لیں۔ ملک کا صدر یا وزیر اعظم اگر کسی سے کوئی بات کر لیتا ہے تو اس کی کمی ہوئی بات کا ایک ایک لفظ دل میں اُتر جاتا ہے۔ ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر یا کسی عام پبلک جلسے میں کی ہوئی کسی بڑے آدمی کی تقریروں کے اقتباسات لوگ انہی کے انداز میں دوہراتے پھرتے ہیں آج فلاں صاحب نے یہ فرمایا اور یوں فرمایا صدر یا وزیر اعظم تو پھر ملک کی بہت بڑی ہستی ہیں۔ کسی علاقے کا تھانیدار یا کوئی اومحولی حاکم ہی کسی سے دوچار باتیں تو جوہ سے کر لیتا ہے تو وہ ان باتوں کو مزے مزے لیکر پورے علاقے میں گانا پھرتا ہے غرض عظمت کی حامل ہستی بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور اس کی تقلید کو باعثِ فخر سمجھا جانے لگتا ہے۔ اب آپ غور کیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ با عظمت کون ہو سکتا ہے خصوصاً صحابہ کے لیے۔ صحابہ کے دلوں میں آپ کی عظمت کا عالم یہ تھا کہ جب آپ کی مجلس میں ہوتے تو اس طرح سر جھکائے اور ساکت وضامت بیٹھے کہ یوں لگتا جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں بعض صحابہ خود اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

كَانَ عَلَيَّ مَرَدُّ سَائِلِيكَ يَوْمَئِذٍ كَمَا كَانَ عَلَيَّ مَرَدُّ السَّرَّاجَةِ عَلَى الْخَبْزِ
ہلے تو اُڑ جاؤ گے مجھے کہ اس قدر بے حس و حرکت کہ پرندے بھی جو اوّل تو آدمی کے سایے سے ہی بھاگتے ہیں اور اگر کوئی شخص وحشت محسوس کر لیں تو پھر ٹھہر ہی نہیں سکتے وہ بھی اس وقت صحابہ سے متوحش نہیں ہوتے تھے کیونکہ شاید نبوی کی محویت ان کو بالکل عابد بنا دیتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صحابہ کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ایسی روایات موجود ہیں کہ کسی صحابی سے بعد کے لوگوں میں سے کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علیہ مبارک کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا یہ ہمت ہی کے بھٹی کہ ہرۃً مبارک کو نظر بھر کر

دیکھ سکے حکیم بیان ہو تو کیونکر ۔

عظمت کی یہ کیفیت تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے لعاب نکلتا ہے تو صحابہ ہاتھوں میں لے کر چہروں پر مل لیتے ہیں کھلی کرتے ہیں تو لوگ دوڑ پڑتے ہیں کہ کوئی چھینٹ ہو جو ہمارے چہروں پر پڑ جائے اور برکتوں سے مالا مال کر جائے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اور کفار قریش کی جانب سے قاصد بن کر آئے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صحابہ کی تعظیم کا یہ عالم دیکھتے ہیں تو جا کر کفار قریش سے کہتے ہیں خدا کی قسم میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں مگر عظمت کا وہ عالم کہیں نہیں دیکھا جس کا مظاہرہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں اصحاب محمد کی جانب سے دیکھنے میں آیا تم ایسے لوگوں کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہ ہو گے۔ بخاری کے الفاظ میں عروہ بن مسعود ثقفی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

أَيُّ قَوْمٍ وَاللَّهِ لَقَدْ وَفَدْتُ عَلَى الْمُلُوكِ وَفَدْتُ عَلَى قِيصَرٍ وَكِرِي وَالنَّجَاشِيِّ وَاللَّهُ هَارِ آيَتُ مَلِكًا قَطُّ يَعْظُمُهُ أَصْحَابُهُ مَا يُعْظَمُ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ وَاللَّهِ إِنِّي مَنَنْتُكُمْ نَخَامَةً الِارْتِعَافِ كَفَّ رَجُلٌ مِنْهُمْ فَذَلِكَ بِهَا جَمَّةٌ وَجِلْدُهُ وَإِذَا أَمَرَهُمْ ابْتَدَوْا أَمْرَهُ وَإِذَا تَوَضَّأُوا كَادُوا يَقْتُلُونَ عَلَى وَضْعَةٍ وَإِذَا كَلَّمَهُ خَفَضُوا أَصْوَالَهُمْ عِنْدَهُ وَمَا يَحْدِقُونَ إِلَيْهِ النَّظَرَ عِظَامُهُ (بخاری)

لوگو خدا کی قسم بادشاہوں کے دربار میں بھی مجھے بائیاہی کا موقع ملا ہے قیصر کسریٰ اور نجاشی (حبشہ) کے ساتھ بھی حاضر ہوا ہوں خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ لوگ اس کی انہی عزت کرتے ہوں جتنی محمد کے ساتھی محمد کی کرتے ہیں خدا کی قسم جب وہ بلغم پھونکتے ہیں تو وہ ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ پر ہنسی کرتا ہے پھر وہ اپنے پھرے اور اپنے بدن پر اسے مل لیتا ہے اور وہ جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں تو اسکی تعمیل میں وہ سب جھپٹ پڑتے ہیں اور جب (محمد) وضو کرتے ہیں تو اس وقت انکے وضو کے پانی پر وہ آپس میں الجھ پڑتے ہیں اور جب وہ (محمد) بات کرتے ہیں تو انکی آوازیں پست ہو جاتی ہیں وہ لوگ (محمد) کو انکی عظمت کی وجہ سے نگاہ بھر کر دیکھ نہیں سکتے۔

ایک طرف صحابہ کرام کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تکریم و عزت اور تعظیم و عظمت کے یہ مظاہر ہیں اور دوسری طرف منکرین حدیث کا یہ مضحکہ خیز دعویٰ کہ احادیث کے بارے میں صحابہ کی یادداشت کا کیا اعتبار! حیرت ہوتی ہے کہ انکی عقلوں کو کیا ہوا۔ کہیں یہ ختم اللہ علیٰ قلوبہم وعلیٰ سمعہم وعلیٰ ابصارہم غشاوۃ (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں اور انکے کانوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں) کے مصداق بن کر تو نہیں رہ گئے۔ جن لوگوں کا تعلق بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو، آخر کچھ تو سوچنا چاہیے ان لوگوں نے حیات نبوی کے ایک ایک لمحے کی نگہداشت میں کس اہتمام کس انہماک اور کس توجہ سے کام لیا ہوگا۔ جن کے نزدیک ایک موئے مبارک جو بظاہر بے جان چیز ہے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہو ان کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حیاتِ جاوداں کے حامل اقوال و افعال کی کیا قیمت ہوگی۔ خادم رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ کو آپ کا ایک موئے مبارک ہاتھ آگیا تھا وہ اس موئے مبارک کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ انہوں نے تو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ مبارک بھی محفوظ کیا ہوا تھا اور اس کو خوشبو کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ حضرت امیر معاویہ کے پاس بھی چند موئے مبارک محفوظ تھے جن کے بارے میں انہوں نے اپنی وفات کے وقت وصیت کی کہ میرے مزارِ ارناک میں بھر دیے جائیں ۷۲

غور کا مقام ہے جس ہستی کو عظمت کا یہ مقام عالی حاصل ہو اس کی ایک ایک بات ایک ایک اداسی اپنے ماننے والوں کے دل و دماغ کو قدرتی طور پر کس قدر متاثر کرتی ہوگی؟ ان کی قوتِ حافظہ میں اس ہستی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نقش فی الحجر ہو کر نہ رہ جاتا ہوگا؟ اس کی ذات سے متعلق ہر ہر تفصیل ان لوگوں کی ارواح کے لیے غذا کا کام نہ دیتی ہوگی؟ غرض محبت اور عظمت یہ دونوں جذبے اس کے متقاضی ہیں کہ جس ہستی کی طرف بھی ان کی نسبت ہو وہ ہستی خود بخود قطری طور پر ہمہ جہتی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور اس کا ہر قول ،

ہر فعل اور ہر عمل اس قدر اہم ہو جاتا ہے کہ دیکھنے اور سُنے والوں کے ذہنوں میں جاگزیں ہو کر رہ جاتا ہے اس طرح کہ عمر بھر یادداشت کے اوراق پر اس کے نقوش تازہ ہی محسوس ہوتے ہیں۔ لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صحابہ کرام کی محبت و عظمت کے ان مظاہر کی موجودگی میں جو مشتبہ نمونہ از خروارے کے طور پر ابھی آپ کی نظروں سے گزرے ہیں اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ اللہ کے رسول کا ہر قول ہر فعل اور ہر عمل صحابہ کرام کے ذہنوں میں واقعی اس طرح جاگزیں تھا کہ ہمیشہ اس کے نقوش تازہ ہی نظر آتے تھے۔

دراصل محبت اور عظمت کا تعلق ہی ایسا ہے کہ اس صحابہ کی غیر معمولی قوتِ حافظہ کے تقاضوں کو یاد رکھنے کے لیے کسی اضافی کوشش

کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے متوالے ضعیف الحافظ بھی ہوں تو قوی الحافظ ہو جاتے ہیں اور صحابہ کو تو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اس نعمت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا حضرت جسد اللہ ابن عباس کے متعلق مشہور ہے کہ طویل طویل قصائد صرف ایک بار سن لیتے سے یاد ہو جاتے تھے ایک مرتبہ عرب کا مشہور شاعر عمر بن ابی ربیعہ ان کے پاس آیا اور اپنا ایک طویل قصیدہ جو ستر اشعار پر مشتمل تھا سنا گیا اس کے جانے کے بعد حاضرین مجلس کے درمیان اس کے ایک شعر کے بارے میں گفتگو چلی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ شاعر نے اس مصرعے کو اس طرح پڑھا تھا مخاطب نے تعجب سے پوچھا کہ کیا پہلی دفعہ میں ہی آپ کو پورا مصرعہ صحیح یاد رہ گیا؟ آپ نے جواب دیا کیوں نہیں؟ کہو تو پورا قصیدہ سنا دوں چنانچہ ستر کے ستر اشعار من وعن اسی ترتیب سے سُنا دیے جس ترتیب سے عمر بن ربیعہ سُنا کر گیا تھا۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں ہے کہ ایک ایک دفعہ میں کسی شاعر کے قصیدے کے ساتھ ساتھ ستر ستر بلکہ سو سو اشعار برجستہ سنا تی چلی جاتی تھیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جن سے بہت زیادہ احادیث مروی ہیں بے پناہ حافظے کے مالک تھے۔ امام بخاریؒ نے کتاب الکئی میں ان کے حافظے سے متعلق ایک عجیب و اقہ نقل کیا ہے ایک مرتبہ مروان بن حکم حاکم دمشق نے حضرت ابو ہریرہ کے حافظے کا امتحان کرنا چاہا چنانچہ اس نے آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ ان کے آنے سے پہلے اپنے کاتب ابو الزعزہ

کو ایک پردے کے پیچھے چھپا کر بٹھا دیا اور حکم دیا کہ میرے پوچھنے پر جو حدیثیں ابوہریرہ بیان کرتے ہیں ان کو تم لکھتے جانا غرض حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے پر مردان مختلف باتیں چھیڑ چھیڑ کر آپ سے احادیث پوچھتا جاتا اور آپ بیان کرتے جاتے ادھر پردے کے پیچھے بیٹھا ابوالزغہ ان احادیث کو لفظ بہ لفظ نقل کرتا جاتا۔ اس طرح خاصی تعداد احادیث کی قلم بند کر لی گئی اور حضرت ابوہریرہ کو پستہ بھی نہ لگا۔ سال بھر کے بعد مروان نے حضرت ابوہریرہ کو دوبارہ طلب کیا اور ابوالزغہ کو حسب سابق پھر پردے کے پیچھے بٹھا دیا۔ سابلہ لکھی ہوئی احادیث کا مجموعہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے مروان نے ابوالزغہ سے کہا میں وہی حدیثیں دوبارہ حضرت ابوہریرہ سے پوچھتا جاؤں گا تم اس مجموعہ سے مقابلہ کرتے جانا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق اس امتحان کی پوری کارروائی عمل میں لائی گئی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ سنئے۔ خود ابوالزغہ کا بیان ہے :

(مروان) حضرت ابوہریرہ سے پوچھتا جاتا اور میں کتاب میں دیکھتا جاتا پس (ابوہریرہ) نے نہ کسی لفظ کا اتفاق کیا اور نہ کسی کی ۔

فَجَعَلَ يَسْأَلُهُ وَأَنَا أَنْظُرُ فِيهِ
الْكِتَابَ فَمَا سَأَدَ وَلَا نَقَصَ
(کتاب الکئی بخاری ص ۳۳)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حافظے کی قوت کا یہ عالم فی الحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ تھا یہ وہی ابوہریرہ ہیں جن کو باوجود کوشش کے احادیث یاد نہ ہوتی تھیں مگر ایک بار بڑی حسرت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی اس کمزوری کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا اپنی چادر پھیلاؤ حضرت ابوہریرہ نے حکم کی تعمیل کی آپ نے اپنے خالی ہاتھوں کو لپ بنا کر ان کی چادر میں ڈال دیا پھر فرمایا کہ چادر سمیٹ لو حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں :

چنانچہ میں نے (چادر کو) سمیٹ لیا پھر اس کے بعد میں کچھ نہیں بولا۔

فَضَمَمْتُهَا فَمَا نَسِيتُ شَيْئًا۔
(بخاری۔ حفظ العلم)

اور آثار اس پر شاہد ہیں کہ اس واقعہ کے بعد واقعی حضرت ابو ہریرہؓ کا حافظہ اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ کسی بات کو ایک بار سُن لینے کے بعد پھر کبھی نہ بھولتے تھے۔ حفظ حدیث کے سلسلے میں تو دراصل قوتِ حافظہ کے جتنے حیرت انگیز مظاہر تاریخ کے اوراق میں ثبت ہیں وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ معجزے ہیں وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کی تاثیر ہی کا زندہ بھرت ہیں۔ حدیث کو یاد کرنے والوں کے لیے آپؐ کی دُعا کے الفاظ ہیں :

ترجمہ : اے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اسی تک اسے پہنچا دیا۔

نَصَّرَ اللَّهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَرَعَاهَا
ثُمَّ آذَاهَا إِلَيَّ مِنْ لَدُنِّي سَمِعَهَا (صحاح)

کبھی آپؐ فرماتے

اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جس نے میری حدیث سنی اور یاد کر لی۔

رَحِمَ اللَّهُ أَمْرًا سَمِعَ مِنِّي حَدِيثًا
فَحَفِظَهُ۔ (ابوداؤد فضل نشر العلم)

حفظ حدیث کے سلسلے میں صحابہ کی قوتِ حافظہ کے حیرت انگیز مظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انہی دُعاؤں کا طفیل سمجھے یا یوں کہیے کہ یہ تمام مظاہر قرآنی وعدے اِنَّا لَنَحْفِظُوكَ کی عملی تفسیر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حفاظتِ حدیث کے لیے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کے جو ظاہری اسباب پیدا فرمائے تھے ان میں سے ایک یہ حافظہ کی غیر معمولی قوت تھی جو صحابہ اور بعد کے آنے والے راویانِ حدیث کو از غیب عطا کر دی گئی تھی :

قوتِ حافظہ اور عرب | اگرچہ محبت کا جذبہ، عظمت کا تعلق، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کی تاثیر اور تائیدِ الہیہ ان میں سے

ہر ایک بجائے خود حفظِ حدیث کے سلسلے میں ایک قوی ضمانت ہے تاہم ان پر اس تائیدی حقیقت کا اور اضافہ کر دیجئے کہ عرب کے باشندے ندرتی طور پر قوی الحافظ واقع ہوئے تھے، ان کے شعراء خطباء اور رواۃ بے پناہ قوتِ حافظہ کے مالک ہوتے

تھے ؟ ان کو ہزاروں اشعار سینکڑوں ضرب الاشمال اور بے شمار واقعات ازبر ہوتے تھے۔ مختلف لوگوں اور مختلف قبیلوں کے شجرہ ہائے نسب کو محفوظ رکھنا ان کا معمول تھا جانوروں تک کے نسب نامے وہ یاد رکھتے تھے۔ قصہ گوئی کو ان کے یہاں باتا عدہ نن کا درجہ حاصل تھا ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس قدر سریع الحفظ تھے کہ صرف ایک بار سن کر لمبے لمبے قصائد یاد کر لیتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر کے الفاظ ہیں :

<p>ان میں سے بعض لوگ صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے۔</p>	<p>كَانَ أَحَدُهُمْ يَحْفَظُ اشْعَارَ بَعْضٍ فِي سَمْعَةٍ وَاحِدَةٍ (جامع بیان العلم)۔</p>
---	--

عرب باشندوں میں قوتِ حافظہ اس قدر نمایاں تھی کہ آج تاہیجی طور پر یہ بات مسلم سمجھی جاتی ہے کہ إِنَّ الْعَرَبَ قَدْ خُصَّتْ بِالْحِفْظِ (عرب حافظہ کے معاملے میں خصوصیت کے حامل تھے) حافظ ابن عبد البر بھی عربوں کی اس تاریخی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

<p>عرب کا عام طریقہ تھا کہ حفظ کے وہ عادی ہو گئے تھے اس بات میں انہیں ایک خاص خصوصیت حاصل تھی۔</p>	<p>مَذْهَبُ الْعَرَبِ أَنَّهُمْ كَانُوا مَطْبُونِينَ عَلَى الْحِفْظِ فَخُصَّوْصِينَ بِذَلِكَ (جامع بیان العلم)</p>
--	--

عربوں کو اپنی اس خصوصیت پر فخر بھی تھا انہیں اپنی قوتِ حافظہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ لکھ کر یاد کرنے تک کو وہ ایک نقص خیال کرتے تھے۔ کتابی علم کو وہ علم ہی نہ سمجھتے تھے ان کے یہاں یہ فقرہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا کہ حُرُوفٌ فِي تَأْمُرٍ كَيْ خَيْرٌ مِنْ عَشْرَةٍ فِي كُتُبٍ (نیرے ذہن میں ایک حرف کا ہونا کتاب کی دس باتوں سے بہتر ہے) ان کے درمیان ایسے اشعار بہت عام تھے جن میں کتابی علم کا مذاق اڑایا جاتا کتابت اور تحریر کو ایک عیب کے طور پر پیش کیا جاتا اور اس کے مقابلے میں قوتِ حافظہ کی برتری ثابت کی جاتی۔ مثلاً کسی شاعر کا شعر ہے :

لَيْسَ بِعِلْمٍ مَا حَوَى الْقَطْرُ مَا الْعِلْمُ الْأَمَّا حَوَى الْمَدْرُ

یعنی علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے بلکہ علم تو صرف وہی ہے جو سینے میں محفوظ ہے۔ ایک اور شاعر کاغذوں کو علم کا بدترین مدفن خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ علم کو کاغذ کے سپرد کر دینا ایسا ہے جیسے اسے ضائع کر دیا وہ کتا ہے :

اَسْتَوْدِعُ الْعِلْمَ تَرْسًا فَضَيَّعَهُ وَيَلْسُ مُسْتَوْدِعُ الْعِلْمِ قَرَاهِيْسُ

یعنی جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کر دیا اس نے گویا اسے ضائع کر دیا اور کاغذ تو علم کے بدترین مدفن ہیں۔ غرض عرب تحریر و کتابت کو پسند نہیں کرتے تھے اور جو شخص قوت حافظہ پر اعتماد کرنے کے بجائے لکھے ہوئے پر بھروسہ کرتا تھا اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ ذوالرمدہ آخری مختصری شاعر مدتوں اس بات کو چھپاتا رہا کہ وہ فن کتابت سے آشنا ہے اسے ڈرتھا کہ کہیں اسے لوگ ناپسند نہ کرنے لگیں۔

عربوں کا تحریر و کتابت کو ناپسند کرنا اور اس پر بھروسہ کرنا ظاہر ہے صرف اس بنا پر تھا کہ انہیں اپنے قوت حافظہ پر ناز تھا وہ زیادہ سے زیادہ اس سے کام لیتے اور جتنا زیادہ وہ اس سے کام لیتے جاتے تھے اتنی ہی زیادہ اس میں بالیدگی اور قوت بڑھتی جاتی تھی کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس قوت کو جتنا زیادہ استعمال کیا جائے گا اتنی ہی زیادہ اس قوت میں جلا پیدا ہوتی جائے گی چنانچہ قوت حافظہ سے کام لینے کی عادت نے عربوں کو بے پناہ قوی الحافظ بنا دیا تھا۔

اسلام آیا تو حفظ حدیث کے مشغلے نے عربوں کی اس قوت حافظہ کو مزید جلا بخشی انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ اس قوت سے کام لینا شروع کر دیا یوں بھی اسلام کے آجانے سے ان کے وہ تمام مشغلے یک دم متروک ہو گئے تھے جو ان کی ذہنی اور دماغی قوتوں کے لیے غذا کا حکم رکھتے تھے ان کا سب سے بڑا مشغلہ شعر و شاعری کا تھا مگر اسلام جھوٹ سچ پر مبنی مبالغہ آمیز شاعری کو قطعاً پسند نہ کرتا تھا فخری اور فحش اشعار کی تو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ انسا کے علم سے بھی انہیں شغف تھا اسلام بھی اس علم کو اگرچہ ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا تھا مگر یہ علم زیادہ تر باہمی تفاخر یا ایک دوسرے کی توہین کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو ظاہر

ہے اسلام کی نظر میں غیر پسندیدہ فعل تھا یوں یہ ذہنی مشغلہ بھی متروک ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں جب کہ عزلوں کی ذہنی اور دماغی قوتیں اپنی پرکائی غذاؤں سے محروم ہو کر کسی نئی غذا کی ٹھوک کی تھیں انہیں حفظِ حدیث کا مشغلہ ہاتھ آ گیا اور پھر وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر اس کی طرف پلکے اور ایسے کم ہوتے کہ بس اسی کے ہو کر رہ گئے ان کی تشنہ قوتِ حافظہ نے پھر ایسی جولانیاں دکھائیں کہ دنیا جبران رہ گئی ۛ

حکمِ نبوی عربوں کی قوتِ حافظہ سے متعلق اس تاریخی حقیقت کے پس منظر میں جب ہم صحابہ کرام کی محبت و عظمت کے ان مظاہر پر نظر ڈالتے ہیں جن کا اس سے

پہلے تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے تو حفظِ حدیث پر یقین و اعتماد کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی یہ یقین و اعتماد کی کیفیت اس وقت مزید قوت حاصل کر لیتی ہے جب ہم اس مرکزِ محبت اور محورِ عظمت ہستی کو خود یہ حکم دیتا ہوا پاتے ہیں کہ جو کچھ مجھ سے سنو اور جو کچھ مجھے کرتا ہوا دیکھو اسے یاد رکھو اور دوسروں تک پہنچاؤ یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ صحابہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کے عاشق تھے اور اس لیے آپ کی حیات کا ایک ایک لمحہ ان کے ذہنوں پر نقش تھا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بات یہ تھی کہ وہ محبوب خود کہہ رہا تھا کہ میری ایک بات یاد رکھو اور عاشقینِ صادقین اپنے محبوب کی خواہش پورا کرنے میں دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح بات محض اتنی ہی نہیں کہ صحابہ کرام عظمتِ نبوی کے تقاضوں کی تکمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول اور ہر فعل کو ہر زبان بنائے ہوئے تھے بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ صاحبِ عظمت ہستی خود حکم دے رہی تھی کہ میرے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کو یاد رکھو اور دوسروں تک پہنچاؤ اور حکم بھی سرسری طور سے نہیں بلکہ اس کی اہمیت کا عالم یہ ہے کہ منی کا میدان ہے حجتہ الوداع کا موقع ہے وہ حج جس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا کی حیاتِ مبارک میں دوبارہ حج نصیب نہیں ہوا۔ ایک لاکھ سے اوپر جانِ نثار صحابہ کا مجمع ہے حجتہ الوداع کے تاریخی خطبے کے الفاظ آپ کی زبان مبارک سے نکل رہے ہیں پورا مجمع ہمتن گوش بنا ہوا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک خاص کیفیت طاری ہے۔ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ اپنی لائی ہوئی ہدایت کے رہنما اصول اس خطبے میں واضح فرما دیتا چاہتے ہیں اور یہ اطمینان کر لینا چاہتے ہیں کہ تبلیغ ہدایت کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب سے سونپی گئی تھی وہ بہ تمام و کمال پوری ہو گئی ہے کیونکہ صحابہ سے خطاب کر کے بڑے ہی دل سوز انداز میں پوچھا جا رہا ہے کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام تم تک تہما سر پہونچا دیا اور مجمع کی طرف سے بیک آواز ثبات میں جواب پا کر بار بار آسمان کی طرف آپؐ کی انگلی اٹھتی ہے اور زبان سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں:

اللَّهُمَّ هَلْ بَلَغْتَ اللَّهُمَّ هَلْ بَلَغْتُ | اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا۔

غرض ایسے پر اثر ماحول میں اور ایسے تمام حجت کے موقع پر آپؐ کی زبان مبارک سے جو آخری الفاظ نکلتے ہیں وہ اسی حکم پر مشتمل ہیں۔ یہی اقوال و افعال نبوی کو یاد رکھنے اور دوسروں تک پہونچانے کا حکم۔ آپؐ ارشاد فرماتے ہیں:

الْأَفْلَسُ يَبْلُغُ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ | خبردار جو حاضر ہے اسے چاہیے (میری باتیں) غائب کو پہونچاتا جائے۔ (صحاح)

مختلف اطراف و اکناف سے مختلف قبائل کے وفود دربار نبوی میں حاضر ہو رہے ہیں اور جب صحبت نبوی سے مستفید ہو کر اور آپؐ کے اقوال و افعال کا مشاہدہ کر کے واپس ہونے لگے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے ہیں:

إِحْفَظُوهُنَّ وَأَخْبِرُوهُنَّ | ان تمام باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے والے ہیں انہیں مطلع کرتے رہو۔ (بخاری)

کبھی صحابہ کے مجمع سے خطاب کر کے بطور پیش گوئی کے ارشاد ہو رہا ہے:

لَسَمِعُونَ وَلَيَسْمَعَنَّ مِنْكُمْ وَلَيَسْمَعَنَّ | تم مجھ سے سن رہے ہو تم سے بھی سنا جائے گا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ان سے بھی لوگ سنیں گے۔ (البودادہ)

یعنی جب معاملہ میرا ہے کہ میری باتیں تمہیں دوسروں کو سنانی ہیں تو انہیں یاد رکھو تاکہ اپنی ذمہ داری

سے یا حسن و بھود عمدہ برآ ہو سکو حامل نبوت کے رمز شناس اس پیش گوئی کے بالواسطہ و بلا واسطہ ہر قسم کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں و داپنی ذمہ داریوں سے بھی پوری طرح واقف ہیں انہیں اپنے محبوب کی منشاء پوری کرنے کے لیے کسی قسم کی تصریحات کی ضرورت نہیں وہ تو ختم ابرو کے اشاروں کا بھی احتیاط نہیں کرتے تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ صحابہ نے واقعی اپنی ذمہ داری کو خوب پہچانا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا جو کچھ دیکھا آنے والوں کو من و عن سننا دیا ہو ہو کر کے دکھا دیا۔

صحابہ کرام کے تعمیل حکم کے اس جذبے سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پوری طرح باخبر تھے آپ کے سامنے صحابہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر سنت نبوی کی حفاظت کرنے اور پوری صحت کے ساتھ اس کو دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں لگے ہوئے تھے چونکہ یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصا اور منشاء قلبی کے عین مطابق تھا اس لیے بے اختیار زبان نبوی پر صحابہ کرام کے لیے دعائیہ کلمات جاری ہو جاتے۔ آپ فرماتے

اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے ہم سے حدیث کو سنا اور جس طرح سنا تھا اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیا لینا اوقات مجھ سے سنتے والوں کی نسبت زیادہ حفاظت کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو ان سے سنتے ہیں۔

نَحْنُ اللَّهُ امْرَأَ سَمِعَ مَنَّا حَدِيثًا
فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعْنَا قَرِيبَ مَبْلَغِ
أَعْنَى مَنْ سَامِعٍ - (صحیح ابن حبان)

ان دعائیہ کلمات میں بھی کما سمعہ کے الفاظ حفظ حدیث کے حکم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس طرح سنا تھا اسی طرح ہو ہو دوسروں تک پہنچانا اسی وقت ممکن ہے جب سنی ہوئی بات کو حفظ کر لیا جائے۔ حفظ حدیث میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر اہتمام تھا کہ آپ صحابہ کو جو کچھ سناتے یا کر کے دکھلاتے تو اس کے متعلق صرف یہ حکم دے دینے پر اکتفا نہ کرتے کہ اس سُننے ہوئے کو یاد رکھو یا جس طرح مجھے کوئی کام کرتے دیکھو اسی طرح تم بھی اسے عمل میں لاؤ بلکہ باقاعدہ اس بات کی نگرانی فرماتے کہ اس حکم پر پوری طرح عمل درآمد بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ ذیقرہ احادیث سے اس قسم کے بہت سے واقعات تلاش کیے جاسکتے ہیں جو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نگرانی کا ثبوت مہیا کرتے ہیں مگر طوالت کے خوف سے صرف دو واقعات ہی بطور نمونہ کے ہدیہ قارئین ہیں ان میں سے ایک واقعے کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہے اور دوسرا واقعہ آپ کے فعل سے متعلق ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے ایک صحابی کو سوتے وقت پڑھنے کے لیے ایک دعا تعلیم فرمائی۔ پھر پوچھا بتاؤ میں نے کیا کہا جو کچھ میں نے کہا ہے اسے دوہراؤ۔ صحابی نے وہ دعا دوہرائی مگر اس دعا کے آخری فقرے میں غلطی سے تبدیلی کے بجائے صحابی کے منہ سے رسول کا لفظ نکل گیا۔ اگرچہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں یعنی نبی اور رسول۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اپنی زبان مبارک سے نبی کے لفظ ادا فرمایا تھا اس لیے ارشاد ہوا کہ میں نے یہ نہیں کہا جو کچھ میں نے کہا ہے وہی دوہراؤ۔ غور کیجئے بات اگرچہ صرف دعا کی تھی جو محض مستحب ہے فرض یا واجب کے حکم سے متعلق کوئی لفظ نہ تھا مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصرار ہے جو میں نے کہا ہے بالکل وہی دوہراؤ۔ جب ایک معمولی دعا کے الفاظ کے بارے میں اس قدر سخت نگرانی ہے تو خود ہی اندازہ لگایے کہ مہمات شریعت اور اساسی امور سے متعلق ارشادات کے بارے میں آپ کی نگرانی کا کیا حال ہو گا۔

اسی طرح آپ کے فعل سے متعلق بھی ایک واقعہ بہت مشہور ہے ایک صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے نماز کے تمام ارکان قیام اور رکوع و سجود وغیرہ ادا تو بالکل درست طریقے اور صحیح ترتیب کے ساتھ کیے مگر ان کی ادائیگی میں ذرا جلد بازی سے کام لیا وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ (پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی) انہوں نے دوبارہ نماز پڑھی مگر اس بار بھی مطلوبہ سکون و قناعت پیدا نہ ہو سکا آپ نے پھر وہی فرمایا انہوں نے پھر نماز دوہرائی لیکن اس مرتبہ بھی وہ نماز صَلُّوا کَمَا سَأَلْتُمُونِي اُصَلِّ (اسی طرح نماز پڑھو جس طرح میں نے کہا ہے) کے سانچے میں پوری نہ اتر سکی۔ بہر حال تبصری بارہا کر کہیں وہ صحابی درست نماز پڑھ چکے تھے۔ اس واقعے میں غور کرنے والی بات یہ

ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے افعال کے طریقوں کی حفاظت کا بھی کس قدر اہتمام تھا کہ نمازیں سکون و اطمینان اگرچہ اکثر فقہاء کے نزدیک فرض یا واجب کے درجہ میں نہیں ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کیے ہوئے عمل کے نمونے کی حفاظت پر اصرار ہے۔

غرض حفظ حدیث پر یقین و اعتماد کی کیفیت میں یہ امر مزید قوت کا باعث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خود یہ خواہش ہے کہ میرا ہر قول اور ہر فعل محفوظ رکھا جائے نہ صرف خواہش بلکہ آپ حکم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور پھر اس بات کی نگرانی فرماتے ہیں کہ اس حکم کی تعمیل کس انداز میں ہو رہی ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے متوالوں اور آپ کی عظمت کے شیدائیوں نے اپنے محبوب کی خواہش کو پورا کرنے اور اپنے آقا کے حکم کو بجالانے میں کیا کچھ نہ کیا ہو گا کیا اس کے بعد بھی اس بدگمانی کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ حفظ حدیث میں تاہل غفلت اور لاپرواہی سے کام لیا ہو گا۔

منشائے الہی | اس سلسلے میں یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش بلکہ آپ کا یہ حکم کہ مجھ سے جو کچھ سنو اور جو کچھ مجھے کرتے دیکھو اسے یاد رکھو دراصل منشائے الہی کی تکمیل تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے قیامت تک اپنے دین کو محفوظ کرنے کا کام چونکہ امت محمدیہ کے سپرد کر دیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت اپنی پوری شکل میں قیامت تک موجود رہے اور اس کی یہی صورت تھی کہ صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کا محکم نمونہ بن جائیں اور آئندہ آنے والوں کو من و عن جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے سنا اور کرتے دیکھا پورا پورا پہونچا دیں گویا صحابہ نے خود قرآن کا یہ مطالبہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ انہوں نے سنا ہے اور جو کچھ خدا کے نبی کو انہوں نے کرتے دیکھا ہے وہ دوسروں تک مسلسل پہونچاتے چلے جائیں ہر جانب غائب کو اور ہر موجود شخص آئندہ آنے والوں کو

اقوال و افعال نبوی کی طرف بلاتا چلا جائے۔ قرآن کا پیغام تھا :

<p>تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں (کی بہتری) کے لیے ظاہر کی گئی ہے تاکہ لوگوں کو بھلائی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو۔</p>	<p>كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْعُرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)</p>
--	--

قرآن کا مطالبہ تھا

<p>اور چاہیے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیتی رہے بدی سے روکتی رہے۔</p>	<p>وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۰۴)</p>
--	---

بھلائی کے ممکن تھا کہ صحابہ قرآن کی اس پکار پر لبیک کہتے قرآنی تقاضوں کی تکمیل ہی کی خاطر تو انہوں نے قسم قسم کی مشقیں سہیں تھیں طرح طرح کی انہیں برداشت کیں انہیں اپنا گھر بار چھوڑا تھا اور اپنے وطن کو خیر باد کہا تھا قرآنی مطالبوں کو پورا کرنے کی خاطر تو انہوں نے اپنے عزیز و اقارب تک سے قطع تعلق کر لیا تھا، وہ سب سے مُنہ موڑ کر قرآن اور صاحب قرآن کے ہو رہے تھے اب قرآن اگر ان سے کہہ رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ سنو اسے ورد زبان بنا لو جو کچھ اللہ کے رسول کو کہنا دیکھو اسے حزنہاں کہہ دو تو کیسے یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ نے قرآن کے اس مطالبے کی تکمیل میں کسی تساہل یا غفلت سے کام لیا ہو گا۔ قرآن نے ان سے کہا

<p>رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے لے لو اور جس سے روکا ہے اسی سے رک جاؤ۔</p>	<p>مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر: ۷)</p>
---	--

اور وہ دنیا کی ہر چیز سے دست بردار ہو کر رسول کی فرائض میں گم ہو گئے وہ اس کی

آواز کے لیے ہمہ تن کان اور اس کے احکام کی تعمیل میں ہمہ تن اطاعت بن گئے۔ رسول نے جو کچھ دیا وہ اسے مضبوطی سے تھامنے چلے گئے اور جس سے روکا اس سے یک لخت منہ موڑ لیا۔ اور پھر اپنی زبان اور اپنے عمل سے رسول اللہ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کے امین بن گئے۔ غور کا مقام ہے جس دین کی خاطر صحابہ نے سب کچھ برداشت کیا وہی ان سے مطالبہ کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر ادا پر نگاہ رکھو اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت کے ہر ہر جزو اور ایک ایک خط و خال کی زندہ تصویر بن جاؤ تو کیسے ممکن تھا کہ وہ اس مطالبے کو کوئی اہمیت نہ دیتے اس مطالبے کو پورا کرنے میں ان سے جو بن پڑا انہوں نے اس کے کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

حفظ حدیث کے عوامل اور اعتماد کی بنیاد | غرض حفظ حدیث کے سلسلے میں اب تک جن عوامل کا بیان ہوا ہے

ان کو یکجا کر کے دیکھئے اور پھر سوچیے کہ ان عوامل کی موجودگی کی بنا پر حفاظت حدیث میں کس قدر اہتمام کس درجہ انہماک اور کیسی توجہ سے کام لیا گیا ہوگا۔ جن لوگوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا ہو جس کے چند ایک نمونے ابھی آپ کی نظر سے گزرے جو لوگ شمع نبوی پر پروانہ وارنشا رہونے ہوں جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عظمت کا پیکر ہوا اور جو لوگ بے پناہ قوتِ حافظہ کے مالک ہوں انہوں نے احادیث کی حفاظت میں اپنی محنت کی کیسی روشن مثالیں قائم کی ہوں گی عظمت نبوی کے تقاضوں کی کس کس طرح لاج رکھی ہوگی اپنی قوتِ حافظہ کے لیے کیسے کرشمے دکھائے ہونگے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اس بدگمانی کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ حفظ حدیث میں کوئی کوتاہی غیر ارادی طور پر بھی ان کی جانب سے ظہور پذیر ہوئی ہو خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ خود وہ ہستی ان سے حفظ حدیث کا مطالبہ کرتی ہو جو ان کی محنت کا مرکز ہے جس کو وہ عظمت کی بلند یوں پر متمکن دیکھتے ہیں اور پھر ان سب پر مزید یہ کہ رضائے الہی کا حصول بھی وہ حفظ حدیث ہی میں منحصر سمجھتے ہوں۔ ان تمام عوامل کے یکجا ہوجانے کے بعد کوئی عقل سے عاری ہی ہو تو یہ کہہ سکتا ہے کہ حفاظت حدیث کے سلسلے میں محض صحابہ کے حفظ پر اعتماد

نہیں کہا جاسکتا۔ حق یہ ہے کہ ان تمام عوامل نے مل کر صحابہ میں ایک ایسی رُوح پھونک دی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال کی حفاظت کے علاوہ ان کو کچھ اور یاد ہی نہ رہا تھا۔

حفظِ حدیث میں صحابہ کا شغف | میں ایسے منہمک ہوئے کہ سچ پوچھتے تو انہیں

تن من کا ہوش نہ رہا ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو آستانہ نبوی پر آئے تو بس اسی در کے ہوئے، عمر گزار دی دن رات خدمت نبوی میں رہ کر حفظِ حدیث کے علاوہ کوئی کام نہ کیا۔ ایسے بھی تھے جن کو نہ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ راحت و آرام کی فکر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا استحصال دیکھا اور وہ تھے۔ انہی میں وہ لوگ بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک حدیث کے پیے در در کی خاک چھانستے پھرتے تھے وہ بھی تھے جو حفظِ حدیث ہی کی دھن میں دُور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو تسکینِ قلب کا سامان سمجھتے رہے۔

آئیے صحابہ کرام کے اس عظیم الشان کام کی چند جھلکیاں دیکھتے چلیں اندازہ لگائیے صحابہ نے قرآن کی اس پکار کا کہ اللہ کا رسول جو کچھ تمہیں دیتا ہے اسے لے لو کس طرح جواب دیا۔ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں ان کے نام سے کون واقف نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بہت کثرت سے ان سے مروی ہیں۔ یمن کے رہنے والے ہیں قبیلہ دؤس سے ان کا تعلق ہے عین عالم شباب میں یعنی تیس سال کی عمر میں خبر کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور پھر بس آپ ہی کے در کے ہو رہتے ہیں دن ہو یا رات، سردی ہو یا گرمی سفر ہو یا حضر صبح و شام جو بیس گھنٹے آپ کا اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ ہر گھڑی ہر لمحے خدمتِ نبوی میں حاضر رہیں اور جو آپ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمائیں سنیں اور جو کچھ آپ کو کرتا ہوا دیکھیں اس کا بخورِ مشاہدہ کریں اور پھر آپ کے ان تمام اقوال و افعال کو ذہن میں محفوظ کر لیں۔ آستانہ نبوی پر حضرت ابو ہریرہ کی یہ ہمہ وقت حاضری اور حفاظت حدیث میں یہ ہمہ تن مشغولیت پورے ذوق و شوق اور اہتمام کے ساتھ اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بالآخر اس دُنیا سے تشریف نہ لے گئے۔ اس پورے دور میں حضرت ابو ہریرہ کا عالم یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر مسجد نبوی میں تشریف فرما ہیں

تو یہ مسجد نبوی کے کسی گوشے میں بیٹھے جمال نبوی کے مشاہدے میں مشغول ہیں اگر آپ ازدواج مطہرات کے مکانوں میں سے کسی مکان میں داخل ہو گئے ہیں تو یہ دہلیز تک ساتھ ساتھ ہیں اور پھر وہیں بیٹھے آپ کے باہر تشریف لانے کے منتظر ہیں۔ آپ حج پر جا رہے ہیں یا جہاد کا سفر درپیش ہے تو ابو ہریرہ ضرور ہم رکاب ہیں غرض کوئی وقت ایسا نہ تھا جب یہ یعنی دوسری نوجوان بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد منڈ لانا نظر نہ آتا ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو آج ہم ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی کی حیثیت سے جانتے ہیں کبھی کبھی اپنے واقعات بیان کرتے ہوئے خود فرمایا کرتے :

قَدِمْتُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ بِخَيْبَرَ أَلْيَوْمَ مَدَّ قَدْرُ دُرَّةٍ عَلَى
الثَّلَاثِ خَاقَمْتُ مَعَهُ 'حَقِي مَاتَ وَ
أَدْوَرُ مَعَهُ' بَبِيعَتِ نَسَائِدِهِ دَاخِرُهُ
وَأَغْزَوْ مَعَهُ
(ابن سعد)

ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں
خبر کے مقام پر حاضر ہوا اس وقت میری عمر تیس سال
سے اوپر ہو چکی تھی پھر میں نے آپ کے ساتھ قیام کر لیا
یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی میں آپ کے ساتھ
لگا رہتا آپ اپنی بیویوں کے مکانوں پر جلتے تو میں
آپ کے ساتھ جاتا آپ کی خدمت کرتا حج اور جہاد میں
آپ کے ساتھ ہوتا۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی حفاظت میں حضرت ابو ہریرہ کے شغف کا عالم یہ تھا
کہ نہ بھوک کی پرواہ تھی نہ پیاس کا خیال کئی کئی وقت فاقوں سے گزر جلتے زمین پر ٹیک لگا لگا کر
یا بیٹ سے پھر باندھ باندھ کر اپنے آپ کو تھامے رہتے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں حضرت ابو ہریرہ
کے خود اپنے الفاظ ہیں :

اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ بھوک
کی وجہ سے میں جگر تمام کر زمین سے سہارا لے لیتا
اور اپنے پیٹ پر پھر باندھ لیتا۔

وَاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِنْ كُنْتُ لَا أَجِدُ
عَلَى الْأَرْضِ بَكْبَدِي مِنَ الْجُوعِ وَأَشَدُّ
الْجُوعِ عَلَى بَطْنِي (بخاری شریف)

کبھی کبھی بھوک اس قدر تنگ کرتی کہ چکرا کر گر پڑتے اور ایسے بیہوش ہو جاتے کہ لوگ جنون کا اثر سمجھنے

لگتے۔ بعد میں یہ تمام حالات ابوہریرہؓ نے بڑے مزے لے لے کر خود بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں

میں خود کو پاتا کہ منبر نبویؐ اور حضرت عائشہؓ کے
جورے کے درمیان پکڑا کر گر پڑا ہوں خیال کیا جاتا کہ
میں پاگل ہوں حالانکہ جنوں سے میرا کیا تعلق وہ تو
صرف بھوک کا اثر ہوتا تھا۔

رَأَيْتُنِي أَصْرَعَ بَيْنَ مَنْبَرِ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَجْرَةِ عَائِشَةَ
فَيَقَالُ مُجَنُونٌ وَمَا لِي جُنُونٌ أَنِ هِيَ

الْأَلْجُوعُ (مصحح)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہ نے حفاظت حدیث کے کام کے لیے اپنے آپ
کو وقف کر دیا تھا ان سے کثرت سے احادیث روایت ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے
دنیا کے ہر کام سے لاتعلقی ہو کر حفاظت قرآن و حدیث کے کام ہی کو اپنا اور رضا بچھونا بنالیا تھا۔
خود فرمایا کرتے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اس کے یاد کرنے اور سمجھنے سے زیادہ
مجھے کوئی چیز پسند نہ تھی (ابن سعد) اپنی آنکھوں سے دوسرے لوگوں کو دنیا کے کاروبار سے
نفع اٹھاتے اور آرام و راحت کی زندگی گزارتے دیکھتے مگر اپنے لیے سب سے زیادہ نفع کی تجارت
اور راحت و آرام کا کام انہیں اس کے سوا نظر نہ آتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات
مبارک کے ایک ایک لمحے سے اپنی رُوح کی غذا کا سامان ہم پہونچالیں بہت سے انصار و مہاجرین
دنیا کی مشغولیتوں میں بھی الجھے رہتے اور حتی الامکان خدمت نبویؐ میں حاضری کا بھی موقع نکال ہی
لیتے مگر حضرت ابوہریرہؓ کو دنیا کے کاروبار سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بعض مرتبہ لوگوں کو ان کی
کثرت روایت پر تعجب ہوتا تو فرمایا کرتے :

تم لوگ خیال کرتے ہو کہ ابوہریرہؓ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ حدیثیں بیان
کیا کرتا ہے مگر خدا کی قسم میں ایک غریب
مسکین آدمی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے پاس پیٹ کے بل پڑا رہتا
حالانکہ مہاجرین بازاروں کے کاروبار

إِنَّكُمْ تَزْعُمُونَ أَنَّ أَبَاهُ رِيَّةٌ يَكْثُرُ
الْحَدِيثَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ وَاللَّهِ الْمَوْعِدُ الْحَقُّ كُنْتُ
أَمْرًا مَسْكِينًا أَصْحَبَ رَسُولَ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مَلَأَ بَطْنِي

مکان الہاجرون یُشغَلُھُم الصَّفَق
 بالاسواقِ وَکانتِ الانصار لِشَغْلِھِم
 القیام علی اموالھِم (بخاری)

میں مشغول رہتے اور انصار اپنے
 اموال (باغ اور کیست وغیرہ)
 میں اُلجھے رہتے۔

یہ تو تھا حضرت ابو ہریرہ کا حال۔ اب دیکھئے یہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار۔ ان کا بھی یہی عالم تھا کہ ہمہ وقت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے چلتے کہ آپ حجۃ مبارک میں تشریف فرما ہوتے تو وہاں بھی موجود ہوتے کیونکہ ان کو پرزہ اٹھا کر حجۃ بنوی میں بھی داخل ہونے اور آپ کی تنہائی کی گفتگو سننے کی اجازت تھی اور اسی لیے ان کو صاحب السواد (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار) کہا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کو لوگ بس اسی حال میں دیکھتے کہ وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نہ کسی خدمت میں مصروف ہیں کبھی بستر بچھا رہے ہیں کبھی اٹھا کر رکھ رہے ہیں کبھی آپ کی نعلین مبارک اتار رہے ہیں کبھی پناہ رہے ہیں اور کبھی آپ کے نعلین مبارک ان کی بغل میں دبے ہوئے ہیں۔ کبھی ان کو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسواک اس کی مناسب جگہ پر رکھنے کی نکر رہے تو کبھی وضو کا پانی مقررہ وقت پر مہیا کرنے کا خیال ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غسل فرما رہے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود چادر تانے کھڑے ہیں آپ سوئے ہوئے ہیں اور یہ انتظار میں ہیں کہ مقررہ وقت پر بیدار کرنے کی ذمہ داری پوری کریں۔ اللہ کا رسول سفر میں ہے اور یہ اللہ کا سپاہی مسلح ہو کر بطور کار وٹا ساتھ ساتھ ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف لائے اور عبداللہ بن مسعود نے لپک کر آپ کا عصا آپ کے دست مبارک میں دے دیا ہے آپ اٹھ کر جانے لگے ہیں اور عبداللہ بن مسعود ہیں کہ عصا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا ہے آگے آگے بطور پیش خدمت کے چلے جا رہے ہیں تاکہ آپ سے پہلے حجرے میں داخل ہو کر آپ کے راحت و آرام

کی جگہ کو درست کرنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کی انہی مشغولیتوں کی بنا پر صحابہ کے درمیان ان کا خطاب ہی صاحب النعلین والسواک والوسادۃ پڑ گیا تھا۔ دربار رسالت میں ان کی ہر وقت کی حاضری سے بعض نوواردوں کو یہ مخالفہ لگ جاتا تھا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے گھر کے کوئی آدمی ہیں چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعرنی کہتے ہیں کہ ہم جب بنی سہ سے آئے تو مدلوں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے متعلق یہی گمان کرتے رہے کہ

کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے کوئی آدمی ہیں جس کی وجہ ان کی اور ان کی ماں کی آمدورفت تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتی رہتی تھی۔

اِنَّ رَجُلًا مِّنْ اَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا نَزَىٰ مِنْ
مَخْوَلِهِ وَدُخِلَ اُمُّهُ عَلَي النَّبِيِّ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (اصابۃ)

دو بار نبوی میں یہ ہر وقت کی حاضری ذرا غور کیجئے آخر کس لیے تھی۔ ما آتا کہ الرسول فخذہ (جو کچھ رسول تمہیں دیتے ہیں اسے لو) کی قرآنی پکار کے علی جواب کے علاوہ بھی کوئی اور وجہ اس کی سمجھ میں آتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ ہر وقت کی حاضری صرف اسی لیے تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ سنیں اور جو کچھ آپ کو کرتے ہوئے دیکھیں ایک ایک جہات نبوی کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیں پھر خود بھی اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں اور دوسروں تک بھی ہدایت کے یہ خزانے من وعن پہنچا دیں۔

بات صرف حضرت ابو ہریرہ یا حضرت عبداللہ ابن مسعود یا اسی قسم کے چند گنے چنے صحابہ تک محدود نہیں بلکہ تقریباً تمام صحابہ کا یہی حال تھا۔ کوئی موقع دربار رسالت میں موجود رہنے کا ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ ابھی حضرت عمرؓ کا حال آپ سن ہی چکے ہیں کہ ایک انصاری صحابی کے ساتھ دربار نبوی میں حاضری کے لیے باری مقرر کی ہوئی تھی کہ کہیں کسی وقت کے فیض و برکت سے محرومی نہ ہو جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ مسلسل نو دس

سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی خدمت میں مصروف رہے یہ دس سال کی عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے پھر آپ کے دنیا سے رحلت فرمانے تک آپ کی ہمہ وقت حضوری سے فیض یاب ہوتے رہے۔ ان کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی مثلاً حضرت رافع اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما بھی شاذ و نادر ہی دربار رسالت کی حاضری سے محروم رہتے۔ ان سب کے سامنے صرف ایک ہی مقصود تھا اور وہ یہ کہ ما استاکم الرسول فخذوه کی زندہ عملی تفسیر بن جائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ ملے اسے لے کر محفوظ کر لیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ اس مقصد کے حصول کی لگن صرف مردوں تک ہی محدود نہ تھی۔ عورتوں میں بھی حال اہمات المؤمنین کا تھا جن میں سے کوئی نہ کوئی آپ کی خلوت کی زندگی میں آپ کے ساتھ ہوتی تھیں اور آپ کے اقوال و افعال کی حفاظت کا فریضہ اسی طرح انجام دیتی تھیں جس طرح جلوت کی زندگی میں مرد صحابہ انجام دے رہے تھے۔

پھر اسی پر بس نہیں جن امور کا علم صحابہ کو براہ راست حاصل نہ ہو پاتا اس کو ایک دوسرے سے پوچھتے پھرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تو حصول حدیث کے شغف میں صحابہ کا عالم ہی عجیب تھا جس کسی کے بارے میں علم ہو جاتا کہ اس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل محفوظ ہے ہزارہ جتن کر کے صحابہ اس کے پاس پہنچتے اور جب تک وہ حدیث حاصل نہ کر لیتے چین نہ آتا۔ ایک ایک حدیث کی خاطر صبر و شام جیسے دُور دراز علاقوں کا بھی اگر سفر کرنا پڑتا تو اس سے بھی انہیں عذر نہ ہوتا حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کثیر احادیث کے راوی ہیں خود ایک ایسے ہی سفر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے

ایک صاحب کے واسطے سے مجھے ایک حدیث

پہنچی میں نے ایک اونٹ خرید کر اس پر بکاوہ

بلغنی حدیث عن رجل من اصحاب

النبي صلى الله عليه وسلم فابتعت

بعيراً فشدت عليه رحلي ثم

سِرَّتِ إِلَيْهِ شَهْرًا حَتَّى قَدِمَتْ
الشَّامَ فَإِذَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَنَسٍ
الأنصاري فَأَتَيْتُ مَنْزِلَهُ وَارْسَلْتُ
إِلَيْهِ أَنَّ جَابِرًا عَلَى الْبَابِ فَرَجَعَ
إِلَى الرَّسُولِ فَقَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ
فَقُلْتُ لَعَنَ فُجْرُحُ إِلَى فَأَعْتَقْتَهُ وَ
اعْتَقَنِي قَالَ قُلْتُ حَدِيثٌ بَلَّغَنِي
عَنْكَ أَنَّكَ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَخَاطِرِ
لَمْ أَسْمَعْهُ أَنَا مِنْهُ قَالَ سَمِعْتُ
رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
يَقُولُ الْحَدِيثَ (جامع بيان العلم)

کسا اور ایک ماہ تک چلتا رہا بیان تک کہ
میں شام پہونچ گیا پھر میں عبد اللہ بن انیس
انصاری (جو سے حدیث پہونچی تھی) کے گھر
جا پہونچا اندر آدی بھیجا کہ دروازے پر جا بے
کہہ لے آدی نے واپس آکر پوچھا کہ کیا جا بے
بن عبد اللہ نہیں میں نے کہا ہاں! عبد اللہ
بن انیس باہر نکل آئے دونوں نے معانقہ
کیا پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے واسطے
سے ایک حدیث پہونچی ہے جو اپنے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منظرالم کے بارے
میں سنی ہے اور میں اس حدیث کو نہیں سنی تھا
عبد اللہ بن انیس نے جواب میں کہا کہ میں رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا پھر
انہوں نے پوری حدیث سنائی۔

مدینے سے شام جیسے دور دراز علاقے کا سفر۔ ذرا غور تو کیجئے۔ کہہ دینا اور سن لینا آسان ہے۔
اتنا طویل سفر کیا جائے تو یہ تہہ لگتا ہے اور پھر خصوصاً آج سے ہزار بارہ سو سال پہلے کا سفر،
ذرا الجھ آمدرفت کا حال معلوم صرف اُرنٹ کی پشت پر صحراؤں اور ریگستانوں کے درمیان
تخلی مسافت۔ یہ سب کچھ کس لیے صرف ایک حدیث کے حصول کی خاطر! ایک حدیث پوری
بھی بڑی بات ہے بعض اوقات کسی حدیث کے محض ایک حرف کی تصحیح کی خاطر صحابہ نے رخت
سفر باندھ لیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا نام روایت حدیث میں بڑا معروف ہے

ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ حدیث کے صرف ایک حرف کی درستگی کے لیے باقاعدہ سفر اختیار کیا۔ اسی طرح دائی میں ایک اور صحابی کے متعلق ہے کہ وہ اسی مقصد سے حضرت فضال بن عبد اللہؓ کے پاس مصر پہنچے، فضال اس وقت اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے۔ ان کے خوش آمدید کہنے پر وہ صحابی برے میں آپ کی ملاقات کو نہیں آیا بلکہ میں نے اور تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی تھی میں یہ اُمید لے کر آیا ہوں کہ وہ تمہیں یاد ہوگی۔ اسی قسم کا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہجرت انگیز ایک واقعہ حضرت ابویوب انصاریؓ کا بھی ہے۔ انہوں نے اور حضرت عقبہ بن عامرؓ نے ایک حدیث مسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ساتھ سنی تھی۔ حضرت ابویوب انصاریؓ رضی اللہ عنہ کو اتفاق سے اس حدیث کے الفاظ میں کچھ شبہ پیدا ہو گیا ضرورت ہوئی کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے اس سلسلے میں استفسار کرے یہ معلوم ہوا کہ وہ تو مصر جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ حضرت ابویوب انصاریؓ صرف ایک معمولی سا شک دُور کرنے کی خاطر مدینہ منورہ سے مصر روانہ ہو جاتے ہیں اور اس سے زیادہ ہجرت آپ کو یہ معلوم کر کے ہوگی کہ مصر پہنچ کر کھڑے کھڑے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے وہ حدیث سنتے ہیں اور سنتے ہی پھر واپس سوار ہو کر عانہ مدینہ منورہ جاتے ہیں۔ کجا وہ تک بھی اپنی سواری کا مصر میں نہیں کھولتے۔ حافظ ابن عبد البر کے الفاظ ہیں کہ

<p>حضرت ابویوب اپنی سواری کی طرف پلٹے سوار ہوئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے آپ نے اپنا کھادہ بھی نہ کھولا۔</p>	<p>فَاتَى ابُو الْيُؤُبَ رَاحِلَتَهُ فَرَكِبَهَا وَالْأَصْرَفَ إِلَى الْمَدِينَةِ وَمَا حَلَّ رَحْلَهُ (جامع بيان العلم)</p>
--	--

کہاں تک بیان کیا جائے کہ صحابہ نے حصول و حفاظت حدیث کی خاطر کیسے کیسے کارنامے انجام دتے ہیں۔ ہجرت ہوتی ہے سن من کر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم ہونے کے باوجود صحابہ کبار کے دروازوں پر تلاش حدیث میں فرشی خاک پر پڑے نظر آتے ہیں نہ سوج کی تمازت کا خیال ہے نہ تیز دندنہ گرم ہواؤں کی فکر ہے۔ گرد و غبار کھاتے ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہے ہیں دھن سوار ہے تو بس یہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی جو حدیث جہاں سے ملتی ہے لے لیں۔ دارمی اپنی سنن میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی نہ بانی روایت کرتے ہیں کہ

حدیث کی طلب میں میں کسی ایسے آدمی کے پاس جاتا جن کے متعلق مجھے پتہ لگتا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے اور ان کو پاتا کہ وہ قیلو کہہ رہے ہیں تو اپنی ہمار کو سیکھنا کہ میں ان کے دروازے پر پڑھتا ہوں ایسے گرو وغیرہ اگر ان کو میرے پھرے پر ڈالتیں تاکہ خود وہ صاحب باہر نکلی آتے۔ باہر نکلی کر (مجھے دیکھتے تو کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے آپ کیسے تشریف لائے میں کہتا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کوئی حدیث روایت کرتے ہیں میں نے چاہا کہ وہ حدیث آپ سے سنوں وہ صاحب کہتے آپ کسی کو بھیج دیتے ہیں خود حاضر ہوجاتا میں کہتا تمہارے پاس حاضر ہونے کا میں زیادہ مستحق ہوں۔

كَنتَ لَا تَأْتِي الرَّجُلَ فِي الْحَدِيثِ يَبْلُغُنِي أَنَّهُ سَمِعَهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاجِدُهُ قَائِلًا فَاتَوَسَّسْتُ دَائِي عَلَى بَابِهِ تَسْفِي الرِّيحَ الزَّارِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى يَخْرُجَ فَاذَا خَرَجَ قَالَ يَا بْنَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَكَ فَاقُولْ بِلُغْنِي حَدِيثٌ عَنْكَ أَنْتَ تَحَدِّثُهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاجَبَبْتُ أَنْ أَسْمَعَهُ مِنْكَ فَيَقُولُ هَلَّا بَعَثْتَ إِلَيَّ حَتَّى أَتِيكَ فَاقُولْ أَنَا أَحَقُّ إِلَيْكَ۔

طلب حدیث میں یحلا اپنے مرتبہ و وقار کا خیال کہے تھا۔ تحصیل حدیث کی لگن میں صحابہ کے درمیان چھوٹے بڑے کا بھی کوئی امتیاز نہ تھا۔ خلفائے راشدین تک اپنی عظمت مرتبت کے باوجود دوسرے صحابہ سے احادیث پوچھنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میری وابستگی کا حال لوگوں کو چونکہ معلوم تھا اس لیے آپ کی حدیثیں لوگ مجھ سے پوچھا کرتے ان میں عمرؓ بھی ہیں عثمانؓ بھی علیؓ بھی طلحہؓ بھی اور زبیرؓ بھی۔

كَانُوا يَعْرِفُونَ لَزْوَجِي فَيَسْأَلُونِي عَنْ حَدِيثٍ مِنْهُمْ عُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ وَطَلْحَةُ وَزُبَيْرٌ (ابن سعد)

غرض صحابہ نے تحصیل حدیث اور حفظ حدیث میں ہر وہ طریقہ اپنایا جو اس کام میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی ایسی حفاظت کی کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہ اس سے پہلے تھی نہ قیامت تک ممکن ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، ان عوامل کی موجودگی میں جن کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے ایسا ہی کچھ ہونا چاہیے تھا جیسا ظہور میں آیا۔ ایسا نہ ہونا تو تعجب کی بات ہوتی۔ حق تو یہ ہے کہ شاید کاغذ کے سفینوں میں بھی حدیث کی ایسی حفاظت ممکن نہ تھی جیسی حفاظت صحابہ نے اپنے سینوں سے کام لے کر کی۔ صحابہ ذخیرہ حدیث کی عجم کتا ہیں بن گئے۔ ہر ہر صحابی اپنی جگہ پر حدیث کا ایک نسخہ تھا اور یہ کہن غلط نہ ہو گا کہ ان زندہ نسخوں کی موجودگی میں حدیث کے کاغذی نسخوں کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی اس لیے اگر امر واقعہ ہی فرض بھی کر لیا جائے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں حدیث کا ذخیرہ تحریر میں نہیں آیا تھا تو حفاظت حدیث کے سلسلے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

حدیث کی زندہ کتا ہیں | یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جن واقعات و حالات اور جن اقوال و ملفوظات کا ظہور ہوا تھا صحابہ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک ان اقوال و افعال کا مکمل نمونہ بنے ہوئے تھے اور اس طرح احادیث نبوی کا ذخیرہ صرف کسی ایک نسخے ہی میں نہیں ہزاروں نسخوں کی صورت میں عہد صحابہ سے بھی پہلے عہد نبوی ہی میں وجود میں آچکا تھا۔ قرآن نے صحابہ پر بڑے تاکید و انداز میں یہ بات واضح کی تھی کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب : ۲۱) | تمہارے لیے رسول اللہ (کی زندگی) میں ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔

اور صحابہ نے اس قرآنی وضاحت کی توجہ کو پہچان کر اپنی زندگی کے ہر گوشے میں ہر پہلو سے اس نمونے کی شمع روشن کر لی تھی صرف فرائض و واجبات ہی کے معاملے میں نہیں بلکہ مستحبات و مباحات میں بھی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر زندگی کے عام معمولات میں بھی صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کی ہو ہو تصویر بن جانے کی کوشش کرتے تھے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق عام طور سے

مشہور ہے کہ ان کا تو عالم یہ تھا کہ سفر پر راہ میں قصداً اس بات کا اہتمام کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں کہیں اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا وہاں ان کی اونٹنی کا رخ بھی ضرور پھرے جن جن مقامات پر آپؐ نے راستے میں نمازیں پڑھی تھیں ان مقامات کو تلاش کر کے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نمازیں پڑھتے حانظہ ابن حجر عسقلانی حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی اسی عادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

<p>جن جن مقامات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں پڑھی تھیں وہ (ابن عمر) ان کو تلاش کرتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے راہ میں جہاں کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا وہ (ابن عمر) بھی اپنی سواری کا رخ موڑتے۔</p>	<p>كَانَ يَتَّبِعُ أَثَارَهُ فِي كُلِّ مَسْجِدٍ صَلَّى فِيهِ وَكَانَ يَعْتَرِفُ بِرَأْسِهِ فِي طَرِيقِ رَأْيِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ نَاقَتَهُ (اصابتہ)</p>
--	---

ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے دوران راہ میں کہیں اونٹ سے اتر کر استنجے کی غرض سے بیٹھتے تھے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنی یہ عادت بنالی تھی کہ جب بھی اس جگہ سے گزر ہوتا تو بلا ضرورت بھی اپنی اونٹنی سے اس مقام پر اترتے اور استنجے کی شکل بنا کر بیٹھتے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ڈھال اور وضع و قطع تک اس حد تک اپنالی تھی کہ صحابہ ان کو ان کے طریقوں اور ان کی عادات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تشبیہ دیتے تھے ایک مرتبہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ طرز و روش اور چال ڈھال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب کون ہے آپ نے جواب میں فرمایا

<p>رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال اور وضع و قطع میں سب سے زیادہ قریب آدمی ابن مسعودؓ ہیں۔</p>	<p>أَقْرَبُ النَّاسِ هَدْيًا وَذَلًّا وَسَمْتًا بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابن مسعود (ترمذی)</p>
---	---

یوں تو عادات و خصائص نبوی کی ہو ہو نقل کرنا تمام صحابہ ہی کا ملخص نظر تھا لیکن بعض صحابہ کبار کو جن میں خلفائے راشدین سب میں ممتاز ہیں عادات و خصائص نبوی کے ساتھ ساتھ خصائص نبوی کی ضرورت انہوں سے بھی خط وافر نصیب ہوا تھا چنانچہ انہیں ہمیں کوئی حدیث کے مقام پر فائز نظر آتا ہے تو کوئی حق اور باطل میں امتیاز کے لیے نادر و قیث کے اعزاز کا حامل دکھائی دیتا ہے کسی کو اصدق الناس حیاء کا خطاب ملا ہوا ہے تو کسی کو عدل و قضا کی کرسی پر سرفرازی نصیب ہوئی ہے کوئی فقر و زہد نبوی کا مجسم پیکر ہے تو کوئی غنا و کفایت پیغمبری کا زندہ نمونہ ہے غرض ہر صحابی اپنی اپنی جگہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی مکمل تصویر نظر آتا ہے اور یوں ہر صحابی اپنے اپنے مقام پر احادیث نبوی کی ایک زندہ کتاب ہے۔

اور جب تک دھڑکتے ہوئے سینوں پر مشتمل یہ زندہ کتابیں موجود رہیں اس وقت تک پھر پھر پڑھتے اور راقی سے جڑی ہوئی بے جان کتابوں کی ضرورت ہی لاحق نہ ہوئی اگرچہ مختصر فیض کا مژدہ بند کرنے کے لیے اللہ نے حفاظت حدیث کے لیے ان کاغذ کے سفینوں کا بھی ساتھ ساتھ انتظام فرمایا جیسا کہ عنقریب انشاء اللہ ثابت ہوا جاتا ہے تاہم اللہ نے اگر یہ انتظام نہ بھی فرمایا ہوتا تب بھی صحابہ کے سینوں میں محفوظ ذخیرہ حدیث کے مجموعے حفاظت کے تمام تر تقاضے پورا کرنے کے لیے بالکل کافی تھے۔

لاکھوں زندہ کتابیں | ذخیرہ حدیث کے یہ زندہ مجموعے اس وقت اور بھی زیادہ دقیق اور قابل اعتماد بن جاتے ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مجموعے

ایک دو نہیں دس بیس نہیں سو دو سو یا ہزار دو ہزار بھی نہیں بلکہ ایک لاکھ سے متجاوز ہیں۔ عقل خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ حدیث کے زندہ مجموعوں کی یہ کثرت تعداد حفاظت حدیث پر کیسے غیر متزلزل یقین اور کس قدر ٹھوس اعتماد کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے احادیث کا محور صرف ایک ذات یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ارد گرد آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا مشاہدہ کرنے والی لاکھوں زندہ آنکھیں۔ ایک فوکس (مرکزی نقطہ) اور ہو ہو ہنہ ہمتی تصویر کشی کے لیے لاکھوں کیمرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر حرم مبارک میں

تشریف فرما ہیں تو آپ کے ارد گرد ازواج مطہرات کا جھگڑا ہے وہ ازواج مطہرات جن کے لیے آپ کی ذات محض ایک خاوند ہی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ آپ کو ہادی عالم کی حیثیت سے بھی اچھی طرح پہچانتی ہیں انہیں بخوبی معلوم ہے کہ آپ کی زندگی کے ہر عمل کو امت کے لیے اسوہ حسنہ بنایا گیا ہے وہ اسی نقطہ نظر سے آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا مشاہدہ کر رہی ہیں وہ آپ کی زندگی کے ان لمحات کی بھی امین ہیں جن کو بیوی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ غرض آپ حرم مبارک میں ہیں تو ازواج مطہرات آپ کے ارد گرد جمع ہیں اور اگر آپ حرم مبارک کے باہر نجی مشاغل میں مصروف ہیں تو آپ کے خدام خاص حضرت انس حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت بلال حضرت رافع رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں مسجد میں تشریف فرما ہیں تو اصحاب صفہ حلقہ بنائے آپ کے مختلف ارشادات سن رہے ہیں اور آپ کو مختلف کام کرتے دیکھ رہے ہیں۔ آپ سفر پر تشریف لے گئے ہیں تو ہزاروں صحابہ آپ کے ہم رکاب ہیں اور ایک ایک بات نوٹ کر رہے ہیں آپ کے سفر کی کیا کیفیت ہے آپ سواری پر کس طرح بیٹھے ہیں سفر کے دوران آپ کی عادات کیا ہیں پڑاؤ پر آپ کا طرز عمل کیا ہوتا ہے اسی طرح آپ ہمد کے لیے نکلے ہیں تو تقریباً تمام ہی صحابہ آپ پر پرواہ و ارشاد پہنچنے کے لیے حاضر ہیں۔ غرض بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ذات مبارک اور مشاہدہ کرنے والے لاکھوں۔ کیا کوئی گوشہ کوئی پہلواند میرے میں رہ جانے کا امکان باقی رہتا ہے اگرچہ ان عوامل کی موجودگی میں جن کا بھی بیان ہوا ہے صحابہ جیسے جاں نثاروں کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی ارشادات نبوی کو یاد رکھنے اور ان حالات و واقعات کو محفوظ کرنے کے لیے بہت کافی ہوتی جو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اکیلی ذات کے گرد گھومتے تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی جدا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔

احادیث روایت کرنے والے صحابہ کی اس کثرت کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو منکرین حدیث

کی اس وحشت کا علاج بھی ہو جاتا ہے جو احادیث کی کثرت تعداد کو دیکھ کر انہیں ہوتی رہتی ہے کہ لاکھوں احادیث صحابہ نے اپنے حفظ کے سہارے کیسے محفوظ رکھی ہوں گی اول تو یہ لاکھوں کا عدد محض ایک مغالطہ ہے جو متابعات و شواہد اور اسناد و طرق کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی بنا پر لگا ہے انشاء اللہ اس مغالطے کی حقیقت اپنے مقام پر واضح ہو جائے گی تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے صحابہ اگر ایک لاکھ سے متجاوز تھے تو احادیث کے لاکھوں کی تعداد میں ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک ایک صحابی کے حصے میں بہت قلیل تعداد احادیث کی آتی ہے جو کا حفظ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محدود سے چند حضرات صحابہ کو چھوڑ کر بہت کم ہیں مگر کثرت کہتے ہیں زیادہ تر صحابہ ایسے ہی ہیں جن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد سو کے عدد سے بھی آگے نہیں بڑھتی۔ صحابہ کی عمومیت اصحاب العشرات (یعنی سو سے کم احادیث کے راوی) میں شمار ہوتی ہے۔ غرض حدیث روایت کرنے والے صحابہ کی اس کثیر تعداد کے پیش نظر اس بدگمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اتنی زیادہ احادیث صحابہ نے اپنے حفظ کے سہارے کیسے محفوظ رکھی ہوں گی اور اس وقت تو اس بدگمانی کا اور بھی کوئی جواز نہیں رہتا جب ہمارے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ وہ ذبیحہ احادیث جو ہر صحابی نے اپنے اپنے طور پر حفظ کیا تھا محض اقوال و ملفوظات نبوی ہی پر مشتمل نہیں تھا بلکہ اس میں کثیر حصہ واقعات کا بھی شامل تھا جن کو یاد رکھنے کے لیے قوتِ حافظہ پر کوئی خاص بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی ایک عام آدمی کے ذہن میں بھی ہزار ہا واقعات کی یاد جو اس کے ساتھ گزرے ہوں بغیر کسی کوشش کے محفوظ رہتی ہے۔

ایک شخص کسی کی زبان سے کوئی بات سنا ہے مختلف الفاظ سے مرکب کوئی جملہ اس کے کانوں میں پڑتا ہے تو اس کو یاد رکھنے کے لیے اسے باقاعدہ اپنا ذہن استعمال کرنا پڑے گا یہ غلام کسی واقعہ کے جو اس نے دیکھا اسے یاد رکھنے کے لیے ذہن کو بالارادہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں وہ واقعہ خود بخود ذہن پر نقش ہو جائے گا وہ جب چاہے گا اسی واقعے کو من و عن سنا دے گا۔ حدیث صرف اقوال و ملفوظات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہتے دیکھا گیا یا آپ کے سامنے دوسروں نے جو کچھ کیا اور اس پر کچھ

نہیں فرمائی محدثین کی اصطلاح میں جسے تقریبہ کہا جاتا ہے ان سب واقعات کو بھی حدیث کا لفظ حاوی ہے اور حدیث کا اکثر حصہ انہی واقعات پر مشتمل ہے احادیث کے ذخیرے کا تقریباً تین چوتھائی حصہ واقعات پر مشتمل ہے ذخیرہ حدیث کے اس اکثر حصے کو یاد رکھنے کے لیے صحابہ کو باتا علاہ اپنا ذہن استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی صحابہ جو کچھ دیکھتے تھے وہ خود بخود ان کے ذہن پر نقش ہوتا جاتا تھا اس لحاظ سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہونے والے اقوال و ملفوظات اور آپ کے ارد گرد وجود میں آنے والے واقعات کو یاد رکھنے کے لیے صحابہ کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی بہت کافی ہوتی۔ مگر یہاں تو عالم یہ ہے کہ اس کام کو کرنے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ایک لاکھ سے اوپر تھے اور یہ تمام سننے اور دیکھنے والے اس سماعت اور اس نظر سے سننے دیکھنے والے نہ تھے جن سے ہر عام واقعہ سنا اور دیکھا جاتا ہے بلکہ یہ سب کے سب شمع بنوی کے پروانے حب بنوی کے دیوانے اور عظمت بنوی کے بے دام غلام تھے اور جو کچھ وہ سن رہے تھے اور دیکھ رہے تھے اس کا تعلق کسی قوم کے متفرق ادوار سے نہیں، کسی ملک کے وسیع و عریض خطوں سے نہیں، کسی حکومت کے پیچیدہ معاملات سے نہیں اور کسی میدان جنگ کے اطراف و جوانب میں بکھرے ہوئے واقعات سے بھی نہیں بلکہ اس کا تعلق صرف اور صرف ایک ذات سے تھا ایک واحد شخص کوئی ایک قوم نہیں، کسی قوم کا کوئی ایک قبیلہ نہیں، کسی قبیلے کا کوئی ایک خاندان نہیں بلکہ صرف اور صرف ایک واحد انسان جس کے گرد تمام ادوار سمٹ آئے تھے جو تمام معاملات و واقعات کا مرکز و محور تھا جو تمام کثرتوں کا مجموعہ تھا۔ انصاف سے کہیے پراگندہ اور منتشر کثرتوں کو اکٹھا کرنے کے مقابلے میں ایک مقام پر مرکب کثرتوں کو سمیٹنا کس قدر آسان ہے اور اسی بنا پر ان مرکب کثرتوں کا صحیح صحیح پورے طور پر سمٹ آنا کس قدر یقینی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اکیلی ذات کے گرد جمع شدہ حقیقتوں کو سمیٹنے اور محفوظ کرنے کے لیے اگر صرف ایک واحد شخص ہی کو مقرر کر دیا جاتا تو یقین و اعتماد کے حصول کے لیے کافی ہو جاتا مگر یہاں تو حالی یہ ہے کہ کثرتیں مجتمع اور سمیٹنے والے لاکھوں ۛ

ذخیرہ حدیث اور تاریخی مواد | ہجرت کی بات ہے کہ یقین و اعتماد کی ان بلندوں میں تو منکرین حدیث کو پستیاں پستیاں نظر آتی ہیں

شکوہ و شبہات اور بدگمانیوں کے عمیق غار دکھائی دیتے ہیں اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو یعنی ارد گرد حد نظر تک منتشر پراگندہ اور بکھری ہوئی کثرین اور ان کو سمیٹنے والے ایک یا دو تر شکوک و شبہات کے ان اندھیروں میں بھی انہیں یقین و اعتماد کے چراغ جلتے ہوئے نظر آتے ہیں ہمارا اشارہ عام تاریخی ذخیروں کی طرف ہے یہ تاریخی ذخیرے بن پر منکرین حدیث کو اندھا اعتماد ہے ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ ابتدا میں مبہم اور غیر واضح افواہوں کی صورت میں یہ تاریخی واقعات پھنسے عالم میں بکھرے رہے پھر یکایک کسی کو شوق پیدا ہوا اس نے انہی افواہوں کو قلم بست کرنا شروع کر دیا اور اپنی صوا بید کے مطابق جس حصے کو چاہا باقی رکھا اور جسے چاہا حذف کر دیا بعد کے آتے والوں نے قرائن و قیاسات کا گورکھ دھندا بچھا کر مزید کنز بیونت سے کام لیا پھر جوں جوں اس انداز میں ترتیب دئے ہوئے واقعات پر زمانہ گزرتا گیا جوں جوں واقعات سے سیاہ شدہ اوراق بوسیدہ ہوتے گئے اور جوں جوں ان کی تحریر کی سیاہی مدھم پڑتی گئی ان واقعات کے تاریخی و ثقہ ہونے پر مہر لگتی چلی گئی اور اگر کہیں کسی تحریر کو کیڑوں نے بھی اپنی خوراک بناتے بناتے کچھ حصہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو کیڑوں کا مسترد کیا ہوا وہ حصہ اور زیادہ تاریخی و ثقہ کی مزاح پاکیا۔ تاریخی ذخیرے میں سے کوئی ایسا تاریخی حصہ مشکل ہی سے دستیاب ہو گا جس کو قلم بست کرنے والے اس کے عینی شاہد رہے ہوں اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ تاریخ کا کوئی ایسا حصہ خوش قسمتی سے موجود ہے جسے ہم چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکتے ہوں تو بھی ان ابتدائی راویوں کی تعداد ایک یا دو سے زیادہ نہیں اور وہ بھی ایسے مجہول الحال کہ کچھ پتہ نہیں کون لوگ تھے کس دماغی قابلیت کے حامل تھے کس قسم کی اخلاقی منزلت سے بہرہ ور تھے ہمارا تمام تاریخی ذخیرہ اسی قسم کی مبہم اور غیر یقینی کوششوں کا پیرین منت ہے۔ اگر یہ مبہم کوششیں یقین و اعتماد کی ضامن ہو سکتی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ احادیث کا وہ ذخیرہ قابل اعتماد کیوں نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد افواہوں پر نہیں عینی شہادتوں پر ہے جو قرائن و قیاسات کا گورکھ دھندا

نہیں ثابت شدہ حقیقتوں کا چمکتا دمکتا سورج ہے جس کو سننے اور دیکھنے والے ایک دو نہیں لاکھوں کی تعداد میں ہیں جن میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے حال سے ہم واقف نہ ہوں ان عینی شاہدوں میں سے ہم ہر ایک کے بارے میں اس کے حسب و نسب اس کے کردار اس کی دماغی قابلیت اس کی اخلاقی منزلت حتیٰ کہ اس کی ذاتی عادات و خصائص سے متعلق تمام جزئی و کلی تفصیلات سے باخبر ہیں۔ ان عینی شاہدوں کے عادل و ثقف ہونے میں کوئی عقل سے عاری ہی ہو تو شک کرے گا ورنہ ان کی ثقاہت اور ان کے عدل پر فرشتے بھی گواہ ہیں ذخیرہ حدیث کے ان امینوں کی قوتِ حافظہ بھی معجزے کی حد تک جبران کن ہے۔

تعصب کی تواریات ہی علیحدہ ہے ورنہ انصاف سے کہئے کہ یقین و اعتماد کے اعتبار سے تاریخی مواد اور ذخیرہ احادیث میں کیا کوئی نسبت نظر آتی ہے؟ اول الذکر میں کوتاہیوں غلط فہمیوں اور غلطیوں کے اندیشے کی بنا پر شکوک و شبہات کی جن تدریجی گنجائش ہے یقیناً اسی نسبت سے آخر الذکر میں اپنی صحت و اقیقت کی بنا پر یقین و اعتماد کی اسی قدر عقلاً توقع ہے مگر بُرا ہوا اس تعصب کا کہ منکرین حدیث کو روز روشن تاریک رات کی طرح نظر آتا ہے اور شب تار کے گھپ اندھیرے ٹامک ٹوٹیوں کے بے نور چراغوں کے سہارے روشن دکھائی دیتے ہیں۔

بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ ہر ایک صحابی اپنے اپنے علم کی حد تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال پر مشتمل ایک زندہ کتاب تھا اور جس وقت آپؐ نے اس دُنیا سے فانی سے کوچ فرمایا اس وقت ذخیرہ حدیث کی ان زندہ کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کچھ اڑپر ہی تھی اس لحاظ سے اگر منکرین حدیث کا یہ دعویٰ تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں احادیث کتابی صورت میں جمع نہیں ہوئی تھیں تب بھی ان لاکھوں زندہ کتابوں کی موجودگی میں سیاہ و سفید اوراق پر مشتمل کتابوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ان زندہ کتابوں نے حفاظت حدیث کا کام کاغذ کے سفینوں سے کہیں زیادہ بہتر صورت میں اپنے سینوں

کاغذی کتابوں کی ضرورت

کے ذریعے سے انجام دیا۔ صرف حفاظت ہی نہیں اپنے سینوں سے دوسرے سینوں میں اس امانت کی منتقلی کا کام بھی ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ نہ اپنی طرف سے کوئی کمی کی نہ زیادتی

نہ کسی بات کو چھپایا نہ کوئی غلط بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت ہوئے دی اور اس طرح اس لحاظ سے بھی ان زندقہ کتابوں نے کاندھنی کتابوں سے مستثنیٰ کیے رکھا۔

امانت حدیث کی منتقلی کے کام میں بھی صحابہ کے احساس ذمہ داری کا عالم یہ تھا کہ موت کے وقت بھی یہی فکر رہتا کہ کہیں کوئی حدیث ایسی نہ رہ جائے جو ہم نے ابھی تک نہ سنا ہو۔ حضرت معقل بن یسافؓ نے مرض الموت طاری ہے مگر فرما رہے ہیں تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں اگر مرض الموت میں مبتلا نہ ہوتا تو نہ بیان کرتا "گویا فکر یہ ہے کہ اگر مر گیا اور حدیث کی یہ امانت ادا نہ کر سکا تو خدا کے یہاں مواخذہ نہ ہو جائے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث سنا کر یہ ہدایت فرمادی تھی کہ اس کا عام اعلان نہ کیا جائے حضرت معاذ بن جبلؓ نے عمر بھر اس بات کو چھپایا مگر وقت نزاع محض اس خوف سے وہ حدیث سنائی کہ کہیں حدیث کو چھپانے کا ترکب نہ ٹھہرا دیا جائے۔ دراصل صحابہ کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد رہتا تھا۔

مَنْ سَيَّلَ عَنْ عِلْمِهِ كُتْمَةً
الْجَمْعَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِإِجَامٍ مِّنْ
فَارِطٍ وَادْمَادٍ تَوَدَّى

جس کسی سے علم کی کوئی بات بوجھتی جائے وہ
اسے چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کی
لگام پھلائی جائے گی۔

ایسی سخت وعید ہے صحابہ سے یہ توقع کی ہی نہیں جاسکتی کہ امانت حدیث کے منتقلی کے کام میں وہ معمولی سی کوتاہی نہ رہا رکھتے۔ عین سکرات کے عالم میں احادیث کے بیان کی فکر اسی قسم کی مواخذہ سے بچنے کا اہتمام تھا۔ احادیث نبویؐ کے علاوہ خود قرآن کی وہ آیت بھی اسی ضمن میں صحابہ کو مستحضر رہتی ہوگی جس میں ہدایت کی باتیں چھپانے والوں کو اللہ اور اس کے بندوں کی طرف سے لعنت کا مستحق گردانا گیا تھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنْ
الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ
بِآيٰتِنَا لِيَكُنْ مِنَ الْغٰفِلِيْنَ

جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم کھلی نشانیاں اور
ہدایت کی باتوں میں سے انہما کو چھپانے کے بعد انہما کو غافل

۱۔ مسلم۔ کتاب الایمان ۲۔ مسلم۔ کتاب الایمان

بعد چھپاتے ہیں جب ہم انسانوں کے لیے اسے کتاب
پیوہ کھول کر بیان کر چکے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر
اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت
کرتے ہیں۔

لَنَاسٍ فِي الْكُتُبِ اُولَئِكَ يَلْعَنُهُم
اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ○
(البقرة : ۱۵۹)

غرض اسی قسم کی آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تعمیل میں صحابہ میں سے ہر صحابی کی کوشش یہ
تھی کہ جتنا علم بھی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس تک پہنچا ہے وہ پورا کا پورا
بعد کے آنے والوں کے سینوں میں منتقل ہو جائے۔ گویا ذخیرہ احادیث پر مشتمل یہ زندہ کتابیں
کاغذی کتابوں کا یہ مقصد بھی باحسن وجوہ پورا کر رہی تھیں کہ ان کے اوراق میں محفوظ ذخیرہ معلومات
دوسروں تک بہ تمام و کمال پہنچتا رہتا ہے۔

اسی طرح کاغذی کتابوں کے اوراق پر جو کچھ ایک مرتبہ نقش کر دیا جاتا ہے وہ من وعن
ان کتابوں کے پڑھنے والوں تک پہنچ جاتا ہے جس طرح وہ کتابیں ان نقوش میں اپنی طرف
سے نہ کمی کرتی ہیں نہ زیادتی بالکل اسی طرح صحابہ کے اوراق قلب پر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
سے سن کر اور دیکھ کر جو کچھ ثبت ہو گیا تھا اس میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی یا زیادتی کیے
بغیر صحابہ نے من وعن وہ سب دوسروں تک پہنچانے میں پوری احتیاط سے کام لیا۔ یوں بھی صحابہ
سے اس کی توقع ہی کیے کی جاسکتی تھی اس لیے کہ احادیث میں کسی بھی قسم کی کمی زیادتی بنی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کر دینے کے مترادف تھی اور صحابہ بکثرت بار بار
بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس شخص کے لیے جہنم کی وعید سن چکے تھے جو
آپ کی طرف غلط بات منسوب کرے۔ آپ فرمایا کرتے

میری باتیں روایت کرو اس میں کوئی عجز
نہیں مگر میری طرف جو جان بوجھ کر جھوٹ
بات منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا۔

حَذِّثُوا عَنِّي وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ
عَلَيَّ مُتَعَدًّا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ
النَّارِ (مسلم)

نہی آپ اسی بات کو یوں ارشاد فرماتے

من قال علیّ ما لم اقل فلیتبعوا مقعدہ | جو شخص میرا نام لے کر وہ بات کہے جو میں نے
من التّار (بخاری باب من کذب علی النبی) | نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

آج کا بے باک ذہن ان خبیث کی وعیدوں کو شاید اتنی اہمیت نہ دے لیکن صحابہ کے سامنے
جہنم کی وعید سنانا ایک زیر دست بات تھی آخرت کے عذاب کو صحابہ سب سے بڑی مصیبت
خیال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
کسی غلط بات کی نسبت کرنا دراصل اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے اور قرآن نے ایک جگہ نہیں
بے شمار مقامات پر خدا پر جھوٹ باندھنے والے کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ جس قسم کے
ایمان و یقین کی دولت سے صحابہ سرفراز تھے اس کے ہوتے ہوئے ان سے یہ توقع کون کر
سکتا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یا اللہ کی طرف کوئی غلط بات بھولے
بھی منسوب کر سکتے تھے۔ صحابہ کا عالم یہ تھا کہ حدیث متانے لگتے تو کاہنے لگتے اور اس دور
سے کہ کہیں کوئی غلط بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے حدیث ربط
کرتے جاتے اور کہتے جاتے اس سے کم یا اس سے زیادہ اس کے قریب یا اس کے مشابہ۔

غرض یقینی طور پر یہ نہ کہتے تھے کہ آپ کی کوئی حدیث کے الفاظ بعینہ ہی ہیں۔
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جب حدیث بیان کرتے تو گھبرا اٹھتے اور کہتے آپ نے یہ کچھ
فرمایا اور یہ کچھ فرمایا پھر فرماتے او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم لا یحیا
بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوگا۔ حضرت علی فرماتے مجھے یہ گوارا ہے کہ مجھ پر
آسمان پھٹ پڑے بہ نسبت اس کے کہ میں آپ کی طرف اس بات کا انتساب کروں جو آپ نے
نہیں کہی۔ بعض صحابہ کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جس وقت حدیث بیان کرتے بیٹھتے تو بیان
کرنے سے پہلے من کذب علیّ متعمداً والی حدیث کو ایک بار ضرور دہراتے
تاکہ اس نازک ذمہ داری کا احساس تازہ ہو جائے کہ کوئی غلط بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف منسوب نہ ہوتے یا اے مخصوصاً حضرت ابو ہریرہؓ تو ہمیشہ ہمیں اس حدیث کو کسی بھی حدیث کے بیان کرنے سے قبل ضرور ہی پڑھتے۔

غرض احادیث نبویؐ دوسروں تک پہنچانے میں صحابیہ نے اس بات کا بھی پورا پورا اہتمام کیا کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر اور آپ کو کرتے ہوئے دیکھ کر انہیں حاصل ہوا تھا وہ بعد کے آنے والوں تک من و عن پہنچا دیا جائے اور اس طرح صحابیہ نے جو فی الحقیقت ذخیرہ احادیث پر مشتمل زندہ کتابوں کے مترادف تھے ہر لحاظ سے کاغذی کتابوں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہونے دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ذخیرہ احادیث کا اکثر حصہ عہد نبویؐ اور عہد صحابہ میں ظلم بند ہو چکا تھا تاہم احادیث کی باقاعدہ تدوین کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب صحابیہ کا دور ختم ہونے لگا جب احادیث کی یہ چلتی پھرتی کتابیں دنیا سے اٹھنے لگیں۔ تب کاغذی کتابوں کی ضرورت پڑی۔ حضرت عمر بن العزیزؒ کا وہ مقولہ آج تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے جو باتا عہد تدوین حدیث کی ابتدا کرتے وقت ان کی زبان پر بے ساختہ آگیا تھا۔ جب انہوں نے اپنی حکومت کی جانتی سے باتا عہد اس کا اہتمام کیا کہ احادیث کو مدون کیا جائے تو یہی فرمایا کہ صحابیہ اٹھتے پہلے جا رہے ہیں خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں احادیث کا ذخیرہ ضائع نہ ہو جائے۔ گویا جب تک صحابیہ موجود تھے۔ حدیث کا ذخیرہ محفوظ تھا اور اوراق پر مشتمل کتابوں سے بے نیاز تھا اب جبکہ حدیث کے یہ زندہ نسخے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تو ضروری ہو گیا ہے کہ اس علم کو باقاعدہ کتابوں کی صورت میں یکجا کر لیا جائے۔

بہر حال حفظ حدیث کے سلسلے میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لیے بہت کافی ہے کہ تحریر و کتابت کے بغیر بھی صرف حفظ اور یادداشت کے راستے سے ہی احادیث کا ذخیرہ پوری طرح محفوظ رہ سکتا تھا اور چنانچہ محفوظ و پایہ حقیقت حال یہ ہے کہ حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت حدیث کا بھی اہتمام عہد نبویؐ اور عہد صحابہ ہی میں پورا کیا گیا جیسا کہ انشاء اللہ ابھی ثابت ہوا جائے گا۔

کتابت حدیث اور صحابہ رضی

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ احادیث کا ذخیرہ تحریر و کتابت کی مدد کے بغیر ہی صرف حفظ اور یادداشت کے ذریعے بہ تمام و کمال محفوظ رہ سکتا تھا اور رہا اگرچہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ احادیث عہد نبوی و عہد صحابہ میں فلم بند ہوئیں یا نہیں تاہم معترضین کا مسئلہ بند کرنے کے لیے اور حقیقت کے اظہار کی خاطر اب ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اور آپ کے بعد کسے متصاویر یا تصانیف میں ذخیرہ احادیث کا کس قدر حصہ قید تحریر میں آچکا تھا۔

جیسا کہ اس سے پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے احادیث کی کوئی تھیلی تعداد نہیں بلکہ ان کا ایک غالب حصہ عہد نبوی اور عہد صحابہ ہی میں مکتوب صورت میں بھی محفوظ ہو چکا تھا اس وقت احادیث کا متنازعہ ذخیرہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی کوئی معمولی مقدار نہیں بلکہ اکثر حصہ ان لوگوں کے ہاتھوں قید تحریر میں آچکا تھا جو اس تمام تر ذخیرے کے اولین مخاطب تھے صحابہ نے احادیث کو حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت کے ذریعے سے بھی پوری طرح محفوظ کر لیا تھا۔ لوگ تو دو سو سال کی بات کرتے ہیں کہ احادیث کثافتی صورت میں دو سو سال بعد آئیں اور اس کے لیے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ کے سین و فات کو ثبوت کے طور پر پیش کر دیتے ہیں جبکہ ہمارا دعویٰ ان کے علیٰ انہ غم یہ ہے کہ دو سو سال تو بہت دور کی بات ہے جو بہات کے سوا کچھ نہیں یہ مدت سو سال کے عرصہ پر بھی محیط نہیں ہے جیسا کہ بعض اصحاب علم کو مغالطہ لگا ہے اور انہوں نے ابن شہاب زہری کو وہ پہلا شخص قرار دیا ہے جس نے سب سے پہلے احادیث کو مدون کیا اصل میں بات اس سے بھی آگے بڑھ کر جو کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ دو سو سال بعد یا ایک سو سال بعد کی باتیں تو خلاف واقعہ ہیں ہی اس سے نصف مدت بعد کی

بات بھی اگر کی جائے تو خلافت واقعہ ہی ہوگی کیونکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور خلفائے راشدین ہی کے عہد میں قید تحریر میں آچکی تھیں اور بخوبی بہت نہیں موجودہ ذخیرہ احادیث کا اکثر حصہ قلم بند ہو چکا تھا۔

اس پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے ضروری

فن کتابت اور عرب باشندے

غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے دراصل تحریر و کتابت حدیث کے سلسلے میں لوگوں کو دھوکہ یہ لگتا ہے کہ آغاز اسلام کے زمانے میں نہ تو تحریری ساز و سامان ہی پورے طور پر دستیاب تھا نہ عرب میں ہی کچھ زیادہ لکھنے لکھانے کا رواج تھا لکھنا جاننے والے بھی چند گنے چنے لوگ تھے ایسی صورت میں احادیث کے پورے ذخیرے کا قلم بند ہو جانا ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور نظر آتا ہے اگر احادیث قلم بند ہوئی بھی ہوں گی تو چند متفرق چھوٹے چھوٹے جز و چند مخصوص لوگ تیار کر پائے ہوں گے۔ اس مغالطے کی اصل وجہ زمانہ جاہلیت کی

اصطلاح ہے اسلام سے قبل کا زمانہ جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس زمانے کے لوگ اس معنی میں جاہل تھے کہ انہیں لکھنے پڑھنے سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا وہ لکھنے پڑھنے کے سامان قلم و روایت کا غذا اور کتاب وغیرہ سے کوئی سروکار ہی نہ رکھتے تھے۔ لفظ فی الحقیقت علم قرآن و حدیث کے مقابلے میں بولا جاتا ہے گویا جب تک اسلام کا علم نہیں آیا اس وقت تک کا زمانہ بھالت کا زمانہ تھا۔ قرن اول میں علم نام ہی صرف علم دین کا تھا علم دین کے علاوہ جو کچھ بھی تھا اسے بھالت تصور کیا جاتا تھا۔

جاہلیت دراصل قرآن کی ایک اصطلاح ہے ایک سے زائد مقامات پر قرآن نے اپنی اس خاص اصطلاح کا تذکرہ کیا ہے۔ اس قسم کی جتنی آیات قرآنی ہیں ان کے مفہوم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص قسم کے ملحدانہ خیالات کا فرانہ عقائد اور فاسقانہ عادات و اطوار کی تعبیر جاہلیت کے لفظ سے کی گئی ہے مدینہ جہاں تک نورشت و خواند کا تعلق ہے اس زمانے میں بھی جسے ہم زمانہ جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں عرب باشندوں کی بھی قریب قریب وہی حالت تھی جو اس زمانے کے عموماً کامل متمدن ممالک نہیں تو کم از کم نیم متمدن ممالک کی تھی۔ دراصل اس

زمانے میں تقریباً ہر ملک اور ہر قوم میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص علیحدہ طبقہ ہوتا تھا عام لوگوں کو اس کام سے چنداں سروکار نہ ہوتا تھا کسی ملک میں لکھنے پڑھنے کا کام پادریوں کے سپرد تھا تو کسی میں موبد یہ کام سرانجام دیتے تھے ہندوؤں میں مثال کے طور پر یہ کام خاص برہمنوں سے متعلق تھا عرب میں بھی قریب قریب یہی حال تھا عرب باشندوں کی اکثریت یقیناً لکھنے پڑھنے کے فن سے آشنا نہ تھی لیکن ہر شہر میں ایسے لوگ ضرور پائے جاتے تھے جو اس فن سے پوری طرح آشنا تھے اور لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتے تھے اور اس طرح مجموعی طور پر عرب میں ایک اچھی خاصی تعداد لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی موجود تھی نہ صرف مرد بلکہ بعض عورتیں بھی ایام جاہلیت میں ایسی پائی جاتی تھیں جو نوشت و خواند سے بخوبی واقف تھیں شہرناہی نہیں بلکہ غلاموں میں بھی اس فن سے آشنا افراد موجود تھے۔ عیسائیوں کے گرجے عرب میں جہاں کہیں تھے ہر ایک میں مختلف مذہبی کتابوں کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس زمانے میں عیسائی گرجوں میں اسی قسم کی تقریباً ۷۲ (ہتر) کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہودی مذہب کی کتابوں کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ مدینہ منورہ اور خیر وغیرہ میں جہاں کہیں بھی عرب میں یہودی آباد تھے موجود تھا ان کتابوں کا ذکر بھی بہ کثرت تاریخ و سیر کی کتابوں اور تفسیری روایات کے ذخیروں میں اب بھی ملتا ہے۔ عرب کے عیسائیوں اور یہودیوں کے علاوہ بھی عرب کے عام جاہلی خاندانوں میں ایک کتاب کے عام رواج کا پتہ چلتا ہے جس کا نام مجاہد لقمان تھا کہتے ہیں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ایک بار یہ کتاب لائی گئی تھی ابراہیموں کے شاہنامہ کا عربی ترجمہ مکہ میں بعض لوگوں کے پاس موجود تھا شام سے بھی اسی قسم کے تاریخی لٹریچر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نصر بن حارث وقتاً فوقتاً مکہ لایا کرتا تھا۔ دمشق اور یمن میں علامہ سیوطی نے ایسی روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے بازاروں میں یہودی کتابوں کی باقاعدہ تجارت کرتے تھے نیز بائبل کا عربی ترجمہ کر کے عربوں کے درمیان اس کی اشاعت کیا کرتے تھے اور یہ تو بہت مشہور بات ہے عام لوگ بھی اس سے واقف ہیں بخاری میں بھی ہے کہ مکہ میں ورقہ بن نوفل تورات و انجیل کا ترجمہ عربی میں کیا کرتے تھے طائف کے ایک باشندے حارث بن کلدہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ایران کی مشہور طبی درسگاہ

جندسابور میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی میں علم طب پر ایک کتاب بھی اس نے لکھی تھی۔ یمن وغیرہ میں مختلف خاندانوں کے پاس کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق موجود تھے عرب شاعروں کے قصائد مکتوبہ شکل میں پائے جاتے تھے سبع مملکت کے نام سے کون واقف نہیں آخر وہ قصائد جو بیت اللہ میں مختلف شاعروں کی طرف سے لٹکائے گئے تھے لکھے ہوئے ہی تو تھے۔ مختصر یہ ہے کہ جاہلیت کے لفظ سے مکمل بے جا حالت کا جو ماحول سمجھ لیا جاتا ہے وہ قطعاً درست نہیں ہے نوشت و خواندہ کے معاملے میں عرب بالکل ہی تہی دست نہ تھے۔

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر حقیقت حال کی وضاحت کے لیے اتنا ہی کافی ہے جاہلیت کے لفظ سے دھوکہ کھا کر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ عرب باشندے لکھنے پڑھنے کے فن سے اس حد تک کورے تھے کہ تحریر و کتابت کے ساز و سامان تک سے نا آشنا تھے سمجھ میں نہیں آتا جو شخص قرآن پڑھتا ہے وہ کیسے اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ قرآن ایسے لوگوں کے لیے نازل کیا گیا تھا جو پڑھنا لکھنا بالکل جانتے ہی نہ تھے بھلا جس کتاب کا نام ہی قرآن ہو یعنی پڑھی جانے والی چیز اس کے بارے میں کیسے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ان لوگوں کی طرف بھیجی گئی تھی جو پڑھنے کے لفظ تک سے واقف نہ تھے۔ جس کتاب میں کھولنے کے ساتھ ہی پہلی ہی لائن میں ذلک الکتاب کے الفاظ نظر آتے ہوں اس کے متعلق کیونکہ یہ باور کر لیا جائے کہ وہ ایسے لوگوں میں اتنی ہی جو کتابت کے فن سے بالکل عاری تھے جو کتاب روشنائی، دوات، سفر، کا تبین اور سجل جیسے الفاظ سے بھری پٹری ہو جس کی تقریباً ہر پٹری سورت میں کتاب کا کاغذ کا اور لوح کا ذکر آتا ہو اور جس کے نزول کی ابتدا ہی پڑھنے لکھنے اور قلم کے ذکر سے ہوئی ہو کون خیال کر سکتا ہے کہ ایسی کتاب اپنے لوگوں کے درمیان نازل کی گئی تھی جو نوشت و خواندہ کے سامان و آلات تک سے ناواقف تھے۔ بھلا غور تو کیجئے قرآن کے مخاطبین اگر ناخواندہ تھے اور لکھنا نہ جانتے تھے تو قرآن کی اس آیت میں پھر آخر کن لوگوں کو خطاب کیا گیا تھا:

اے ایمان والو جب تم کسی مدت معینہ کے لیے
ایک دوسرے کو قرض دو تو اسے لکھ بیکرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا مَدَّ إِلَيْكُمْ مِبْدِي
إِلَى أَجَلٍ مَّسْئِي فَكْتُوبُهُ (البقرة: ۲۸۲)

قرآن اگر ایسے لوگوں کے درمیان اُترا تھا جو لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف ہی نہ تھے تو قرآن کے اس لکھنے کا کیا مطلب تھا کہ

وَلَا تَسْمَوْنَ أَنْ تَكْتَبُوهُ صَغِيرًا
وَكَبِيرًا | قرص چھوٹا ہو یا بڑا اسے ضبط تحریر میں لانے سے نہ اکتاؤ۔

ذرا سوچئے تو سہی جو لوگ لکھنا جانتے ہی نہیں ان کے اکتانے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے قرآن جن سے مخاطب ہے وہ بخوبی لکھنا جانتے ہیں بلکہ قرآن کا یہ عام خطاب تو یہ بتلاتا ہے کہ عام آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

آلات کتابت کی دستیابی | دراصل یہ غلط فہمی کتابت قرآن کے سلسلے میں بیان کی جانے والی ان روایتوں سے بھی پیدا ہوئی ہے جن میں ذکر کیا گیا

ہے کہ شروع شروع میں قرآنی آیات ہڈیوں پر، کھجور کی ٹہنیوں پر، چمڑے کے ٹکڑوں پر یا پتھروں پر لکھی جاتی تھیں۔ پس اسی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ اس کی وجہ آلات نوشت و خواندگی کمی تھی عظیم عیب لغات اور ادم کے الفاظ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ ان سے مراد گری پٹری ہڈیاں نازہ یا سوکھی ہوئی کھجور کی ٹہنیاں، بن گھڑے بے ڈول پتھر اور کچے پکے چمڑے کے ٹکڑے ہیں۔ حالانکہ غور کرنے کی بات ہے کہ ان چیزوں میں اتنی وسعت ہی کب ہوتی ہے کہ ان پر قرآن جیسی ضخیم کتاب کے اجزاء تحریر میں لائے جاسکیں۔ دراصل یہ تمام الفاظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ وہ تمام چیزیں جو اس زمانے میں مصنوعی طریقوں سے لکھنے کے کام کے لیے تیار کی جاتی تھیں ان کو ان اصطلاحی الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لکھنے کی جس چیز کی تیاری میں ہڈی کام میں لائی جاتی تھی اس کے لیے عظیم کا لفظ ہی اصطلاحی انداز میں اختیار کر لیا گیا اسی طرح کھجور کی شاخوں سے لکھنے کے لیے جو تختہ تیار کیا جاتا ہوگا اسے عیب کے لفظ سے تعبیر کیا جاتے دکانی پر چمڑے کے ٹکڑوں اور پتھر کے پتروں کو قیاس کر لیجئے۔ غرض ان الفاظ سے عام چیزیں ہڈی چمڑا پتھر وغیرہ مراد مقصود نہ تھیں موجودہ زمانے میں بھی ہم لکڑی اور پتھر کو لکھنے کے کام میں لاتے ہیں مگر ان کے لیے ہم علیحدہ تختی اور پلیٹ کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں تو وہ لکڑی اور پتھر ہی ہیں اسی طرح اس زمانے میں کچھ چیزیں لکھنے کے کام میں لائی جاتی تھیں جن کو عظیم عیب

لغات اور آدم کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ کتابت قرآن سے متعلق ان روایتوں کا اثر کتابت حدیث پر بھی پڑا اور سطحی علم رکھنے والوں نے سمجھا کہ ابتدا میں سامان کتابت کی کمی کی وجہ سے احادیث قید تحریر میں نہ آسکی ہوں گی حالانکہ یہ امر واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ انہی بات تو مسلم ہے کہ عرب میں مسر کا کاغذ یا چین کا بنا ہوا کاغذ دستیاب نہ تھا مگر پھر بھی اس زمانے میں لکھنے کی جو عام چیز تھی اور جسے عربی میں رقی کہتے تھے اس کی عرب میں کوئی کمی نہ تھی۔ عرب میں اس کی کمی کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ یہ رقی جسے آپ پارچنٹ یا شیتلہ یا تختہ کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں جانوروں کے معدے کے پاس کی باریک جھلیوں سے تیار کیا جاتا تھا اور یہ کسے معلوم نہیں کہ عرب باشندوں کی عام خوراک گوشت تھی۔ عرب جیسے گوشت کھانے والے ملک میں یہ جھلیاں جتنی وافر تعداد میں فراہم ہو سکتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ معدے کی جھلیوں کے علاوہ لکھنے کے یہ شیتلہ شتر مرغ یا خرگوش وغیرہ کی باریک کھالوں سے بھی تیار ہوتے تھے اور ان چیزوں کی بھی ظاہر ہے عرب میں کوئی قلت نہ تھی۔ غرض رقی عرب میں وافر مقدار میں دستیاب تھا اور اس زمانے کے لحاظ سے یہ رقی کاغذ ہی کا متبادل تھا۔ ہڈی چمڑے اور پھڑ وغیرہ سے بنی ہوئی چیزیں تو دراصل زیادہ تر حفاظت اور پائیداری کے نقطہ نظر سے استعمال کی جاتی تھیں ورنہ عام حالات میں رقی ہی لکھنے کے کام آتا تھا۔

فن کتابت سے واقف صحابہ | غرض عرب میں نہ لکھنے پڑھنے کے ساز و سامان کا قحط تھا نہ لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی کوئی

کمی تھی جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا عرب باشندوں کی اکثریت تو واقعی لکھنے پڑھنے کے فن سے آشنا نہ تھی تاہم ایک اچھی خاصی تعداد عرب کے مختلف شہروں میں ایسے لوگوں کی موجود تھی جو نوخت و خواندہ سے بخوبی واقف تھے مرد تو مرد عورتیں بھی بعض ایسی مل جاتی تھیں جو اس فن سے پوری طرح آشنا تھیں چنانچہ صحابہ میں بھی بہت سے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ خلفائے اربعہ کے علاوہ حضرت ابی ابن کعب حضرت زید بن ثابت حضرت خالد بن ولید حضرت

عمر بن العاص حضرت عبداللہ بن عباس حضرت معاذ بن ابی سفیان حضرت مغیرہ بن شعبہ حضرت حنظلہ حضرت زبیر بن عوام حضرت ثابت بن تبس حضرت عامر بن نفیر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام لکھنا پڑھنا جلنے والوں میں سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت سے ایسے صحابہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے آثار و سیر کی کتابوں سے اگر ایسے تمام صحابہ کے نام جمع کیے جائیں تو یقیناً سینکڑوں سے متجاوز ہو جائیں اسی سے اندازہ لگائیے کہ وحی قرآنی کی کتابت جن صحابہ کے سپرد تھی ان کی تعداد تینتالیس تک جا پہنچتی ہے۔

کتابت سکھانے کا خصوصی اہتمام | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت کچھ لوگ تو پہلے ہی سے لکھنا جانتے تھے

تاہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ میں فن کتابت کو عام کرنے کے لیے خصوصی اہتمام فرمایا۔ مسجد نبوی میں قائم ہونے والی سب سے پہلی درسگاہ جو ایک سائبان اور ایک چبوترے پر مشتمل تھی اور جسے درسگاہ صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس میں قرآن و حدیث کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا چنانچہ حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں صفہ میں لوگوں کو لکھنا سکھانے اور قرآن پڑھانے پر مامور فرمایا تھا حضرت عبداللہ بن مسعود بن العاصؓ کو بھی جو فن کتابت کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور بڑے خوشنویس تھے نیز زمانہ جاہلیت میں بھی ماہر کتابت کی حیثیت سے مشہور تھے ان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ لکھنے پڑھنے کے فن

سے واقف ہو جائیں چنانچہ جنگ بدر کے ان قیدیوں کے بارے میں جو ندیہ دے کر رہائی حاصل نہ کر سکے تھے آپ نے اعلان فرمایا کہ جو قیدی دہی مسلمان بچوں کو فن کتابت سکھا

دے گا اس کو رہائی دے دی جائے گی۔ سب مردوں کے ساتھ ساتھ آپ عورتوں کو بھی لکھنے پڑھنے کے فن سے روشناس کرانا ضروری سمجھتے تھے چنانچہ امام مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شفاء بنت عبد اللہ رضی اللہ عنہا حضرت صفیہؓ کو لکھنا سکھایا کرتی تھیں۔

حدیث کی عام کتابت | غرض کتابت حدیث کے سلسلے میں اس خیال کی ایک مفروضہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں کہ سامان کتابت کی قلت کی بنا پر یہاں کتابت سے ناواقفیت کی وجہ سے احادیث قید تحریر میں نہ آسکی ہوں گی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حفظ حدیث کے ساتھ ساتھ صحابہ کتابت حدیث کا بھی پورا اہتمام کرتے تھے اور جس جس کو لکھنا آتا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو لکھ کر بھی محفوظ کرتا جاتا تھا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اس پر شاہد ہے آپ فرماتے

ہیں: کُنَّا قَعْدًا نَكْتُبُ مَا نَسْمَعُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ | ہم حضور کے گرد بیٹھے ہوئے جو کچھ آپ

الذی (جمع التذابہ)۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے جمع منکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے گویا احادیث لکھنے کا عمل صرف حضرت ابوسعید تک محدود نہ تھا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے دیگر صحابہ بھی احادیث لکھتے جاتے تھے گویا صورت حال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں تشریف فرما ہیں اور آپ کے ارد گرد صحابہ حلقہ بنائے بیٹھے ہیں آپ جو کچھ فرماتے جاتے ہیں صحابہ لکھتے جاتے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری کی اس

روایت کی تائید حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں: **بينا نحن حول رسول الله صلى الله عليه وسلم نكتب (جامع بيان العلم)** | جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے لکھ رہے تھے۔

اس قسم کی روایات کا اندازہ ذرا غور تو کیجئے کیا بتلا رہا ہے یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں کہ صحابہ

اپنے طور پر احادیث لکھا کرتے تھے بلکہ بات اصل یوں بنتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لکھاتے جاتے تھے اور صحابہ لکھتے جاتے تھے۔ اس پس منظر میں ان روایات کا مفہوم اور زیادہ کھل کر واضح ہو جاتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو اسے نین بار دہراتے حضرت انس کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

کان اذا تكلم بكلمة اعادها ثلثاً
حتى تفهم عنه -
(بخاری باب من اعاد الحديث ثلثاً) -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو تین مرتبہ دوہراتے یہاں تک کہ وہ خوب سمجھ میں آ جاتی -

گویا آپ اس بات کا خیال رکھتے کہ میری کسی ہوئی بات کا ایک ایک کلمہ مخاطبین تک پورا پورا پہنچ جائے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں صحابہ احادیث کا ایک ایک لفظ پوری صحت کے ساتھ قلم بند کر لیتے ہوں گے بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احادیث قلم بند کرنے کے بعد بعض صحابہ اسلحہ و تصحیح کی خاطر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت انسؓ اپنی لکھی ہوئی احادیث کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں انکو لکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کر چکا ہوں۔ متدرک میں سعید بن ہلال کا بیان ہے :

ہم جب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے زیادہ پوچھ چکھ کرتے تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھیں اور لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کو پیش کر چکا ہوں -

كان اذا اُكْتُرنا على انس بن مالك
رضي الله عنه فاخرج الينا مما لا عهد
فقال هذه سمعناها من النبي صلى الله
عليه وسلم فكتبناها وعرضناها عليه
(مسندك لھاكم)

مسند دارمی میں بھی یہ روایت تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ موجود ہے حضرت انسؓ کو خادم خاص ہونے کی بنا پر جو قرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل تھا وہ محتاج بیان نہیں اس لحاظ سے احادیث تحریر کرنے کا خوب موقع ملا ہوگا اور حضرت انسؓ وہ ہیں جو بچپن ہی سے لکھنے کے فن سے خوب واقف تھے چنانچہ ان کی والدہ نے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش

کرتے وقت خاص طور سے ان کی اس مہارت کتابت کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا یا رسول اللہ! هذا ابني وهو غلام كاتب (اسد الغابہ) یہ میرا بیٹا ہے ابھی پھر ہے مگر فن کتابت جانتا ہے۔

بہر حال یہ تمام روایات یہ بتلاتی ہیں کہ احادیث کو قید تحریر میں لانا صحابہ کی ایک عام عادت تھی۔ صحابہ میں سے جس کو بھی لکھنا آتا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ لکھ بھی لیتا تھا۔ بعض صحابہ اس لیے بھی احادیث کو لکھنے کا خصوصی اہتمام کرتے تھے کہ اس طرح احادیث حفظ کرنے میں انہیں آسانی ہو جاتی تھی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا اس پر اسے سے کہ لے یاد کر لوں گا۔

كُنْتُ أَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ أَسْمَعُهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرِيدُ حِفْظَهُ
(ابوداؤد کتاب العلم)

حفظ میں آسانی کے علاوہ صحابہ کو سب سے زیادہ فکر اس بات کا رہتا تھا کہ میں کوئی غلط بات نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے ان کے پیش نظر ہر وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد رہتا تھا جس میں غلط بات منسوب کرنے والے کے لیے جہنم کی وعید سنائی گئی تھی پھر صحابہ کو یہ بات بھی پوری طرح مستحضر تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کرنا خدا پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے اور خدا پر جھوٹ باندھنے والے کو قرآن نے جابجا سب سے بڑا ظالم ٹھہرایا تھا اس قرآنی الزام اور وعید نبوی سے بچنے کی خاطر بھی صحابہ حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ احادیث کو لکھتے بھی جاتے تھے چنانچہ ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن عمرو کے ایک سوال کے جواب میں صحابہ کبار کی ایک جماعت نے اسی حقیقت کا اظہار بڑے واضح الفاظ میں فرمایا :

یہ سوال و جواب حضرت عبداللہ بن عمرو ہی کی زبانی سنئے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صحابہ کی ایک جماعت حاضر تھی ان میں بھی ان میں تھا اور میں سب سے چھوٹا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھتا ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنائے جب مجلس برخواست ہوئی تو میں نے صحابہ

كان عند رسول الله ناس من اصحابه وانا معهم وانا اصغرهم القوم فقال النبي صلى الله عليه وسلم من كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار فلما خرج القوم قلت

كَيْفَ تَحْدِثُونَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَقَدْ
سَمِعْتُمْ مَا قَالُوا وَانْتَهَرْتُمْ عَنْ كُنْ فِي
الْحَدِيثِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ فَضِيحًا وَقَالُوا يَا
ابْنَ أَخِيْنَا إِن كُلَّ مَا سَمِعْنَا مِنْهُ عِنْدَنَا
فِي كِتَابٍ (مجمع الزوائد)

لکھا کہ آپ نے حضور کے ارشاد کو سنا پھر آپ لوگ
حدیث بیان کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں صحابہ نے
ہنستے ہوئے جواب دیا اے بھتیجے ہم نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا ہے وہ ہمارے پاس
لکھا ہوا موجود ہے۔

یعنی لکھا ہوا ہونے کی بنا پر ہمیں پورا اطمینان ہے کہ ہم کوئی غلط بات آپ کی طرف منسوب کرتے کے
جرم کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں۔ اس روایت کے بیان کرنے والوں کے بارے میں ہاشمی نے تصریح
کی ہے کہ سب صحیح بخاری کے راوی ہیں :-

کاتبین حدیث | غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ کرام کی ایک واضح تعداد حدیث
نبوی کو حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ لکھ کر بھی محفوظ کرتی تھی صحابہ کا جو
طرز عمل قرآن کے بارے میں تھا کہ حفظ بھی کرتے تھے اور مختلف اجزاء میں لکھ کر بھی اسے محفوظ
کرتے جاتے تھے یہی طرز عمل احادیث کے بارے میں بھی تھا احادیث کو بھی حفظ اور کتابت
دونوں طریقوں سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اگر ان روایات کو پیشی نظر رکھا جائے جن سے معلوم
ہوتا ہے کہ بعض مخصوص صحابہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کتابت حدیث کی خصوصی
اجازت ملی ہوئی تھی تو بلا تکلف یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح قرآن کی کتابت کے لیے کاتبین
وحی مقرر تھے اسی طرح احادیث کی کتابت کے لیے بھی بعض صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
سے کاتبین حدیث کی حیثیت کے حامل تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ان لوگوں میں
شامل ہیں جن کو کتابت حدیث کی خصوصی اجازت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملی ہوئی
تھی اپنی اس اجازت کا سال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ وہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

عن عبد الله بن عمرو عن أبيه عن رسول
الله صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول

اللہ انی اريد ان اروي من حديثك
فاردت ان استعين بكتاب يدي
مع قلبي ان رايت ذلك فقال رسول
اللہ ان كان حديثك ثم استعين
بيدك مع قلبيك (سنن دارمی)

حاضر ہوئے اور عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ آپ کی
حدیثیں روایت کروں میرا ارادہ ہے کہ دل کے
ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ سے دل کی مدد بھی لوں اگر
آپ یہ پسند فرمائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا اگر میری حدیث ہو تو پھر اپنے دل کے
ساتھ اپنے ہاتھ سے بھی مدد لو (یعنی لکھ لیا کرو)

اس اہواز کے بعد معلوم ہوتا ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے کتابت حدیث میں اس قدر
انہماک سے کام لیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا اسے نلیم بند کر لیا چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں:

كنت اكتب كل شيء اسمعه
من رسول الله صلى الله عليه وسلم
أريد حفظه فمنعتني قرشي فقالوا
أنك تكتب كل شيء تسمعه من
رسول الله ورسول الله بشر
يتكلم في الغضب فامسكت
عن الكتابة فذكرت ذلك لرسول
الله صلى الله عليه وسلم فقال
اكتب والذي نفسي بيده
ما حرج مني الا الحق
(سنن دارمی)

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا
تھا اسے لکھ لیتا تھا اس ارادے سے کہ اسے
یاد کروں گا لیکن قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ
تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے ہو لکھ
لیتے ہو حالانکہ آپ بشر ہیں اور غصہ میں بھی کچھ
فرمادیتے ہیں میں نے (یہ سن کر) لکھنا ترک
کر دیا پھر میں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا جو مجھ سے سنا
کہ و ضرر نہ لکھ لیا کہ وہ اس کی قسم جس کی قدرت میں
میری جان ہے میری زبان سے حق کے علاوہ کچھ
نہیں نکلتا۔

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے متعلق
حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو دی ہوئی اجازت کو بحال رکھا وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے
اس امر کی بھی توثیق فرمادی کہ میری ہر ہر بات کو لکھ کر محفوظ کر لیا جائے اس توثیق نبوی کی

تائید مسند احمد کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک بار بڑی صراحت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا کہ

اَاُكْتُبُ كُلَّ مَا سَمِعْتُ قَالَ نَعَمْ
 قَالَ فِي الرِّضَى وَالْغَضَبِ قَالَ نَعَمْ
 فَاَنَّى لَا اَقُولُ فِي ذَلِكَ الْاِحْقَاقًا

(مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرو کی طرح حضرت رافع بن خدیج کو بھی بارگاہ نبوی سے کتابت حدیث کی اجازت ملی ہوئی تھی چنانچہ انہی سے روایت ہے کہ

قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ اَنَا نَسَمِعُ مِنْكَ
 اَشْيَاءً اَفَنُكْتُبُهَا قَالَ اَكْتُبُوا وَلَا
 حَسَبَ (کنز العمال)

ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ہم لوگ آپ سے بہت سی باتیں سنتے ہیں کیا انہیں لکھ لیا کریں آپ نے فرمایا لکھ لیا کرو کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت رافع بن خدیج کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ کتابت حدیث کی اجازت سے متعلق اس سوال میں دیگر صحابہ بھی شامل تھے اور بارگاہ نبوی سے سب سوال کرتے والوں کو کتابت کی اجازت مل گئی تھی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور خادم حضرت ابورافع نے بھی آپ سے احادیث لکھنے کی اجازت مانگی تھی اور آپ نے انہیں اجازت دے دی تھی۔ بارگاہ نبوی سے کتابت حدیث کی خصوصی اجازت حاصل کرتے والوں میں ان تذکرہ حضرات کے علاوہ حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت سمرہ بن جندب اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام صحابہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے اپنے مستقل صحیفے تیار کیے تھے اور جن کے صحیفوں کے متعلق احادیث کے موجودہ ذخیروں میں بھی اچھا خاصا مواد ملتا ہے ان کے صحیفوں کے بارے میں تفصیلی ذکر انشاء اللہ آگے مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

اب تک کتابت حدیث کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ بلاشبہ یہ ثابت کرنے

کے لیے بہت کافی ہے کہ صحابہ میں سے جس جس کو بھی ماکھنا آتا تھا وہ احادیث کو حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ قلم بند بھی کرتا تھا اور ان میں سے بعض حضرات نے ہارگاہ نبوی سے کثرت حدیث کی باقاعدہ اجازت بھی حاصل کی تھی :-

کتابت حدیث کی ممانعت پر مبنی روایات | اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کا بھی جائزہ لے

لیا جائے جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے کی ممانعت فرمادی تھی اگرچہ منکرین حدیث کا طرز عمل اس سے یکسر مختلف ہے وہ ان ممانعت حدیث والی روایات کو تو بہت نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں اور ان سے اپنے مزمومہ نتائج نکال نکال کر رادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں مگر ان احادیث کا ذکر تک نہیں کرتے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ یہ ایک علمی خیانت ہے جو منکرین حدیث ہی کو سمجھتی ہے جن کا مقصد محض اپنے مخصوص عزائم کو پورا کرتا ہے مگر ہمارا مقصود اثبات حق ہے اس لیے ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ ہم ان روایات کی بھی اصل حقیقت معلوم کیے بغیر آگے نہ بڑھیں جن کو ساندین حدیث کے متعلق بے اعتمادی پھیلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کے تمام اعتراضات کا اصل مدار حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس کو امام مسلم نے کتاب الزہد میں باب الثبت فی الحدیث و حکم کتابہ العلم کے تحت بیان کیا ہے اور جس کے الفاظ اس طرح پر ہیں :

عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ و حدثنی و لا حرج و من کذب علی متعمدا فلیتوبأ مقعداً من النار۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور اگر کسی نے سوائے قرآن کے مجھ سے کچھ لکھا ہے تو وہ مٹا دے البتہ میری حدیث کو نہ بانی روایت کرد اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مزید وضاحت انہی کی روایت کردہ اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امیشمی نے مجمع الزوائد میں مستند احمد سے نقل کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا ہم نے جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا اسے بیٹھے لکھ رہے تھے کہ آپؐ تشریف لائے اور فرمایا یہ کیا لکھ رہے ہو ہم نے عرض کیا وہ کچھ جو آپؐ سے سنتے ہیں آپؐ نے فرمایا کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ ایک اور کتاب (بھی لکھی جا رہی ہے) اللہ کی کتاب کو علیحدہ کر کو اسے خالص رکھو پس ہم نے جو کچھ لکھا اسے اکٹھا کیا اور جلادیا۔

عن ابی سعید الخدری قال کنا نعوذاً نکتب ما نسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فخرج علینا فقال ما هذا تکتبون فقلنا ما نسمع منك فقال اکتب مع کتاب اللہ فحضرنا کتاب اللہ واخلصوا قال فجمعنا ما کتباہ فحسبنا واحد ثم احرقناہ۔

اسی طرح کی ایک روایت حضرت ابوہریرہ سے بھی بیان کی جاتی ہے خطیب بخاری نے اس کو تقييد العلم میں نقل کیا ہے۔ روایت ہے

حضرت ابوہریرہؓ نے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم احادیث لکھ رہے تھے آپؐ نے فرمایا یہ تم کیا لکھ رہے ہو ہم نے کہا یہ وہ احادیث ہیں جو ہم نے آپؐ سے سنی ہیں آپؐ نے فرمایا اللہ کی کتاب کے علاوہ کوئی کتاب ہے کیا تم جانتے ہو کہ پہلی قومیں صرف اس وجہ سے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ ملا کر کتب لکھیں۔

عن ابی ہریرۃ انہ قال خرج علینا رسول اللہ ونحن نکتب الاحادیث فقال ما هذا الذی تکتبون قلنا احادیث نسعیھا منک قال کتاب غیر کتاب اللہ اندرون ما خلل الامر قبکم الا بما اکتبوا من الکتاب مع کتاب اللہ۔

انہی روایات کو بنیاد بنا کر متکرمین حدیث یہ ثابت کرتے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو قید تحریر میں لانے سے مطلقاً منع فرما دیا تھا اور پھر انہیں جو نتیجہ نکالتے

ہوئے ہیں کہ اس ممانعت کتابت سے آپ کا منشاء یہ تھا کہ احادیث کو محفوظ نہ کیا جائے
مبادا بعد کے لوگ احادیث کو بھی قابل محبت سمجھنے لگیں۔

منکرین حدیث کا غیر منطقی طرز عمل

علمائے کرام نے ان روایات کی جو توجہات پیش کی ہیں ان کا ذکر کرنے سے پہلے منکرین حدیث سے اس سلسلے میں ایک اہم بات کا فیصلہ کر لینا بہت ضروری ہے منکرین حدیث پہلے یہ بتلائیں کہ احادیث کی عدم کتابت کے ثبوت کے لیے اگر ان متذکرہ بالا روایات کا سہارا لیا جاسکتا ہے جیسا کہ انہوں نے لیا ہے تو تحریر و کتابت حدیث کو ثابت کرنے کے لیے ان روایات سے استشہاد کیوں نہیں کیا جاسکتا جو اسناد کے اعتبار سے اول الذکر روایتوں سے قوی تر ہی ہیں۔ وہ اگر روایات کی مدد سے کوئی بات ثابت کر رہے ہیں تو تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے اگر واقعی حقی کی تلاش ہے تو انصاف سے کیسے کیا اس غیر منطقی طرز عمل سے حتیٰ کا حصول ممکن ہے کہ پہلے اپنے طود پر ایک بات طے کر لی جائے اور پھر روایات کا جائزہ لیا جائے جو روایت اپنے مفروضے کی تائید کرتی ہوئی ہے اسے لے لیا جائے اور جس روایت سے اس مفروضے پر زد پڑتی ہو اسے ترک کر دیا جائے۔ ممانعت حدیث والی روایات پر بے بنیاد دلائل کی خواہ کیسے ہی فلک بوس علمیت تعمیر کر لیجئے اجازت حدیث والی روایات سے معاذ حق ہوتے ہی آپ کی اس عمارت میں ایسے رخنے پڑتے ہیں ایسی دراڑیں آتی ہیں کہ اس کی فلک بوسی زمین بوس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ آپ یا تو ان رخنوں اور ان دراڑوں کو پُر کر کے دکھائیے یا پھر اپنے مفروضہ نتائج پر مبنی بر خود غلط و عادی سے دست بردار ہو جائیے۔ پہلی بات تو یقیناً آپ کے بس کی نہیں اس لیے آپ کے لیے دوسری راہ اختیار کیے بغیر چارہ نہیں مگر ہمیں معلوم ہے آپ سے یہ بھی نہ ہو سکے گا جھوٹا فتوہ اور بے جا ضد ہمیشہ قبول حق کے راستے میں زبردست رکاوٹ بنے رہے ہیں آپ کی بھی یہی مجبوری ہے۔

منکرین حدیث کا معاملہ اللہ کے پُرورد کردہ سمجھے مگر جس کو حق کی تلاش ہے وہ خود سوچے روایات وہ بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کی

کتابت سے منع فرمایا تھا اور روایات وہ بھی ہیں اور وہ گزشتہ اوراق میں آپ کی نظر سے گزر چکی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ سے بعض صحابہ نے خصوصی طور سے احادیث لکھنے کی اجازت طلب کی اور آپ نے مرحمت فرمادی نہ صرف ایک بار مرحمت فرمادی بلکہ اس اجازت کو اس وقت بھی باقی رکھا جب بعض حضرات کو کتابت حدیث کی اجازت سے متعلق اصل منسلکے نبوی کے سمجھنے میں شبہ پیش آیا ہمارا اشارہ حضرت عبید اللہ بن عمرو سے مروی غصہ کی حالت میں کلام نبوی سے متعلق روایت کی طرف ہے جس کا تفصیلی حال ابھی گزر چکا ہے۔ ان دونوں قسم کی روایات کی موجودگی میں انصاف سے کہیے کیا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو منکرین حدیث نکالتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے سے کلی طور پر مطلقاً منع فرمادیا تھا۔ اگرچہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی ممانعت حدیث والی روایت کو امام بخاری نے موقوف علیہ قرار دیا ہے اور اس سے استدلال کو درست نہیں جانا اس لحاظ سے اجازت حدیث والی روایات زیادہ قوی ہو جاتی ہیں تاہم دونوں قسم کی روایات کو صحت کے اعتبار سے اگر ایک مقام پر بھی رکھا جائے تب بھی وہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا جو منکرین حدیث اپنے طور پر نکالنے بیٹھے ہیں۔ دونوں قسم کی روایات کی موجودگی میں ہم زیادہ سے زیادہ جس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جہاں آپ نے بعض صحابہ کو احادیث لکھنے سے منع فرمایا وہاں بعض صحابہ کو خصوصی طور سے لکھنے کی اجازت بھی دی گویا زیادہ سے زیادہ بزرگی ممانعت ثابت ہوتی ہے کلی ممانعت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی :

احادیث قلمبند کرنے کی ہدایت | ممانعت کیوں کی گئی تھی اور اجازت کیوں دی گئی تھی اس سلسلے میں یہ سیر حاصل تبصرہ اور

اصل حقیقت حال کی وضاحت تو ہم آگے چل کر کریں گے اس وقت تو ہمیں منکرین حدیث کے اس دعوے کا ابطال مقصود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے بالکل ہی منع فرمادیا تھا یہ دعویٰ ایک سفید جھوٹ سے زیادہ کچھ نہیں بس اتنی بات درست کی جاسکتی ہے کہ کتابت حدیث کی اگر ممانعت کی گئی تھی تو اجازت بھی دی گئی تھی بلکہ صرف اجازت ہی نہیں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے احادیث کو لکھ لینے کا باقاعدہ حکم فرمایا تھا ۔

چنانچہ حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

قَدْ طَافَ بِالْكِتَابَةِ (جائے بیان العلم) | علم کو لکھ کر مقید کرو۔

ی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قَدْ طَافَ بِالْكِتَابَةِ وَمَا تَقْيِيدُهُ قَالَ | علم کو مقید کر لے میں نے عرض کیا مقید کرنے سے کیا مراد ہے آپ نے فرمایا اس کو لکھ کر

ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے یہ چل رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے یہ شکایت کی کہ ہم آپ کی احادیث سننے میں مگر بھول جاتے ہیں تو آپ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اپنے دہانے ہاتھ سے مدد لیں یعنی ان کو لکھ لیا کرو۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ

انصار میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

و سلم کی مجلس میں بیٹھا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

حدیث سننا تو اسے پسند تھی مگر اسے یاد نہ رہتی

اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ذکر کرنے کی

شکایت کی اور عرض کیا اے اللہ کے رسول

میں آپ کی حدیثیں سننا ہوں اور وہ مجھے پسند

آتی ہیں مگر یاد نہیں رہتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا اپنے دہانے ہاتھ سے مدد لے اور

اپنے ہاتھ سے لکھنے کی طرف اشارہ فرمایا۔

كَانَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ يَحْسِنُ الْحَى .

رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَسْمَعُ

مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَدِيثَ

فَيَجِدُهُ لَا يَحْفَظُهُ فَشَكَاهُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي

لَا أَسْمَعُ مِنْكَ الْحَدِيثَ فَيَجْعَلُنِي وَلَا أَحْفَظُهُ .

فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اسْتَعِنْ بِمِعِينَتِكَ وَأَدْحَابِي بِالْخَطِّ

(فتح باب ماجاء في الوصية فيه)

کچھ الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ اسی قسم کی ایک روایت حضرت ابو ہریرہ سے ہی خلیف بغدادی نے تیسرا العلم میں بھی نقل کی ہے۔ حکیم کتابت حدیث کی پہلی دو روایتوں میں لفظ علم کی مختلف تعبیرات کی بحث چھوڑ کر منکرین حدیث ممکن ہے کہ ان جن کی کوشش کریں مگر حضرت ابو ہریرہ سے مروی یہ متذکرہ بالا روایتیں تو کتابت حدیث سے متعلق حکم بغوی کے ثبوت میں بہت ہی واضح ہیں۔ ان

روایات کی موجودگی میں ہر کوئی خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ منکرین حدیث کے اس دعوے میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی بالکل ممانعت فرمادی تھی۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اجازت کتابت اور حکم کتابت سے متعلق روایات ابتدائی زمانے کی ہیں اور ممانعت کتابت والی احادیث کا زمانہ بعد کا ہے اس لیے کہ مؤخر الذکر روایات کے بارے میں محدثین کا خیال ہے کہ آغاز ہجرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ محدث راہرزی نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے جبکہ اول الذکر روایات میں سے بعض کے بارے میں حتمی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان تعلق حجاز الوداع سے ہے چنانچہ وہ روایت اس پر شاہد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت میں حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دینے کا پورا واقعہ بھی نقل کیا گیا ہے تاہم ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا اور راوی نے حدیث میں ایک قصہ کا ذکر کیا تو ابو ہریرہ نے کہا اے اللہ کے رسول مجھے لکھوادے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو ہریرہ کے لیے لکھ دو۔

عن ابی ہریرۃ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ فَذَكَرَ قِصَّةً فِي الْحَدِيثِ فَقَالَ ابُو شَاةٍ اَكْتُبْ لِي يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْتُبْ لِي يَا شَاةٍ (ترمذی ابواب العلم باب فی الوضوء فیہ)

حکیم ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

ممانعت کتابت سے غلط استدلال | بہر حال ممانعت کتابت والی احادیث سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ہمیش کے لیے کلی طور پر احادیث لکھنے سے منع فرمادیا تھا۔ انہی

روایات سے منکرین حدیث یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ اس ممانعت کتابت سے منشاء نبوی یہ تھا کہ احادیث کو قید تحریر میں لاکر محفوظ نہ کیا جائے مبارکباد کے لوگ احادیث کو بھی حین میں حجت سمجھنے لگیں۔ ممانعت کی اصل حقیقت پر گفتگو کرتے سے پہلے آئیے منکرین حدیث کے اس دعوے کا بھی تجزیہ کرتے چلیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ دریافت طلب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منشا کا علم منکرین حدیث کو ہر کس طرح؟ کیا وہ کوئی ایسی روایت پیش کر سکتے ہیں جو اشارتاً ہی اس منشاء نبوی کا پتہ دیتی ہو؟ کیا یہ منشا منکرین حدیث کا خود تراشہ نہیں؟ کیا یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط بات منسوب کرنے کے مترادف نہیں؟ وہ بات جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول کسی فعل میں دور دور تک پتہ نہیں اس کو آپ کی منشا قرار دینا کیا بہتان طرازی کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ ممانعت کتابت سے متعلق روایات سے اخذ کردہ اس برنورد غلط نتیجہ کو منشاء نبوی کہہ کر کیا منکرین حدیث از خود اس ارشاد نبوی کی زد میں نہیں آگئے جس میں آپ کی طرف غلط بات منسوب کرنے والے کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے؟

منکرین حدیث اگر ذرا عقل سے کام لیتے تو ان کو اتنی روایات سے جن کو وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں حقیقت حال کا علم ہو جاتا اگر انہوں نے ان ممانعت کتابت پر مشتمل روایات ہی کو ذرا غور کی نظر سے دیکھ لیا ہوتا تو انہیں اتنی بڑی ٹھوکر بھی نہ لگتی وہ ایک غلط بات کو منشاء نبوی کبھی قرار نہ دیتے۔ منکرین حدیث کو دعوت فکر ہے وہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس روایت کو جو ان کے تمام دعاوی کا اصل ماخذ ہے آخر تک ذرا غور سے پڑھیں۔ اس روایت میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو اور اگر کسی نے کچھ لکھا ہے تو اسے چاہیے کہ اسے فوراً مٹا دے اس کے فوراً بعد آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ

میری حدیث کو زبانی روایت کرو اس میں کوئی سوج نہیں۔

وحدثوا عنی ولا حرج

اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ کی منشا یہ تھی کہ میری احادیث کو دین میں حجت نہ سمجھا جائے تو آپؐ زبانی روایت کو بھی ممنوع قرار دیتے زبانی روایت کی اجازت دینا تو یہ بتلا رہا ہے کہ آپؐ کی منشا اس کے برعکس تھی آپؐ کی خواہش تھی کہ لوگ اپنی دینی زندگی میں میری احادیث سے مستفید ہوتے رہیں اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کو دین میں حجت قرار دینا نہیں چاہتے تھے تو کتابت حدیث سے منع فرماتے وقت آپؐ کو بڑی صراحت کے ساتھ یہ فرمانا چاہیے تھا کہ میری احادیث کو زبانی بھی ہرگز ہرگز روایت نہ کرو مگر یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے کتابت حدیث کی ممانعت کے فوراً بعد آپؐ خصوصی طور پر احادیث کو زبانی روایت کرنے کی اجازت دیتے ہیں نہ صرف اجازت بلکہ فرماتے ہیں کہ زبانی روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں گویا اس متوقع غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں کہ ممانعت کتابت سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس سے مقصود حفاظت حدیث اور تبلیغ حدیث سے رکنا ہے احادیث کی سینہ بہ سینہ منتقلی جاری رہنی چاہیے۔

حیرت کی بات ہے منکرین حدیث جس روایت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں اس روایت کے ان الفاظ کو نو خوب نمایاں کر کے پیش کیا جا رہا ہے جن میں کتابت حدیث کی ممانعت کا ذکر ہے اور فوراً بعد آنے والے ان الفاظ سے عمداً آنکھیں بند کی جا رہی ہیں جو ان کے مفروضہ نتائج کا صریحاً رد کرتے ہیں۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ منکرین حدیث تحقیق و تلاش حق میں دیانت و امانت کے تقاضوں کا کس حد تک خیال رکھتے ہیں۔

منکرین حدیث کو اسی روایت کے آخری الفاظ بھی شاید نظر نہیں آئے ذرا سپرچ کر

بتلائیے اگر منشا یہ نبوی یہ ہے کہ احادیث کو دین میں حجت نہ ٹھہرایا جائے تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے کوئی بات نقل کرنے میں جھوٹ اور سپرچ کا امتیاز کیسا۔ پھر تو آپؐ کو یہ فرمانا چاہیے تھا کہ میری طرف منسوب کر کے کوئی بات بھی نقل نہ کرو آپؐ کا یہ فرمانا کہ من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار (جو شخص عمداً میری طرف جھوٹ بات منسوب کرتے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے) صاف بتلا رہا ہے کہ چونکہ احادیث کو دین میں حجت کی حیثیت حاصل ہے اس لیے جھوٹ بات منسوب کرنے سے دین میں خلل واقع ہوگا۔ خلل دین

سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ میری طرف نسبت کر کے جو بات بھی بیان کی جائے اس کے متعلق پورا یقین حاصل کر لیا جائے کہ وہ اپنے مفہم میں بالکل اسی طرح ہے جس طرح میں نے کہا تھا یا جس طرح کوئی کام میں نے کر کے دکھایا تھا۔

حجیت حدیث پر تفصیلی بحث تو انشاء اللہ اپنے مقام پر ہوگی مگر یہاں بھی اتنی بات تو منکرین حدیث ہمیں سمجھائیں کہ کتابت حدیث کی ممانعت سے اگر مقصود یہی تھا کہ دین میں احادیث کو حجیت کا مقام نہ حاصل ہو پائے تو پھر ان ارشادات نبوی کا آپ کیا مطلب لیں گے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بڑے ہی تاکید و انداز میں یہ ہدایت فرمائی کہ میری بات جس جس کے پاس پہنچتی رہے وہ آگے ان لوگوں تک پہنچاتا چلا جائے جن تک میری بات نہیں پہنچتی۔^۱ احادیث کے جس ذخیرے سے منکرین حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کی یہ کتابت حدیث کی ممانعت سے متعلق روایت نکال کر لائے ہیں اسی ذخیرے میں انہیں کیا یہ روایت نظر نہیں آئی الا فلیبلغ الشاهد الغائب (خبردار جو حاضر ہے اسے چاہیے میری باتیں ان تک پہنچاتا جائے جو غائب ہیں) یہ روایت تو صحاح کی تمام کتابوں میں موجود ہے تعصب کی عینک اترنے تو نظر آئے۔ اگر مقصود یہی تھا کہ احادیث نبوی سے امت مسلمہ مستفید نہ ہو تو اس تاکید و انداز میں تبلیغ احادیث کا حکم دینا کیا معنی۔ اگر کتابت حدیث کی ممانعت سے منشاء نبوی بھی تھا کہ احادیث کو حجیت نہ جانا جائے تو لازم تھا کہ احادیث کی حفاظت کرنے والوں کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حوصلہ شکنی فرماتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بالکل برعکس آپ ان لوگوں کی قدم قدم پر حوصلہ افزائی فرماتے ہیں جو احادیث کو محفوظ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے کام میں مصروف ہیں ایسے لوگوں کے لیے زبان نبوی پر بے اختیار دعائیں کلمات جاری ہو جاتے ہیں کبھی آپ فرما رہے ہیں اللہ اس شخص کو توفیق دے رکھے جس نے مجھ سے حدیث کو جس طرح سنا تھا اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیا۔ کبھی روایت حدیث کی ضرورت و اہمیت جتلانے کے لیے آپ اس حقیقت کا اظہار فرما رہے ہیں کہ قُرْبَ مَبْلَغِ ادْعٰی مِنْ سَامِعٍ^۲ (بسا اوقات مجھ سے سننے والوں کی نسبت حدیث کی حفاظت زیادہ

وہ کرتے ہیں جو ان سے منکر پہنچانے والے ہوتے ہیں) اور کبھی صحیح فہم حدیث کی فقہی ضرورت کو اذہان میں اُجاگر کرنے کے لیے ارشاد مہر رہا ہے قُرْبَ حَامِلِ فَتْحِ اِلٰی مَنْ هُوَ اَفْقَهُ صَدْرُ (بہت سے اہل فقہ حدیث کو ان لوگوں تک پہنچاتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہیں)۔ اگر منشاء نبوی حجیت حدیث کے حق میں نہیں تھا تو روایت حدیث کی اہمیت بتلانے کے بجائے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار ہونا چاہیے تھا احادیث کو فقہی ضرورت قرار دینے کے بجائے واضح الفاظ میں یہ بتلانا چاہیے تھا کہ احادیث کا فقہ اسلامی میں کوئی مقام نہیں۔ یہ تمام روایات منکرین حدیث کو احادیث کے کسی مجموعے میں نظر نہیں آتیں مگر کیا وہ حضرت ابو ہریرہؓ کی اس مشہور روایت سے بھی انکسین بند کر لیں گے جو صحاح کی عام کتابوں میں پائی جاتی ہے اور امام بخاری نے بھی باب حفظ العلم کے تحت اس کو بیان کیا ہے۔ اور جس میں حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنی قوتِ حافظہ کی شکایت بارگاہِ نبوی میں پیش کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے اس واقعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعجازی طور پر حضرت ابو ہریرہؓ کا حافظہ قوی کر دیا تھا سوال یہ ہے کہ اگر احادیث کی حفاظت و تبلیغ منظور نہ تھی تو حافظہ کو قوی کرنے کے بجائے اعجازی انداز میں اور زیادہ کمزور کیا جانا چاہیے تھا تا کہ احادیث کا سینہ بہ سینہ منتقلی کا دروازہ ہی بند ہو جاتا امت میں احادیث کا ذکر ہی پہنچنے نہ پاتا اور حجیت و عدم حجیت کی بحث ہی نہ چھڑتی۔

غرض کتابت حدیث کی ممانعت والی روایات سے منکرین حدیث کا نہ یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے کلی طور پر احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا اور نہ یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ ممانعت کتابت سے مقصود حفاظت و تبلیغ حدیث سے روکنا اور احادیث کے حجت ٹھہرا لیے جانے کے خدشے کو دور کرنا تھا۔

ممانعت کتابت کی اصل وجہ منکرین حدیث کے ان دونوں دعوؤں سے پیدا شدہ غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد اب ہمارے لیے ممانعت

۱۔ ابوداؤد باب فضل نشر العلم
۲۔ زیر نظر کتاب میں یہ واقعہ حفظ حدیث اور صحابہ کے
عنوان کے تحت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

کتابت پر مشتمل احادیث کے بارے میں اصل حقیقت حال تک پہنچنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ آئیے ان روایات کو دوبارہ بخور پڑھیں اور ان تمام توجیہات کی روشنی میں جو علماء نے کرام نے اس سلسلے میں پیش کی ہیں کتابت حدیث کی ممانعت سے جو اصل مقصود و منشاء نبوی تھا وہ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

علمائے کرام نے کتابت حدیث کی ممانعت سے متعلق روایات کی متعدد توجیہات پیش کی ہیں۔ ان تمام توجیہات کا باہم ترجیح و تطبیق کے نقطہ نظر سے اگر بخور مطالعہ کیا جائے تو درج ذیل دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو قلم بند کرنے سے مطلقاً منع نہیں فرمایا تھا بلکہ اس طور سے احادیث لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی کہ جس سے قرآن اور حدیث دونوں آپس میں خلط ملط ہو جائیں۔

(۲) دوم یہ کہ اس ممانعت سے مقصود قرآن اور حدیث کے درمیان ایک واضح امتیاز باقی رکھنا تھا متن اور عبارت کے لحاظ سے بھی اور احکام و نتائج میں فرق مراتب کے اعتبار سے بھی۔

قرآن اور حدیث میں امتیاز | حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کردہ احادیث پر ذرا دوبارہ نظر ڈالیے خصوصاً اس روایت کے الفاظ میں غور کیجئے جس کو ایشمی نے مجمع الزوائد میں مندا احمد سے نقل کیا ہے اِخْصُوا كِتَابَ اللَّهِ وَاخْلَصُوهُ (یعنی اللہ کی کتاب کو علیحدہ کر دو اور اسے خالص دے آمیز کرو) کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں کہ اللہ کی کتاب کی ساتھ کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ کرو یعنی مطلوب یہ نہیں ہے کہ احادیث کو بالکل نہ لکھو بلکہ مطلوب یہ ہے کہ قرآن کی ساتھ خلط ملط کر کے نہ لکھو۔ اسی روایت میں ان الفاظ سے پہلے جو سوال جواب صحابہ کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہوا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ قرآن اور حدیث کو یکجا کر کے اس طرح لکھ رہے تھے کہ دونوں میں کوئی حد فاصل کھینچنا مشکل تھا۔ غور فرمائیے صحابہ کو لکھنا ہوا دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے ہیں کہ کیا لکھ رہے ہو تو صحابہ جواب میں عرض

کرتے ہیں جو کچھ آپ سے سنتے ہیں یعنی قرآن اور حدیث میں سے جو کچھ آپ سے سنتے ہیں اسے لکھ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے قرآن و حدیث دونوں کو یکجا اس طرح لکھنا کہ دونوں میں کوئی امتیاز نہ ہو سکے وہی مقاصد کے لیے انتہائی ضرر رساں تھا اس لیے آپ نے روکا اس بات سے تھا کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب کو اس طرح نہ لکھو کہ دونوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ ”اَلْکِتَابُ مَعَ کِتَابِ اللّٰہِ“ کے الفاظ بھی یہی بتلا رہے ہیں کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی دوسری کتاب کے لکھنے سے روکنے مقصود ہے۔

مشہور محدث امام خطابی معالم السنن میں اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

آپ نے قرآن و حدیث کو ایک ہی صحیفہ میں لکھنے سے منع فرمایا تھا تا کہ کہیں خلط ملط نہ ہو جائے اور پڑھنے والا کسی شبہ میں نہ پڑ جائے تاہم نفس کتابت اور علم کو لکھ کر محفوظ کر لینا ہرگز ممنوع نہ تھا۔

اِنَّہٗ اَمَّا نَهٰی اَنْ یَّکْتُبَ الْحَدِیثُ مَعَ الْقُرْآنِ
فِی صَحِیْفَةٍ وَاحِدَةٍ لِئَلَّا یُخْتَلَطَ بِهِ وَلِیَسَّرَ
عَلٰی الْقَارِیْ فَاَمَّا اَنْ یَّکُوْنَ نَفْسُ الْکِتَابِ
مَحْظُوْرًا وَتَقْیِیْدُ الْعِلْمِ بِالْمَحْظُوْرِ مِنْہَا عَنہٗ
فَلَآ۔

محدث راہرزی نے بھی حضرت ابوسعید خدری کی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے کہ آپ نے کتابت حدیث کی ممانعت اس وقت فرمائی تھی جب قرآن و حدیث کے مل جانے کا خطرہ تھا۔ بات یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی کتابت مطلقاً منع نہیں فرمائی تھی بلکہ اصل حقیقت حال یہی تھی کہ بعض صحابہ کلام الہی اور کلام رسول دونوں کو ایک ہی ورق پر یا ایک ہی صحیفہ میں ساتھ ساتھ لکھ رہے تھے اس طرح خدشہ یہ تھا کہ قرآن و حدیث کہیں اس طرح خلط ملط نہ ہو جائیں کہ دونوں میں کوئی امتیاز ہی باقی نہ رہے جبکہ دونوں میں امتیاز باقی رہنا عبارت کے اعتبار سے بھی ضروری تھا کہ کلام الہی رسول کے کلام سے ملنس نہ ہو جائے اور احکام و نتائج کے اعتبار سے بھی لازمی تھا کہ دونوں کا فرق راتب برقرار رہے۔

قرآن اور حدیث اگرچہ دونوں دین کے سرچشمے ہیں۔ مگر ان دونوں سے پیدا ہونے والے احکام کے مطالبوں میں قوت و ضعف کا جو فرق ہے وہ محتاج بیان نہیں کون نہیں جانتا کہ تواتر و توارث کی جس راہ سے منتقل ہوتا ہو قرآن ہم تک پہنچا ہے اسی راہ سے منتقل ہونے والی وہ ساری چیزیں جو ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہیں یقین و اعتماد کا جو مقام قرآن کو اور ان چیزوں کو امت مسلمہ میں حاصل ہے وہ مقام ان چیزوں کو کہاں حاصل جن کے علم کا ذریعہ وہ حدیثیں ہیں جنہیں اصطلاحاً خبر اتحاد کہا جاتا ہے۔ ملازوال یقین و اعتماد سے بہرہ ور دین کا ازل الذکر حصہ یقیناً قرآن کی اپنی اصطلاح کے مطابق بینات کا درجہ رکھتا ہے جبکہ مؤخر الذکر حصے کو بینات کے مقابلے میں غیر بیناتی کہا جاسکتا ہے۔ دین کے ان دونوں حصوں سے پیدا ہونے والے احکام کے مطالبوں میں قوت و ضعف کا جو فرق ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔ اس فرق کو باقی رکھنے کے لیے بھی ضروری تھا کہ قرآن اور حدیث آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں اور دین کا وہ حصہ جس کو امت کی سہولت کے پیش نظر غیر بیناتی رکھنا مقسود ہے بینات کی شکل نہ اختیار کر لے۔

۱۔ دین کا بیناتی حصہ وہ اصول و کلیات ہیں جن کا انکار خود دین کا انکار ہے جبکہ دین کا غیر بیناتی حصہ ان فروع اور ان جزئیات پر مشتمل ہے جن سے اگرچہ دینی زندگی کی تعمیر کا کام لیا جاتا ہے لیکن ان سے نکل جانے پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آدمی دین سے نکل گیا۔ گویا دین کے بیناتی حصہ کی بنیاد قرآن کے بعد وہ احادیث ہیں جو تمام صحابہ اور تواتر و توارث عامۃ المسلمین کی راہ سے بغیر کسی انقطاع کے نقل و بدیل لاکھوں سالوں انسانوں کے ذریعے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں۔ اسی احادیث کی بنیاد پر تشکیل پلتے والے دین کے بیناتی حصے کی مقدار متعین کرنے کے لیے عقائد و ایمانیات کے سوا طہارت غسل وضو عبادات نماز روزہ حج زکوٰۃ معاملات عقوبات سیاسیات اور مباحات و محذورات وغیرہ و غیرہ مختلف ابواب سے ان اتھارٹی مسائل کا انتخاب کر لیا جائے جن پر امت اسلام کے تمام فرقے متفق ہیں اور جو ہر نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں تواتر کے ساتھ اس وحدانیت سے مسلم ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

مقصد پیش نظر اسی امتیاز کو برقرار رکھنا تھا، البتہ اس کے لیے آپؐ نے ظاہر ہے تدابیر مختلف اختیار فرمائی ہوں گی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع شروع میں چند مخصوص لوگوں کو احادیث لکھنے کی اجازت دی اور عام طور پر ممانعت فرمادی ممکن ہے آپؐ نے ان لوگوں کو اجازت دے دی ہو جو علم رسم الخط سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے اور ان کی تحریر کردہ باتوں میں غلطی اور شبہ کا امکان نہ تھا اور جو اس فن سے پوری طرح واقف نہ تھے انہیں منع فرمادیا ہو ابن قتیبہ نے ممانعت و اجازت کتابت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ بعض قرائن بھی اس کی تائید میں ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جن کو احادیث لکھنے کی اجازت دی گئی تھی سریانی و عبرانی رسم الخط میں مکمل مہارت رکھتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کتابت حدیث سے منع کرنے اور اجازت دینے میں آپؐ نے صحابہ کی قوت یادداشت کو ملحوظ رکھا ہو جن صحابہ کا حافظہ قوی تھا۔ ان کے لیے آپؐ نے یہ پسند فرمایا ہو کہ وہ اپنی اس

محنت سے پیوستہ

کہ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور یہی آپؐ کا طرز عمل تھا اگر پوری تلاش و جستجو سے کام لیا جائے تو اس قسم کے مسائل کی تعداد یقیناً ہزاروں سے متجاوز ہوگی۔ یہی دین کا بنیاتی حصہ ہے اس کے مقابلے میں دین کا غیر بنیاتی حصہ ان احادیث کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیقاً اور اراداً انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے تاکہ یہ احادیث اپنے مطالبوں کی قوت میں دین کے اول الذکر حصے کے برابر نہ ہو جائیں نہ دین اسلام کے بنیاتی اور غیر بنیاتی حصوں کے درمیان اس امتیاز نے ہی اسلام کو تمیز اور سہولت پسندانہ خصوصیت عطا کی ہے کہ عزم و ہمت رکھنے والے اگر چاہیں تو دین کے دونوں حصوں پر عمل پیرا ہو کر محبوبیت حق میں ترقی کرتے چلے جائیں اور عزم و ہمت سے محروم افراد اگر دین کے ان دونوں حصوں کے مطالبوں کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتے ہوں تو کم از کم دین کے بنیاتی حصے کی تعمیل کر کے ان ثمرات و نتائج سے تو محروم نہ رہیں جن کی توقع ایک مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنی آخرت کی زندگی میں رکھتا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب تدوین حدیث میں اس موضوع پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔

الحمد للہ بحوالہ توجیہ النظر للمعجز المہدی ص ۱

خدا داد قوت سے کام لیں اور احادیث کو لکھنے کے بجائے حفظ کریں اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو جن کی قوتِ حافظہ کمزور تھی کتابت کے فن سے مدد لینے کی ہدایت کی گئی اس خیال کو تقویت ان روایات سے بھی ملتی ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ بعض صحابہ نے سوءِ حفظ کی تسنیت کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے احادیث کو قلم بند کر لینے کی ہدایت کی۔ ابنِ جابر نے کتابتِ حدیث سے ممانعت پر مشتمل روایات کی یہی توجیہ کی ہے ان کا کہنا ہے کہ قرآن کے سوا حدیث لکھنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے منع کیا تھا کہ حفظِ حدیث پر زور دینا مقصود تھا۔

تدائیرِ نواہ کچھ بھی اختیار کی گئی ہوں مگر اتنی بات بالکل صاف ہے کہ کتابتِ حدیث سے ممانعت محض اسی مقصد کے پیشِ نظر تھی کہ کہیں قرآن اور حدیث ایک دوسرے میں خلط ملط نہ ہو جائیں چنانچہ یہ ممانعت اسی وقت تک رہی جب تک یہ قرآن و حدیث کے خلط ملط ہونے کا خطرہ باقی رہا جب قرآن کا اکثر حصہ نازل ہو گیا اور بہت سے صحابہ نے اسے حفظ کر لیا اور اس طرح احادیث سے اس کے انقباس کا کوئی خطرہ نہ رہا تو آپ نے حدیث نویسی کی کھلی اجازت دے دی وہ روایات جن سے کتابتِ حدیث کی عام اجازت مفہوم ہوتی ہے اسی بعد کے دور کی ہیں۔ محدثِ رامہر مزی کتابتِ حدیث کی ممانعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت آپ نے آغازِ ہجرت میں اس وقت فرمائی تھی جب قرآن و حدیث کے آپس میں ملتس ہو جانے کا خطرہ تھا لے لے کر صبحی صالح کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو قیدِ تحریر میں لانے سے آغازِ وحی میں منع فرمایا تھا کہ مبادا آپ کے اقوال و تشریحات اور سیرت قرآن سے خلط ملط ہو جائے اور دونوں میں کسی فرق و امتیاز کا امکان باقی نہ رہے۔

مولانا منظر احسن گیلانی اس بات سے تو اتفاق کرتے ہیں کہ کتابتِ حدیث سے ممانعت اسی مقصد کے پیشِ نظر تھی کہ قرآن اور حدیث سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج کے مطالبوں میں

قوت وضعف کا جو فرق ہے اسے قائم کیا جائے اس نکتہ کی وضاحت پر انہوں نے اپنی کتاب تدوین حدیث میں سیر حاصل بحث بھی کی ہے مگر وہ ممانعت کتابت کی اس توجیہ سے متفق نہیں ہیں کہ اس سے مقصود قرآن اور حدیث کی عبارات کے آپس میں خلط ملط ہو جانے کے اندیشے کو روکنا تھا۔

مولانا مناظر حسن گیلانی دراصل اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ممانعت کتابت کا حکم یکایک نہیں دے دیا گیا تھا بلکہ اس حال سے واقف ہونے کے بعد دیا گیا تھا کہ آپ سے ہر سنی ہوئی بات لکھی جا رہی ہے احادیث کی اس طرح کی عمومی اشاعت آپ کو پسند نہ تھی کیونکہ عہد نبوت ہی میں اگر مکتوب احادیث کے اس کثرت سے مجموعے تیار ہو جاتے تو ان سے بتدریج پیدا ہونے والے احکام و نتائج میں اور قرآنی آیات سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج میں کوئی فرق باقی نہ رہتا اور اس طرح دین کے احکام میں تنگی پیدا ہو جاتی مولانا کے نزدیک منشاء نبوی دراصل یہ تھا کہ ان احادیث کو چھوڑ کر جو قرآن کے عملی مطالبات کی تشکیلات اور اسی نوعیت کے حامل دین کے دوسرے بینائی احکام پر مشتمل ہیں عام احادیث کی تدوین اسی اہتمام سے نہ ہو جس اہتمام سے قرآن کی تدوین ہو رہی تھی نہ کہ عام احادیث کا سرمایہ قطعیت اور یقینی ہونے میں قرآن کے برابر نہ ہو جائے۔ مولانا کے خیال کے مطابق اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو عام طور پر لکھنے سے منع کر دیا اور قصداً و اراداً ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ قرآن کے مقابلے میں ان احادیث کا درجہ دوسرا ہو گیا ایسا دوسرا درجہ جس کی وجہ سے ان کے متعلق علماء کے اجتہاد کی راہیں کھل گئیں اور فقہاء کو فکر و نظر کے لیے وسیع میدان میسر آگیا اور اس طرح دین پر عمل کرنا آسان ہو گیا نیز انے والے زمانوں میں دین جمود کے خطرے سے محفوظ ہو گیا۔

مولانا مناظر حسن گیلانی کا یہ نقطہ نظر اپنی جگہ پر اگرچہ درست ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لیے انہوں نے ممانعت کتابت کی اس توجیہ کو رد کرنا کیوں ضروری سمجھا کہ اس سے مقصود قرآن و حدیث کے باہم خلط ملط ہو جانے کے اندیشے کو دور کرنا تھا حالانکہ یہ توجیہ ان کے نقطہ نظر کے ثبوت کے لیے تائید کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا کے یہ الفاظ کہ

”میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہر لکھی ہوئی چیز کو صحابہ یا ان کے بعد کے مسلمان قرآن کیوں سمجھ لیتے تھے“

اگرچہ صحابہ کی اکثریت کے معاملے میں بالکل مبنی پر حقیقت ہیں لیکن صحابہ کے درمیان بھی دینات سے تعلق رکھنے والے ایسے اصحاب کی موجودگی کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا جو گہری دینی بصیرت سے پوری طرح بہرہ ور نہ ہونے کی بنا پر کلام الہی اور کلام رسول کے درمیان امتیاز کرنے میں کسی شبہ کا شکار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ خطیب بغدادی کتبائت حدیث کی ممانعت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ابتداءً اسلام میں علم کو مکتوب کرنے سے اس لیے منع کیا کہ اس وقت اس بارے میں گہری بصیرت کی کمی تھی اور وحی وغیروحی میں امتیاز کرنے میں شبہ ہو سکتا تھا کیونکہ اکثر دیہاتیوں کو دینی بصیرت حاصل نہ تھی اور نہ وہ عارف علماء کے پاس بیٹھتے تھے اس کا اندیشہ تھا کہ وہ دیگر صحیفوں کو قرآن سے ملحق کر دیتے اور یہ سمجھنے لگ جاتے کہ جو کچھ ان میں ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔

وَنَهَى عَنْ كِتَابِ الْعِلْمِ فِي صِدْرِ الْإِسْلَامِ
لِقَلَّةِ الْفُقَهَاءِ فِي ذَلِكَ الْوَقْتِ وَالْمَيِّزِينَ
بَيْنَ الْوَحْيِ وَغَيْرِهِ لِأَنَّ أَكْثَرَ الْأَعْدَابِ
لَمْ يَكُونُوا فَفُهِمُوا فِي الدِّينِ وَلَا جَالِسُوا
الْعُلَمَاءَ الْعَارِفِينَ فَلَمْ يُؤْمِنُوا أَنَّ
يَلْحَقُوا مَا يَجِدُونَ مِنَ الصَّحَفِ
بِالْقُرْآنِ وَيَعْتَقِدُوا أَنَّ مَا اشْتَمَلَتْ
عَلَيْهِ كَلَامُ الرَّحْمَنِ

(تفہیم العلم)

جب نزن اول میں یہ خدشہ موجود تھا کہ بعض لوگ قرآن اور غیر قرآن کو باہم ملتبس نہ کر دیں تو ان کے بعد کے مسلمانوں کا معاملہ تو اور بھی زیادہ معرض خطر میں ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی وحی الہی کے اولین مخاطبین کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے اوراق بعد میں آنے والوں کے لیے یقین و

قطعیّت کے کس مقام پر ہوتے اور وہ اوراق جن میں قرآن اور حدیث یکجا لکھے ہوئے ہوتے کیسے کیسے شبہات کو دعوت دیتے اور کتنے عظیم فتنے کا سبب بن جاتے۔ حذرت ابو سعید خدریؓ کی روایت میں جو یہ آتا ہے کہ لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ سب ایک جگہ لا کر جمع کیا اور نذر آتش کر دیا یہ سب کچھ اسی عظیم فتنے کے سد باب کے لیے تھا کہ بن کے آنے والے کہیں قرآن اور حدیث کو باہم ملا نہ دیں۔

بہر حال کتابت حدیث کے موافق و مخالف قرآن پر اس تفصیلی گفتگو کے بعد شکوک و شبہات کے وہ بادل پوری طرح چھٹ گئے ہیں جو عدم کتابت کے ثبوت کی ناکام کوشش میں منکرین حدیث کے اٹرائے ہوئے غبار سے وجود میں آسکتے تھے اور ہمارے اس دعوے کے لیے فضائل و صفات ہو گئی ہے جو ہم نے اس موضوع پر گفتگو کی ابتدا کرتے وقت کیا تھا کہ احادیث کا اکثر حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور آپ کے بعد کے متصل زمانے میں ہی قید تحریر میں آچکا تھا۔ آئیے اب حقیقت حال کے آئینے میں اس دعوے کا اصل عکس دیکھنے کی کوشش کریں :

مکثرین صحابہ کے مکتوب ذخیرے | سب سے پہلے ہم ان صحابہ کے مکتوب
ذخیروں کا جائزہ لیتے ہیں جو مکہ میں کی
صف میں شمار ہوتے ہیں یعنی جن کی مرویات کی تعداد ایک ہزار سے اوپر ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کا تحریری ذخیرہ

مکثرین صحابہ میں سرفہرست حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں آپ سے پانچ ہزار تین سو چوبیس (۵۳۷۴) احادیث مروی ہیں۔ فقہ اسلامی میں جن تین ہزار احادیث پر مدار احکام ہے ان میں سے پندرہ سو احادیث حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہیں۔ اب وہ شواہد ملاحظہ کیجئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جتنی روایات بھی حضرت ابو ہریرہؓ مروی ہیں وہ سب کی سب مکتوب صورت میں آپ کے پاس محفوظ تھیں۔

تھامع بیان العلم میں حافظ ابن عبد البر نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جو مشہور صحابی

حضرت عمرو بن امیہ ضمیرؓ کے صاحبزادے حضرت حسن کے الفاظ میں اس طرح پر ہے کہ

أُحَدِّثُ عِنْدَ أَبِي هُرَيْرَةَ بِحَدِيثٍ
فَأُنْكِرُهُ فَقُلْتُ إِنِّي قَدْ سَمِعْتُهُ مِنْكَ
فَقَالَ إِن كُنْتَ سَمِعْتَهُ مِنِّي فَهُوَ
مَكْتُوبٌ عِنْدِي فَأَخَذَ بِيَدِي إِلَى
بَيْتِهِ فَأَرَانَا كِتَابًا كَثِيرَةً مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ
ذَلِكَ الْحَدِيثَ فَقَالَ قَدْ أَخْبَرْتُكَ إِن
كُنْتَ حَدَّثْتُكَ بِهِ فَهُوَ مَكْتُوبٌ عِنْدِي

میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے
ایک حدیث بیان کی انہوں نے اس کا انکار کیا میں
نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ ہی سے
سنا ہے بولے اگر تم نے مجھ سے حدیث سنی ہے تو
پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی پھر انہوں نے
میرا لاکھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے مجھے انہوں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی
کتابیں دکھائیں۔ انہی میں وہ حدیث بھی پائی گئی
حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا میں نے تم سے کہا نہ
تھا کہ میں نے اگر تم سے کوئی حدیث بیان کی تھی
تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔

اس واقعے کو سرسری نظر سے پڑھتے ہوئے نہ گزر جائیے غور کیجئے حضرت ابو ہریرہ کا یہ فرمانا کہ
”اگر تم نے مجھ سے کوئی حدیث سنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی“ صاف یہ بتلا رہا
ہے کہ جو کچھ آپ روایت کرتے تھے وہ سب آپ کے پاس مکتوب صورت میں محفوظ تھا اور
یہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوبیس ہے اس کا مطلب یہ
ہوا کہ پانچ ہزار سے اوپر احادیث حضرت ابو ہریرہ کے پاس لکھی ہوئی موجود تھیں پھر
راوی کا یہ کہنا بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے مجھے حدیث کی بہت سی کتابیں دکھائیں
معلوم ہوا یہ تحریری ذخیرہ صرف چند اوراق پر مشتمل نہ تھا بلکہ کتابوں کی ایک کثیر تعداد تھی اس
سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کی تمام مرویات کتابی شکل میں محفوظ تھیں۔
اس واقعے میں کسی شک و شبہ کی بھی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ حافظ ابن حجر نے بھی اس
واقعہ کو فتح الباری میں نقل کیا ہے اگرچہ اس کی سند مختلف ہے۔ اس کے علاوہ حضرت
ابو ہریرہؓ کی مرویات کے مکتوب ہونے پر اس سے قوی تر ایک اور شاہد بھی موجود ہے۔

سنن دارمی حدیث کی ایک مستند کتاب ہے اور اس کا درجہ صحاح ستہ کی اکثر کتابوں سے بلند ہے ملا علی قاری نے صحاح ستہ میں ابن ماجہ کے بجائے سنن دارمی کو شامل کرنے کی رائے دی ہے اس کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات کا ایک نسخہ ان کے شاگرد بشیر بن نیک نے تیار کیا تھا نہ صرف تیار کیا تھا بلکہ پڑھ کر حضرت ابو ہریرہؓ کو سنایا بھی تھا۔ بشیر بن نیک ہی سے روایت ہے فرماتے ہیں :

میں حضرت ابو ہریرہؓ سے جو حدیثیں سنا کرتا تھا وہ لکھ لیا کرتا تھا میرا جب ارادہ ان سے الگ ہونے کا ہوا تو کتاب ان کے پاس لے کر آیا اور ان کے سامنے پڑھ گیا اور پھر میں نے ان سے کہا کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو آپ سے میں نے سنی ہیں فرمایا ہاں

کُنْتُ أَكْتُبُ مَا أَسْمَعُ مِنَ الْحَبِ
هَرِيرَةَ فَلَمَّا أَرَدْتُ أَنْ أَفَارِقَهُ أَتَيْتُهُ
بِكِتَابِهِ فَقَرَأْتُهُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ لَهُ
هَذَا مَا سَمِعْتُهُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ۔

اس روایت کے الفاظ بھی یہی بتا رہے ہیں کہ حضرت بشیر بن نیک نے جو کچھ حضرت ابو ہریرہؓ سے سنا تھا سب کچھ فلم بند کر لیا تھا اور پھر لکھ کر حضرت ابو ہریرہؓ سے گویا اس کی تصدیق بھی کر لی تھی ظاہر ہے حضرت بشیر کا یہ مجموعہ اس مجموعے کے علاوہ تھا جو حضرت ابو ہریرہؓ نے از خود اپنے لیے تیار کیا ہوا تھا اور جس کا ذکر ابھی حافظ ابن عبد البر کے حوالے سے گزرا ہے۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات کے یہ دو نسخے علیحدہ علیحدہ تیار ہو گئے تھے بلکہ ان رد کے علاوہ ایک اور نسخہ کا ثبوت بھی حدیث کی کتابوں سے ملتا ہے جس کو حضرت ابو ہریرہؓ کے ایک اور شاگرد حضرت ہمام ابن منبہ نے تیار کیا تھا اور انہی کے نام پر صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہے امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی مسند میں شامل کیا ہے امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں اس کو نقل کیا ہے۔

ان شواہد کی روشنی میں اتنی بات بہر حال یقینی ہو گئی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی تمام مرویات کتابی شکل میں محفوظ تھیں گویا یہ شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ پانچ ہزارین سوچو ہتر احادیث قرن اول ہی میں فلم بند ہو چکی تھیں۔

عہد نبوت اور قرن صحابہ میں حدیث کے جن مکتوب ذخیروں کی موجودگی کا ہم جائزہ لینے

لگے ہیں ابھی اس کی صرف ابتدا ہی ہوئی ہے۔ ابھی صرف ایک صحابی کی مرویات کا تذکرہ ہوا ہے مگر اس پہلے قدم ہی پر ہم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا اکثر و غالب حصہ قرن اول ہی میں قید تحریر میں آچکا تھا اس لیے کہ اول درجے کی صحیح احادیث کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور پانچ ہزار تین سو چوبیس کا عدد دس ہزار کے عدد کا یقیناً اکثر و غالب حصہ ہے۔

احادیث کی صحیح تعداد | صحیح حدیثوں کی تعداد کے بارے میں دس ہزار کا عدد منکر شاید بعض ناواقف حضرات کو حیرانی ہو رہی ہو مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اول درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچ پاتی اور یہ بات یونہی بے سند نہیں کہی جا رہی بلکہ ہمارے پاس اس کے لیے سند موجود ہے۔ تمام کتابوں سے چھان بین کر کے امام حاکم نے جو تعداد صحیح حدیثوں کی بیان کی ہے وہ یہی ہے ان کے الفاظ ہیں :

<p>الاحادیث التي في الدرحة الاولى لا تبلغ عشرة آلاف (بجاء توجیه النظر ص ۹۳)۔</p>	<p>اعلیٰ درجے کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہنچ پاتی۔</p>
--	---

اسی سے اندازہ لگائیے کہ صحیح بخاری میں صحیح سند کے ساتھ جو حدیثیں مروی ہیں ان کی تعداد بمشکل دو ہزار چھ سو کے قریب ہے اور صحیح مسلم کی حدیثوں کی کل تعداد چار ہزار ہے جبکہ اس میں اکثریت ان روایتوں کی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں مشترک ہیں۔ بتلائیے حدیث کی یہ دو بڑی کتابیں ہیں ان دونوں کی صحیح حدیثوں کی مجموعی تعداد تین چار ہزار سے آگے نہیں بڑھتی۔ مؤطا امام مالک کو بھی شمار کر لیجئے جسے اصحیحین کہا جاتا ہے اس میں صحیح سند کے ساتھ مروی احادیث صرف چھ سو ہیں۔ غرض اعلیٰ درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد کسی طرح بھی دس ہزار کے عدد تک پوری نہیں پہنچتی دس ہزار سے کم ہی رہتی ہے اور یہ دس ہزار سے کم کی تعیین بھی امام حاکم کے قول کے مطابق ہے جن کی تنقید کا معیار سب جانتے ہیں کہ اتنا سخت نہیں ہے۔

حقیقت سال سے ناواقف بعض حضرات کی سمجھ میں ممکن ہے یہ بات پوری طرح نہ اپاری ہو اور ان کے ذہنوں میں وہ لاکھوں کے ہند سے گھوم رہے ہوں جو مختلف محدثین کے تذکروں

میں وہ سنتے چلے آئے ہیں کہ فلاں فلاں محدث کو اتنے اتنے لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ (اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اصل صورتِ حال کی وضاحت ہو جائے) :

دو بنیادی باتیں | احادیث کی صحیح تعداد کا تعین کرنے سے پہلے دو بنیادی باتوں کا سمجھ لینا انتہائی ضروری ہے۔ اول یہ کہ محدثین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ احادیث کو متون کے اعتبار سے نہیں بلکہ ان کے طریقوں اور ان کی سندوں کے اعتبار سے گنتے تھے یعنی اگر کوئی حدیث دس طریقوں سے روایت ہوئی ہے تو محدثین کے نزدیک وہ ایک حدیث نہیں رہی بلکہ دس حدیثیں بن گئیں۔ دوم یہ کہ حدیث کا اطلاق ابتداء میں اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ کے افعال اور آپ کی تقریرات پر ہی کیا جاتا تھا مگر بعد میں صحابہ کے اقوال و فتاویٰ اور ان کے مختلف فیصلوں کو بھی حدیث ہی کے ضمن میں داخل سمجھا جانے لگا بلکہ اس کے بھی بعد کے زمانے میں تو تابعین اور تبع تابعین تک کے اقوال پر بھی حدیث کے لفظ کا اطلاق کیا جانے لگا :

ان دونوں بنیادی باتوں کا اگر لحاظ رکھا جائے تو حفاظِ حدیث کی طرف منسوب احادیث کے سلسلے میں بیان کیے جانے والے لاکھوں کے ہندسوں کی اصل حقیقت سمجھنے میں کوئی دشواری نہ رہے گی۔

توابع و شواہد | دراصل صحابہ سے روایت کرنے والے محدثین کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک ہی روایت کو جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو سب سے سنا جائے۔ اس طرح ایک روایت اگر کسی نے مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی سنی ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی تو اپنی عبارت اور اپنے متن کے اعتبار سے تو وہ اگرچہ ایک ہی حدیث ہے مگر محدث جب اسے ان تینوں سے روایت کرے گا تو یہی کہا جائیگا کہ اسے تین حدیثیں یاد ہیں۔ گویا ایک حدیث کی تین حدیثیں بن گئیں شروع شروع میں تو یہ سلسلہ مختصر ہی رہا مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا راویوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ہر راوی کی یہ کوشش رہی کہ جتنے شیوخ و اساتذہ سے کوئی حدیث حاصل کی جا سکے اس میں کمی نہ کی جائے چنانچہ ایک ایک حدیث کے راویوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ دراصل کسی حدیث کے راویوں کی

تعداد جس قدر بڑھتی جاتی تھی اسی قدر اس حدیث کی قطعیت اور اس کے یقینی ہونے میں قوت بڑھتی چلی جاتی تھی اس لیے ہر محدث اپنی روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ راویوں کی تلاش کرتا تھا۔ اس طریق عمل کا نام محدثین کی اصطلاح میں متابعت ہے اور جو حدیثیں اس طرح جمع کی جاتی ہیں انہیں توابیح و شواہد کہا جاتا ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ توابیح و شواہد جمع کرنے کا شوق شدید ہوتا گیا اور راویوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اندازہ کیجئے ایک مشہور حدیث ہے **اَلْمَا لَا اَعْمَالُ بِالْاَنْبِیَاتِ** یہ کہنے کو تو ایک حدیث ہے مگر اس کے راویوں کی تعداد سات سو سے بھی منبجوز ہے اور اس طرح محدثین کی نظر میں یہ ایک حدیث نہیں بلکہ سات سو حدیثیں ہیں اور یہ کسی ایک حدیث کی بات نہیں بلکہ ذخیرہ حدیث کے بیشتر حصے کا یہی حال ہے۔ یہ جو ہم امام احمد بن حنبل اور امام ابو ذر عہ جیسے حفاظ حدیث کے بارے میں سنتے ہیں کہ انہیں سات لاکھ سے اوپر احادیث یاد تھیں یا امام بخاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں دو لاکھ کے قریب غیر صحیح اور ایک لاکھ کے قریب صحیح احادیث زبانی حفظ تھیں یا اسی طرح امام مسلم اپنی صحیح کے بارے میں خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کانوں سے سنی ہوئی تین لاکھ احادیث سے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بڑے بڑے اعداد جو مختلف محدثین کی طرف منسوب ہیں ان کا راز یہی ہے کہ یہ سب اعداد حدیثوں کے متن اور عبارت کے اعتبار سے نہیں بلکہ سند اور طریقہ کے اعتبار سے ہیں راویوں کے ناموں میں ہماں کہیں لفظ دو لفظ کا اضافہ یا تبدیلی ہوئی حدیث کے عدد میں اضافہ ہو گیا اس طرح سے ایک حدیث چند لفظوں کے فرق سے سات سات سو کے عدد تک شمار ہوتی چلی گئی۔ احادیث کی تعداد کے سلسلے میں جو لاکھوں کے ہند سے نظر آنے ہیں وہ زیادہ تر اسی بنا پر ہیں۔ یا پھر حدیثوں کے عددی اضافہ کی بنیاد وہ توسع اور کشادگی ہے جو بعد کے دور میں حدیث کے لفظ کے اطلاق کے بارے میں اختیار کر لی گئی اور جس کا ذکر دوسرے درجے کے عامل کے طور پر ابھی اوپر ہوا ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال و فتاویٰ نیز تابعین و تبع تابعین تک کے ملفوظات کو اصطلاحاً حدیث میں شامل سمجھا جانے لگا۔ انہی دو بنیادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحب توجیہ النظر لکھتے ہیں :

إِنْ كَثُرَ مَنْ الْمُتَقَدِّمِينَ كَأَنْ يَطْلُقُونَ
اسْمَ الْحَدِيثِ عَلَى مَا يَشْمَلُ آثارَ الصَّحَابَةِ
وَالْمُتَابِعِينَ وَتَابِعِيهِمْ وَفَتَاوَهُمْ
وَيَعْدُونَ الْحَدِيثَ الْمُرَوِّىَ بِإِسْنَادٍ
حَدِيثِيٍّ۔

اکثر متقدمین حدیث کے لفظ کا اطلاق
ایسے عام مفہوم پر کرتے تھے جس میں صحابہ
تابعین اور تبع تابعین کے آثار و فتاویٰ سب
اسی داخل ہیں نیز ایک ہی حدیث جو دو سندوں
سے مروی ہوتی اسے دو حدیث قرار دیتے۔

احادیث کی تعداد میں لاکھوں کے ہندسوں کی بنیاد انہی دو وجوہ کی بنا پر ہے۔ ورنہ
جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی معیار حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی
نہیں پہنچتی۔ صحیح کے ساتھ حسن ضعیف ہر قسم کی تمام حدیثیں جو اس وقت صحاح ستہ
مسند احمد اور دو سہی کتابوں میں موجود ہیں ان سب کو بھی اگر ملا لیا جائے تب بھی تمام
حدیثوں کی تعداد پچاس ہزار تک بھی مشکل پہنچتی ہے یہ بھی اس وقت جبکہ اس میں
جعلی اور موضوع احادیث بھی شامل کر لی جائیں۔ علامہ ابن جوزی سے بڑھ کر کسی کا بیان
قابل اعتماد ہو سکتا ہے انہوں نے اپنی کتاب صیdanخراطر میں فصل ۷۵ کے تحت
احادیث کے اس عددی مغالطے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

انہ لوجع الصحیح والمحال والموضوع
وکل منقول عن رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ما بلغ خمسين الفا۔

صحیح حدیثوں کے ساتھ ان ساری بے بنیاد جھوٹی
اور گھڑی ہوئی جعلی حدیثوں کو بھی جمع کر لیا جائے
جو کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو وہ بھی پچاس ہزار
تک نہیں پہنچتیں۔

ابن جوزی کے قول کو ممکن بنانے کی تشدد پسندی اور تنقید کے معیار میں سختی اختیار کرنے
کی بنا پر درخور اعتنا نہ سمجھا جائے لیکن علامہ جلال الدین سیوطی کی سہولت پسندی اور تنقید
کے معیار میں نرمی تو سب کو معلوم ہے انہوں نے اپنی کتاب جمع الجوامع میں تمام حدیثوں کو جمع
کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کتاب میں احادیث کی تعداد پچاس ہزار سے کہیں کم ہے۔
بکہ دُور کیوں جائیے کنز العمال نامی کتاب سے کون واقف نہیں یہ جمع الجوامع ہی کی نفی ترتیب

ہے اس کے مؤلف ہندوستان کے مشہور محدث علی متقی ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں نہ صرف صحیح ابوحامد کی کل حدیثیں موجود ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو صحیح ابوحامد میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں۔ اب سنئے کنز العمال میں صحیح شدہ احادیث کی کل تعداد چالیس ہزار نو سو اسیٹھ ہے اور یہ بھی اس وقت ہے جبکہ اس کتاب میں ابھی مکررات موجود ہیں غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ صحیح اعلیٰ معیاری حدیثوں کی تعداد اگر دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی تو ضعیف و حسن و صحاح سب کو ملانے کے بعد تیس ہتیس ہزار سے آگے ان کی تعداد کا بڑھنا مشکل ہے البتہ موضوعات کو ملا لینے کے بعد شاید پچاس ہزار تک یہ تعداد پہنچ جائے۔

۔ ہر حال چونکہ اعلیٰ درجے کی صحیح احادیث دس ہزار سے کم ہی ہیں اس لیے حضرت ابوہریرہ کی پانچ ہزار تین سو چوہتر روایات کا مکتوب صورت میں محفوظ ہو جانا ثابت ہو جانے کے بعد ہمارا یہ دعویٰ پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ احادیث کا اکثر وغالب حصہ قرن اول ہی میں قلم بند ہو چکا تھا مگر ابھی ہمیں بہت کچھ کہنا ہے ابھی تو مکثرین صحابہ میں سے صرف ایک صحابی کی روایات کا ذکر ہوا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا کتابی مجموعہ | مکثرین صحابہ میں سے دوسرے نمبر پر حضرت عبداللہ بن عباس کا نام آتا ہے ان سے روایت ہونے والی احادیث کی تعداد دو ہزار چھ سو ساٹھ (۲۶۶۰) ہے۔ متعدد شواہد ایسے موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی روایات کا مجموعہ ان کی زندگی ہی میں قلم بند ہو چکا تھا۔

طبقات ابن سعد کی یہ روایت بہت مشہور ہے حدیث کا کوئی طالب علم بھی اس سے بے خبر نہ ہو گا کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی جب وفات ہوئی تو جو علم انہوں نے چھوڑا وہ اتنی کتابوں کی صورت میں تھا کہ ایک اُونٹ کا بوجھ بنتا تھا۔ اے حافظ ابن حجر عسقلانی نے

بھی تہذیب التہذیب میں موسیٰ بن عقبہ کا بیان نقل کیا ہے وہ فرماتے تھے :

میرے پاس عبداللہ ابن عباس کے غلام
کرینے ابن عباس کی کتابیں رکھوائی تھیں
جو ایک یا نصف بار شتر تھیں۔

وضع عندنا کرب د مولیٰ عبد اللہ بن
العباس حمل بعیرا و عدل بعیر من
کتب ابن عباس (تہذیب جلد ۵)

علم کا یہ کتابی مجموعہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث فلم بند کرنے میں حضرت عبداللہ بن عباس کا عالم یہ تھا
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافع کے پاس پہنچتے اور
حیات نبوی سے متعلق ایک ایک دن کا حال تفصیل سے پوچھتے جاتے اور لکھتے جاتے۔
الکتانی کی وہ روایت اس پر شاہد ہے جو انہوں نے روایانی کی مسند سے بسند متصل نقل
کی ہے اس کے الفاظ ہیں :

ابن عباس ابورافع کے پاس آتے اور کہتے کہ
فلاں دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا
کیا اور ابن عباس کے ساتھ ایک شخص ہوتا
جو ان باتوں کو لکھتا جاتا۔

کان ابن عباس یأتی ابورافع فیقول
ما صنع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یوم کذا مع ابن عباس من یکتب ما
لیقول (الکتانی)

طبقات ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہ ابن عباس نے احادیث نبوی بہت سی
تختیوں پر بڑے اہتمام کے ساتھ لکھی ہوئی تھیں جب آپ کی غفلت میں جاتے تو یہ تختیاں اپنے ساتھ
لے کر جاتے۔ حضرت ابورافع کی بیوی حضرت سلمیٰ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ
ان تختیوں میں وہی علم تھا جو حضرت عبداللہ ابن عباس نے حضرت ابورافع سے حاصل کیا
تھا۔ روایت ہے :

رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ مَعَ السَّوَّاحِ يَكْتُبُ
عَلَيْهَا عَنِ ابْنِ رَافِعٍ شَيْئًا مِنْ
نَعْلِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ

(الکافی بحوالہ طبقات ابن سعد)

میں نے ابن عباس کو دیکھا کہ ان کے پاس تختیاں
ہیں جن پر وہ ابورافع کی بیان کی ہوئی ان روایتوں
کو لکھا کرتے تھے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے افعال کے متعلق بیان کیا کرتے تھے۔

یہ تمام شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے اپنی تمام مرویات اپنے
طور پر لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھیں۔ اب کچھ ایسے شواہد بھی ملاحظہ کر لیجئے جن
سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی مرویات کے کچھ نسخے آپ کے شاگردوں اور دوسرے لوگوں نے
بھی تیار کیے ہوئے تھے۔

سنن دارمی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے ممتاز ترین شاگرد سعید بن جبیرؓ
نے اپنے استاد کی مرویات کے متعدد صحیفے تیار کیے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس
باقاعدہ ان کو املا کرتے جاتے اور وہ لکھتے جاتے۔ انہماک کا عالم یہ ہوتا کہ لکھتے لکھتے اگر کاغذ
ختم ہو جاتا تو اپنے کپڑوں پر اور اپنے جوتوں پر ہی لکھنا شروع کر دیتے۔ بعض اوقات کچھ
نہ ملتا تو اپنی سہیلی پر ہی لکھ لیتے اور پھر اپنے گھر جا کر اپنے صحیفوں میں درج کر لیتے۔ حضرت
سعید بن جبیر کے اس انہماک کو دیکھ کر اور اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ حضرت عبداللہ
ابن عباس کے علم کے یہ سب سے بڑے راوی ہیں یہ یقین کر لینے میں کوئی امر مانع نہیں کہ
حضرت عبداللہ بن عباس کی شاہد ہی کوئی حدیث ایسی ہو جو ان کے ہاتھوں تحریر میں
آنے سے رہ گئی ہو۔ علم ابن عباس پر مشتمل یہ صحیفے ڈاکٹر صبحی صالح کے بیان کے مطابق
مدت مدید تک منداول رہے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے بیٹے حضرت علی ان صحیفوں
سے استفادہ کرتے ہوئے دیکھے گئے۔

علم علوم الحدیث و مصطلح

حضرت عبداللہ بن عباس کی مرویات کے مکتوب ہونے پر ایک اور شہادت آپ کے مشہور آزاد کردہ غلام حضرت عکرمہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

<p>حضرت ابن عباس کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے پڑھنے لگے۔</p>	<p>أَنَّ لَفْرًا قَدَمَرَ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ مِنْ أَهْلِ الطَّائِفِ بَكْتَبٍ مِنْ كُتُبِهِ فَجَعَلَ يَقْرَأُ عَلَيْهِمْ (كتاب العل)</p>
--	---

حضرت عکرمہ کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے خاص خاص شاگردوں کے علاوہ کچھ دوسرے اصحاب نے بھی آپ سے روایت کردہ احادیث کے مجموعے تیار کیے ہوئے تھے اور یہ مجموعے ایک دوہیں بلکہ متعدد تھے کتب کا لفظ یعنی جمع کا صیغہ ہی بتلاتا ہے۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مختلف مجموعے حضرت عبداللہ بن عباس کی زندگی ہی میں تیار ہو چکے تھے اور آپ سے ان کی تصدیق بھی کرائی جا چکی تھی۔

حضرت عائشہؓ کی مرویات کا مکتوب ذخیرہ | مکتوب صحابہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ

عنها تبصرے نمبر پر ہیں۔ محدثین نے ان کی روایت کردہ حدیثوں کی تعداد دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) بتائی ہے۔ عورتوں میں سب سے زیادہ احادیث حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی سے مروی ہیں۔ اگرچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اپنے متعلق تو یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے خود اپنی مرویات کا کوئی مجموعہ تیار کیا تھا یا نہیں مگر یہ ضرور ثابت ہے کہ آپ کے براہ راست شاگرد اور حقیقی بہن کے لڑکے حضرت عروہ بن زبیر نے یقیناً اپنے علم کو ایک کتاب میں محفوظ کیا تھا جس میں ظاہر ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی مرویات ہی ہوں گی کیونکہ حضرت عروہ بن زبیر کا شمار ان لوگوں میں ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایتوں کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ ان کا تو سارا سرمایہ ہی اپنی خالہ سے حاصل کیے ہوئے علم میں منحصر تھا۔ حضرت عروہ کے اس مکتوب مجموعے کا ثبوت ان کے اس واقعے سے ملتا ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں واقعہ حرہ کے سلسلے میں نقل کیا ہے کہ جب مدینہ

ٹوٹا اور برباد کیا گیا تو غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے اپنے اس مجموعے کو قصداً ضائع کر دیا مگر بعد میں اپنی اس بلد بازی پر تائید پکڑتے رہے۔ اپنے اس مکتوب مجموعے کے ضائع ہو جانے کا حضرت عروہ کو اس قدر افسوس تھا کہ اکثر فرمایا کرتے :

<p>اچھا ہوتا کہ میں اپنے اہل و عیال اور اپنے مال کو اس کتاب پر قربان کر دیتا۔</p>	<p>لَوَدِدْتُ اَنْفِثْتُ كَنْتُ فَدَيْتُهَا بِأَهْلِي وَفَالِي</p>
---	--

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کے امین جس طرح مردوں میں حضرت عروہ بن زبیر تھے اسی طرح عورتوں میں حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن تھیں۔ حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن کے علم کے مکتوب ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے ان کے علم کو ان کے بھانجے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن خزیمہ نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے اس مشہور فرمان کی بنیاد پر قلم بند کر لیا تھا جس کا ذکر امام بخاری نے بھی کیا ہے۔ اس طرح حضرت عائشہ کی مرویات ایک مرتبہ مکتوب ہونے کے بعد اگر حضرت عروہ کے ہاتھوں ضائع ہو گئی تھیں تو آپ کی خاتون شاگرد حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن کے واسطے سے دوبارہ تحریری صورت میں جمع ہو گئیں۔ حضرت عمرہ نے حضرت عائشہ صدیقہ کی گود میں پرورش پائی تھی۔ مشہور محدث شیخ ابن مدینی کا قول ہے کہ عمرہ حضرت عائشہ کی مستند حدیثوں کی جاننے والی تھیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ کے تیسرے مشہور شاگرد اور آپ کی مرویات کے امین آپ کے بھتیجے حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر ہیں ان کے علم کو بھی حضرت عمر بن عبد العزیز کے فرمان پر ابوبکر بن محمد بن عمرو بن خزیمہ نے ہی قلم بند کیا تھا۔ حضرت عمرہ اور حضرت قاسم کے علم کو جمع کرنے کا حکم دیتے ہوئے حضرت عمر بن عبد العزیز نے لکھا تھا :

<p>عمرہ بنت عبد الرحمن اور قاسم بن محمد کے علم (حدیثوں) کو وہ ان کے لیے لکھ کر تیار کریں۔</p>	<p>أَنْ يَكْتُبَ لَهُ مَنْ الْعِلْمُ مِنْ عِنْدِ عُمَرَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ وَالْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ (بخاری)</p>
---	---

حضرت قاسم کے علم کا زیادہ تر مدار حضرت عائشہ ہی کی مرویات پر تھا کیونکہ ان کے والد محمد بن ابی بکر ان کے بچپن کے زمانے ہی میں مشہور فتنے میں شہید ہو چکے تھے ان کے بعد ان کی تمام تر کفالت حضرت عائشہ نے اپنے ذمے لے لی تھی اور اپنے اس یتیم بھتیجے کی بڑی شفقت سے تعلیم و تربیت کی تھی۔ بہر حال حضرت قاسم کی راہ سے بھی حضرت عائشہ کی مرویات مکتوب ہو کر محفوظ ہو گئیں :

حضرت عائشہؓ کے بعد حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا نمبر آتا ہے ان کی روایات کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیس (۱۶۳۰) ام المومنین۔ حضرت حفصہؓ کے بھائی ہونے

کی حیثیت سے آپ کو چونکہ حرم نبوی میں آمد و رفت کی سہولت حاصل تھی نیز آپ اسلام بھی بہت پہلے لا چکے تھے اس لیے آپ کو احادیث نبوی سے استفادے کا خوب خوب موقع ملا۔ السنۃ قبل التذوین کے مصنف محمد عجّاج الخطیب نے الجّامع للاخلاق الراوی واداب السامع کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس اپنی روایات کا مکتوب ذخیرہ موجود تھا۔ لکھا ہے

روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر جب کبھی بازار نکلتے تو اپنی کتابوں کو دیکھ لیتے راوی تاکید کرتے ہیں کہ ان کی کتابیں احادیث پر مشتمل تھیں۔

يُرْوَى أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ إِذَا خَرَجَ إِلَى السُّوقِ نَظَرَ فِي كُتُبِهِ وَقَدْ أَكَّدَ الرَّادِيُّ أَنَّ كُتُبَهُ هَذِهِ كَانَتْ فِي الْحَدِيثِ.

کتب کا لفظ اس روایت میں بھی قابل غور ہے گویا ایک دو کتابیں نہیں بلکہ متعدد کتابیں تھیں جو حضرت ابن عمر نے اپنی مرویات کی تیار کی ہوئی تھیں راوی نے اس بات کی بطور خاص صراحت کی ہے کہ یہ کتابیں احادیث نبوی پر مشتمل تھیں حضرت ابن عمر کے اس ذاتی مکتوب ذخیرے کے علاوہ بھی آپ کی مرویات آپ کے گمراہ راست شاگرد حضرت نافع کے واسطے سے تحریری شکل میں محفوظ ہو گئی تھیں۔ اس کے ثبوت کے لیے شہادت کے طور پر سنن دارمی کی وہ روایت پیش کی جاسکتی ہے جس میں سلمان بن موسیٰ کے حوالہ سے یہ کہا گیا ہے کہ

اللّٰهُ رَأٰى نَافِعًا مَوْلٰى ابْنِ عُمَرَ عَلٰى
عِلْمِهِ وَيَكْتُبُ بَيْنَ يَدَيْهِ -

انہوں نے حضرت ابن عمر کے آزاد کردہ غلام حضرت
نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہے ہیں۔

طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ حضرت نافع حضرت عبداللہ ابن عمر کے آزاد
کردہ غلام اور چہیتے شاگرد تھے اس قدر چہیتے کہ حضرت ابن عمر کبھی کبھی فرمایا کرتے :

لقد منّ اللّٰهُ عَلَيْنَا بِنَافِعٍ (تہذیب) | اللہ نے نافع کی صورت میں ہم پر احسان کیا ہے

یہ تیس برس تک مسلسل حضرت ابن عمر کی خدمت میں رہے اس طویل عرصے میں حضرت عبداللہ
ابن عمر کے علم سے کیا کچھ مستفیض نہ ہوئے ہوں گے۔ ان کے علم کا مکتوب ہو جانا یقیناً حضرت
ابن عمر کے علم کا مکتوب ہو جانا ہے :

حضرت جابر کے صحیفے | مکثر بن صحابہ میں سے اب صرف ایک دو ہی کا ذکر باقی رہ
گیا ہے انہی میں حضرت جابر بن عبداللہ ہیں ان کی مرویات

کی کل تعداد ایک ہزار پانچ سو چالیس (۱۵۴۰) ہے۔ اب ان کی مرویات کے قلم بند
ہونے کا حال سنئے۔ جہاں تک ان کے اپنے ذاتی مجموعے کا تعلق ہے اتنی بات یقینی ہے کہ انہوں
نے بھی ایک صحیفہ رقم کیا ہوا تھا۔ اس صحیفے کی ضخامت معلوم ہوتا ہے سورہ بقرہ کے برابر
یا اس سے کچھ زیادہ ہی تھی کیونکہ مشہور تابعی قتادہ بن دعامة السدوسی جہنور نے اس
صحیفہ کو حفظ کیا ہوا تھا کہا کرتے تھے :

جابر کا صحیفہ تو مجھے سورہ بقرہ سے بھی زیادہ
اندر ہے -

لانا بصحيفة جابر احفظ مني من
سورة البقرة (تاریخ الکبیر۔ امام بخاری)۔

حضرت قتادہ ابن دعامة کے اس قول سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ یہ صحیفہ کافی ضخیم تھا وہاں یہ بھی
پتہ لگا کہ یہ صحیفہ لوگوں میں عام طور پر مشہور بھی تھا حضرت قتادہ کے بات کرنے کا اندازہ یہی
بتلا رہا ہے اس صحیفے کی موجودگی کا ثبوت صحیح مسلم کی اس روایت سے بھی ملتا ہے جس میں
ذکر ہے کہ حضرت جابر کا صحیفہ حج کے مناسک پر مشتمل تھا۔

حضرت جابرؓ کے اس ذاتی مجموعے کے علاوہ ایسے شواہد بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ کے شاگردوں نے بھی اپنے استاد کی مرویات کے مجموعے تیار کیے تھے۔ چنانچہ ان کے مشہور شاگرد سلمان بن تیسؓ الیشکری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت جابرؓ کی روایتوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور شعبی و سفیان جیسے بڑے بڑے محدثین نے اس مجموعے کو سلمان بن تیسؓ کی زبان سے لفظ بہ لفظ سنا بھی تھا۔ صاحب تقييد العلم نے محدث ابو سفیان کا ایک قول نقل کیا ہے کہ سلمان حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھا نہیں کرتا تھا۔

اسی طرح حضرت جابرؓ کے دوسرے مشہور شاگرد وہب بن منبہ کے بارے میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت جابرؓ جب مسجد نبویؐ کے حلقہٴ درس میں اپنے شاگردوں کو حدیثیں لکھوایا کرتے تو وہب بن منبہ وہ حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ اس روایت سے حضرت جابرؓ کی مرویات حضرت وہب بن منبہ کے ہاتھوں مکتوب ہو جانے کا ثبوت تو ملتا ہی ہے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ اپنے تلامذہ کو باقاعدہ حدیثیں لکھوایا کرتے تھے اس طرح نہ جانے کتنے شاگردوں نے اپنے استاد کی مرویات کو لکھ کر محفوظ کر لیا ہو گا۔ مسجد نبویؐ میں حضرت جابرؓ کے حلقہٴ درس کے بارے میں تو الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ میں بھی ہشام بن عروہ کی ایک روایت موجود ہے کہ

<p>مسجد نبویؐ میں حضرت جابر بن عبد اللہ کا ایک حلقہٴ درس تھا جس میں ان سے لوگ علم حاصل کرتے تھے۔</p>	<p>كان لجابر بن عبد الله حلقه في المسجد النبوي يؤخذ عنه العلم (امباہ جلد ۱ ص ۳۳)</p>
--	--

اس حلقہٴ درس میں شریک ہوتے والوں میں مشہور تابعی محمد بن الحنفیہؓ، محمد بن علی ابو جعفر الباقرؓ اور عبد اللہ بن محمد عقیل جیسی ہستیوں کے نام آتے ہیں ان تینوں حضرات کے بارے میں ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ تینوں حضرت جابرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر احادیث نبویہ کے

بارے میں دریافت کرتے اور لکھا کرتے تھے۔

حضرت انس کا تحریری مجموعہ | مکثرین صحابہ کی فہرست میں سے ابھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنا باقی ہے حضرت

انس رضی اللہ عنہ ہی سے لکھنے کے فن سے خوب واقف تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہونے کی بنا پر دربار نبوی میں ہمہ وقت حاضری بھی نصیب تھی اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھنے کا خوب نوب موقع ملا آپ نے نہ صرف احادیث لکھیں بلکہ لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تصدیق کے لیے پیش بھی کیں۔ حاکم نے مستدرک میں سعید بن ہلال سے روایت کیا ہے کہ

ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ سے زیادہ پوچھ گچھ لگاتے تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنیں اور ان کو لکھا اور لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔

كَثَرَا إِذَا اكْتَوَى عَلَى أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فَاخْرَجَ إِلَيْنَا
فَجَالًا عِنْدَهُ فَقَالَ هَذِهِ سَمِعْتُهَا
مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فَكُتِبَتْهَا وَعَرَضْتُهَا عَلَيْهِ

اسی بات کو خطیب بغدادی حضرت قتادہ سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں :

وہ حدیثیں لکھ لیا کرتے اور جب لوگ زیادہ آ جاتے تو کتابوں کا ایک چونگہ نکال کر ڈال دیتے اور فرماتے یہ ہیں وہ احادیث جو میں نے رسول اللہ سے سنی ہیں انہیں لکھا ہے اور حضور کے سامنے پیش کیا ہے۔

كَانَ يَمْلِكُ الْحَدِيثَ حَتَّى إِذَا اكْتَرَى
عَلَيْهِ النَّاسُ جَارِعًا لِمَا لَمْ يَكُنْ يَلْقَاهَا
ثُمَّ قَالَ هَذِهِ أَعْلَفْتُ سَمِعْتُهَا وَكُتِبَتْهَا عَنْ
رَسُولِ اللَّهِ وَعَرَضْتُهَا عَلَيْهِ (تقييد العلم)

ہر حال ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ نے احادیث کو صرف قلم بند ہی نہیں کیا تھا اصلاح و تصحیح کی غرض سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش بھی کیا تھا اس لحاظ سے شاید یہ واحد صحابی ہیں کہ جن کا مجموعہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تصدیق و توثیق شدہ تھا۔

یہ تحریری مجموعہ تو وہ تھا جو حضرت انسؓ نے خود تیار کیا تھا اس مجموعے کے علاوہ بھی بعض مجموعے آپ کے شاگردوں نے بھی تیار کیے تھے مثلاً دارمی میں سلم العلوی سے روایت ہے کہ

رَأَيْتُ ابَانَ يَكْتُبُ عِنْدَ أَنَسٍ فِیْ سُبْرَةٍ | میں نے ابان کو دیکھا کہ وہ حضرت انسؓ کے پاس بیٹھے کاپی میں حدیثیں لکھتے تھے۔

شاگردوں کے علاوہ گمانِ اغلب ہے کہ آپ کی اولاد نے بھی آپ کی روایات کے مجموعے تیار کیے ہوں گے کیونکہ دارمی ہی میں ان کے بیٹوں کے بارے میں جن کی ایک بڑی تعداد تھی ایک روایت ہے کہ حضرت انسؓ اپنے بیٹوں سے اکثر فرمایا کرتے

يَا بَنِيَّ تَبَيَّنْ وَهَذَا الْعِلْمُ | میرے بچو اس علم حدیث کو قید تحریر میں لے آنا کرو۔

مکثرین صحابہ میں سے اب صرف حضرت ابوسعید خدریؓ کا ذکر باقی رہ گیا ہے ان کے بارے میں اگرچہ کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے معلوم ہو سکے کہ ان کی روایات قلم بند ہوئی تھیں یا نہیں مگر متذکرہ بالا مکتوب ذخیروں کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ بھی اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہ رہے ہوں گے۔ یہی منکرین حدیث کی پھیلانی ہوئی یہ غلط فہمی کہ انہیں احادیث لکھنے سے منع کر دیا گیا تھا اس لیے انہوں نے کوئی حدیث قلم بند کی ہی نہیں تو اس کی اصل حقیقت ممانعت کتابت پر گفتگو کرتے ہوئے واضح کی جا چکی ہے۔

مکثرین صحابہ کے جن تحریری ذخیروں کا اب تک ذکر ہوا ہے ان کی موجودگی میں نہ کہ کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں کہ عہد نبوت و عہد صحابہ میں حدیث کا دار و مدار صرف حفظ پر نہ لا تحریری شکل میں اس ذخیرے کو محفوظ نہیں کیا جاسکا یہ مکتوب ذخیرے اس بات کا

مَٹے بولتا بیٹوت ہیں کہ احادیث صحیحہ کا اکثر وغالب حصہ ہی نہیں تمام تر حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور اس کے متصل زمانے میں ہی قید تحریر میں آکر سینوں کے ساتھ ساتھ سفینوں میں بھی پوری طرح محفوظ ہو چکا تھا۔ اور ابھی تو یہ مکتوب ذخیرے بھی صرف مکتوبین صحابہ کی مرویات تک محدود رہے ہیں ابھی تو ایسے کئی صحیفوں کا ذکر ہمیں کرنا ہے جو مکتوبین صحابہ کے علاوہ دیگر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں نیز ان صحف کے علاوہ ابھی ان خطوط، معاہدوں، امان ناموں اور جاگیر و قطائع کے قرائین کا ذکر بھی باقی ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لکھوایا ہے اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

کتابت حدیث کے سلسلے میں جو کچھ اب تک کہا گیا ہے وہ اگرچہ ان شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے بہت کافی ہے جو حدیث کو عامۃ المسلمین کے اعتماد سے محروم کرنے کے لیے اس کے غیر محفوظ ہونے کے بارے میں منکرین حدیث کی طرف سے بڑے شد و بد سے اچھالے جاتے ہیں تاہم کتابت حدیث سے متعلق ہماری بات ابھی پوری نہیں ہوئی اس لیے اب ہم مزید چند ایسے قابل ذکر صحیفوں کی نشاندہی کرنے لگے ہیں جو مکتوبین کے علاوہ دیگر صحابہ کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں وہ صحیفے بھی ہیں جو بعض صحابہ نے اپنے طوط پر رقم کیے اور وہ صحیفے بھی ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مخصوص حالات میں بعض لوگوں کو خود لکھوا کر عطا فرمائے :

صحیفۃ الصادقہ

ان صحف میں سے جس صحیفہ کا ذکر اولیت کا منتقاضی ہے وہ صحیفۃ صادقہ ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے تیار کیا تھا۔ آپ غالباً سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے احادیث کو کتابی شکل دی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے آپ کو دربار نبوی سے کتابت حدیث کی خصوصی اجازت ملی ہوئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور جو کچھ زبان نبوی سے نکلتا لکھ لیتے اس طرح آپ نے ایک مستقل کتاب تیار کر لی اور باتا عہد اس کو الصادقہ کے نام سے موسوم

کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب تدرین حدیث میں حوالہ دے بغیر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ نام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا تھا اگرچہ تلاش بسیار کے باوجود ایسی کوئی روایت نہیں مل سکی تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر و خود اس کتاب کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ ابن اثیر جزیری نے اسد الغابہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا یہ قول نقل کیا ہے :

صادقہ ایک صحیفہ ہے جو میں نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھا ہے اس میں وہ کچھ ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا اور میرے اور ان کے درمیان جس میں کوئی واسطہ نہیں۔

الصَّادِقَةُ صَحِيفَةُ كُتُبِهَا مِنْ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ هِيَ
الصَّادِقَةُ فِيهَا مَا سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَيْسَ بَيْنِي
وَبَيْنَهُ أَحَدٌ۔

حدیث کی اکثر کتابوں میں اس صحیفہ کا تذکرہ ملتا ہے امام احمد نے لو اپنی مستند میں اس سے جو کمازوں نقل کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں مشہور جلیل القدر تابعی حضرت مجاہد کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے یہ صحیفہ عبداللہ بن عمرو کے پاس دیکھا تھا اُسے نیز حضرت عبداللہ بن عمرو کے پوتے عمرو بن شعیب کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ اس صحیفہ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ سنن دارمی میں بھی اس صحیفہ کا تذکرہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن الحارث کے اپنے الفاظ میں اس طرح ہے :

مجھے زندگی و دُحیروں کی وجہ سے عزیز ہے ایک
صادقہ کی بنا پر اور ایک و صطہ (نامی زمین)
کی بنا پر۔ صادقہ وہ صحیفہ ہے جو میں نے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (سُن کر) لکھا
..... الخ

ما یرغبنی فی الحیوة الاٰخصلتان
الصادقة والوهطه فانا الصادقة
نصحیفة کتبتہا عن رسول اللہ
الخ۔ (سنن دارمی جلد ۱)۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو یہ صحیفہ عزیمت
 تھا اور کیوں نہ ہوتا زندگی بھر کی کمائی تھی۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ جب بھی آپؓ سے کوئی
 شخص الیا مسئلہ پوچھتا جس کا جواب نہ پائی آپؓ کو یاد نہ ہوتا تو آپؓ اس صحیفے سے دیکھ کر وہ
 مسئلہ بتاتے معلوم ہوتا ہے ہر قسم کے مسائل و احکام پر مشتمل احادیث اس صحیفے میں موجود
 تھیں۔ اس صحیفے میں احادیث کتنی تعداد میں تھیں اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاتا۔
 اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی کل مرویات کی تعداد سات سو بتائی جاتی ہے لیکن
 اسد الغابہ میں ابن الاثیر جزری نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے تذکرے میں نقل کیا ہے
 کہ صحیفہ صادقہ میں ایک ہزار احادیث تھیں مگر یہ قول بھی مرجوح نظر آتا ہے اس لیے کہ صحیح بخاری
 میں منقول حضرت ابو ہریرہؓ کے اس اعتراف کو اگر مد نظر رکھا جائے جس میں انہوں نے حضرت
 عبداللہ بن عمروؓ کو اپنے سے زیادہ حدیثوں کا حامل مانا ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ صحیفہ
 صادقہ میں ایک ہزار سے کہیں زیادہ احادیث مرقوم تھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے:

صاحبہ میں مجھ سے زیادہ کثیر الروایات اور کوئی نہ
 تھا البتہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا معاملہ جداگانہ
 نوعیت کا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حدیثیں لکھ
 لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

ما من أصحاب رسول الله أحد أكثر
 حديثاً عنه مني إلا ما كان من
 عبد الله بن عمرو وفاته كان
 يكتب ولا يكتب۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ پانچ ہزار تین سو چوبیس ہیں تو اس کا
 مطلب یہ ہوا کہ اس روایت کی روشنی میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی مرویات پانچ ہزار تین سو
 چوبیس سے یقیناً زیادہ ہونی چاہئیں اور زیادہ بھی دو چار نہیں بلکہ خاصی تعداد میں ہونی چاہئیں
 اس لیے کہ عام محاورے میں اکثر کے لفظ سے دو چار عدد کی زیادتی کبھی مقصود نہیں ہوتی بلکہ
 اکثر کا لفظ معقول تعداد کی زیادتی کو چاہتا ہے گویا احادیث صحیحہ کی جو تعداد بتائی گئی ہے
 اس کے قریب قریب تعداد کے برابر احادیث تھیں جو حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے تھے
 اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھ لیتے تھے اس لیے یہ خیال

کرنا غلط نہ ہوگا کہ صحیفہ صادقہ میں دس ہزار کے قریب قریب احادیث مرقوم تھیں اس طرح احادیث کا اگر کوئی اور تحریری ذخیرہ نہ بھی ہوتا تب بھی صحیفہ صادقہ ایکلا ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ عہد نبوت ہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی اتنی بڑی مقدار خود آپ کے حکم سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے ہاتھوں قلم بند ہو چکی تھی ۔

صحیفہ حضرت علی بخاری مسلم اور صحاح کی دوسری کتابوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک صحیفے کا ذکر پایا جاتا ہے جسے وہ اپنی تلوار کی بنیام میں رکھا

کرتے تھے۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں حضرت ابو جحیفہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا

میں نے حضرت علی سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے فرمایا نہیں مگر کتاب اللہ یا وہ فہم جو ہر مسلمان کو عطا کیا گیا یا وہ کچھ جو اس صحیفے میں ہے۔

ثَلَاثٌ يَغْلِيْهَا هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ قَالَ لَا اِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ اَوْ فِهْمٌ اَعْطٰهُ جَلِيٌّ مِّسْلًا اَوْ مَا خِفَ هَذِهِ

الصَّحِيفَةُ

اسی طرح امام مسلم اپنی صحیح میں کتاب الحج کے تحت ایک روایت لائے ہیں جس کو ابو ایہم البیہمی نے اپنے والد سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

ہمیں حضرت علی نے خطبہ دیا تو فرمایا ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں ہے جس کو ہم پڑھتے ہیں سوائے اللہ کی کتاب کے اور اس کے جو اس صحیفے میں ہے۔

خَطْبَنَا عَلِيٌّ فَقَالَ مَا عِنْدَنَا كِتَابٌ نَقْرَأُ اِلَّا كِتَابَ اللّٰهِ وَمَا خِفَ

هَذِهِ الصَّحِيفَةُ

اسی صحیفہ کے مندرجات کے بارے میں مختلف روایات میں مختلف احکام پر مشتمل احادیث کا ذکر کیا گیا ہے بعض روایات میں غلاموں اور قیدیوں کے آزاد کرنے کے احکام کا ذکر ہے بعض میں جراحات و دیت کے احکام اور اونٹوں کی زکوٰۃ کا حوالہ ہے اور بعض نے حرم مدینہ سے متعلق احکام کو خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ اس صحیفے میں مسلمان، کافر اور معاہد کے قصاص سے متعلق احکام پر مشتمل احادیث تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس صحیفے

میں شریعت کے متعدد اہم مسائل تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو لکھ کر دیئے تھے۔ ان متفرق احکام و مسائل کا حوالہ یہ بھی بتلا رہا ہے کہ یہ صحیفہ کافی ضخیم تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

کو یہ صحیفہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عطا فرمایا تھا چنانچہ ابن شہاب کہتے ہیں کہ میں نے منبر پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ فرماتے سنا تھا کہ

واللہ ہمارے پاس پڑھنے کی کوئی کتاب نہیں ہے
سوائے اللہ کی کتاب کے اور اس صحیفے کے جو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمایا اور
اس میں احکامِ زکوٰۃ ہیں۔

واللہ ما عندنا کتابٌ نقرءُ علیکم
الا کتابُ اللہ تعالیٰ و ہذہ الصحیفۃ
اعطانیہا رسول اللہ فیہا فرائض
الصدقۃ۔ (مسند احمد)

مسند احمد میں ہی ابو طفیل سے بھی اسی قسم کا ایک قول منقول ہے کہ جب حضرت علی سے یہ دریافت کیا گیا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص کیا عطا فرمایا تھا تو آپ نے اس صحیفہ کا حوالہ دیا اور پھر صحیفہ نکال کر بھی دکھایا۔ اشرقتے ہیں کہ حضرت علی کے بارے میں یہ بات عام ہو گئی تھی کہ آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان ہے استفسار کیا گیا تو آپ ایک صحیفہ نکال کر لائے۔

صحیفہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ
حضرت سعد بن عبادہ نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر ارشادات ایک صحیفہ میں تلمذ کیے تھے۔ دورِ جاہلیت میں جن لوگوں کو کتابت کے فن میں مہارت حاصل تھی ان میں ایک حضرت سعد بن عبادہ بھی تھے۔ انہوں نے اپنی اس مہارت سے یقیناً پورا پورا فائدہ اٹھایا ہوگا۔ ترمذی کا ایک روایت میں اس صحیفے کا ذکر ملتا ہے۔ کتاب الاحکام میں باب ”ما جاء فی الیمین مع الشاہد“ کے تحت حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعی کی قسم پر صرف ایک گواہ کے ساتھ فیصلہ دے دیا۔ اس روایت کے ایک راوی ربیعہ اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ کو حضرت سعد بن عبادہ کے ایک بیٹے نے بتلایا کہ یہ حدیث صحیفہ سعد بن عبادہ میں موجود تھی۔ ربیعہ کے الفاظ ہیں :

اور مجھے سعد کے ایک بیٹے نے خبر دی کہ ہم نے سعد بن عبادہ کی کتاب میں یہ پایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کر دیا۔

وَأَخْبَرَنِي ابْنُ لَسْعَدِ بْنِ عِبَادَةَ قَالَ
وَجَدْنَا فِي كِتَابِ سَعْدِ بْنِ أَبِي
مُطَلِبٍ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضَى بِالْيَمِينِ
مَعَ الشَّاهِدِ

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ صحیفہ حضرت سعد بن عبادہ کے ایک بیٹے کے پاس بعد میں موجود رہا اور وہ اس صحیفہ سے احادیث روایت کیا کرتے تھے بلکہ مسند امام احمد کی ایک روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی پشت تک یہ صحیفہ حضرت سعد بن عبادہ کے خاندان میں محفوظ رہا۔

صحیفہ سمرۃ بن جندب | حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ نے بھی ایک صحیفہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کی تھیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ صحیفہ خاصا ضخیم تھا کیونکہ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اس صحیفے کا ذکر کرتے ہوئے نسخہ بکیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ حضرت سمرۃ کے بیٹے سلیمان بن سمرۃ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

رَوَى عَنْ أَبِيهِ نَسْخَةً كَبِيرَةً | وہ اپنے والد سے ایک بڑی نسخہ روایت کیا کرتے تھے

بڑا نسخہ ظاہر ہے کسی ضخیم اور بڑی کتاب کو ہی کہا جاسکتا ہے غالباً یہ وہی صحیفہ ہے جو حضرت سمرۃ نے اپنے بیٹوں کو بصورت مکتوب روانہ فرمایا تھا امام ابن سیرین بھی اس مکتوب کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں علم کثیر تھا۔ ان کے الفاظ ہیں :

بیٹوں کے نام حضرت سمرہ کے خط میں
علم کثیر موجود ہے۔

فَإِنَّ سَمْرَةَ بْنَ جَنْدَبٍ
عَلَّمَ كَثِيرًا (تہذیب)

امام ابن سیرین کے اس قول سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت سمرۃ کا متذکرہ صحیفہ خاصا ضخیم تھا۔ ظاہر ہے چند احادیث کے مجموعے کو تو علم کثیر یا نسخہ بکیرہ جیسے الفاظ سے

تعبیر نہیں کیا جایا کرتا۔

صحیفہ وائل بن حجر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مخصوص لوگوں کو مخصوص حالات میں کچھ چیزیں لکھوا کر عطا فرمائی تھیں جیسا کہ حضرت

علی کے بارے میں ابھی ذکر ہوا کہ آپ نے انہیں مختلف احکام و مسائل پر مشتمل ایک صحیفہ عطا فرمایا تھا اسی طرح ایک صحیفہ آپ نے حضرت وائل بن حجر کو بھی جو حضرت موت کے شاہزادوں میں سے تھے اس وقت عطا فرمایا تھا جب وہ مسلمان ہونے کے لیے مدینہ حاضر ہوئے تھے اور کچھ دن قیام فرما کر واپس جا رہے تھے اس صحیفہ میں نماز، وزہ، شراب اور سوز وغیرہ کے احکام تھے۔

صحیفہ اہل یمن

اسی طرح کثر العمال میں ایک روایت ہے کہ عمرو بن حزم کو جب آپ

نے حاکم یمن مقرر فرمایا تو ایک تحریر بھی لکھوا کر ان کے حوالہ کی مسند امام احمد بن حنبل اور مستدرک للحاکم میں بھی یہ روایت موجود ہے اس صحیفے میں فرائض، صدقات، دیات، طلاق، عتاق، صلوة اور مس مصحف وغیرہ کے احکام تھے داری میں اس صحیفے کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
كَتَبَ إِلَى أَهْلِ الْيَمَنِ أَنْ لَا
يَمْسَسَ الْقُرْآنَ وَلَا طَاهِرٌ وَلَا تَطْلُقَ
قَبْلَ مِلَالٍ وَلَا عِتَاقَ حَتَّى يَبْتَاعَ
(مسند داری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو لکھا
بھیجا کہ قرآن کریم صرف پاک آدمی چھوس سکتا ہے
نکاح سے پہلے طلاق نہیں اور غلام خریدنے سے
پہلے اس کی آزادی نہیں۔

کتاب الصدقة

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری ایام
میں مختلف علاقوں کے حاکموں کو بھیجنے کے لیے کتاب الصدقة

اے طبرانی صغیر

لکھوائی تھی مگر ابھی بھیجئے نہ پائے تھے کہ رحلت فرما گئے۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے وہ کتاب عاملوں کے پاس بھجوائی۔ اس کتاب میں جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مسائل تھے۔ ترمذی میں اس کتاب کا ذکر اس روایت میں موجود ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے اور جس کو امام ترمذی نے باب ”ما جاء فی ترک زکوٰۃ الابل“ میں نقل کیا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل اور دارقطنی کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب اصل میں والی بحرین کے نام تھی لیکن دوسرے عاملین کو بھی روادہ کی گئی تھی۔

صحیفہ ابوشاہ یمنی | حضرت ابوشاہ یمنی رضی اللہ عنہ کی درخواست پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ خطبہ لکھوا کر دیا تھا جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ اس خطبہ کا ہر فقرہ بجائے خود اسلام کا ایک اصول تھا یہ خطبہ اچھا خاصا طویل ہے۔ امام ترمذی ابوداؤد حازن ابن حجر خطیب بخاری ابن صلاح اور ابن عبد البرؒ سے ہر ایک نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حجۃ الوداع کے خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوشاہ یمنی نے درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھے لکھوا دیا جائے تو آپ نے ارشاد فرمایا اکتبوا لابی شاہ (ابوشاہ کے لیے لکھ دو) چنانچہ یہ خطبہ ان کو لکھ کر دے دیا گیا۔ امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ پورا خطبہ شاید لکھ کر نہ دیا گیا ہو بلکہ اس کا کچھ حصہ ہو جس کی نقل کا حکم دیا گیا ہو تو اس شبہ کے ازالے کے لیے امام اوزاعیؒ کی شہادت جو سیر کے امام ہیں بہت کافی ہے ان سے پوچھا گیا کہ کیا پورا خطبہ لکھوا کر دیا گیا تھا تو جواب میں فرمایا :

نعم هذه الخطبة التي سمعناها من النبي صلى الله عليه وسلم - (یعنی ص ۵۲)

ہاں وہی خطبہ جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔

دیگر چھوٹی بڑی تحریریں | یہ تمام صحیفے جن کا اب تک ذکر ہوا ہے اگر جمع کیے جائیں تو ذرا اندازہ لگائیے کس قدر واقعہ تحریری ذخیرہ احادیث

محض انہی صحیفوں سے تیار ہو جاتا ہے۔ اور اس میں بھی ذکر صرف ان صحیفوں تک محدود رہا ہے جو اپنی ضخامت کے اعتبار سے اور متفرق احکام و مسائل کو محیط ہونے کے لحاظ سے اہم اور نمایاں تھے ورنہ ان کے علاوہ بھی اور متعدد چھوٹی بڑی تحریروں کی موجودگی کے ثبوت موجود ہیں مثلاً حضرت عبداللہ بن حکیم صحابی کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نامہ مبارک تھا جس میں مردہ جانوروں کے متعلق احکام تھے ایسے حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کرائی ہوئی ایک ہدایت تھی جس میں شوہر کی دیت کا حکم تھا۔ حضرت معاذ بن جبل کو آپ کی طرف سے ایک تحریر میں بھیجی گئی جس میں سبزیوں، ترکاریوں پر زکوٰۃ نہ ہونے کا حکم تھا۔ نیز حضرت رافع بن خدیج کے پاس بھی ایک تحریر تھی جس میں یہ درج تھا کہ مدینہ بھی مثل مکہ کے حرم ہے۔ اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن ربیعہ بن مرثد اسلمی اور حضرت سعد بن ربیعہ انصاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ حدیثیں قلم بند کی تھیں۔

خطوط و وثائق اور اب ان سب پر آپ ان خطوط و وثائق کا اور اضافہ کر لیجئے جو مختلف اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سلاطین و امراء اور سرداران قبائل کے نام لکھوائے یا مختلف مواقع پر معاہدے اور میثاق کی صورت میں تیار کرائے۔ مثال کے طور پر وہ خطوط جو آپ نے قیصر روم، خسرو ایران، مقوقس شاہ مصر، نجاشی بادشاہ حبش، حارث غسانی رئیس حدود شام اور مختلف رؤسائے یمامہ کی جانب لکھوا کر روانہ فرمائے۔ ان میں سے ان خطوط کی تو نقلیں بھی محفوظ ہیں جو مقوقس اور نجاشی کے نام لکھوائے گئے تھے۔ حال ہی میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے الوثائق السیاسیہ کے نام سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خطوط شائع کر دیے ہیں۔ وثائق میں وہ تحریری احکام و فرامین ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل کو بھیجے تھے، مشہور صلح حدیبیہ کا

۱۔ مجمع صغیر طبرانی ۲۔ البراد ۳۔ مسند احمد ۴۔ تہذیب التہذیب و شرح بلوغ المرام
۵۔ بخاری و تذکرۃ الحفاظ ۶۔ طبری و میرت ابن ہشام ۷۔ البدایہ و النہایہ

معاہدہ نامہ ہے جو ۶۰ھ میں حضرت علی کے ہاتھوں تحریر میں آیا اور اس سلسلے کی اہم کردہ دستاویز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد اہل مدینہ کے ساتھ معاہدے کی صورت میں لکھوائی اور جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے سیرت ابن ہشام میں اس میثاق کا متن لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے۔

حدیث کے مکتوب ذخیروں کے بارے میں جو تفصیلات اوپر گزری ہیں ذرا ان پر دوبارہ نظر ڈالیے، مکثرین صحابہ کی مرویات پر مشتمل طویل طویل تحریری مجموعے دیگر مختلف صحابہ کی طرف منسوب ضخیم صحیفے، متفرق تحریری احکام، قراین، معاہدات، وثائق، خطوط اور امان نامے وغیرہ ان سب کو یکجا کر کے دیکھئے کہ عہد نبوت و قرن صحابہ میں حدیث کا یکساں زبردست سرمایہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس پر بھی اگر منکرین حدیث یہی رٹتے چلے جاتیں کہ احادیث غمہ نبوی و عہد صحابہ میں قید تحریر میں نہیں آسکیں تو ہر کوئی خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان کا یہ بے بنیاد و اوہلا کس حد تک کان دھرنے کے قابل ہے ؟



حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ رضی اللہ عنہما کی طرف انکارِ حدیث کی نسبت

حدیث کا انکار کرنے والے اپنی اغراض کے بندے حفاظتِ حدیث کے سلسلے میں، سادہ لوح مسلمانوں کو جس طرح دھوکے دیتے ہیں گزشتہ اوراق میں اس کا پورا نقشہ سامنے آچکا ہے لیکن ان لوگوں کے ایک اور فریب کا پردہ چاک کرنا بھی باقی ہے۔ ان لوگوں نے خود خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ پر اتہام طرازی اور تہتان تراشی کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کی۔ تاوقتِ حضرات کو یہ معلوم کر کے شاید حیرت ہو کہ منکرینِ حدیث کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی انہی کی طرح حدیث کی حجیت کے قائل نہ تھے العیاذ باللہ!۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ مختلف بے سرو پا باتیں بناتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور جو سادہ لوح ناواقف حال مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوششوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ باتیں اس قابلِ توجہ تھیں کہ انہیں کسی سنجیدہ تحریر کا موضوع بنایا جاتا مگر اصل حقیقتِ حال کی وضاحت بھی ضروری ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ منکرینِ حدیث کے متذکرہ دعویٰ کا بھی مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

منکرینِ حدیث کے اس دعوے کا تعلق اگرچہ حجیتِ حدیث کے موضوع سے ہے جو اس وقت ہمارے زیرِ بحث نہیں ہے تاہم یہ دعویٰ جس بنیاد پر کیا جاتا ہے وہ چونکہ بلا واسطہ حفاظتِ حدیث سے ہی متعلق ہے اس لیے موجودہ مرحلے پر یہی ہمیں اس دعوے کا تجزیہ کرنا پڑے گا۔

منکرین حدیث کا الزام | منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ درنوں اصحاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کرنے سے لوگوں کو منع کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ احادیث کو محفوظ نہ رکھا جائے چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی لکھی ہوئی احادیث کا مجموعہ نذر آتش کر دیا اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی اپنے زمانہ خلافت میں بعض لوگوں کے لکھے ہوئے مجموعے منگو کر ان کو جلادیا۔ یہ روایت حدیث سے منع کرنا اور احادیث کی حفاظت کرنے کے بجائے ان کے مکتوب مجموعوں کو نذر آتش کرنا بقول منکرین حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دونوں اصحاب حدیث کو دین میں حجت خیال نہ کرتے تھے۔

کیسی ستم ظریفی ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگی کا ایک لمحہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا مجسم نمونہ تھا جن کی عبادات جن کے معاملات و اخلاق جن کے امور سیاست و معیشت اور جن کی معاشرت غرض جن کی زندگی کا ہر گوشہ سنت نبوی کے رنگ میں رنگا ہوا ہوان حضرات کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو دین میں حجت نہ سمجھتے تھے ۛ

حجیت حدیث اور حضرت ابو بکرؓ | کتنی حیرت کی بات ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادات کے نفاذ کی راہ میں کبھی کسی دینی مصلحت اور مادی مجبوری کو درخور اعتناء نہ سمجھا ان کے بارے میں یہ یاد رکھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ احادیث نبوی کو واجب العمل خیال نہ کرتے تھے۔ یہ صریح ہتان ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کی نظر میں سنت نبوی کی حجیت کس اہمیت کی حامل تھی اس کو ثابت کرنے کے لیے تو کسی طویل و عریض دلیل کے طومار کی بھی ضرورت نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حبش سامہ اور مانعین زکوٰۃ کے سلسلے میں حضرت ابو بکرؓ کا طرز عمل ہی اس بات کی شہادت کے لیے بہت کافی ہے۔ ذرا تصور تو کیجئے۔ جھوٹے مدعیان نبوت کے شبہاتی فتنوں نے سراٹھایا ہوا ہے ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آرہی ہیں اور دشمنان اسلام دہینے پر ہر پہاڑ جانب سے حملے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

ایسے آڑے وقت میں صحابہ متردد ہیں کہ شام کی طرف جس لشکر کشتی کا حکم حضرت اسامہ کی سرکردگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں دیا تھا اس کو روانہ کیا جائے یا نہیں مگر حضرت ابوبکر ہیں کہ انتہائی یقین و اعتماد کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ :-

”اگر مجھ کو اس بات کا بھی یقین ہو کہ اس لشکر کے

روانہ کرنے کے بعد مجھے مدینے میں کوئی درندہ تنہا

پاکر پھاڑ کھائے گا تب بھی میں اس لشکر کی روانگی

کو ہرگز ملتوی نہ کروں گا جس کو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے روانہ فرمایا تھا“ (طبری)

اسی طرح مانعین زکوٰۃ سے قتال کے موقع پر صدیق اکبر اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ

”خدا کی قسم کوئی قبیلہ اگر زکوٰۃ کا ایک جانور یا

ایک دانہ بھی جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

سامنے ادا کرتا تھا اب ادا نہ کرے گا تو میں اس

سے ضرور قتال کروں گا۔“ (طبری)

کیا عزم و استقامت سے بھرپور یہ الفاظ کسی ایسے شخص کی زبان سے نکل سکتے ہیں جو سنت

نبوی کو واجب العمل نہ سمجھتا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے سرمو اخراجات حضرت

ابوبکر کے لیے ناقابل تصور تھا جیش اسامہ کی سرداری کے بارے میں جب یہ تجویز پیش کی

گئی کہ کوئی معمر قریشی اس منصب پر مقرر کیا جائے تب بھی جو جواب حضرت ابوبکر نے دیا اس کا

بھی ایک ایک لفظ اس بات کا ثبوت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فرمان آپ کے لیے

حرم آخر کی حیثیت رکھتا تھا آپ نے فرمایا ”جس کا تقرر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ہے اس میں کوئی رد و بدل ابوبکر کیسے کر سکتا ہے۔“

منکرین حدیث خائف کو مسخ کر کے اپنی مطلب برآری کی کوشش میں ہیں ورنہ
پہلا خطبہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس خطبہ سے بے خبر ہوں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ

پہننے جانے کے فوراً بعد دیا تھا اور جس میں واضح الفاظ میں اپنے اس عزم کا اعلان کیا تھا کہ

قرآن کے بعد سنت نبوی کا اتباع ہی میری منزل مقصود ہے۔ اس خطبہ کے الفاظ ہیں :

اے لوگو میں تمہارا والی بنا دیا گیا ہوں مگر میں تم سے بہتر نہیں ہوں لیکن خوب سمجھ لو ہم میں قرآن اُترا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سنتیں اور طریقے سکھائے جو ہم نے جانے اور سیکھے اے لوگو میں ان دونوں کی پیروی کرنے والا ہوں کوئی نئی بات نکالنے والا نہیں ہوں اگر میں ٹھیک چلوں تو میرا اتباع کرو اور اگر انحراف کروں تو مجھے بیدھا کر دو۔

يا ايها الناس قد وليت امركم ولست بخيركم ولكن نزل القرآن وسرت النبي صلى الله عليه وسلم السنن فاعلموا وعلمنا ايها الناس انما انا متبع ولست بمبتدع فان احسنت فاعينوني وان زغت فقوموني
(طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۹)

خلافت نہ منصب پر فائز ہونے کے بعد حضرت ابوبکر کا پہلا خطبہ ہونے کی حیثیت سے اس کو جدید اصطلاح میں پالیسی تقریر کا نام دیا جاسکتا ہے گویا اس خطبہ میں حضرت ابوبکر نے کاروبار خلافت چلانے کے لیے اپنی آئندہ پالیسی کے خطوط متعین کر دئے کہ قرآن اور سنت یہ دو چیزیں ہوں گی جن کا اتباع خلافت صدیقی کا رہنما اصول رہے گا۔ اپنی اس پالیسی کو اور نہ زیادہ متوکد بنانے کے لیے حضرت ابوبکر نے اپنی اطاعت کے مطالبے کو بھی انہی دونوں کی اتباع کے ساتھ مشروط کر دیا علامہ طبری نے اس خطبے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں :

تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو پھر تم پر میری کوئی اطاعت نہیں۔

اطيعوني ما اطعت الله ورسوله فان عصيت الله ورسوله فلا طاعة لي عليكم (طبری جلد ۲ ص ۴۵)

واقعات اس پر شاہد ہیں کہ حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو آپ اس کے فیصلے کے لیے پہلے قرآن میں اسکی

عام دستور العمل

اصل تلاش کرتے اس میں اگر کوئی اصل نہ ملتی تو سنت نبوی میں اس سے متعلق کوئی اثر یا نمونہ ڈھونڈتے اگر دیاں بھی کچھ نہ ملتا تو پھر اپنا اجتہاد کام میں لاتے حضرت ابو بکر کا یہ عام دستور العمل تھا چنانچہ محقق ابن سیرین آپ کے اس دستور العمل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

أَنَا أَبُو بَكْرٍ إِذَا نَزَلْتُ بِهِ قَضِيَّةٌ
لَمْ يَجِدْ لَهَا فِي كِتَابِ اللَّهِ أَصْلًا
وَلَا فِي السُّنَنِ أَثَرًا فَالْأَجْتِهَدُ
بِرَأْيِي فَإِنْ يَكُنْ صَوَابًا فَمِنْ اللَّهِ وَإِنْ
يَكُنْ خَطَا فَمِنِّي وَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ
(المبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۳۶)

حضرت ابو بکر کے سامنے جب کوئی ایسی صورت حال پیش ہوتی جس کے متعلق نہ اللہ کی کتاب میں کوئی اصل ملتی اور نہ سنت نبوی میں اس سے متعلق کسی اثر کا سراغ ملتا تو فرماتے میں اب اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہوں اگر درست ہوا تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہوا تو میری جانب سے اور اس پر میں اللہ سے معافی کا طلب گاہ ہوں۔

بلکہ مسند دارمی کی ایک روایت میں ترہیاں تک بھی ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں میں کوئی حکم نہ ملتا تو حضرت ابو بکر اپنے اجتہاد سے بھی پہلے صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کو ترجیح دیتے اور اس مشورے کے نتیجے میں جو کچھ سامنے آتا اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے گویا کتاب و سنت کے بعد اجماع کو تیسرا مانعہ احکام قرار دیتے۔ مسند دارمی کے الفاظ ہیں :

كَانَ أَبُو بَكْرٍ إِذَا وَرَدَ عَلَيْهِ الْخَصْمُ
نَظَرَ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَإِنْ رَجَدَ فِيهِ
مَا يَقْضَى مِنْهُمْ قَضَى وَ
إِنْ لَمْ يَكُنْ فِي الْكِتَابِ وَعِلْمُ مَنْ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي
ذَلِكَ سَنَّهُ، قَضَى بِهِ فَإِنْ أَعْيَاهُ
ذَلِكَ خَرَجَ فَسَّالَ الْمُسْلِمِينَ۔

ابو بکر صدیق کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو کتاب اللہ میں نظر فرماتے اگر اس میں حکم پاتے تو اسی کے موافق فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ ہوتا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں کوئی سنت معلوم ہوتی تو اسکے مطابق فیصلہ فرماتے اور اگر حدیث اور سنت میں بھی اسکے متعلق کوئی حکم نہ ملتا تو باہر نکل کر مسلمانوں سے دریافت فرماتے۔

غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن میں کوئی حکم نہ ملنے کی صورت میں حضرت ابو بکر حدیث کی طرف رجوع فرماتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے یعنی یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حضرت ابو بکر قرآن کے بعد حدیث کو دین میں حجت قرار دیتے تھے تاہم سیر سے متعدد واقعات اس کے ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے پر صحابہ کے درمیان جب اس بات پر اختلاف ہوا کہ آپ کے جسد مبارک کو دفن کہاں کیا جائے تو حضرت ابو بکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہی سے سند پکڑ لی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے چنانچہ اس حدیث کے سنتے ہی سب اختلاف رفع ہو گیا۔ اگر حضرت ابو بکر کے نزدیک حدیث حجت نہ تھتی تو پھر رفع اختلاف کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کرنا کیا معنی؟ اسی طرح باغ فدک کے مشہور قہیصے کے فیصلے کے لیے حضرت ابو بکر نے ایک حدیث نبوی ہی سے استشہاد کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت طاہمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے باغ فدک میں اپنی میراث کا مطالبہ کیا تو حضرت ابو بکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا۔

ہم گروہ انبیاء نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ کوئی ہمارا وارث ہوتا ہے ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

إِنَّا هُمْشَرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نَرِثُ مَا تَرَكَ نَامِدَقَةً -
(بخاری باب ماجاء فی قعة فدک)

اور اسی ارشاد نبوی کی روشنی میں باغ فدک کو تقسیم کرنے کے بجائے اس کی آمدنی کو حسب سابق آلِ محمد کے لیے مخصوص رہنے دیا گیا۔ کیا حدیث کسی عدم حجت اسی کا نام ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سامنے آتے ہی سادے جھگڑے ختم ہو جائیں اور ہر ایک کا اطاعت و

تسلیم کے اظہار میں جسکا نظر آئے ۔

احادیث کی تلاش و جستجو | غرض یہ ایک دو واقعہ ہی نہیں اور بھی متعدد واقعات

صدیق دیگر تمام صحابہ کی طرح حدیث کو دین میں حجت تسلیم کرتے تھے۔ تذکرۃ الحفاظ کی وہ روایت کس سے مخفی ہے جس کو نہ ہری نے قبیلہ سے نقل کیا ہے کہ ایک جدہ یعنی دادی اپنے پوتے کی میراث مانگنے کے لیے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی تو آپؓ نے فرمایا کہ دادی کے متعلق تو نہ کتاب اللہ میں میں کوئی حکم پاتا ہوں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان ہی مجھ کو اس بارے میں معلوم ہے اس کے بعد آپؓ نے صحابہ کرام سے دریافت کیا کہ شاید انہیں ایسی کسی حدیث کا علم ہو تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دلوا یا تھا پھر حضرت محمد بن مسلمہؓ نے جی اس کی تصدیق کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی حدیث کو بنیاد بنا کر اس خاتون کو چھٹا حصہ دلوا دیا۔ اب منکرین حدیث تلاش نہیں یہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کی تلاش و جستجو آخر کس لیے تھی؟ اگر حدیث حجت ہی نہ تھی تو پھر اس سارے تردد کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن میں کوئی اصل نہ ملنے کی صورت میں حضرت ابوبکرؓ کو بلا کھٹکے اپنی رائے سے فیصلہ کر دینا چاہیے تھا اس فکر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا کہ اس باب میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا عمل رہا ہے یا اس بارے میں آپؓ نے کیا فرمایا ہے اور کیا نہیں فرمایا۔ کیا منکرین حدیث کوئی ایک بھی نظیر ایسی پیش کر سکتے ہیں جس سے حضرت ابوبکرؓ کے اس طرز عمل کا اظہار ہوتا ہو کہ آپؓ نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپؓ کی سنت ثابتہ کی پروا کیے بغیر اپنی مرضی سے کبھی کوئی فیصلہ کر دیا ہو۔ حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں :

حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں نص کی خلاف ورزی کی

لا یحفظ للصدیق خلاف

لقب واحد ابدًا۔

ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

(اعلام الموقعین جلد ۵ ص ۵۴)

یا کیا کوئی ایسی نظیر منکرین حدیث بتلا سکتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت ابوبکر نے حدیث کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کیا ہو اور صحابہ میں سے کسی ایک فرد نے ہی یہ اعتراض کیا ہو کہ اے ابوبکر حدیث کی بنیاد پر آپ فیصلہ کیسے دے سکتے ہیں حدیث تو دین میں حجت ہی نہیں۔ اگر کسی ایسی نظیر کی منکرین حدیث نشانہ ہی نہیں کر سکتے اور یقین ہے کہ نہیں کر سکتے تو پھر ماننا پڑے گا کہ صرف حضرت ابوبکر ہی نہیں تمام صحابہ بالا جماع حدیث کو حجت جانتے اور مانتے تھے۔

روایت حدیث سے سماعت اور حضرت ابوبکر کا جواز لیں جس کی بنیاد پر منکرین حدیث یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابوبکر احادیث بنویہ کی روایت سے منع کرتے تھے اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ آپ حدیث کو دین میں حجت نہ سمجھتے تھے۔ وہ روایت جس سے یہ سارا تانا بانا بنا گیا ہے تذکرۃ الحقائق میں ذہبی نے ابن ابی ملیکہ سے نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ ہیں :

حضرت ابوبکر صدیق نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور کہا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی احادیث بیان کرتے ہو جن میں تمہارا اختلاف ہے اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں نہ پاوہ سخت ہو جائیں گے پس تم رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ کیا کرو اگر تم سے کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے اور

إِنَّ الصِّدِّيقَ جَمَعَ النَّاسَ بَعْدَ
وَفَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فَقَالَ إِنَّكُمْ تَحَدُّثُونَ عَنِ رَسُولِ
اللَّهِ الْأَحَادِيثَ تَخْتَلِفُونَ فِيهَا
وَالنَّاسُ بَعْدَكُمْ أَمْثَلُ اخْتِلَافًا
فَلَا تَحَدِّثُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ شَيْئًا
فَمَنْ سَأَلَكُمْ فَقُولُوا بَيْنَا وَ

بَيْنَكُمْ كِتَابُ اللَّهِ فَاسْتَحِلُّوا حِلَّاهُ
وَحَرِّمُوا حَرَامَهُ

(تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳)

تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے اس نے جن
چیزوں کو حلال کیا انہیں حلال جانو اور جن چیزوں
کو حرام کیا انہیں حرام جانو۔

اس روایت کے اصل مفہوم و منشا پر تفصیلی گفتگو سے پہلے منکرین حدیث کی ایک اور علمی خیانت
ذرا ملاحظہ ہو۔ منکرین حدیث اپنی عادت کے مطابق اس روایت کے متن کو تو اپنے مزعومہ
دعوے کو ثابت کرنے کے لیے بڑے شد و مد سے اُچھالتے ہیں مگر اس کے فوراً بعد امام ذہبی
نے اس روایت سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کو بائبل گون کر جلاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس روایت
کے فوراً بعد آنے والے الفاظ تذکرۃ الحفاظ میں نظر ہی نہیں آتے اس لیے کہ وہ الفاظ منکرین
حدیث کے مزعومہ دعوے کی تردید کرتے ہیں امام ذہبی اس روایت کو بیان کرنے کے
معا بعد کہتے ہیں :

فهذا المرسل يدلک ان مراد
الصدیق الثبت فی الاخبار
والیقینی لامدّ باب الروایۃ الاترا
انه لما نزل به امراً بجدة
ولم یجدہ فحی الکتاب
کیف سئل عنه فی السنن فلما
اخبه الثقة ما اکتفی حتی
استظهر بثقة آخر ولم
یقنل حسبنا کتاب الله كما نقول
الخوارج (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ صدیق اکبر کا مقصود یہ
ہے کہ احادیث کی روایت میں تثبت اور احتیاط لازم
ہے روایت کا دروازہ بند کرنا مقصود نہیں کیا تم نے
نہیں دیکھا کہ جب صدیق اکبر سے دادی (کی میراث)
کے متعلق دریافت کیا گیا اور اس کا حکم کتاب اللہ میں
نہ پایا تو کس ارجح اس کے متعلق احادیث نبویہ کو
دریافت کیا اور جب ایک ثقہ اور مستبر آدمی نے اس
بارے میں حدیث نبوی کی خبر دی تو اس پر اکتفا نہ فرمایا
بلکہ ایک دوسرے ثقہ آدمی کی توثیق طلب کی اور فرائع
کی طرح یہ نہیں کہا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔

سہ بات کو تو ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر حضرت ابو بکر کے پیش نظر
روایت حدیث کا دروازہ بند کرنا ہوتا تو مختلف معاملات و مسائل کے تصفیے کے لیے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں خود لوگوں سے استفسار کیوں فرماتے۔ امام ذہبی نے ابن ابی ملیکہ کی تذکرہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد اسی نکر کی دعوت دی تھی مگر منکرین حدیث نے اس کو درخور اعتناء نہ سمجھا کیونکہ یہ ان کی اپنی خواہش کے خلاف تھی انصاف سے کیئے کیا تلاش حق کا یہی طریقہ ہے؟ تلاش حق کو بھی چھوڑے کہ منکرین حدیث کا وہ مطمح نظر ہی نہیں کیا علمی دیانت داری بھی کوئی چیز نہیں کیا علم کی دنیا میں اس قسم کی خیانتوں کی گنجائش ہے؟ سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ابوبکر احادیث نبویہ کی روایت ابوبکر اور روایت حدیث کا دروازہ بند کرنا چاہتے تھے تو خود اس کے خلاف

کیوں کرتے تھے کیا اس بات میں بھی کوئی شبہ ہے کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ ابن جوزی نے حضرت ابوبکر کی مرویات کی تعداد بقی بن محمد کی مسند کے حوالے سے ایک سو بیالیس بیان کی ہے۔ حال ہی میں مسند ابی بکر صدیق طبع ہوئی ہے یہ احمد بن علی بن سعید الاموی المروزی (۲۹۲-۲۰۲ھ) کی تصنیف ہے اس کی تحقیقی و تعلیقی اور تخریج کا کام شعیب ارناؤوط نے کیا ہے اس مسند میں بھی حضرت ابوبکر کی کُل مرویات کی تعداد ایک سو بیالیس ہے۔ گویا ایک جانب صرف ایک روایت ہے جو بقول منکرین حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابوبکر روایت حدیث سے منع کرتے تھے اور دوسری جانب اس ایک روایت کے مقابلے میں دو چار یا دس بیس نہیں پوری ایک سو بیالیس روایتیں ہیں جو اس پر شاہد ہیں کہ دوسروں کو منع کرنا کیا معنی حضرت ابوبکر خود احادیث نبویہ روایت کرتے تھے۔ بلکہ ایک سو بیالیس ہی نہیں اگر شاہ ولی اللہ کے قول کو لیا جائے تو حضرت ابوبکر کی مرویات کی تعداد ایک سو پچاس تک جا پہنچتی ہے۔ اب بتلائیے ایک روایت کے مقابلے میں کیا ڈیڑھ سو روایات سے قطع نظر کیا ہاں سکتا ہے؟ اپنے خود تراشیدہ اوہام اور من مانی خیالات کے پیچھے لگ کر کسی روایت سے کوئی اثا سیدھا نتیجہ نکال لینا بہت آسان ہے مگر علمی سطح پر اس کو نبھانا بہت مشکل ہے۔

اس کے علاوہ ذرا یہ بھی تو سوچئے کہ کیا آپ ایسی ہستی کے بارے میں جو صدیقیت کے مقام پر فائز ہے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ معاذ اللہ وہ کہتے کچھ تھے اور کرتے کچھ تھے لوگوں کو روایت حدیث سے متنبہ کرتے رہے اور خود اتنی تعداد میں حدیثیں روایت کر گئے۔ کتنی غیر محقول بات ہے یہ! اس کے ساتھ ہی اس پر بھی غور کیجئے کہ صحابہ کی ایک کثیر تعداد ہمیشہ حدیثوں کی روایت میں مشغول رہی تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ تمام صحابہ نے حضرت ابوبکر کی اس تجویز کو قطعی طور پر مسترد کر دیا تھا کہ حدیثوں کی روایت کا سلسلہ بقول منکرین حدیث ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے اور روایت کے الفاظ یہ بتلا رہے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے یہ تجویز سرسری طور پر پیش نہیں کی تھی بلکہ باضابطہ صحابہ کی ایک مجلس منعقد کی تھی اور اس مجلس میں یہ حکم دیا گیا تھا تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صحابہ نے خلیفہ وقت کے حکم کی کوئی پروا نہ کی۔ غیر معقولیت کی بھی حد ہوتی ہے منکرین حدیث ہجرت ہے ذرا بھی فکر سے کام نہیں لیتے۔

ممانعت کی اصل وجہ رفع اختلاف

منکرین حدیث کو ہم ان کے حال پر چھوڑتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ حضرت ابوبکر کے الفاظ فلا تخذوا عن رسول اللہ شیئاً (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کمرے کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو) سے بظاہر ہی مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے روایت حدیث سے روک دیا تھا مگر ان الفاظ کا یہ مطلب اس وقت نکلتا ہے جب اس کو بیان و بیان سے علیحدہ کر کے پڑھا جائے۔ ان الفاظ سے پہلے حضرت ابوبکر نے جو کچھ کہا ہے اسے علیحدہ نہ کیجئے حضرت ابوبکر نے صحابہ کے سامنے یہ تجویز رکھنے سے پہلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات بیان نہ کی جائے تمہید کے طور پر ایک ایسے امر واقعہ پر صحابہ کو مطلع کیا ہے جس کی طرف اگر بر وقت دھیان نہ دیا جاتا تو فساد دین کا موجب ہو سکتا تھا۔ اس امر واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے حضرت ابوبکر فرماتے ہیں:

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث روایت کرتے ہو جن میں تمہارا اختلاف ہے اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔

إِنَّكُمْ تَخَذُونَ عَنِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْأَحَادِيثَ تَخْتَلِفُونَ فِيهَا وَالنَّاسُ بَعْدَكُمْ أَشَدَّ اخْتِلَافًا۔

گویا حضرت ابوبکر صحابہ کرام کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ وہ احادیث جن کو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے محتاط حکیمانہ طرز عمل کے ذریعے انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے ان کا بدستور انفرادی معلومات تک محدود رہنا انتہائی ضروری ہے ورنہ وہ اختلافات جو اس قسم کی احادیث میں قدرتی طور پر موجود ہیں ارادی اور اختیاری مخالفتوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ ابتدا میں عہد نبوت سے قرب کی بنا پر ممکن ہے ان مخالفتوں میں شدت نہ ہو لیکن جوں جوں اس خبر القرون سے دوری بڑھتی جائے گی یہ مخالفتیں بھی شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائیں گی اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی احادیث روایت ہی نہ کی جائیں جس کے پاس جو علم ہے وہ اس کے مطابق عمل کرتا چلا جائے دوسروں کو مجبور نہ کرے کہ وہ بھی اس کے علم کے مطابق عمل کریں کہ دین میں سہولت اور وسعت صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں دین کے مختلف طریقوں پر عمل کرنے کی نظیریں اسی لیے چھوڑی ہیں اور ان کو قصداً اور اراداً اسی لیے کثرت سے اشاعت پذیر نہیں ہونے دیا کہ دین میں کسی قسم کی تنگی پیدا نہ ہونے پائے۔ حضرت ابوبکر نے صحابہ کے سامنے جو تجویز رکھی تھی اس کا مقصد روایت حدیث سے مطلقاً روکنا نہ تھا بلکہ مطمح نظر یہ تھا کہ احادیث کی اس طور پر روایت نہ کی جائے جس سے وہ قدرتی اور فطری اختلافات جو امت کی سہولت کے لیے ہیں ارادی اور اختیاری مخالفتوں میں تبدیل ہو کر امت کے لیے زحمت اور تنگی کا سبب بن جائیں۔

فائدہ بین نے محسوس کر لیا ہو گا کہ کسی کلام کے ایک جزو کو اس کے سیاق و سباق سے علیحدہ کر دینے اور ملا کر سمجھنے میں معانی کے اندر کس قدر تفاوت واقع ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر کے الفاظ فلا تحدّ ثوا عن رسول اللہ شیئاً اپنے مابین سے علیحدہ نہیں ہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو اپنے مابین کے لازمی نتیجے کے طور پر کہے گئے ہیں۔ عربی زبان سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلا تحدّ ثوا کی ابتدا میں جو حرف (ف) ہے وہ ترتیب پر دلالت کرتا ہے یعنی اس سے پہلے جو بات بیان کی گئی ہے اس کے نتیجہ کا اظہار کرنے کے لیے کلام کی ابتدا (ف) کے حرف سے کی گئی ہے۔ گویا پوری بات اس طرح بنتی ہے کہ چونکہ احادیث

کے قدرتی اختلافات کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ بنایا جانے لگا ہے اس لیے اس سے تو بہتر ہے کہ احادیث کو روایت ہی نہ کیا جائے انصاف سے بتلائیے اس پوری بات کے الفاظ سے کیا یہ مطلب نکالنا کسی طرح بھی درست ہے کہ یہ بات کہنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کو سرے ہی سے ختم کرنا چاہتا ہے۔ خود ہی سوچئے اس قسم کا مطلب نکالنا بہتان و افتراء نہیں تو اور کیا ہے۔ حضرت ابو بکر کا مقصود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مخالفانہ اغراض کو ہوا دینے کے لیے احادیث بیان کرنے سے لوگوں کو روکا جائے۔ وہ صحابہ کرام پر دراصل یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ احادیث نبویہ کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق جس شخص کے پاس جو معلومات ہیں وہ ان کی پابندی کا خواہ مخواہ دوسروں سے مطالبہ کرے بلکہ صحیح مسلک ان اختلافات کے متعلق جو اس قسم کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں یہ ہے کہ امت مسلمہ کا ہر فرد ایک دوسرے کے قدرتی و فطری اختلافات کو برداشت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے اور اگر کوئی شخص ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کے لیے دھونڈ دھونڈ کر ایسی احادیث بیان کرے جو دین کے طریقوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مختلف نظیروں کی حامل ہوں تو اس کو خاموش کرانے کے لیے فوراً ایہ کہا جائے کہ ان تمام نظیروں کے بنیادی اصول و کلیات قرآن کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہیں جو پوری امت مسلمہ کو اتفاقی نقطے پر سمیٹنے کے لیے بہت کافی ہیں حضرت ابو بکر نے متذکرہ روایت کے آخر میں یہی بات ارشاد فرمائی کہ

اگر تم سے کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے اس نے جن چیزوں کو حلال کیا انہیں حلال جانو اور جن کو حرام کیا انہیں حرام جانو۔

مَنْ سَأَلَكُمْ فَقُولُوا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
كِتَابُ اللَّهِ فَاسْتَحِلُّوا حَلَالَهُ
وَحَرِّمُوا حَرَامَهُ۔

ان الفاظ سے حضرت ابو بکرؓ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک قاعدہ کلیہ بتلا دیا کہ جب کبھی اختلافی اغراض کے لیے احادیث نبویہ کے بارے میں کسی گوشے سے کمزور کیا جائے اور پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہو تو واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہیے کہ ان تمام باتوں کا مرکز و محور وہی

اصول و کلیات میں جو فہرستان میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔

غرض تذکرۃ الحفاظ کی مذکورہ بالا روایت سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کرام کو احادیث نبویہ روایت کرنے سے بالکل روک دیا تھا اور اس طرح وہ بنیاد ہی باقی نہیں رہتی جس پر منکرین حدیث نے حضرت ابوبکرؓ کو متم کرنے کے لیے عدم حجیت حدیث کے دعوے کی عمارت کھڑی کی تھی۔

مجموعہ حدیث کو نذر آتش کر دینا | دوسری چیز جو منکرین حدیث حضرت ابوبکرؓ کی طرف عدم حجیت حدیث کا نظریہ منسوب کرتے

کے لیے استشہاد کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں وہ واقعہ ہے جس کو ابن اثیر جزیری نے اسد الغابہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی نقل کیا ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ سو احادیث پر مشتمل ایک مجموعہ تیار کیا تھا مگر بعد میں خود اپنے ہی ہاتھوں اسے نذر آتش کر دیا۔ اس واقعہ سے بھی منکرین حدیث یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ احادیث نبویہ کو دین میں حجت خیال نہ کرتے تھے۔

جہاں تک احادیث نبویہ کو دین میں حجت سمجھنے نہ سمجھنے کا تعلق ہے اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ کے طرز عمل پر گزشتہ اوراق میں اس موضوع پر گفتگو کی ابتدا کرتے وقت تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے اور واضح دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ منکرین حدیث کا یہ دعویٰ سراسر سہمناں اور افتراء ہے۔ اس وقت تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اپنے مجموعہ حدیث کو نذر آتش کرتے وقت حضرت ابوبکرؓ کے سامنے اصل محرک کیا تھا؟

پورا واقعہ | آئیے پہلے یہ معلوم کریں کہ پورا واقعہ کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے اس واقعہ

کے بارے میں اسد الغابہ میں جو روایت منقول ہے اس کا لہجہ باب یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد احادیث نبویہ کا ایک مجموعہ قلم بند کیا جو پانچ سو احادیث پر مشتمل تھا یہ مجموعہ تحریر کرنے کے بعد آپ نے اسے حضرت عائشہؓ کے پاس رکھوا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک رات حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ بے چین ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ والد ماجد

کی یہ غیر معمولی بے چینی دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں سر ہانے تشریف لائیں اور پوچھا کہ آپ یہ کر رہیں کسی جسمانی تکلیف کی بنا پر بدل رہے ہیں یا کسی خبر نے آپ کو بے چین کر دیا ہے؟ حضرت ابو بکر نے کوئی جواب نہ دیا مگر جب صبح ہوئی تو حضرت عائشہ سے فرمایا: بیٹی! وہ مجموعہ احادیث جو تمہارے پاس ہے اسے لے آؤ۔ حضرت عائشہ نے وہ مجموعہ لا کر دیا تو حضرت ابو بکر نے لے کر اسے آگ کی نذر کر دیا۔ حضرت عائشہ حیران رہ گئیں کہ اس قدر محنت سے لکھی ہوئی احادیث نبویہ کو آخر کیوں جلا دیا گیا۔ وہ پوچھنے پر جو جواب حضرت ابو بکر دیتے ہیں وہ اس سارے واقعہ میں بہت اہم ہے۔ یہ جواب ہمیں دراصل ہمارے بھی ان تمام سوالات کا جواب ہے جو اس سلسلے میں تدریقی طبع پر ذہن میں ابھرتے ہیں اور جن کو منکرین حدیث طرح طرح سے ہوا دینے کی کوشش کرتے ہیں حضرت ابو بکر جواب میں فرماتے ہیں :

مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ میں مرجائوں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے پاس رہ جائے اس حالت میں کہ اس میں ایسے شخص کی بھی حدیثیں ہوں جن کی امانت پر میں نے بھروسہ کیا اور اس کے بیان پر اعتماد کیا مگر جو کچھ اس نے مجھ سے بیان کیا اصل بات ویسی نہ ہو اور میں نے اسے نقل کر دیا۔ پس ایسا کرنا درست نہ ہو گا۔

خَشِيتُ اَنْ اَمُوتَ وَهِيَ عِنْدِي
فَيَكُوْنُ فِيْهَا اَحَادِيْثٌ عَنْ رَجُلٍ
قَدْ اسْتَمْنَعْتُ دَوْلَتَهُ وَاَمَرَ بِيْ
صَحَابَةٌ ثَنِي فَاَكُوْنُ قَدْ نَقَلْتُ
ذَاكَ فَهٰذَا الْاِيْتِمَامُ
(اموال الغابہ جلد ۳ ص ۲۲۳)

واقعہ کا محرک حضرت ابو بکر کے ان الفاظ میں ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان الفاظ سے ایک عام آدمی کا ذہن تو شاید یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ حضرت ابو بکر نے راویوں کی روایت میں کذب کا احتمال موجود ہونے کی بنا پر اپنے مجموعہ حدیث میں مرقوم احادیث کو قابل اعتماد نہ سمجھا اس لیے ان کو جلا دیا مگر وہ اذہان جو غور و فکر کی صلاحیتوں سے مزین ہیں وہ ذرا سوچیں کہ اگر احتمال کذب کی بنا پر حضرت ابو بکر نے ان احادیث کو ناقابل اعتماد سمجھا ہوتا تو چاہیے تھا کہ ابتدا میں ان کو قلم بند ہی نہ کرتے اس لیے کہ یہ احتمال تو اس

وقت بھی موجود تھا۔ اگر باوجود پسچ بولنے کے ہر شخص کے بیان کے بارے میں یہ اندیشہ باقی رہتا ہے کہ شاید اس کی خبر میں پسچ کے ساتھ جھوٹ بھی ہو تو یہ اندیشہ توفیق تحریر میں آنے سے پہلے بھی ان ساری روایتوں میں موجود تھا باوجود اس اندیشہ کے حضرت ابوبکر نے احادیث کو قلم بند کیا تھا تو ظاہر ہے ان پر اعتماد کرتے ہوئے ہی کیا تھا۔ صدق کے ساتھ کذب کی موجودگی کا محض امکان کسی خبر کو ناقابل اعتماد اور ناقابل قبول قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہوا کرتا بلکہ عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ خبر دینے والا بظاہر معتبر اور ثقہ ہے یا نہیں۔ دنیا کا عام کاروبار اسی بنیاد پر قائم ہے۔ عدالتوں تک میں تانوں شہادت کی بنیاد یہی اعتماد و اعتبار ہے جس کے تحت حکام آئے دن فیصلے صادر کرتے رہتے ہیں قطعی اور لازماً یقین حاصل کرنے کی نہ کوئی کوشش کرتا ہے اور نہ اس کا حصول ممکن ہی ہے۔ حضرت ابوبکر نے بھی راویوں کو معتبر اور قابل اعتماد سمجھ کر ہی ان سے سنی ہوئی حدیثوں کو جمع کر لیا تھا۔ احتمال کذب کی اہمیت نہ لکھنے سے پہلے تھی اور نہ لکھنے کے بعد۔ لہذا معلوم ہوا کہ مجموعہ احادیث کا جلانا ان کے ناقابل اعتماد ہونے کی بنا پر نہ تھا۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حدیثوں کے اس مجموعے میں یقینی بات ہے وہ احادیث بھی ضرور شامل ہوں گی جن کو حضرت ابوبکر نے بذات خود بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا کم از کم وہ احادیث تو تمام کی تمام حضرت ابوبکر کے لیے ہر قسم کے کذب کے احتمال سے خالی تھیں اگر ناقابل اعتماد سمجھے جانے کی بنا پر احادیث کے مجموعے کو جلایا گیا ہوتا تو اس مجموعے میں سے ان احادیث کو تو یقیناً الگ کر لینا چاہیے تھا جن میں کذب کا کوئی امکان نہ تھا۔ پورے مجموعے کو جلانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی وجہ احادیث پر عدم اعتمادی ہرگز نہ تھی ۝

معلوم ہوا کہ بیان کرنے والوں کے بیان میں جس شبہ کا اظہار حضرت ابوبکر اپنے مجموعے کے جلانے کے سلسلے میں کر رہے ہیں اس کا تعلق ان شکوک و شبہات

دین کی سہولت پسندانہ
خصوصیت کی حفاظت

سے نہیں ہے جن کی موجودگی و عدم موجودگی کسی خبر پر عدم اعتماد یا اعتماد کا موجب ہوا کرتی ہے بلکہ یہ شیعہ اس ظن و گمان کی قبیل سے ہے جس کو قصداً ان حدیثوں میں باقی رکھنا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصود تھا جن کے متعلق عمومیت اور عام اشاعت کا طریقہ آپؐ نے اختیار نہیں فرمایا تھا۔ اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کو برقرار رکھنے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محتاط حکیمانہ طرز عمل کے ذریعے جن احادیث کو انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے وہ احادیث ظاہر ہے یقیناً اعتماد کا وہ مقام حاصل نہیں کر سکتیں جو تواتر و تواتر کی راہ سے منتقل ہو کر آنے والی احادیث کو حاصل ہے۔ اول الذکر احادیث میں قصداً اور اراداً اس احتمال کی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ بیان کرنے والے کا بیان ممکن ہے صحیح نہ ہو اسی گنجائش نے ان احادیث کے مطالبے کی قوت کو دین کے اس حصے کے مطالبے کی قوت کے مقابلے میں کچھ کمزور کر دیا ہے جس میں قطعاً اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔

حضرت ابو بکرؓ کو خدشہ تھا تو اسی بات کا کہ میرے ہاتھ سے تنید تحریر میں آ جانے کے بعد ایسا نہ ہو کہ یہ احادیث اس حال پر قائم نہ رہ سکیں جس پر ان کا باقی رہنا لازمی ہے اور اس طرح دین میں جو سہولت کی راہ کھلی ہوئی ہے وہ کیوں بند نہ ہو جائے۔ سوچنے کی بات ہے جو کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پلٹ خلیفہ اور دینی سیاسی جانشین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو اسمیں ہر قوم ہو جانے کے بعد کہ ان انفرادی معلومات پر مبنی احادیث کا اپنے مطالبوں کی قوت میں وہ حال باقی رہ سکتا تھا جس کا باقی رکھنا مقصود تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کی یہ کتاب اگر باقی رہ جاتی تو اس کی حیثیت سربراہ حکومت کی جانب سے جاری کیے جانے والے ایک سرکاری وثیقہ کی بن جاتی اور آنے والے زمانوں میں اس کتاب کی حدیثوں کے ساتھ اور ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام و قوانین کے ساتھ عقیدت و گرویدگی کا جو عالم ہوتا وہ کسی بیان و تشریح کا محتاج نہیں۔ حضرت ابو بکرؓ کے یہ الفاظ کہ حشیتُ اَنْ اُصْبِتَ وَهِيَ عُنْدِي (مجھے اندیشہ ہوا کہ میں مر جاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے

پاس رہ جائے، تو اس باب میں بہت ہی واضح ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی زندگی میں ان احادیث کی اشاعت نہ بھی کرتے تو آپ کے بعد آپ کے پاس سے محض اس کتاب کا نکل آنا ہی اس میں موجود احادیث کی اس نوعیت کو بدل دینے کے لیے کافی ہوتا جس کو قصداً باقی رکھنا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تھا۔ حتیٰ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مکتوب مجموعے کو جلا کر اس خطرے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسداد فرما دیا۔

بلکہ دیکھا جائے تو حضرت ابوبکرؓ اپنے مجموعہ حدیث کو مذہبِ تشن کر کے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کو زندہ کیا۔ حدیثوں کے کتابی ذخیرے کو جلانے کا پہلا واقعہ عہدِ نبوت میں ہوا تھا جب صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتابت حدیث کی مخالفت کا حکم سن کر اپنے مکتوب مجموعوں کو جلا دیا تھا اس وقت بھی پیش نظر ہی خدشہ تھا کہ قرآن کے ساتھ ساتھ لکھے جانے کی بنا پر یا کثیر تعداد میں مکتوب مجموعے تیار ہو جانے سے ان میں عمومیت کا رنگ پیدا ہو جانے کی بنا پر کہیں ان احادیث سے نکلنے والے احکام و نتائج کے مطابقوں میں وہ قوت نہ پیدا ہو جائے جو قرآن کو یا دین کے اس حصے کو حاصل ہے جو قرآن کی عملی تشکیلات پر مشتمل ہے اور اس طرح یہ حدیثیں کہیں امتِ مسلمہ کی دینی زندگی میں ضیق اور تنگی کا سبب نہ بن جائیں۔ اس خطرے کا انسداد کرنے کے لیے پہلی بار بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حدیثوں کے کتابی ذخیرے کو جلایا گیا تھا اب اسی طریقہ کا احیاء حضرت ابوبکرؓ نے اپنے کتابی ذخیرے کو جلا کر کیا اب بھی مقصود اسی خطرے کا انسداد تھا کہ دین کا وہ حصہ جو تواتر و توارث کی دولت سے مالا مال ہے اور جس کو ہم نے گذشتہ اوراق میں بیانات کی قرآنی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے وہ دین کے اس حصے سے خلط ملط نہ ہو جائے جس کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو قصداً اور اراداً دین میں سہولت کے پیش نظر انفرادی معلومات تک محدود رکھا گیا ہے۔ دین کے ان دونوں حصوں کے مطابقوں میں قوت و ضعف کو برقرار رکھنے کے لیے جو طرزِ عمل عہدِ نبوت میں اختیار کیا گیا تھا اسی طرزِ عمل کی تجدید حضرت

ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں فرمائی۔

غرض روایت حدیث سے ممانعت کی بات ہو یا مجموعہ حدیث جملانے کا ذکر ہو حضرت ابوبکرؓ کی طرف حدیث کی عدم حجیت کا نظریہ ثابت کرنے کے لیے کسی طرح بھی یہ دونوں باتیں بنیاد کا کام نہیں دے سکتیں۔ اس لیے بلا خوف تردید ہی کہا جائے گا کہ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں منکرین حدیث کا دعویٰ ایک بہتان سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۛ

حضرت عمرؓ اور منکرین حدیث کا الزام | منکرین حدیث کی اتہام طرازی کا دوسرا نشانہ

ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں تو یہ دریدہ دین لوگ اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انکو انکار حدیث کے نفع کا امام قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ احادیث کو محاذ اللہ دین سے بالکل خارج کر دینا چاہتے تھے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت کے لیے بھی منکرین حدیث نے اتنی دو باتوں کا سہارا لیا ہے جو حضرت ابوبکرؓ کے سلسلے میں ان کا تختہ مشق بن چکی ہیں یعنی روایت حدیث سے ممانعت اور حدیث کے مختلف کتابی ذخیروں کو نذر آتش کر دینا۔ منکرین حدیث اپنی فاسد اغراض کو پورا کرنے کے لیے دھونڈ دھونڈ کر ایسی روایات لاتے ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح بس یہ ذکر آگیا ہو کہ حضرت عمرؓ نے احادیث بنویہ کو روایت کرنے سے لوگوں کو روکا تھا یا پھر بڑے شد و مد کے ساتھ اس روایت کو اچھلتے ہیں جس میں کہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے لکھے ہوئے حدیث کے مجموعے منکوائے اور ان کو بیلادیا ۛ

منکرین حدیث کی علمی خیانت | ان تمام روایات کا انشاء اللہ تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا مگر اس سے قبل ہم منکرین حدیث

کے طرز عمل کے بارے میں اپنے اسی سوال کا پھر اعادہ کرتے ہیں کہ آخر یہ لوگ قدم قدم پر علمی خیانت کے ترکبہ کبوں ہوتے ہیں حدیث کے جن ذخیروں سے کرید کرید کر انہوں نے اپنے مطلب کی روایات نکالی ہیں کیا اتنی ذخیروں میں وہ روایات انہیں نظر نہیں آئیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ روایت سے بالکل لوگوں کو روکنا تو کجا حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ خود سینکڑوں حدیثیں روایت کرتے رہے ہیں۔ عجب حال ہے ان لوگوں کا ایک طرف روایات

کے تمام ذخیرے کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا جاتا ہے۔ جھوٹ کا پلندہ اور دھجی سازش کا نام دے دے کر روایات کی پوری بساط کو لپیٹ کر رکھ دینے کے مشورے دئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اسی ذخیرہ روایات میں سے کچھ روایتیں نکال کر اور انہیں اپنے فنی پہنا کر اس پر اصرار کیا جاتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس پر اعتماد کیا جائے جو روایات وہ پیش کر رہے ہیں انہیں حجت کے طور پر قبول کیا جائے۔ روایات تو روایات ہی ہیں اگر منکرین حدیث کی پیش کردہ روایات درست ہو سکتی ہیں تو وہ روایات درست کیوں نہیں ہو سکتیں جو ان کے خلاف دوسروں کی جانب سے حجت کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اگر رد کرنا ہے تو تمام روایات کو رد کر دیجئے اور اگر قبول کیا ہے تو سب کچھ قبول کیجئے۔ ”میٹھا میٹھا پیپ پیپ کر دو، کڑوا کڑوا تھو“ کی منطقی تلاش حق میں ممدوحین ثابت ہونے کے بجائے ہمیشہ زیر دست رکاوٹ بنی رہی ہے۔ اگر ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم آپ کی پیش کردہ وہ روایات قبول کریں جن سے آپ حضرت عمر کو بزرگ خود انکار حدیث کا امام محاذ اللہ ثابت کرتے ہیں تو ہمیں اس مطالبے کی مقبولیت ثابت کرنے کے لیے پہلے یہ بتلانیے کہ ہم ان روایات کو کس دلیل کی بنا پر رد کر دیں جن سے آپ کے دعوے کی کھلی تردید ہوتی ہے جبکہ وہ روایات جو آپ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ان کی اسناد کو صحت و موثاق کے لحاظ سے ان روایتوں کی اسناد سے کوئی نسبت نہیں جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں اور آپ کے دعوے کی تردید کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ حضرت عمرؓ سے مروی احادیث عموماً صحاح ستہ کی کتابوں میں بلکہ زیادہ تر بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہیں جن کی اسناد کا قوی ترین ہونا متفق علیہ ہے اور منکرین حدیث کی طرف سے جن روایات کو پیش کیا جاتا ہے ان کا کم از کم صحاح کی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں۔ اس کے علاوہ ان روایات کی تعداد دو چار دس پانچ کے عدد سے آگے نہیں بڑھتی جبکہ ان حدیثوں کی تعداد جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں سینکڑوں سے تجاوز ہے۔

حضرت عمرؓ اور روایت حدیث | حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جو احادیث مروی ہیں وہ صاحب التلخیص ابن جوزی کے مطابق پانچ سو سینتیس (۵۳۷) ہیں علامہ ابن حرم نے جوامع السیر میں حضرت عمرؓ کی مرویات

کی تعداد پانچ سو تیلانی ہے۔ ممکن ہے اس تعداد میں طرق کا شمار شامل ہو اگر متون ہی کا اعتبار کیا جائے تب بھی حضرت عمرؓ کی مرویات دو سو سے کچھ اوپر بیان کی گئی ہیں۔ غور تو کیجئے جس ہستی کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگوں کو حدیثیں روایت کرنے سے روکتی تھی وہی ہستی خود دو چار نہیں دس بیس نہیں پوری دو سو سے کچھ اوپر احادیث بنویہ روایت کرتی نظر آتی ہے۔ اگر منکرین حدیث کی بات مان لی جائے تو پھر حضرت عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر اور خلیفہ رسول صحابی کے اس علی تضاد کی آخر آپ کیا توجیہ کریں گے کہ ایک طرف لوگوں کو روکتے رہے اور دوسری طرف دو دو سو احادیث خود روایت کرتے رہے اور یہ دو سو کی تعداد بھی اس وقت ہے جب ہم حضرت عمرؓ کے ان فقہی استدلالات کو شامل نہ کریں جو آپ نے قرآن پاک کی تیسیر و تفسیر اور احکام و مسائل کی توضیح و تبیین میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے کیے ہیں اور فن حدیث کے نقطہ نظر سے وہ حدیث ہی کی تعریف میں آتے ہیں ایسے استدلالات فاروقی کی تعداد ہزار سے بھی اوپر ہے اسی بنا پر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالۃ الخفا میں کہا ہے کہ حضرت عمرؓ کا شمار مکثرین صحابہ کے طبقہ میں ہونا چاہیے یعنی وہ صحابہ جن کی مرویات کی تعداد ہزار یا ہزار سے اوپر ہے۔ منکرین حدیث ذرا آنکھیں کھولیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ہزار سے زیادہ استدلالات کرنے والا بھی کہیں منکر حدیث ہو سکتا ہے کیا ایسے شخص کے بارے میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ احادیث بنویہ کو دین سے معاذ اللہ بالکل خارج کر دینا چاہتا ہے؟

عمال کو تعلیم حدیث کا حکم | حیرت کی بات ہے جس عمرؓ کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ احادیث بنویہ کو دین سے خارج کر دینا چاہتا تھا وہی عمرؓ ہمیں حج کے موقع پر لاکھوں اصحاب رسول کے سامنے اپنے خطبے میں یہ اعلان عام کرتے نظر آتا ہے :

لوگو! میں تم پر اس لیے حاکم مقرر نہیں کرتا کہ وہ تمہارے

ایہا الناس لدا عمل عمالاً بضرباً

ابنائکم ولا یأخذوا اموالکم
وانما ارسلکم الیکم
لیعلمکم دینکم و سنۃ
نبیکم (تاریخ ابن اثیر ص ۲۰۸)

بیٹوں کو ماریں اور نہ اس لیے کہ وہ تمہارے
مال چھین لیں ہیں نے ان کو صرف اس لیے بھیجا
ہے کہ وہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کی
سنت کی تعلیم دیں۔

کیا سنت نبوی کی تعلیم دینا سنت نبوی کو دین سے خارج کرنا کہلاتا ہے۔ جو شخص اپنے عمال
مقرر کرنے کا مقصد واحد یہ بتلاتا ہے کہ وہ لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سکھائیں اس
کے بارے میں کیسے یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ نبی کی سنت کو دین سے خارج کر دینا چاہتا
ہے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ اپنے عمال روانہ فرماتے وقت بطور خاص ان کے ذمے
یہ فرض سوچتے تھے کہ وہ اپنے علاقے میں جا کر قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث لوگوں کو سکھائیں
چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو جب حضرت عمر کی جانب سے بصرہ کا والی بنا کر بھیجا گیا تو جاتے
ہی حضرت ابوموسیٰ نے حج عام میں جو تقریر کی اس میں انہوں نے اپنے بھیجے جانے کا مقصد
تعلیم قرآن و حدیث ہی کو قرار دیا۔ آپ نے فرمایا

بَعَثْنِي عَمْرًا لَعَلَّكُمْ كُنَّا بِكُمْ
وَسَنَّةُ نَبِيِّكُمْ (دارمی ص ۶۵)

مجھے عمر نے بھیجا ہے کہ میں تمہیں تمہارے
رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت
سکھلاؤں۔

عدالتی فیصلوں کی بنیاد | سنت نبوی کی صرف تعلیم ہی نہیں حضرت عمر کے دربار خلافت
سے باقاعدہ ہدایت نامے روانہ کیے جلتے تھے کہ قرآن

کے بعد حدیث کو مقدمات و خصوصیات کے فیصلوں کی بنیاد بنایا جائے۔ ماضی شرح کے نام
ایک مکتوب میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لکھا :

اِذَا اَتَاكَ اَمْرًا فَاقْضِ بِمَا فِيهِ
كِتَابُ اللَّهِ فَإِنْ اَتَاكَ مَا لَيْسَ فِيهِ
اَلْكِتَابُ فَاقْضِ بِمَا سَمِعَ مِنْ رَسُوْلِ اللَّهِ
(الموافقات للبیہقی ج ۴ ص ۴)

جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو تو اس میں
کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ دو اور اگر کوئی
ایسی چیز آئے جو کتاب اللہ میں نہیں تو تم رسول اللہ
کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو۔

اسی طرح ایک اور موقع پر حضرت شریح ہی کے نام ہدایت مذبحی کہ جو چیز تمہیں کتاب اللہ میں مل جائے تو پھر اس میں مزید کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں اسی پر عمل کرو لیکن اگر کوئی چیز کتاب اللہ میں نہ ملے یا مبہم ہو تو پھر سنت رسول کا اتباع کرو۔ حضرت عمرؓ کے الفاظ ہیں :

تم دیکھو جو چیز تمہارے لیے کتاب اللہ میں واضح ہو اس بارے میں کسی سے مت سوال کرو اور جو چیز کتاب اللہ میں واضح نہیں اس میں سنت رسول کا اتباع کرو۔

أَنْظُرُوا تَبَيَّنَ لَكُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَلَا تَسْأَلُوا نِدًا وَلَا مَعْتَبَةً لَكُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَاتَّبِعُوا حَقَّ سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ -

(الوافقات ج ۲ ص ۷)

ان شواہد کے بعد بھی اگر کسی کو اس پر اصرار ہے کہ حضرت عمرؓ حجرت حدیث کے قائل نہ تھے یا حدیث کو دین سے

نبی کی رائے وحی الہی ہے

خارج کر دینا چاہتے تھے تو ہم اس کا معاملہ خدا پر چھوڑتے ہیں اور اس باب میں آخر کے طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک قول پیش کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ اس سے جو نتیجہ چاہیں اخذ کریں۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں اور علامہ جلال الدین سیوطی نے مفتاح الحشر میں حضرت عمر کا یہ قول نقل کیا ہے :

اے لوگو! جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کا تعلق ہے سو وہ درست ہے کیونکہ اللہ اپنی رہنمائی کرتا تھا لیکن ہماری رائے تو صرف گمان اللہ تکلف ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ! إِنْ رَأَيْتُمْ أَنَّ كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ مَصِيبًا لَأَنَّ اللَّهَ كَانَ يَوْمِيًّا وَإِنَّمَا هُوَ مِنَ الظَّنِّ وَالتَّكَلُّفِ -

نبی کی رائے کو وحی الہی تسلیم کرنے والا بھی اگر منکر حدیث ہے تو پھر مؤید حدیث اور حجرت حدیث کا قائل آپ کے کہیں گے جو یہ سمجھتا ہو کہ رسول اللہ کی رائے ہر حال میں درست ہے اس لیے کہ اس کی پشت پر اللہ کا ارادہ کام کرتا ہے اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرتا کہ وہ حدیث کو دین سے خارج کرنا چاہتا ہے بہتان اور افتراء تو ہے ہی دعویٰ کرنے والوں کے عقل سے عاری ہونے کی دلیل بھی ہے ۔

منکرین حدیث کے دعوے کا اصل مدار

حضرت عمرؓ کے اس قول کو اتمام حجت کے طور پر پیش کرنے کے بعد اب ہم ان روایات کا جائزہ لیتے ہیں جو اس سلسلے میں منکرین حدیث کے دعوے کا اصل

مدار ہیں۔ منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں جن روایات کو بہت بڑھ چڑھ کر پیش کرتے ہیں وہ تین طرح کی ہیں :

(۱) وہ روایات جن سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ حدیثیں روایت کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے۔

(۲) وہ روایت جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حدیثیں روایت کرنے پر بعض صحابہ کو سزا دی تھی۔

(۳) وہ روایت جس میں ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے لکھے ہوئے احادیث کے مجموعے منگوائے اور ان کو جلا دیا۔ اب ہم ان تینوں قسم کی روایات کا تفصیل سے جائزہ لیں گے اور بتلائیں گے کہ ان روایات کے اصل مفہوم کی روشنی میں فی الواقع کیا نتیجہ نکلتا ہے اور منکرین حدیث نے خود ساختہ معنی پہنا کر ان روایات سے کتنے دور از کار نتائج اخذ کیے ہیں :

روایت سے منع کرنا

وہ روایات جن کو مختلف سباق و سباق میں بار بار پیش کر کے منکرین حدیث ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے ان میں سب نمایاں روایت وہ ہے جس کو حضرت قرظ بن کعبؓ صحابی سے امام شعبی نے نقل کیا ہے اور علامہ ذہبی نے اسے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت عمرؓ کے حالات بیان کرتے ہوئے بھوں کا توں لے لیا ہے۔ حضرت قرظ بن کعبؓ سے روایت ہے :

ہم (مدینہ سے) نکلے تو حضرت عمر ہاری ضایعت میں ہر نامی مقام تک آئے پھر آپؓ نے پانی طلب کر کے وضو کیا پھر فرمایا تم لوگوں نے سمجھا بھی کہ میں

خَرَجْنَا فَبَشَعْنَا عُمَرَا لِي صَرَارٍ ثُمَّ
دَعَانِي فَوَضَّأْتُ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُ رَوْنٌ لِّمِ
خَرَجْتُ مَعَكُمْ فَلَمَّا اَرَدْتُ اَنْ

تَشْتَعْنَا تَكْرِمًا قَالَ إِنَّ مَعَ
ذَلِكَ لِحَاجَةً لِّكُمْ بِأَكُونُ
بَلَدًا لِأَهْلِهَا وَرِيًّا بِالْعَرَابِ
كَذَوِي النَّخْلِ فَلَا تَصَدُّوهُمْ
بِالْأَحَادِيثِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَشْغَلُوهُمْ جِزْرًا
الْقُرْآنَ وَاقْتُلُوا الرِّوَايَةَ عَنْ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
إِمْضُوا وَأَنَا شَرِيكُكُمْ
(تذكرة الحفاظ ج ۱ ص ۱)

تمہارے ساتھ (مدینہ سے) نکلی کر کوں آیا عرض کیا
ہم لوگوں کی مشابہت اور عزت افزائی کے لیے فرمایا اس
کے سوا بھی ایک ضرورت تھی میرے نکلنے کی وہ یہ کہ تم
ایسے شہر میں پہنچو گے جس کے باشندوں میں قرآن کی تلاوت
اس طرح گونجتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی جھنجھٹ
دیکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کر
کر کے تم ان لوگوں کو (قرآن کی مشابہت سے) روک
نا دینا قرآن کو استوار کرتے چلا جانا اور رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے میں کمی کرنا۔ اب جاؤ
میں تمہارا ساتھ ہی ہوں۔

روایت حدیث سے منع کرنے کے ثبوت میں بنیادی طور پر تو یہی روایت منکرین حدیث کی جانب
سے بار بار پیش کی جاتی ہے البتہ اس روایت سے جو نتیجہ وہ اخذ کرتے ہیں اس میں قوت
پیدا کرنے کے لیے بعض ایسے اقوال بھی بطور تائید پیش کیے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا
ہے کہ حضرت عمر روایت حدیث سے روکنے میں اس قدر سخت تھے کہ ان کی وفات کے
بعد بھی لوگ ان کی سختی کو یاد کر کے کانپ اُٹھتے تھے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ کا ایک قول
نقل کیا جاتا ہے جس کو ان کے شاگرد ابو سلمہ نے روایت کیا ہے کہ

قُلْتُ لَمْ أَكُنْتُ تَحْدِثُ فِي زَمَانِ
عُمَرَ هَكَذَا فَقَالَ لَوْ كُنْتُ أَحَدَهُ
فِي زَمَانِ عُمَرَ مِثْلًا مَا أَحَدْتُكُمْ
لَضَرَبَنِي بِمُخَفِّفِهِ
(تذكرة الحفاظ ج ۱ ص ۱)

میں نے حضرت ابو ہریرہ سے پوچھا کہ کیا
آپ حضرت عمر کے زمانے میں بھی اسی طرح
احادیث روایت کرتے تھے تو انہوں نے کہا اگر میں
حضرت عمر کے زمانے میں اسی طرح روایت کرتا
جیسے اب کرتا ہوں تو عمر مجھے درے مارتے۔

اسی سے ملنے ملتے مضمون کا حامل ایک اور قول بھی پیش کیا جاتا ہے جو دوسری صدی ہجری

کے مشہور محدث سفیان بن عیینہ کی طرف منسوب ہے کہ حدیث کے طلبہ جب ان کے حلقہ درس میں آتے تو کبھی کبھی ان کو مخاطب کر کے حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے :

اگر حضرت عمرؓ میں امد تمہیں پالیتے تو ضرور میں مار کر دیکھ بیٹھتا۔	ذَا دَرَكْنَادٍ يَا كَدُّ عَمْرٍ لَا جَعْفًا (جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۱۳۵)
--	---

غرض اسی قسم کی مختلف روایتیں پیش کر کر کے منکرین حدیث ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کے تائل نہ تھے اور لوگوں کو حدیثیں روایت کرنے سے روکنے میں اس قدر سختی سے کام لیتے تھے کہ لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ منکرین حدیث ان روایات سے جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ کھس تک غلط ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر روایات کی صحت میں محدثین کو کلام ہے۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو ان روایتوں کی صحت میں شبہ ہے۔ علامہ ابن حرم نے بھی کتاب الاحکام میں حضرت عمرؓ کی طرف منسوب اس قسم کی روایات کے راویوں پر جرح کر کے ان روایتوں کو مشتبہ و مشکوک قرار دیا ہے :

روایت میں کمی کا مشورہ تاہم ان روایتوں کی صحت و ثقافت سے قطع نظر حیرت تو اس بات پر ہے کہ حضرت قزظہ بن کعبؓ مروی

وہ روایت جس کی بنیاد پر روایت حدیث سے ممانعت کی ساری عمارت کھڑی کی گئی ہے بجائے تائید کرنے کے منکرین حدیث کے دعوے کی کھلی تردید کرتی ہے۔ حدیث دشمنی کی پاداش میں شاید اللہ نے ان کی عقلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ اتنی تمیز بھی نہ رہی کہ کوئی بات ان کے حق میں جاتی ہے اور کوئی ان کے خلاف اس روایت کے الفاظ پر پہلے اچھی طرح غور تو کر لیا ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے روایت حدیث سے روکنے کے وقت یہ نہیں کہا کہ میں تم لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے سے منع کرتا ہوں بالکل کوئی حدیث روایت نہ کرنا بلکہ کیا یہ ہے کہ حدیثیں کم روایت کرنا۔ حضرت عمرؓ

کے الفاظ ہیں **وَأَقْلَوُا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ** (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں روایت کرنے میں کمی کرنا) ان الفاظ سے روایت حدیث کی ممانعت تو بہت دور کی بات ہے البتہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کا حکم دے رہے ہیں۔ جب کسی کام کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس کام کے کرنے میں ذرا کمی کرنا تو اس کا کھلا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کام کو کرتے ضرور رہنا۔ مخاطب کو اس کام سے جو تعلق خاطر ہے اس کے پیش نظر چونکہ حدیث یہ ہے کہ میں اعتدال سے نکل کر کثرت سے اس کام میں انہماک نہ پیدا ہو جائے جو بعض مصالح کے تحت مقصود نہیں اس لیے کہا یہ جاتا ہے کہ اس کا میں کمی ہی رکھنا کہ وہی مطلوب ہے۔ اس کو ایک قریب کی مثال سے سمجھئے کوئی شخص کھانوں کا بہت سہوین ہو اور اس بنا پر خدشہ یہ ہو کہ انواع و اقسام کے کھانے دیکھ کر اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے گا۔ ضرورت سے زیادہ کھائے گا اس خدشے کے پیش نظر طیب اسے کہے کہ دعوت میں جا تو رہے ہو مگر کھانے میں کمی ہی رکھنا تو کیا یہ سمجھا جائے گا کہ طیب نے کھانا کھانے سے اسے بالکل منع کر دیا ہے صاف ظاہر ہے کہ ہر کوئی طیب کے اس جملے سے یہی مطلب اخذ کرے گا کہ کھانا کھانے سے روکا نہیں جا رہا ہے بلکہ اجازت دی جا رہی ہے کہ کھانا کھاؤ ضرور مگر کم کھاؤ صحابہ کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے سے زیادہ کوئی چیز مرغوب ہو سکتی تھی حقیقت یہ ہے کہ احادیث بنوہ صحابہ کی محبوب ترین روحانی غذا تھی اور حضرت عمرؓ روحانی طیب ہونے کی کیفیت سے جس چیز سے منع کر رہے تھے وہ یہی تھی کہ روایت حدیث میں تہملے اپنے تعلق خاطر کی بنا پر ضرورت سے زیادہ انہماک نہ ہو جائے گویا بالواسطہ طور پر اس بات کی تو اجازت کیا حکم دے رہے ہیں کہ احادیث بنوہ ضرور روایت کرنا مگر ساتھ ہی اس بات کی تاکید کر رہے ہیں کہ حدیث اعتدال میں رہتے ہوئے حدیثیں روایت کرنے میں کمی کرنا۔

حضرت ابوہریرہ اور حضرت سفیان بن عیینہ وغیرہما کے جو اقوال تائید کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ان کے الفاظ بھی یہی بتلا رہے ہیں کہ ان حضرات کو حضرت عمرؓ کی سختی کا خیال آتا تھا تو کثرت سے حدیثیں روایت کرنے کی بنا پر۔ حضرت ابوہریرہ کا یہ فرمانا کہ

لَوْ كُنْتُ أَحَدَ ثُفَي زَمَانٍ عَمَّرَ مِثْلَ مَا أَحَدٌ شَكَرَ (اگر میں حضرت عمر کے زمانے میں اسی طرح حدیث روایت کرتا جیسے اب کرتا ہوں) اسی طرح حضرت سفیان کو روایت حدیث کے لیے ہاتھ ملانے کا حلقہ بنا کر بیٹھنے پر یہ خیال آتا کہ اگر حضرت عمرؓ اس طرح جمع بنا کر حدیثیں روایت کرتے ہیں دیکھ لیتے تو ضرور ہمیں سزا دیتے ان سب سے یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے کہ جس کثرت سے ہم اب حدیثیں بیان کرتے ہیں اسی کثرت سے اگر حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کرتے تو ضرور سزا پاتے۔ مطلق انکار روایت کا مفہوم کسی طرح بھی ان اقوال سے سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ واقعہ بھی جس میں ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعض صحابہ کو حدیثیں روایت کرنے پر سزا دی تھی اور جس پر تفصیلی بحث آگے آ رہی ہے۔ یہی ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو ان حضرات سے شکایت تھی تو اس بات کی کہ وہ بہت زیادہ حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ سزا دیتے وقت حضرت عمرؓ نے ان کی غلطی کا ذکر کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ ہی بات کہی تھی کہ اِنَّكُمْ قَدْ اَكْثَرْتُمُ الْحَدِيثَ (تم لوگ بہت زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے ہو)۔ ان الفاظ کا اس کے علاوہ کوئی مطلب نکلتا ہی نہیں کہ بہ کثرت حدیثوں کی روایت سے حضرت عمرؓ منع کرتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر نے بھی جامع بیان العلم میں ان روایتوں کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ

یہ روایات ہیں بات کی دلیل ہیں کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث میں کثرت آمد زیادتی کو رد کرتا چاہتے تھے اور اس بات کا حکم کرتے تھے کہ روایت حدیث میں کمی کی راہ اختیار کی جائے۔

هَذَا يَدُلُّ عَلَى فَهْمٍ عَنِ الْاَكْثَارِ
وَأَمْرٍ بِالْاِقْلَالِ مِنَ الرِّوَايَةِ عَنْ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(جامع بیان العلم ص ۱۲۳)

ہر حال ان روایات سے جو منکرین حدیث کی طرف سے بار بار پیش کی جاتی ہیں ان کے الفاظ کو خواہ کسی طرح توڑ مروڑ لیا جائے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث سے بالکل منع کرتے تھے۔ منکرین حدیث یا تو کوئی اور ایسی روایت پیش کریں جو ان کے دعوے کو واقعی درست ثابت کر دے اور یہ یقینی بات ہے کہ وہ کوئی ایسی روایت پیش نہیں کر سکتے تو پھر انہیں یہ مان لینا چاہیے کہ ان روایات سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کی کثرت سے منع فرماتے تھے۔ ظاہر ہے منکرین حدیث یہ بات ماننے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گے کہ چونکہ وہ اگر یہ

مان لیں تو پھر منطقی نتیجے کے طور پر انہیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر روایت حدیث کو ناپسند نہیں فرماتے تھے اس لیے کہ آپ کے نزدیک اگر روایت حدیث ناپسندیدہ ہوتی تو پھر کمی زیادتی کی کیا بحث دونوں ہی سے رک جلنے کا حکم دیتے۔ کسی ناپسندیدہ کام کے بارے میں یہ کہنے کا تو کوئی مطلب ہی نہیں کہ اس کام کو کم کرنا ایسے موقع پر تو صاف یہ کہا جاتا ہے کہ اس کام کو مت کرنا۔ ان روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی بات حافظ ابن عبد البر نے بھی کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

اگر آپ مطلق روایت کو ناپسند کرتے اور برا جانتے تو زیادتی اور کمی دونوں ہی سے منع کرتے۔

ولو كره الرواية وذمها لذهب
عن الاقل والاکثر
(جامع بيان العلم ج ۲ ص ۱۳۲)۔

سیدھی سی بات ہے معمولی تامل سے سمجھ میں آجائے والی بات۔ اگر حضرت عمر کی نظر میں حدیث کی زوائد کرنا معاذ اللہ کوئی بُرا کام ہوتا تو پھر ان روایات کا مطلب یہ نکلا کہ حضرت عمر زیادہ بُرا کام کرتے سے روک رہے ہیں لیکن تھوڑا سا بُرا کام کر لینے کی اجازت دے رہے ہیں بلکہ صرف اجازت ہی نہیں کہ یہ رہے ہیں کہ اس تھوڑے سے بُرے کام میں یس خود بھی تمہارا شریک ہوں آخر میں امضوا وناشروا (اب جاؤ میں تمہارا ساتھی ہوں) کہنے کا تو یہی مطلب ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی کیسی غیر معقول بات حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کی جا رہی ہے۔

کثرت روایت سے روکنے کی وجہ | اب رہا یہ سوال کہ حضرت عمرؓ کثرتِ روایت ہی سے آخر کیوں منع کرتے تھے اگر حدیث

روایت کرنا کوئی نیک کام ہے تو پھر جتنا زیادہ یہ نیک کام کیا جاتا ہے، تمہارا شریک حضرت عمرؓ ایک نیک کام کی انجام دہی میں کمی پر کیوں اصرار کرتے تھے تو اس کے جواب کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے وہ الفاظ کافی ہیں ایمان روایات پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے ازالۃ الخفایں بطور تبصرہ ارشاد فرمائے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

اچھی طرح تلاش و تفتیش سے معلوم ہوا کہ فاروق اعظم کی دقیق نظر حدیث کے دونوں حصوں میں امتیاز

باستقرار تام معلوم شد کہ فاروق اعظم نظر دقیق را در تفریق میان احادیث کہ بتبلیغ شرائع و

تکمیل افراد بشر لعلی دارد از غیراں مصروف
می ساخت۔ لہذا احادیث شامل و احادیث
سنن زوائد و لباس و عادات کمتر روایت
می کرد۔ اینها از علوم تکلیفیه تشریعیہ نیست
باحتی کہ چون اہتمام تام بروایت آن بکار برند
بعض اشیا از سنن زوائد بہ سنن ہدی
مشتبہ می گردد۔

(ازالۃ الخفاف - ۲ ص ۱۴۱)

پیدا کرنے پر زحمت رہی یعنی وہ حصہ جو شرائع
کی تبلیغ اور انسانی افراد کی تکمیل سے متعلق
تھا اس میں مشغول رکھ کر دوسرے حصے میں
انہماک سے لوگوں کو روکتے تھے اسی لیے شمائل
نبوی سے متعلق احادیث اور سنن زوائد پر مشتمل
احادیث جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے لباس اور آپ کی عادات سے تھا ان کو کم
روایت کرتے تھے چونکہ ان حدیثوں کا شمار ان
علوم میں نہیں ہے جن کا لوگوں کو مکلف بنایا گیا
ہے اور عام تشریح و قانون کی حیثیت۔ ان کی
نہیں ہے اس لیے اس کا احتمال تھا کہ اگر زیادہ
توجہ ان کی اشاعت میں کی جائے گی تو سنن زوائد
اور سنن ہدی آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے۔

در اصل یہ وہی بات ہے جو اس سے پہلے حضرت
ابوبکرؓ کے ذکر کے سنن میں عرض کی جا چکی ہے کہ یہ سب
کچھ صرف اس لیے تھا کہ خبر احادیث والی راویوں میں ثبوت

دین کے بیناتی اور غیر بیناتی حصوں میں امتیاز

کی ایسی کیفیت پیدا نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے دین کے بیناتی حصہ کے مطالبوں کی جو
قوت ہے وہی قوت لوگ ان روایتوں کے مطالبوں میں بھی محسوس کرنے لگیں یعنی دین کے
بیناتی اور غیر بیناتی حصے کہیں آپس میں گڈ بڈ نہ ہو جائیں دین کے ان دونوں حصوں میں امتیاز
پیدا کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا کہ اول الذکر کی تبلیغ
و اشاعت میں عمومییت کا رنگ جس حد تک پیدا ہو سکتا تھا اس کے پیدا کرنے پر پورا زور صرف
فرمایا اور مؤخر الذکر حصے کو پہنچانے کی حد تک تو آپؐ نے پہنچایا لیکن اس کو ہر شخص تک
پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی مقصد ہی تھا کہ دین کے ان دونوں حصوں کے مطالبوں میں

قوت وضعف کا فرق برقرار رہے جو دین میں سہولت و آسانی کے پیش نظر بہت ضروری تھا اپنے عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پوری نگرانی فرمائی آپ کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں اس امتیاز کو برقرار رکھنے پر پورا زور صرف فرمایا اور اب یہی غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر تھی جس کے لیے آپ کثرت روایت سے منع فرماتے تھے :

کذب سے حفاظت | اس اہم مقصد کے علاوہ ایک اور مصلحت بھی تھی جس کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کثرت روایت سے لوگوں کو منع فرماتے تھے۔

در اصل کثرت روایت کی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب ہو جانے کا اندیشہ قلت روایت کی صورت کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فکر یہ تھا کہ کہیں کثرت روایت کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جھوٹ سچ کی آمیزش نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے تعداد میں کم احادیث حافظ میں آسانی سے محفوظ رکھی جاسکتی ہیں جتنی زیادہ احادیث ہوں گی اتنا ہی ان کو یاد رکھنا مشکل ہوگا اور اسی قدر بھول چوک اور غلطی کا امکان بڑھے گا۔ اس لیے بجائے اس کے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ احادیث بیان کرنے کے شوق میں کوئی غلط بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر بیٹھے اور اپنے ہاتھوں جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنالے بہتر یہ ہے کہ کم سے کم حدیثیں بیان کرے۔ صحابہ کے درمیان یہ حدیث بہت مشہور تھی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعِدًّا فَلَْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (جس نے جان بوجھ کر کوئی غلط بات میری طرف منسوب کی اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ بخاری کتاب العلم) کثرت روایت سے روکتے وقت معلوم ہوتا ہے حضرت عمر کے لیے یہی حدیث ایک محرک قوت کے طور پر کام کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے قلت روایت کے بارے میں استفسار فرمایا تو آپ نے اسی خطرے کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا :

كَذَلِكَ أُنْذِرُكُمْ أَنْ أَزِيدَ فِيهِ | اگر مجھے یہ درد نہ ہوتا کہ روایت حدیث میں مجھ سے

کی بیشی ہو جائے گی تو میں تم سے حدیث بیان کرتا۔

الحديث أو أنقص فحدثكم به .
(انساب الاشراف للبلاذري)

اسی کی بیشی سے ڈرتے ہوئے حضرت عمرؓ خود بھی حدیثیں کم روایت کرتے تھے اور یہی دور ان کو مجبور کرتا تھا کہ دوسرے لوگوں کو بھی کثرت سے حدیثیں روایت کرنے سے روکیں۔ علامہ ذہبی اسی موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

حضرت عمرؓ اس دور سے کہ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں ان کو حکم دیتے تھے کہ رسول اللہ سے روایت کم کریں۔

وَقَدْ كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ
الصَّاحِبُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ يَا مَعْرُوفُ أَنْ يَقْلَّ
الرَّوَايَةُ عَنْ نَبِيِّهِ (تذكرة الخفاف ج ۱ ص ۱۸۱)

روایت میں احتیاط | حضرت عمرؓ دراصل چاہتے یہ تھے کہ صرف ان احادیث کی روایت کی جائے جن کے متعلق راوی کو پورا اطمینان ہو کہ جو اس نے دیکھا یا سنا ہے وہی کچھ وہ بیان کر رہا ہے۔ چنانچہ بعض مرتبہ کوئی حدیث بیان کرے آپؐ مخاطبین سے کہتے کہ جس نے اس حدیث کو خوب اپنے فظ میں جمایا ہے اسے چاہیے کہ وہ جہاں جہاں جائے اس حدیث کو بیان کرتا چلا جائے۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں ایسا ہی ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بار ایک حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا :

جس نے اس حدیث کو اچھی طرح حافظے میں جمالیا اور اس کو سمجھ لیا اور یاد کر لیا اسے چاہیے کہ وہ اس حدیث کو ان مقامات تک بیان کرتا چلا جائے جہاں پہنچ کر اس کی سواری رک جائے مگر جسے اندیشہ ہے کہ حدیث کو پوری طرح دل میں جمائیں سکا میں اس کیلئے جائز نہ کروں گا کہ وہ میری طرف جھوٹ کو منسوب کرے۔

مَنْ رَوَاهَا وَعَقَلَهَا وَحَفِظَهَا فَلْيُحَدِّثْ
بِهَا حَيْثُ تَنَهَى بِهِ رَاحِلَتُهُ
وَمَنْ خَشِيَ أَنْ لَا يَعْصِيَهَا نَفْسُهُ
لَا أُجِلُّ لَهُ أَنْ يَكْذِبَ عَلَيَّ .
(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۱)

بات یہی ہے حسرتِ عمرؓ کا اصل مقصود صرف ان لوگوں کو روکنا تھا جن کو اپنی یادداشت اور حافظے پر پورا اطمینان اور اعتماد نہ ہو۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی وہ مشہور حدیث جس میں تین بار سلام کے ذریعے استیذان کے طریقے کا ذکر ہے اور جس کے روایت کرنے پر حضرت عمرؓ نے تصدیق کے لیے کسی شاہد کا مطالبہ کیا تھا۔ اس میں بھی ذکر ہے کہ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے خاص طور سے جس بات کا ذکر کیا وہ یہی تھی کہ اگر ہمیں حدیث پروری طرح یاد ہے تو خیر و رزق میں تم کو دوسروں کے لیے باعثِ عبرت بناؤں گا۔ جمع الفوائد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا :

اگر یہ کوئی ایسی بات ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر تم نے یاد کر لیا تو خیر و رزق میں تم کو دوسروں کے لیے عبرت بناؤں گا۔

إِنْ كَانَ هَذَا شَيْئًا حَفِظْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبِهَا وَإِلَّا لَا جَعَلَنَّاكَ عِظَةً۔

(جمع الفوائد ص ۱۳۴)۔

حقیقت یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کو خوف تھا تو اس بات کا کہ کہیں لوگ ان احادیث کو بھی بیان کرنے پر جری نہ ہو جائیں جو ان کو اچھی طرح محفوظ نہ ہوں یا جن کے بارے میں انہیں اپنی یاد پر پورا بھروسہ نہ ہو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے ان کی روایت پر جو گواہ طلب کیا گیا تھا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ حضرت عمرؓ کو ان پر اعتماد نہ تھا بلکہ وہ دکھانا چاہتے تھے کہ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے ساتھ ایسی سختی کا معاملہ ہے تو عام آدمی کو خود ہی سمجھ لینا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے احتیاطی سے کوئی غلط بات منسوب کرنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ نے جب حضرت ابو سعید خدریؓ کو اپنی تائید میں پیش کیا تو بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو خطاب کر کے فرمایا :

خبردار میں تم کو غلط بیانی سے متہم نہیں کرتا لیکن ڈرتا ہوں کہیں لوگ غلط باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ منسوب کرنے لگیں۔

أَمَّا إِنِّي لَمْ أَتِمُّكَ وَلَكِنْ خَشِيتُ أَنْ يَقُولَ النَّاسُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

غرض حضرت عمرؓ کثرتِ روایت سے اگر منع کرتے تھے تو آپ کے پیشِ نظر ہی دو مقصود تھے اول یہ کہ کثرتِ روایت کی بنا پر کم سن خراجِ احاد پر مبنی احادیث میں عمومی کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے اور دوم یہ کہ اس طرح نبی کریم صلی اللہ کی احادیث میں جھوٹ پر صبح کی آمیزش نہ ہو جائے۔

متذکرہ بالا وضاحتوں کی روشنی میں جو لوگ حق کے طالب ہیں خداوند تعصب میں مبتلا نہیں ہیں ان پر پوری طرح یہ بات روشن ہو گئی ہوگی کہ حضرت قرظہ بن کعب والی روایت ہو یا اس کی تائید میں پیش کیے جانے والے دیگر اقوال ہوں کسی سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ بالکلہ حدیثیں روایت کرنے سے منع کرتے تھے اور اس طرح حدیث کو معاذ اللہ دین سے خارج کر دینا چاہتے تھے :-

روایت حدیث پر سزا | اب رہی وہ روایت جس میں ذکر ہے کہ بعض صحابہ کو حضرت عمرؓ نے حدیثیں روایت کرنے پر سزا دی تھی تو اس کے بارے میں بعض ناواقف حضرات کو یہ معلوم کر کے شاید حیرت ہو کہ یہ حدیث سب کے نزدیک موضوع ہے۔ حیرت کی بات ہے منکرین حدیث ایک طرف وضع حدیث کا رونا روتے رہتے ہیں اور دوسری طرف خود ہی اپنی تائید میں موضوع احادیث سے استدلال بھی کرتے رہتے ہیں اس طرح اندھیرے میں رکھ کر عامۃ الناس کو بھی آخر تک یہ لوگ بے وقوف بنا سکیں گے حق چھپا نہیں رہتا بالآخر ان کے فریب کا پردہ چاک ہو ہی جاتا ہے۔ یہ روایت امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں سعید بن ابراہیم کے حوالے سے نقل کی ہے کہ ان کے والد ابراہیم کہتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت ابوالدرداء اور حضرت ابوسعود انصاری تین آدمیوں کو مجنوس کر دیا تھا اور کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تم نے بہت زیادہ حدیثیں بیان کرنا شروع کر دی ہیں۔

ان عمر جس ثلاثۃ ابن مسعود
وآبا الدرداء و آبا مسعود انصاری
فقال انکم قد اکثرتم الحدیث
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
(تذکرۃ الحفاظ جلد ۱)۔

علامہ ابن حزم ظاہری جو روایت بالحدیث اور تمسک بالحدیث میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اس روایت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی سند کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں اور اس کے نفس مضمون کو کذب و افتراء سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے احفاظ ہیں :

یہ روایت فی نفسہ کذب اور افتراء کا نمونہ ہے۔

إِنَّ الْخَبَرَ فِي نَفْسِهِ ظَاهِرُ الْكُذْبِ
وَالْعَمَلُ بِهِ - (کتاب الاحکام جلد ۳)

اس روایت کو علامہ نے سند کے لحاظ سے منقطع قرار دیا ہے اس لیے کہ اس کے اصل راوی ابراہیم بن عبدالرحمن کا سماع حضرت عمر سے ثابت نہیں امام بیہقی نے بھی یہی لکھا ہے۔ ابراہیم بن عبدالرحمن ۹۵ھ یا ۹۹ھ میں بعمر ۷۵ سال فوت ہوئے بنا بریں وہ ۱۰۰ھ میں خلافت فاروقی کے اواخر میں پیدا ہوئے ظاہر ہے اس قدر چھوٹی عمر میں حضرت عمر سے انہوں نے کیسے یہ روایت سنی ہوگی اس کے علاوہ سوچنے کی بات ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عمرؓ نے بعض صحابہ کبار کو صرف اس لیے قید کر دیا تھا کہ وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرتے تھے تو لازم آتا ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ حضرت عمرؓ معاذا اللہ دین کی تبلیغ سے زبردستی روکتے تھے اور احکام دین کو لوگوں سے چھپانا چاہتے تھے۔ کتنی غیر معقول بات ہے یہ۔ کسی عام مسلمان سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ حضرت عمرؓ جیسے اولوا العزم خلیفہ رسول کی طرف اس کی نسبت کی جائے۔ اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ بن مسعود کو ”علم سے بھرا ہوا ایک طرف“ بھی کہتے جائیں اور پھر اسی بات پر ان کو قید کی سزا بھی دیں کہ انہوں نے اس علم کو دوسروں تک کیوں پہنچایا ہمارا اشارہ اس روایت کی طرف ہے حکومتات ابن سعد میں زید بن وہب سے نقل کیا گیا ہے اور جس میں ذکر ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک دہلا پتلا آدمی آیا تو اس کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے تین بار یہ بات دہرائی کہ ”یہ ایک طرف ہے علم سے بھرا ہوا“ اور وہ آنے والا شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔

حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ ابن مسعود کو انتہائی عزیز رکھتے تھے۔ ایک موقع پر اپنے ایک عامل کی طرف کسی ضرورت سے ان کو روانہ فرمایا تو عامل کے نام خط میں لکھا کہ میں عبداللہ بن مسعود کو اپنے پاس رکھنے کی بجائے تمہارے پاس بھیجنے میں بڑے ایشارے سے کام لے رہا ہوں کیا ایسے عزیز اور محبوب شخص کو حضرت عمرؓ محض اس جرم میں قید میں ڈال دیتے کہ وہ لوگوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتا ہے اسی طرح حضرت ابوالدرداء کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ان کو حضرت عمرؓ نے شام میں مسلمانوں کا معلم مقرر کیا تھا۔ ایک طرف ان کو علم سکھانے پر مقرر کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اسی علم کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے پر ان کو قید کیا جا رہا ہے۔ منکرین حدیث خدا رکچھ تو سوچیں یہ کیسا علمی تضاد ہے جو حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ اگر حدیثیں روایت کرنے پر سزا دینا مقصود تھا تو حضرت عمرؓ سب سے پہلے ان لوگوں کو سزا دیتے جن کی مرویات سینکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز ہیں بڑے تعجب کی بات ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے مکثرین صحابہ کو حضرت عمرؓ کچھ نہیں کہتے اور قید میں ڈال دیتے ہیں تو بے چارے حضرت ابوالدرداءؓ اور ابومسعود انصاریؓ جیسے اصحاب کو جن کی مرویات کی تعداد سو سے آگے نہیں بڑھتی اور جو بے چارے متوسلین میں بھی نہیں مقبّلین میں شمار ہوتے ہیں۔

غرض کسی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے کی بھی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ حضرت عمرؓ نے محض اس بنا پر بعض صحابہ کو قید کر دیا تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے لہذا متذکرہ روایت کے بارے میں علامہ ابن حزمؒ ظاہری کے یہ الفاظ بالکل مبنی بر حقیقت ہیں کہ ان الخبر فی نفسہ ظاہر الکذب والتولید (یہ خبر فی نفسہ کذاب وافترا کا نمونہ ہے)۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ اس روایت میں جَبَسَی کا لفظ قید کرتے کے معنی میں نہیں بلکہ روک دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہو اس صورت میں ہم کم از کم درایت کے اعتبار سے اس روایت کو قابل قبول قرار دے سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس روایت کو بھی پھر انہی روایات کی قبیل سے تصور کیا جائے گا جن میں ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعض اصحاب کو کثرت روایت سے روک دیا تھا۔ اس روایت کے الفاظ بھی ہمارے اس خیال کی تائید کرتے ہیں اِنْکُمْ قَدْ اَکْثَرْتُمْ الْحَدِيثَ کا یہی مطلب تو ہے کہ تم نے حدیثوں کے بیان کرنے میں اکتار کی راہ اختیار کی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اب تم حدیث روایت ہی نہ کیا کرو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ فلاں کام میں چونکہ تم سے احتیاط نہیں برتی جاتی اس لیے اس سے تو اچھا ہے تم وہ کام کرو ہی مت ۝

مکتوب ذخیرے جلاتا | مختصر یہ ہے کہ منکرین حدیث کی طرف سے پیش کی جانے والی کسی روایت سے بھی نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت

عمرؓ روایت حدیث سے بالکل منع کرتے تھے اور نہ ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے حدیثیں روایت کرنے پر بعض صحابہ کو قید کر دیا تھا۔ اس کے بعد اب ہم اس روایت کا جائزہ لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں احادیث کے مکتوب ذخیرے منگو اکراں کو جلا دیا تھا۔ اس سلسلے میں عموماً جو روایت پیش کی جاتی ہے اسی کو ابن سعد نے قاسم بن محمد کے حوالہ سے طبقات میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے :

إِنَّ الْإِحَادِيثَ قَدْ كَثُرَتْ عَلَى عَهْدِ
عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَالْتَمَسَ النَّاسُ
أَنْ يَأْتَوْهُ بِهَا فَلَمَّا آتَوْهُ بِهَا أَمَرَ
بِتَحْرِيقِهَا.

(طبقات ج - ۵)

حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں حدیثوں کی پھر کثرت ہو گئی تب حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے سامنے پیش کریں جب لوگوں نے پیش کر دیا تو آپ نے ان کو جلانے کا حکم دے دیا۔

منکرین حدیث کا استدلال | اس روایت کے سلسلے میں بنیادی بات غور کرنے کی یہ ہے کہ حدیثوں کے نذرِ آتش کرنے کے اس

واقعہ سے منکرین حدیث جو نتیجہ نکالتے ہیں کیا وہ درست ہے منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ احادیث بنویہ کو محفوظ کرنے کے اس قدر مخالف تھے کہ جن لوگوں کے پاس لکھی ہوئی حدیثیں پائی گئیں ان سب کو منگوا کر آپؐ نے نذرِ آتش کر دیا اور پھر اسی پر اپنی طرف سے ایک نتیجہ مرتب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ حدیث نبویؐ کو دین میں حجت نہیں سمجھتے تھے :-

حدیث کی مخالفت نہیں حمایت | جہاں تک حضرت عمرؓ کے نزدیک حدیث کے دین میں حجت سمجھے جانے کا تعلق ہے اس پر تفصیلی بحث

حضرت عمرؓ سے متعلق گفتگو کی ابتدا کرتے وقت گزر چکی ہے اس وقت تو صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ حدیثوں کے نذرِ آتش کر دینے کے اس واقعے سے حفاظت حدیث کی مخالفت نہیں حمایت ثابت ہوتی ہے منکرین حدیث جو کچھ کہہ رہے ہیں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے حضرت عمرؓ حفاظت حدیث کے مخالفت نہیں زبردست داعی تھے۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کی توجہ پہلے اس روایت کی طرف مبذول کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کو بیہقی نے مدخل میں اور ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں عروہ بن زبیر کی زبانی نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

حضرت عمرؓ نے احادیث بنویہ کی کتابت کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا سب بالائفاق ہی مشورہ دیا کہ احادیث بنویہ کی کتابت کرانی بجا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر ایک ماہ تک اللہ تعالیٰ سے اس بارے میں استخارہ کرتے رہے ایک دن صبح کو اٹھے اور اس وقت تک حق تعالیٰ نے فیصلہ کی یکسوئی عطا فرمادی تھی تو فرمایا میں نے حدیثوں کو قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن مجھ کو گزشتہ

أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَرَادَ أَنْ يَكْتُبَ السُّنَنَ فَاِسْتَشَارَ فِي ذَلِكَ أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَشَارُوا عَلَيْهِ أَنْ يَكْتُبَهَا فَنَظَّفَ عُمَرُ بَيْتَ خَيْرِ اللَّهِ فِيهَا شَهْرًا ثُمَّ أَصْبَحَ يَوْمًا وَقَدْ عَزِمَ اللَّهُ لَهُ فَقَالَ رِخْتَ كُنْتُ أُرِيدُ أَنْ أَكْتُبَ السُّنَنَ وَرِخْتَ ذَكَرْتُ قَوْمًا كَانُوا قَبْلَكُمْ كَتَبُوا كِتَابًا

فَاَكْبَرُ عَلِيَّهَا وَتَرَكَوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَ
الْحَقُّ لَا اسْتِقْبَابَ كِتَابَ اللّٰهِ لِبَشِيٍّ
ابداً۔ (جامع بيان العلم ص ۳۳)

قوموں کا خیال رہا کہ انہوں نے کتاب لکھی اور اسی
پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں
کی قسم میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی اور چیز کا
ملا ناپسند نہیں کرتا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار حادث بنویہ کو قلم بند کرانے کا
ارادہ کیا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اگر حفاظت حدیث کے مخالف تھے تو پھر احادیث
بنویہ کو قید تحریر میں لانے کا خیال ہی آپ کو کیوں آیا اور اس خیال کو آپ نے اتنی اہمیت
کیوں دی کہ اسے صحابہ کی مجلس کے سامنے پیش کیا اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو مہینہ بھر
تک استخارہ کرتے رہے۔ کسی چیز کو قید تحریر میں لانے سے مقصود اس کی حفاظت کرنا
ہوتا ہے یا اس کو ضائع کرنا؟ انکار حدیث کی تو ساری عمارت ہی کتابت و علم کتابت
کے فرق پر استوار کی گئی ہے منکرین حدیث کے نزدیک تو حفاظت کا ذریعہ ہے ہی صرف
کتابت تو پھر بتلائیے حضرت عمرؓ کتابت حدیث کرنا چاہتے تھے تو حفاظت مقصود تھی یا
نہیں۔ ہاں البتہ اب بات سوچنے کی یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارادے کو عملی
جامہ کیوں نہیں پہنایا جبکہ دیگر صحابہ کا بھی یہی مشورہ تھا کہ احادیث بنویہ کو قلم بند کر لیا
جائے بس یہی ہے وہ سوال جس کے جواب کی روشنی میں اصل حقیقت واضح ہوتی ہے اور
حدیثوں کے نذر آتش کرنے کا اصل مقصود کھل کر سامنے آتا ہے :

قرآن اور حدیث میں امتیاز

ہمارے اس سوال کا جواب حضرت عمرؓ نے خود ہی
دے دیا ہے حضرت عمرؓ کو خطرہ تھا تو وہی پُرانا
کہ کہیں قرآن اور حدیث آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں واللہ لا اشرب کتاب اللہ لشيء
ابداً (خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی چیز کی آمیزش نہ ہونے دوں گا) کہہ کر حضرت عمرؓ نے
دراصل اسی مفہوم کو ادا کیا ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر جنس صحابہ کو کتابت
حدیث سے روکتے ہوئے کتابت مع کتاب اللہ کے الفاظ سے ادا کیا تھا بلکہ بعض روایتوں

میں حضرت عمرؓ کے الفاظ بالکل الفاظ نبویہ سے ملتے جلتے ہیں آپ فرماتے ہیں لا کتاب مع کتاب اللہ (اللہ کی کتاب کے ساتھ کوئی کتاب نہیں) گویا حدیث کی حفاظت تو مقصود ہے مگر ان تمام رعایتوں کے ساتھ مقصود ہے جن کی بطور خاص نگرانی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں فرماتے رہے اور جن کو باقی رکھنے میں حضرت ابو بکرؓ نے اپنے زمانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا یعنی حدیث کی حفاظت تو ہو مگر اس طرح کہ قرآن اور حدیث آپس میں خلط ملط نہ ہونے پائیں۔ قرآن اور وہ احادیث جو قرآن کے عملی مطالبات کی تشکیل اور اسی نوعیت کے دوسرے بنیاتی احکام پر مشتمل ہیں وہ عام احادیث سے ہمیشہ نمر اور علیحدہ رہیں گویا اس بات کا پورا اہتمام رہے کہ دین کا وہ حصہ جو توازن و تعامل اور توارث کی دولت سے مالا مال ہے وہ دین کے اس حصے سے خلط ملط نہ ہونے پائے جس کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو قصداً اور امداداً دین میں سہولت کے پیش نظر انفرادی محرمات تک محدود رکھا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ اگر اپنی نگرانی میں بلکہ دوسرے لفظوں میں اگر اپنی خلافت و حکومت کی جانب سے حدیثوں کو قلم بند کرا جاتے تو یہ بنیاداً مقصد فوت ہو جاتا ظاہر ہے حضرت عمرؓ کے ہاتھوں مرتب شدہ مجموعے میں جو حدیثیں مندرج ہو جاتیں ان کے نتائج کے مطالبے اور گرفت کی وہ نوعیت قطعاً ہوتی نہ۔ ہاں جو اس وقت خبر آحاد کی حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی ہے۔ حضرت عمرؓ کا مرتب شدہ وہ مجموعہ اگر آج موجود ہوتا تو ذرا اندازہ لگائیے اس مجموعے کی حدیثوں کے ساتھ اور ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام و قوانین کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت و گرویدگی کا کیا عالم ہوتا۔ اس مجموعے کے متعلق مسلمانوں میں وہ احساس قطعاً باقی نہ رہتا جسے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خبر آحاد کی روایتوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے پیش نظر یہ خطرہ تھا جس کے انداز کے لیے انہوں نے اگرچہ پہلے خود ہی یہ تجویز رکھی کہ احادیث بنویہ قلم بند کر لی جائیں مگر پھر خود ہی اپنی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہے ۴

صحابہ سے مشورہ

اس سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کرنا بھی یہی بتلاتا ہے کہ جس وقت حفاظت حدیث کے مقصد کے پیش نظر حضرت عمرؓ یہ سوچ رہے تھے کہ احادیث قلم بند کرائی جائیں اس وقت بھی آپ کے ذہن میں یہ خطرہ موجود تھا ورنہ سوچنے کی بات ہے نیک کام میں مشورے کی کیا ضرورت۔ حضرت عمرؓ دریافت یہ کرنا چاہتے تھے کہ کیا اس مصلحت کی رعایت کرنا اب بھی ضروری ہے جس کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر احاد کی حدیثوں کی تبلیغ میں بجائے عمومیت کے خاص خاص افراد تک ان کے علم کو محدود رکھا تھا اور خود حضرت عمرؓ بھی شروع شروع میں اسی مصلحت کی بنیاد پر حدیثوں کے بیان کرنے میں اتلاں اور کمی پراصرار کرتے رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ مصلحت وقتی تھی نبوت اور نبوت سے قریب تر زمانوں میں اگر ان حدیثوں میں عمومیت کا رنگ پیدا ہو جاتا تو یقیناً اُسندہ زمانے میں ان حدیثوں کے مطالبات میں زیادہ سختی پیدا ہو جاتی جو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصود نہ تھا۔ مگر بعد کے زمانے میں ان حدیثوں میں عمومیت کا رنگ پیدا ہونے سے اس خطرے کا کوئی امکان نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے مشورہ طلب امر یہی تھا کہ وہ زمانہ گزر گیا ہے یا ابھی ان اسباب کی مزاحمت کے سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے جس سے ان حدیثوں کے مطالبات میں شدت کے پیدا ہونے کا خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے صحابہ کی اس مجلس شوریٰ نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اب وقت خاصا گزر گیا ہے اور اب اگر احادیث قید تحریر میں آکر مسلمانوں کی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل بھی ہوتی رہیں تو عمومیت اور قطعیت میں اپنے اصل مقام سے بلند نہ ہو جائیں گی یہی مشورہ دیا کہ حضرت عمرؓ اپنی تجویز پر عمل کرتے ہوئے احادیث بنو یہ کہ قلم بند کرائیں مگر حضرت عمرؓ کو شرح صدر نہ ہوا۔ ان کی نظر میں ابھی خطرہ موجود تھا چنانچہ جیسا کہ حضرت عروہ بن زبیر سے منقول محولہ بالا روایت میں ذکر ہے حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں اللہ سے استخارہ کیا اور کامل ایک مہینے تک استخارہ کرتے رہے بالآخر اللہ نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اور جن خطرات کا اندیشہ تھا ان کے تمام گوشوں کو نئے سرے سے تازہ کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا اور آپ کے

دل میں یہ عزم راسخ پیدا کر دیا کہ اپنی خلافت و حکومت کی نگرانی میں اس حدیث کو قلم بند نہ کرایا جائے۔ مگر معلوم ہوتا ہے لوگ انفرادی طور پر حدیثیں پھر بھی قلم بند کرتے رہتے تھے تا آنکہ اچھے خاصے مجموعے مختلف افراد کے ہاتھوں تیار ہو گئے جیسا کہ اس روایت کے الفاظ سے ظاہر ہے جو طبقات ابن سعد کے حوالے سے حدیثوں کے نذر آتش کر دینے کے واقع کے ضمن میں ابھی پیش کی گئی ہے اس روایت کے الفاظ ہیں **إِنَّ الْأَحَادِيثَ كَثُرَتْ عَلَى عَهْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَأُلْشِدَ النَّاسُ أَنْ يَأْتَوْهُ بِهَا** (حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں حدیثوں کی پھر کثرت ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسیم دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے سامنے پیش کریں) ان تمام مجموعوں کو منگا کر حضرت عمرؓ نے انہیں جلا دیا۔ گویا استخارے کے بعد آپ نے خود تو حدیثیں لکھوانے کا ارادہ ترک کر ہی دیا تھا لیکن لوگوں کے بارے میں آپ شددع میں کچھ ڈھیل سے کام لیتے رہے بعد میں آپ کو خیال آیا ہو گا کہ خلافت و حکومت کی طرف سے نہ سہی انفرادی طور پر ہی سہی جو تحریر بھی مرتب ہوگی وہ عہد فاروقی ہی کی طرف نسبت کی جائے گی اور اس طرح متذکرہ خطہ جو کاتوں برقرار رہے گا لہذا اس خطرے کا پوری طرح ہی سد باب کیوں نہ کر دیا جائے چنانچہ

جب وہ مجموعے لائے گئے تو آپ نے انہیں

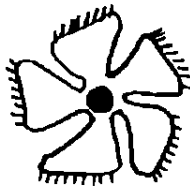
جلانے کا حکم دے دیا۔

فَلَمَّا أَتَوْهُ بِهَا مِنْ بَحْرِ لُفْطَا۔

اب اس سارے پس منظر میں حدیثوں کے نذر آتش کیے جانے کے واقعہ کو دیکھیں تو ہمارے اس دعویٰ کی حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس واقعے سے حفاظت حدیث کی مخالفت نہیں حمایت ثابت ہوتی ہے۔ حدیثوں کے مکتوب مجموعے نذر آتش کر کے حضرت عمرؓ نے فی الواقع حفاظت حدیث کا فریضہ انجام دیا اگر حضرت عمرؓ یہ کام نہ کرتے تو جن رعایانوں کے ساتھ حدیث کی حفاظت مقصود تھی وہ پوری نہ ہوتی اور حفاظت حدیث کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

کتنی حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ وہ کام جو خدمت حدیث کے طور پر پیش

کیے جانے کے قابل ہیں منکرینِ حدیث کی طرف سے مخالفتِ حدیث کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں بہر حال ہمارے تائیدین پر توبہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہوگی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوں یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دونوں اصحاب نے اپنے اپنے زمانے میں حدیث کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے منکرینِ حدیث کی طرف سے جو اتہام طرازی اور بہتان تراشی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کی جاتی ہے وہ سادہ لوح نادان افح حال مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوشش سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۛ



حفاظت حدیث اور خلفائے راشدین

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیے جانے والے الزامات کی اصل حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اب ہم مختصر طور پر ان خدمات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو حفاظت حدیث کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر و عمر اور حضرت عثمان و علی چاروں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے اپنے عہد میں انجام دیں :

حفاظت حدیث اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر کا نمبر آتا ہے۔ آپ کی خلافت کا زمانہ اگرچہ مدت کے لحاظ سے ایک بہت ہی مختصر زمانہ ہے یعنی صرف ڈھائی سال اور یہ ڈھائی سال بھی ایسے کہ مختلف قسم کے فتنہ و فساد اور قسم قسم کی شرورشوں سے بھرپور۔ اندرون عرب بھی عدم استحکام کی سی صورت اور بیرونی خطرات کا بھی سامنا مگر اس مختصر ہی مدت میں ہی اور ان تمام مشکلات کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حفاظت حدیث کے لیے جس بنیادی کام کی اس وقت ضرورت تھی حضرت ابوبکر نے اسے باحسن و بوجہ انجام دیا۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر کے تین اصولی اقدامات کا تذکرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

رفع اختلاف | اول یہ کہ آپ نے اس بات کی بطور خاص نگرانی کی کہ وہ احادیث جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے محتاط طرز عمل کے ذریعے انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے

وہ بدستور انفرادی معلومات تک محدود رہیں اور ان کی روایت اس طور پر نہ کی جائے جس سے وہ قدرتی اور فطری اختلافات جو امت کی سہولت کے پیش نظر ان احادیث میں موجود ہیں وہ ارادی اور اختیاری مخالفتوں میں تبدیل ہو کر امت کے لیے زحمت اور تنگی کا سبب بن جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس قسم کی روایات کے سلسلے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک قاعدہ لکھ کے طور پر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرادی کہ احادیث بنو بہ کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق جس شخص کے پاس جو معلومات ہیں وہ ان کی پابندی کا خوا مخواہ دوسروں سے مطالبہ کرے بلکہ صحیح مسلک ان اختلافات کے متعلق جو اس قسم کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں یہ ہے کہ امت مسلمہ کا ہر فرد ایک دوسرے کے قدرتی و فطری اختلافات کو برداشت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے اور اگر کوئی شخص ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کے لیے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی احادیث بیان کرے جو دین کے طریقوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مختلف نظیروں کی حامل ہوں تو اس کو خاموش کرانے کے لیے فوراً یہ کہا جائے کہ ان تمام نظیروں کے بنیادی اصول و کلیات قرآن کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہیں جو پوری امت مسلمہ کو اتفاقی نقطے پر سمیٹنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی جانب سے حفاظت حدیث کے لیے کی جانے والی اس پہلی بنیادی خدمت کی پوری کیفیت اور اس پر سیر حاصل تبصرہ گذشتہ اوراق میں گزر چکا ہے تاہم اس پر دوبارہ نظر ڈالیں۔

دوسری بنیادی خدمت جو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں

دین کے بنیاتی و غیر بنیاتی
حصوں کا امتیاز نہ

نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ جو قریب قریب مڑھا امام مالک کی مرفوع احادیث کی تعداد کے برابر ہے اپنے ہاتھ سے لکھ کر تیار کیا مگر پھر سنت بنوی اور مصلحت پیغمبری کی تجدید کرتے ہوئے اس مجموعہ کو اپنے ہاتھوں ہی جلا کر اس

۱۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مسوئی شرح مؤطا میں ابن حزم کا جو قول نقل کیا ہے اس کے مطابق مؤطا امام مالک میں مرفوع حدیثوں کی کل تعداد پانچ سو سے کچھ اوپر ہے۔

خطرے کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا کہ دین کا وہ حصہ جو تسمان اور قرآن کی عملی تشکیلات پر مشتمل ہے یعنی وہ حصہ جو تواتر و توارث اور تعامل صحابہ کی دولت سے مالا مال ہے وہ دین کے اس حصے سے خلط ملط نہ ہو جائے جس کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو قصداً اور اراداً دین میں سہولت کے پیش نظر انفرادی معلومات تک محدود رکھا گیا ہے۔ دین کے دونوں حصوں کے مطالبوں میں قوت و ضعف کو برقرار رکھنے کے لیے جو طرز عمل عہد نبوت میں اختیار کیا گیا تھا اسی طرز عمل کی تجدید حضرت ابوبکر نے اپنے زمانے میں اس طرح فرمائی کہ پہلے احادیث کا مجموعہ خود اپنے ہاتھوں تحریر فرمایا اور پھر اپنے ہی ہاتھوں اسے نذر آتش کر دیا۔ حضرت ابوبکر کی اس خدمت پر بھی تفصیلی بحث گذشتہ اوراق میں گزر چکی ہے۔

اصول شہادت کی بنیاد | حفاظت حدیث کے سلسلے میں تیسری بنیادی خدمت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ انجام دی کہ آپ نے

تحقیق حدیث کے لیے اصول شہادت کی بنیاد قائم فرمائی آپ نے اپنے طرز عمل سے اس بات کو ایک اصول کے طور پر پیش کیا کہ ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے غرض منسوب ہو جانے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد یقین حاصل کرنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس بات کو منسوب کرتے ہیں کسی غلط بیانی یا سہو کا دخل نہیں ہے۔

اس بات کو اصول کے طور پر پیش کرنے میں حضرت ابوبکرؓ کا طرز عمل کیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں ایک خاتون نے آکر اپنے پوتے کے چھوڑے ہوئے ترے کے میں اپنے حصے کی میراث کا مطالبہ کیا۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن تو اس مسئلے میں خاموش تھا ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد بھی حضرت ابوبکرؓ کو اس بارے میں معلوم نہ تھا چنانچہ آپؓ نے لوگوں سے دریافت فرمایا حضرت مغیرہؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا میں نے سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو چھٹا حصہ دلواتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر فرمایا کیا تمہارے علاوہ بھی کوئی اس پر شاہد ہے اس پر محمد بن مسلمہ نے شہادت دی ان کی شہادت پر حضرت ابوبکرؓ نے اس خاتون کو چھٹا حصہ

دلوادیا۔ اپنے اس طرزِ عمل سے گویا حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات ہنڈا دی کہ اخبارِ احاد کے رد و قبول میں لاپرواہی سے کام نہ لینا چاہیے۔ اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ شمس الدین ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں:

سب سے پہلے شخص جنہوں نے قبولِ روایت میں احتیاط کا طریقہ جاری کیا وہ ابوبکر صدیقؓ ہیں جیسا کہ زہری بن شہاب نے قبصۃ بن ذویب سے روایت کیا ہے کہ ایک وادی اپنے پوتے کی میراث مانگے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں تیرے بارے میں نہ تو کتاب اللہ میں کوئی حکم پاتا ہوں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان اس بارے میں مجھے معلوم ہے پھر اپنے لوگوں سے دریافت کیا تو حضرت مغیرہؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی کو چھٹا حصہ دلاتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کیا تمہارے ساتھ اسی پر کوئی اور بھی شاہد ہے تو محمد بن مسلمہ نے اس پر شہادت دی اپنے ان کی شہادت پر وادی کو چھٹا حصہ دلوادیا۔

وكان رأي ابوبكر (اول من احتاط بحقب الانبياء فرؤى ابن شهاب عن قبصة بن ذؤيب ان الجدة جارت الح ابوبكر تلتمس ان تورث فقال ما اجد لك في كتاب الله شيئا وما علمت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم ذكر لك شيئا ثم سال الناس فقام المغيرة فقال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يعطيها السدس فقال له هل معك احد فتشهد محمد بن مسلمة لمثل ذلك فافذها لها۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳)

حافظ ذہبی نے واقعی سچ کہا قبولِ روایت میں احتیاط کا یہ طریقہ جاری کرنے والے پہلے آدمی حضرت ابوبکرؓ ہی ہیں بعد کے زمانوں میں احادیث کے لیے چھان بین، تحقیق و تلاش اور تنقید و تحیص کے جتنے علوم وجود میں آئے ان سب کا منبع حضرت ابوبکرؓ کے جاری کردہ اسی چشٹے سے پھوٹا نظر آتا ہے اسی طرح بعد کے زمانوں میں روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے

محدثین کے درمیان توابع و شواہد کو جمع کرنے کا جو عظیم الشان سلسلہ جاری ہوا اس کی ابتدا گویا اسی دن ہو گئی تھی جس دن حضرت ابو بکر کی زبان سے اہل محلہ احناف کے الفاظ نکلے تھے اور حضرت محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر حضرت میسرہ کی بیان کردہ روایت کے لیے اولین متابعت و شہادت مہیا کر دی تھی۔

شہادت کی اصل حقیقت | مگر اس سے یہ نتیجہ نکلان درست نہ ہوگا کہ جس طرح انصاف خصوصیات کے لیے کم از کم دو گواہوں کا ہونا ضروری

ہے اسی طرح قبول حدیث کے لیے بھی حضرت ابو بکر کے اس طرز عمل نے کم از کم شہادت کا انصاف دو مقرر کر دیا ہے اس لیے کہ خود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتیں ایسی مروی ہیں جن کے تنہا وہی راوی ہیں جیسے فدک کی تقسیم کے مطالبے پر انبیاء کی میراث سے متعلق روایت یا وہ روایت جس میں ذکر ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں حدیثیں تنہا حضرت ابو بکر سے ہی مروی ہیں اور کون نہیں جانتا کہ ان دونوں حدیثوں کی بنیاد پر تاریخ کے کتنے اہم فیصلے طے کیے گئے گویا بغیر کسی دوسری شہادت کے تمام صحابہ نے ان حدیثوں کو قبول کیا۔ اور یہ دو حدیثیں ہی کیا کتنی حدیثیں ہیں جن کو حضرت ابو بکر ہی نہیں آپ کے علاوہ باقی خلفائے راشدین اور دیگر تمام صحابہ صرف ایک صحابی کے بیان پر بھروسہ کر کے عموماً مانتے رہے ہیں ایسی تمام حدیثوں کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

علاوہ انہیں سوچنے کی بات ہے کہ اس نوعیت کی حدیثوں پر اعتماد کرنے کے لیے کم از کم دو راویوں کی موجودگی کو اگر قانونی انصاف کی شکل دے دی جائے تو ہمیں ثابت کرنا پڑے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس نوعیت کی حدیثوں کی تبلیغ کے لیے کم از کم دو آدمیوں کو ضرور روانہ فرماتے تھے حالانکہ یہ امر واقعہ کے خلاف ہے۔ روایات کا ایک معتد بہ ذخیرہ ایسا موجود ہے جن کے متعلق خود راوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور کسی دوسرے آدمی سے اس بات کا ذکر نہ کیا تھا نیز جس طرح دنیا کے عام کاروبار میں دستور ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بھی عموماً ضرورتوں کے لیے ایک ہی آدمی کو روانہ فرمایا کرتے تھے لیکن کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے، سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے اس آدمی پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہو کہ تم تنہا اکیلے آدمی ہو جب تک تم کئی دوسرا گواہ نہ پیش کر دہم کیسے مان لیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فرمان ہے۔ صدقہ وغیرہ وصول کرنے کے لیے بھی عموماً ایک ہی آدمی روانہ کیا جاتا تھا مگر کبھی کسی نے اس سے اس بات پر گواہی طلب نہیں کی کہ وہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرستادہ ہے۔

مزید اطمینان کی ایک تدبیر | غرض حضرت مغیرہ کی روایت پر حضرت ابو بکر کا گواہی مانگنا اعتماد کی شرط کے طور پر نہ تھا

بلکہ محض مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی۔ حضرت ابو بکرؓ اپنے طرز عمل سے یہ سبق سکھاتا چاہتے تھے کہ دین کا وہی حصہ کیوں نہ ہو جس کی بنیاد اخبار احاد پر ہے اس کے رد کرنے یا قبول کر لینے میں لاپرواہی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ آخر ایک صحابی کی روایت پر بھی اگر تائید کا سبب نہ ملتا تو آئندہ آنے والوں کو سوچ لینا چاہیے کہ ان کی روایتوں کے قبول کرنے میں کس درجہ احتیاط کی ضرورت ہے اور حق یہ ہے کہ آئندہ آنے والوں نے اس سبق کو خوب سیکھا صحابہ سے روایت کرنے والوں کے بارے میں جو ہم سنتے ہیں کہ وہ حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ ایک ہی روایت جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو اس میں کمی نہ کی جائے وہ حضرت ابو بکرؓ کے پڑھائے ہوئے اسی سبق کی عملی تفسیر تھی۔ اس لحاظ سے حفاظت حدیث کے سلسلے میں حضرت ابو بکرؓ نے یہ ایک انتہائی گرانتہ خدمت انجام دی کہ روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے متابعت و شہادت کے طریقے کی بنا ڈال دی حقیقت یہ ہے کہ نواب و شواہد کی جو بلند وبالا اور عظیم الشان عمارت تدوین حدیث کی تاریخ میں بعد کے دور میں تعمیر ہوئی اس کی پہلی اینٹ حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھوں ہی رکھی گئی۔

حفاظت حدیث اور حضرت عمرؓ | حفاظت حدیث کے سلسلے میں جہاں تک حضرت عمرؓ کی خدمات کا تعلق ہے تو آپ کی ترجیح

زیادہ تر اس بات پر مرکوز رہی کہ حضرت ابو بکرؓ اپنے مختصر عہد خلافت میں حفاظتِ حدیث کے لیے جن جن کاموں کی ابتدا کر گئے تھے ان میں استحکام پیدا کیا جائے۔ گذشتہ اور آتی میں معمر بن حدیث کے لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہوئے جو کچھ کہا گیا ہے اس میں حضرت عمرؓ کی جانب سے حفاظتِ حدیث کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات کا بھی اگرچہ مفصل تذکرہ آگیا ہے تاہم اب بھی انہی اقدامات کے حوالے سے ہم حضرت عمرؓ کی خدمات کا مختصر اذکر کرتے ہیں :

کثرتِ روایت میں احتیاط | حضرت عمرؓ نے اس بات کی بطور خاص نگرانی فرمائی کہ لوگ روایتِ حدیث میں اکثر سے کام نہ لیں کثرتِ روایت سے روکنے میں آپ کو اگر سختی سے بھی کام لینا پڑا تو آپ نے اس سے بھی دریغ نہ کیا مقصود اس سے یہ تھا کہ کثرتِ روایت کی بنا پر کہیں خبرِ احاد کی روایتوں میں غمومیت کی ایسی کیفیت پیدا نہ ہو جائے جس کی وجہ سے دین کے بیناتی حصّہ کے مطالبوں میں جو قوت ہے وہی قوت لوگ ان روایتوں کے مطالبوں میں بھی محسوس کرنے لگیں۔ آپ دین کے ان دونوں حصّوں کے مطالبوں میں قوت و ضعف کے اس فرق کو برقرار رکھنا چاہتے تھے جو دین اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کے پیش نظر بہت ضروری تھا اس فرق کو برقرار رکھنے میں حضرت عمرؓ نے اس قدر احتیاط سے کام لیا کہ احادیثِ بنویہ کو کتابی شکل دینے کی شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی آپ انہیں قلم بند کرانے سے احتراز ہی فرماتے رہے ایک مرتبہ لکھوانے کا ارادہ بھی کر لیا صحابہ سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی اجازت دے دی مگر پھر اسی فرق کو برقرار رکھنے کی خاطر نہ صرف خود اپنے ارادہ سے باز رہے بلکہ دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے مجموعے بھی منگا کر ان کو جلادیا۔ دین کے بیناتی و غیر بیناتی حصّوں کے مطالبوں میں اس فرق کو برقرار رکھنے کے علاوہ حضرت عمرؓ کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ کثرتِ روایت کی صورت میں سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب ہو جانے کا خدشہ زیادہ تھا حضرت عمرؓ کو فکر یہ تھا کہ کہیں کثرتِ روایت کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جھوٹ پھیلنے کی آمیزش نہ ہو جائے۔ یہ سب کچھ دراصل سنتِ بنوی اور طرزِ صدیقی کا استحکام ہی تھا۔

اپنے عہد نبوت میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں باتوں کی پوری طرح نگرانی فرمائی آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں ان کو برقرار رکھنے پر پورا زور صرف فرمایا اور اب یہی غرض حضرت عمرؓ کے پیش نظر تھی آپ انہی دو باتوں کو یقینی بنانے کے لیے کثرت روایت سے منع فرماتے رہے ۛ

تحقیق حدیث کے لیے تائید
مزید کا مطالبہ

دوسرا کام حفاظت حدیث کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے یہ کیا کہ تحقیق حدیث کے لیے جس اصول شہادت کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ رکھ گئے تھے اس کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش فرمائی۔ سنت صدیقی کی پیروی کرتے ہوئے آپ نے بھی بعض صحابیوں کی روایت پر مزید تائید کا مطالبہ کیا بلکہ اپنی خاص فطری طبیعت کے لحاظ سے اس مطالبے میں کچھ شدت کی راہ بھی اختیار کی۔ جیسا کہ استیذان والی اس مشہور روایت میں ہے جو نسائی کے سوا صحاح ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ سخت طرز عمل اختیار کرتے ہوئے آپ نے دھکی آمیز لہجے میں کہا تھا کہ تم کو شہادت پیش کرنی پڑے گی ورنہ میں تمہارے ساتھ کچھ کو گزروں گا بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا تھا میں تمہیں دوسروں کے لیے باعث عبرت بنا دوں گا۔ بہر حال یہ سختی تو حضرت عمرؓ کے مزاج کا ایک حصہ تھی دین کے دوسرے شعبوں میں بھی آپ کے مزاج کی یہ سختی نمایاں ہے تو حدیث کا شعبہ بھی اس سے کیوں محروم رہتا تاہم بتلانا یہ تھا کہ حضرت عمرؓ بھی حضرت ابوبکرؓ کے طریقے کی پیروی کرتے ہوئے صحابہ کی روایت پر مزید تائید کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ کے علاوہ بعض دیگر صحابہ کے ساتھ بھی حضرت عمرؓ نے کئی دفعہ اپنے اسی طرز عمل کو دہرایا۔ مسجد نبویؐ کی توسیع کے سلسلے میں حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کے مکان کے داخل کرنے کے جھگڑے میں جب حضرت ابی بن کعبؓ نے وہ حدیث سنائی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لائق بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ ذکر کیا ہے تو اس حدیث کی روایت پر بھی حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے گواہ طلب کیا اور جب تک حضرت ابوذر غفاریؓ نے

گواہی نہ دے دی حضرت ابی بن کعب کی جان نہ چھوٹی۔^۱

صحابہ کی روایتوں پر تائید کا یہ مطالبہ اور اس مطالبے میں یہ سختی ظاہر ہے اس لیے نہ مٹھی کہ تھا ابو موسیٰ اشعریؓ یا اکیلے حضرت ابی بن کعبؓ جیسے حلیل القدر صحابہ کی روایت پر حضرت عمرؓ کو اعتماد نہ تھا کیونکہ اسی نوعیت کی تنہا راویوں کی روایت کردہ نہ جانے کتنی حدیثوں پر حضرت عمرؓ سے بارہا اعتماد کرنا ثابت ہے۔ ان دونوں موقعوں پر بھی حضرت عمرؓ نے خود اس غلط خیال کی تردید برطے پُر زور الفاظ میں فرمائی تھی۔ حضرت ابو موسیٰؓ والے واقعے میں حضرت ابی بن کعبؓ کی اس بنیہ پر کہ یا بن الخطابؓ فلا تکونن عذاباً علی اصحاب النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اے خطاب کے بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے لیے عذاب نہ بنو) حضرت عمرؓ نے حقیقتِ حال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

سُبْحَانَ اللَّهِ سُبْحَانَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُنْ لَكَ بِأَيِّ ثَبَرَةٍ تَكْ بِهَذَا جَاءَ -	سُبْحَانَ اللَّهِ سُبْحَانَ اللَّهِ أَلَمْ يَسْمَعْ شَيْئًا فَاجِبْتُ أَنْ أَثْبَتَ (جمع الفوائد)
---	--

اسی طرح دوسرے واقعے میں جب یہ شکایت کی گئی کہ عمرؓ تم ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں متہم کرتے ہو تو اس وقت بھی حضرت عمرؓ نے یہی جواب دیا کہ خدا کی قسم میں تم کو متہم نہیں ٹھہرانا لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یوں ہی لا پرواہی سے پھیلا دی جائیں تو بات دراصل یہ نہ تھی کہ حضرت عمرؓ تنہا ایک راوی کی روایت کو کافی نہ سمجھتے تھے بلکہ بات یہی تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یوں ہی لا پرواہی سے کوئی بات منسوب نہ کی جائے بلکہ اعتماد میں قوت پیدا کرنے کیلئے جو تائید بھی مل سکتی ہو اس کو حاصل کیا جائے۔ اور یہی ہے وہ بات جس کی ابتدا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کی تھی اور اب حضرت عمرؓ اسے مستحکم سے مستحکم تر بنا دینا چاہتے تھے۔ محدثین کے درمیان بعد کے دور میں متابعات و شواہد جمع کرنے کا جو شوق

پیدا ہوا یعنی ایک ہی حدیث ممکنہ حد تک جتنے زیادہ طریقوں سے مل سکتی ہو ان طریقوں کے تلاش کرنے اور جمع کرنے کا جو اہل امانہ ذوق ہمیں ان میں نظر آتا ہے وہ سنتِ صدیقی اور طرزِ فاروقی ہی کا یہ تو تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی بنیاد رکھی حضرت عمر فاروقؓ نے اسے خوب مستحکم کیا اور بعد کے دور میں محدثین نے اس پر ایک بلند بالا عمارت تعمیر کر دی۔ حافظ ذہبی نے حضرت عمرؓ کے تذکرے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی مذکورہ بالا استیذان والی روایت اور اس پر حضرت عمرؓ کی جانب سے تائید طلب کرنے کا واقعہ درج کرنے کے بعد لکھا ہے :

حدیثوں کے طرق میں جس کثرت کا خیال (بعد میں لوگوں کو) ہوا اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر لوگوں کو (حضرت عمرؓ کے) اس طرزِ عمل نے ہی آمادہ کیا۔

وَفِي ذَلِكَ حَقٌّ عَلِيٌّ
تَكَثِيرِ طُرُقِ الْحَدِيثِ
(تذکرہ الحفاظ)

حافظ ذہبی نے بالکل درست کہا مگر اس طرزِ فاروقی کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں ہی رکھی جا چکی تھی حضرت عمرؓ نے اس بنیاد کو اس قدر استحکام اور استواری عطا فرمائی کہ آنے والوں کے لیے اس پر عمارت کھڑی کرنا نہایت آسان ہو گیا۔

حفاظتِ حدیث اور حضرت عثمانؓ | حفاظتِ حدیث کے سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق کسی خاص

واقعہ کا ذکر تاریخِ حدیث کی کتابوں میں اگرچہ ہمیں نہیں ملتا لیکن ایسی روایتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ نے شیخین رضی اللہ عنہما کے قائم کیے ہوئے طریقے کو باقی رکھا۔ آپؓ کثرتِ روایت سے پرہیز کرتے رہے اور اس بات کی کوشش فرماتے رہے کہ اخبارِ احاد کا جو مقام عہدِ نبوی اور عہدِ شیخین میں متعین ہو گیا ہے وہ بحال رہے چنانچہ سندِ احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمان فرمایا کرتے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے

مَالِیْنَعْنِ اَنَّ اَحَدًا عَنْ رَسُولٍ

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَن لا
اکون اوعی اصحابہ عنہ و لکنی
اشہد لسمعہ ليقول من قال
علی ما لا اقل فلیتقوا مقعدہ
من النار (مسند احمد)

بیان کرنے میں مجھے یہ چیزیں روکتی کہ دوسرے
صحابیوں سے حدیثوں کے یاد رکھنے میں میں کچھ
کم ہوں لیکن بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے میری طرف
کوئی ایسی بات منسوب کی جو میں نے نہ کی ہو تو یہ جانیے
کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کثرت روایت سے پرہیز کرتے تھے اگرچہ دوسرے صحابہ کی
طرح آپ کو بھی احادیث خوب یاد تھیں مگر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرح آپ
بھی بہت کم حدیثیں روایت کرتے تھے ظاہر ہے اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ اخبار احاد
کی عام اشاعت کو پسند نہ فرماتے تھے آپ نے یہ فرما کر کہ احادیث بنویہ یاد رکھنے میں دوسرے
صحابہ سے میں کچھ کم نہیں ہوں یہ بھی واضح فرمادیا کہ کثرت روایت سے میرے پرہیز کی یہ
وجہ نہیں ہے کہ مجھے اپنے حلفے پر اعتماد نہیں بلکہ ڈر ہے تو یہ ہے کہ ان حدیثوں کی عام
اشاعت کے بعد یہ خدشہ قوی ہو جائے گا کہ سن کر روایت کرنے والے کیوں کوئی غلط بات
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عثمان
کی نظر سے یہ حقیقت بھی مخفی نہ تھی کہ خلیفہ رسول کی جانب سے ان احادیث کی عام اشاعت
انہیں قطعیت کا وہ رنگ پیدا کرنے کا بھی موجب ہو سکتی ہے جو ان احادیث سے شائع
علیہ السلام کا مقصود نہیں ہے چنانچہ ایک موقع پر ایسی ہی ایک حدیث بیان کرتے ہوئے
آپ نے اس حقیقت کا اظہار واضح الفاظ میں فرمایا کہ یہ حدیث میں اس سے پہلے نہیں سنانے
سے محض اس لیے کہ یہ کرتا رہا کہ کہیں تم سب کچھ چھوڑ چھاؤ کہ محض اسی کی تعمیل کو ضروری نہ
سمجھنے لگو پھر فرمایا کہ حدیث کو سننے کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ اپنے لیے جس پہلو کو بہتر سمجھو
اختیار کرو مسند احمد کی روایت ہے :

حضرت عثمان کے غلام ابو صالح سے مروی ہے وہ

عن ابی صالح مولى عثمان

بن عقیان رضی اللہ عنہ یقول
 إِلَهَا النَّاسُ إِنِّي كَتَمْتُكُمْ
 حَدِيثًا سَمِعْتُهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَرَاهِيَةً
 تَفَرَّقَكُمْ عَنِّي ثُمَّ بَدَأَ أَنْ
 أَحَدٌ تَكْمُوكَ لِيَخْتَارَ أَمْرًا
 لِنَفْسِهِ - مَا بَدَأَهُ سَمِعْتُ رَسُولَ
 اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ
 رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ تَعَالَى
 خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ يَوْمٍ فِيمَا سِوَاكَ
 مِنَ الْمَنَازِلِ -

(مسند احمد - ج ۱)

کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان کو یہ کہتے سنا
 کہ اے لوگو ایک حدیث جو میں نے رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اسے تم لوگوں سے
 اب تک اس لیے چھپاتا رہا کہ تم کو یہ حدیث
 مجھ سے جدا کر دے گی مگر مجھے ہی محسوس ہوا کہ
 میں اس حدیث کو تم سے بیان کر ہی دوں پھر اسکو
 سننے کے بعد آدمی جس پہلو کو چاہے اختیار کرے یہاں
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ کی
 راہ میں ایک دن کا رباط (بہ نیت ہمارا قیام)
 دوسری جگہوں میں ہزارہ دن گزارنے سے بہتر ہے۔

حضرت عثمان نے یہ کہہ کر کہ آدمی کو اختیار ہے اپنے لیے جس پہلو کو چاہے پسند کرے دراصل
 خبر احاد کی حدیثوں کے اصل مقام کی وضاحت کی ہے کہ عزم و ہمت رکھنے والے اگر چاہیں
 تو اس قسم کی حدیثوں کے مطالبوں پر عمل کر کے محبوبیت حق میں نرہتی کرتے چلے جائیں اور جو
 لوگ اس قدر عزم و ہمت سے بہرہ ور نہ ہوں ان کو اجازت ہے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی
 رخصتوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں۔

اگرچہ حضرت عثمان کا خود اپنا حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء
 مبارک کی اطلاع خواہ آپ کو خبر واحد ہی کی راہ سے کیوں نہ پہنچی ہو اس کی تعمیل کو اپنی سوائت
 خیال فرماتے تھے۔ احرام کی حالت میں شکار کے گوشت سے ہاتھ کھینچ لینے کا مشرور واقعہ

اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے اگرچہ وہ شکار نہ حضرت عثمان نے خود کیا تھا نہ اس کے شکار کرنے کا آپ نے حکم دیا تھا قدید نامی گاؤں کے رہنے والوں نے جو احرام کی حالت میں نہ تھے اس کو شکار کیا تھا۔ اور انہی لوگوں نے حضرت عثمان کو کھانے کے لیے بھیجا تھا یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمان خود اپنے اجتہاد اور تفقہ کی روشنی میں اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے مگر جب حضرت علی نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے فعل کی خبر دی جو بظاہر حضرت عثمان کے اپنے اجتہاد کے خلاف نظر آتا تھا تو حضرت عثمان فوراً دسترخوان سے اٹھ گئے۔ یہ تھا خبر واحد کی تعمیل میں حضرت عثمان کے عزم و شوق کا انداز۔

روایت حدیث میں متذکرہ تمام ترا حیطہ کے باوجود حضرت عثمان کی اپنی مرویات کی تعداد اچھی خاصی ہے امام احمد نے اپنی مسند میں جن روایات کو جمع کیا ہے ان کی تعداد ایک سو چھیالیس ہے۔

حفاظت حدیث اور حضرت علی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی ابتدا میں اپنے پیش رو و خلیفے راشدین کے طرز پر اس بات کا خیال رکھا کہ خبر احاد کی حدیثوں میں عمومیت کا رنگ نہ پیدا ہو جہاں تک ممکن تھا آپ نے بھی اس کی نگرانی میں کوئی کمی نہیں کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو باتیں احاد کی شکل میں آپ تک پہنچی تھیں اور جن کا ایک حصہ مکتوبہ شکل میں آپ کے پاس موجود تھا آپ نے ان کی اشاعت عام سے حتیٰ الامکان احتراز ہی فرمایا۔ حضرت علی نے یہ حدیثیں کس زمانے میں فلم بند فرمائی تھیں اس کے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تاہم اتنی بات یقینی ہے کہ آپ کے پاس لکھی ہوئی شکل میں کچھ حدیثیں تھیں ضرور۔ آپ نے یہ نرشتہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھا ہوا تھا۔ لوگوں کے اصرار کے باوجود آپ ان حدیثوں کی اشاعت سے انکار ہی کرتے رہے لیکن جب لوگوں کی طرٹ سے

اصرار میں شدت بڑھتی چلی گئی نیز آپ کے انکار سے لوگوں کے دو میان غلط فہمیاں پھیلنے لگیں کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغہ راز میں رکھتے ہوئے کچھ خاص رموز و اسرار کی نوعیت کی چیزیں آپ کو عطا فرمائی تھیں حضرت عثمان کے زمانے میں جن لوگوں نے فتنہ و فساد کا باضابطہ پردہ گرام تیار کیا تھا ان کو متوجہ ملنے لگا کہ اس سے مختلف قسم کے خود تراشیدہ مخالطوں میں لوگوں کو مبتلا کر دیں تو آپ نے اس مکتوب میں جو حدیثیں لکھی ہوئی تھیں ان پر لوگوں کو مطلع کر دیا مگر اس کے باوجود کسی روایت سے یہ ثبات نہیں ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے اس صحیفے کی نقل لینے کی عام اجازت لوگوں کو دے دی ہو۔ منہ احمد میں ہے کہ آپ نے نساویوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں سے علیحدہ مجھ سے کوئی ایسی بات بطور عہد کے نہیں فرمائی سوائے اس کے کہ میں نے آپ سے چند باتیں سنی ہیں وہ اس صحیفے میں ہیں جو میری تلوار کی پیام میں ہے۔

فَاعْهَدِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا خَاصَّةً دُونَ النَّاسِ إِلَّا شَيْئًا سَمِعْتُهُ مِنْهُ فَهُوَ فِي صَحِيفَةٍ فِي قُرَابِ سَيْفِي (منہ احمد)

مگر لوگوں کی اس پر بھی تسلی نہ ہوئی اور وہ اس صحیفہ کو دکھانے پر مصر رہے تو حضرت علیؑ نے صحیفہ نکال کر بھی دکھا دیا چنانچہ آگے چل کر راوی کا بیان ہے:

لوگ اس کے (دکھانے) پر مصر رہے یہاں تک کہ آپ نے اس کو نکال لیا۔

فَلَمْ يَزَلِ الْوَلِيدُ حَتَّى أَخْرَجَ الصَّحِيفَةَ (منہ احمد)

منہ احمد میں ہی طارق بن شہاب کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ آپ نے فتنہ پردازوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے لوگوں کو واضح طور سے یہ بھی بتلایا کہ اس صحیفے میں صدقہ و زکوٰۃ سے متعلق چند مسائل ہیں۔ طارق کی روایت کے الفاظ ہیں:

میں نے منیر پر حضرت علیؑ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ان کی کمر میں تلوار تھی جس کا قبضہ لوہے سے بھا ہوا تھا میں نے سنا آپ فرما رہے تھے اللہ کی قسم

زَأَيُّتُ عَلِيًّا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى الْمَنْبَرِ يَخْطُبُ وَعَلَيْهِ سَيْفٌ حَلِيقُهُ مِنْ حَدِيدٍ فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ وَاللَّهِ مَا

ہمارے پاس کتاب اللہ اور اس صحیفے کے سوا
کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے تم لوگوں کے آگے پیش
اور یہ صحیفہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
مجھے عطا فرمایا ہے اس میں صدقہ کے حصوں
کی تفصیل ہے۔

عَنْمَا كُنَّا نَقْرَأُ عَلَيْكُمْ إِلَّا كِتَابَ اللَّهِ
تَعَالَى وَهَذِهِ الصَّحِيفَةُ أَعْطَانِيهَا
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيهَا
فِرَاقُ الصَّدَقَةِ - (مسند احمد جلد ۱)

موقع پرستوں کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے حضرت علی نے برسرِ منبر اس بات کی
تو پوری طرح وضاحت کر دی کہ ان کے پاس رموز و اسرار کی قسم کی کوئی چیز نہیں بلکہ عام دینی
مسائل ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی آپ نے اس کی اجازت کسی کو نہ دی کہ
وہ ان کے پاس موجود صحیفے کی نقل لے لے کیونکہ اپنے صحیفے کی عام نقول لے لینے کی اجازت
اگر آپ نے دے دی ہوتی تو آج معاملہ یہ نہ ہوتا کہ اس صحیفے کے مضامین جن متعدد راویوں
سے حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں ان میں ایک راوی جن ابنا کا ذکر کرتا ہے دوسرا راوی
ان کے ذکر سے خاموش ہے بلکہ بجائے اس کے وہ دوسرا جزا کا ذکر کرتا ہے اگرچہ بعض اجزا
ساری روایتوں میں مشترک ہیں۔ اجزا کا یہ اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ ان راویوں میں
سے کسی راوی کے پاس بھی حضرت علی کے صحیفے کی نقل موجود نہ تھی سن سنا کر جو باتیں بارہ
گئی تھیں وہ ان ہی کو بیان کرتا تھا ۛ

روایت حدیث کے
طرزِ عمل میں تبدیلی

غرض ابتدا میں حضرت علیؑ نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ خبر
احاد کی حدیثوں میں عمومیت کا رنگ پیدا نہ ہو چنانچہ جو باتیں
احاد کی شکل میں آپ تک پہنچی تھیں ان کی عام اشاعت سے
شروع شروع میں آپ نے احتراز ہی فرمایا مگر معلوم ہوتا ہے جوں جوں زمانہ گزرتا گیا حضرت علی
کم اللہ وجہہ کو احساس ہوتا گیا کہ اب تعلیل و روایت کا طریقہ ترک کر دینا چاہیے کیونکہ ہم دیکھتے
ہیں کہ رفتہ رفتہ روایت حدیث کے معاملے میں حضرت علی کے طرزِ عمل میں تبدیلی آتی چلی گئی
کو ذہ منتقل ہو جانے کے بعد تو آپ کا عالم یہ تھا کہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ایک طرف لے جاتے اور
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو علم آپ کو پہنچا تھا اس کی تبلیغ فرماتے - تذکرۃ الحفاظ میں

حافظ ذہبی نے کمال بن زیاد کے ساتھ حضرت علیؑ کی جس طویل گفتگو کا تذکرہ کیا ہے اس میں زیاد کا بیان ہے کہ

<p>بیرہ دوڑوں ہاتھوں کو حضرت علیؑ نے پکڑا اور صحرائی میدان کی طرف مجھے نکال کر لے گئے۔</p>	<p>اَخَذَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ بِيَدَيَّ فَاَخْرَجَنِي اِلَى نَاحِيَةِ الْجَبَانِ - (تذکرۃ الحفاظ جلد نمبر ۱)</p>
--	---

کبھی آپؐ کسی کو مخاطب کر کے کہتے کہ پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتوں کو آپؐ ہم سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں رہا چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں مصنف عامری کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اسے خطاب کر کے فرمایا :

<p>اے بنو عامر! تعلق رکھنے والے بھائی! مجھ سے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ارشادات کے بارے میں پوچھ لے کیونکہ میں اہل بیت میں سے ہوں اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتوں کو زیادہ جانتا ہوں۔</p>	<p>يَا اَخَا بَنِي عَامِرٍ سَلْنِي عَمَّا قَالَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ فَاَنَا اَهْلُ الْبَيْتِ اَعْلَمُ بِمَا قَالَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ - (ابن سعد جلد ۶)</p>
---	---

کیا تو حضرت علیؑ کا حال یہ تھا کہ لوگوں کے شدید اصرار کے باوجود اپنے صحیفے میں مرقوم احادیث کے بارے میں کسی کو کچھ بتلانے پر تیار نہ ہوتے تھے کہاں لوگ دیکھ رہے تھے کہ کوفہ کے منبر پر کھڑے حضرت علیؑ لوگوں کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو خدا کی قسم جس چیز کے متعلق مجھ سے دریافت کرو گے میں اس کے متعلق بتاؤں گا۔ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنا تلوار والا صحیفہ حضرت علیؑ کسی کو دکھانے تک کے روادار نہیں ہیں دوسری طرف یہی کوفہ کا منبر ہے اور حضرت علیؑ اعلان کرتے نظر آ رہے ہیں کہ ایک درم میں کون مجھ سے علم خریدتا ہے لانے والے ایک درم کے کاغذ خرید کر لا رہے ہیں اور آپؐ اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ لکھ کر ان کے حوالے کر رہے ہیں۔ طبقات ابن سعد میں ہے :

أَنَّ عَلِيَّ بْنَ الْحَبِّ طَالِبِ خُطْبِ
النَّاسِ فَقَالَ مَنْ نِشْتَرِي عَلِمًا
بِدُرْهِمٍ فَاشْتَرَى الْحَادِثَ الْأَعْوَرَ
صُحْفًا بِدُرْهِمٍ ثُمَّ جَاءَ بِهَا
عَلِيًّا نَكَبَ لَهُ عَلَمًا كَثِيرًا -

(ابن سعد جلد - ۶)

ایک دن حضرت علی نے خطبہ دیا تو فرمایا ایک درہم
میں کون علم خریدنا چاہتا ہے عارث اعمور نے ایک
درہم میں کچھ کاغذ خریدے اور حضرت علی کے
پاس لیکر آئے آپ نے ان کاغذوں پر حدیث کے
لیے بہت سا علم لکھ دیا۔

طبقات ابن سعد ہی کی بعض دوسری روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عارث اعمور کے علاوہ
بھی چند دیگر حضرات کو اپنی مرویات حضرت علی نے لکھوا دی تھیں مثلاً حضرت حجر بن عدی
کے بارے میں ہے کہ ایک موقع پر انہوں نے ایک صحیفہ نکال کر پڑھتے ہوئے کہا یہ وہ روایتیں
ہیں جنہیں میں نے علی بن ابی طالب سے سنا۔ اسی طرح حضرت علیؓ کے صاحبزادے
حضرت محمد بن الحنفیہؓ کے پاس بھی معلوم ہوتا ہے حضرت علیؓ کی حدیثوں کا کرنی مجموعہ تھا
کیونکہ عبدالاعلیٰ بن عامر کے ترجمہ میں آتا ہے کہ

كُلُّ شَيْءٍ رَوَى عَبْدُ الْأَعْلَى
عَنِ بْنِ الْحَنْفِيَّةِ إِذَا هُوَ كَتَبَ
أَخَذَهُ وَلَمْ يَسْمَعْهُ -

(ابن سعد جلد - ۶)

عبدالاعلیٰ محمد بن حنفیہ سے جو کچھ روایت کرتے
تھے وہ دراصل ایک کتاب تھی اور عبدالاعلیٰ نے
براہ راست محمد بن حنفیہ سے ان روایتوں کو
نہیں سنا تھا۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کے جو حالات رجال کی کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ
کے پاس بھی حضرت علیؓ کی روایات کا کوئی مجموعہ تحریری شکل میں موجود تھا۔ بہر حال بات یہ ہو
رہی تھی کہ کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علیؓ کی تقلید و روایت کے اصول پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ
سکے اور روایتوں کی عمومیت کے جس دروازے کو بیچین رضی اللہ عنہما کے عہد میں پہنچنے کے

ساتھ بند رکھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ دروازہ کھل گیا۔

حضرت علی کا یہ طرز عمل بظاہر اپنے پیش رو خلفاء کے مقابلے میں عجیب محسوس ہوتا ہے مگر جن حالات میں حضرت علیؓ نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا ان کو اگر نظر میں رکھا جائے تو یہ طرز عمل عین صواب نظر آتا ہے حضرت علیؓ کو وہی کچھ کرنا چاہیے تھا جو آپؐ نے کیا۔

طرزِ عمل کی تبدیلی کا پس منظر | حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو اپنے طرزِ عمل میں یہ تبدیلی کو فہ تشریف لانے کے بعد ہی کرنی پڑی یہ رہی

زمانہ ہے جس سے کچھ ہی عرصہ پیشتر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور میں ایک عجیب غریب اندرونی تحریک دشمنانِ اسلام کی سازشوں کی پشت پناہی میں مسلمانوں کے اندر عام طور پر پھیلانے کی کوشش جاری ہو چکی تھی اس تحریک کے پیچھے دشمنوں کے بہت سے مقاصد کام کر رہے تھے مگر اس تحریک کا اصل محرر صحابہ کرام کی جماعت کو بدنام کرنا تھا دشمنوں نے اس جوہری قوت کو قطعی طور پر ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جو اسلام کی نصرت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد صحابیت کی شکل میں قدرت کی طرف سے جمع کر دی گئی تھی۔ اسلام کے دشمن عمر عثمانی کے آخری دور میں یہی ارادہ لے کر اُٹھے تھے کہ صحابیت کی اس قوت پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منتشر ہو جائے تاکہ اسلام اپنے دیہی اور دنیوی دونوں سرمایوں کے اعتبار سے خود بخود صفر ہو کر رہ جائے۔ اس کے لیے انہوں نے صحابہ کو طرح طرح سے بدنام کرنا شروع کیا اور گئے چنے چند صحابیوں کو مستثنیٰ کر کے کہنا شروع کر دیا کہ صحابہ کی اکثریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخلص نہ تھی۔ مگر ظاہر ہے صحابہ کے خلافتِ عام مسلمانوں کو اس حد تک کھینچ کر لے آنا کہ صحابیت کی قوتِ عدم محض ہو کر رہ جائے کچھ آسان کام نہ تھا کوفہ کی چھاؤنیوں میں بسنے والوں کی اکثریت مانا ان لوگوں پر مشتمل تھی جو ہجرت کی صحبت سے فیض یاب نہ تھے مانا کہ صحرائے عرب کے یہ بدو ہونے کو تو مسلمان ہو گئے تھے مگر اب بھی ان میں بدویانہ خوبیاں باقی تھیں مگر اس سب کے باوجود وہ لوگ بہر حال تھے تو مسلمان ہی بنی کر کم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا پیغمبر اور اسلام کو خدا کا سچا دین مان چکے تھے ان لوگوں کو یہ باور کرانا آسان نہ تھا کہ صحابیت کی ساری قوت اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت

پر خراج ہوتی رہی۔ اپنی تمام تر علمی و کرداری کمزوریوں کے باوجود کوئی ایک مسلمان بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا کہ صحابہ کی پوری جماعت میں سے محدود سے چند افراد کے علاوہ کوئی بھی نہ اسلام ہی کا درست تھا اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کسی اخلاص و عقیدت کا تعلق رکھتا تھا۔ اس حقیقت سے دشمنان اسلام بھی بخوبی واقف تھے چنانچہ انہیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر کارگر نظر نہ آئی کہ جھوٹ کا دھواں اٹھایا جائے اور اس کے ذریعے ایسی تاریکی پھیلا دی جائے کہ دن اور رات کی تمیز مشکل ہو جائے۔ اسی واحد تدبیر کو دشمن کام میں لائے اور اپنی طرف سے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر ان چند صحابہ کے حوالے سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے لگے جن کو انہوں نے اپنی مقصد برآری کی خاطر پہلے ہی صحابہ کی عام جماعت سے مستثنیٰ کر کے ان کے متعلق یہ مشہور کرنا شروع کر دیا تھا کہ بس یہی چند اصحاب ایسے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے۔ سب سے پہلی جھوٹی حدیث گھڑنے والا عبد اللہ بن سبا ہی تھا جس کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ صحابہ کی عام جماعت کے خلاف تحریک چلانے والوں کا سرغنہ تھا حافظ ابن حجر عسقلانی نے عام شیعہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ

أَوَّلُ مَنْ كَذَبَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ سَبَا | سب سے پہلے جس نے جھوٹی حدیث بنائی وہ
 رِلسان المیزان جلد ۱۳ | عبد اللہ بن سبا ہے۔

عبد اللہ بن سبا کی سرگرمیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ وہ علی الاعلان بڑی ڈھٹائی سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر بیان کرنا چلا جاتا آخر ایک روز حضرت علیؓ کی جماعت کے مشہور بزرگ مسیب بن نجبه نے عبد اللہ بن سبا کو گردن سے پکڑ لیا اور گھیسٹے ہوئے کوفہ کی جامع مسجد میں منبر کے سامنے لا کھڑا کیا اور بلند آواز میں اعلان فرمایا اِنَّكَ كَذِبٌ عَلَى اللَّهِ وَسُوءٌ لِّهِ (یہ شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف جھوٹی باتیں بنا بنا کر منسوب کرتا ہے) مگر بات صرف عبد اللہ بن سبا تک محدود نہ رہی کئی اسکے

کامندے کوفہ، بصرہ، شام، حجاز اور مصر وغیرہ تمام بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے یہ لوگ صحابہ کے خلاف سب بڑا حربہ یہی استعمال کرتے تھے کہ جھوٹی ٹھیکشیں گھڑتے اور جہاں ضرورت ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے لوگوں میں پھیلا دیتے۔ جعل سازی اور افترا پردازی کی اس مہم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علاوہ حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت مقداد بن اسودؓ وغیرہ کے ناموں سے کام لیا جاتا ہے سادے مسلمان ان جلیل القدر صحابہ کا نام سننے تو فوراً یقین کر لیتے اور پھر خود بھی ان گھڑی ہوئی بے سرو پا روایتوں کا تذکرہ ان کی اصل حقیقت سے بے خبر دوسرے لوگوں کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ کرتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے یہی سب سے بڑا سوال تھا کہ آخر اس فتنے کا سد باب کس طرح کیا جائے ردائیتوں میں آتا ہے کہ خود حضرت علی کی طرف منسوب کر کے جن باتوں کو عبد اللہ ابن سبا اور اس کے ساتھی مسلمانوں کے درمیان پھیلاتے پھرتے تھے وہ سب حضرت علی کے علم میں آتیں تو بے چین ہو جاتے اور بے ساختہ آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ آ جاتے کہ

ما لِح وَ لِهَذَا الْخَبِيثِ الْأَسْوَدِ	اس سیاہ کالے گندے خبیث کو مجھ سے
لِسَانِ الْمِيزَانِ جلد ۳	کیا تعلق۔

اور پھر جن بے سرو پا باتوں کی تشہیر کی جاتی تھی اس کی تردید فرماتے مگر قصہ کسی ایک جگہ کا نہ تھا مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے شہروں اور اہم چھاؤنیوں میں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے جھوٹ کا ایک سیلاب تھا جو ہر طرف چھا گیا تھا ہر صحابی اپنی جگہ حیران تھا ان لوگوں کی خود تراشیدہ باتیں احادیث بنو یہ کے نام سے جب ان کے کانوں میں پڑتیں تو ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ سب کچھ ہے کیا۔ لہذا صحابہ نے تو اس صورتِ حال سے گھبرا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثوں کا بیان کرنا ہی چھوڑ دیا تھا ان کی سمجھ میں اس فتنے کے مقابلے کی یہی ایک شکل تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس فتنے کا ذکر کر کے فرماتے :

إِنَّا كُنَّا نَحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
إِذَا الْمَلِكُ يُكْذِبُ عَلَيْهِ
فَأَمَّا إِذَا رَكِبَ النَّاسُ الصَّعْبَ
وَالذَّلُولَ تَرَكْنَا الْحَدِيثَ عَنْهُ

(مقدمہ سلم)

ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں
اس زمانے میں بیان کیا کرتے تھے جب آپ پر
جھوٹ گھڑنے کا رواج نہ ہوا تھا مگر جب لوگ
ہر سرکش اور غیر سرکش (اڈونٹوں) پر سوار ہونے لگے
تو ہم نے حدیثوں کا بیان کرنا ہی چھوڑ دیا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس نے صیغہ واحد کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے
تَرَكْنَا الْحَدِيثَ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نکتے کے بعد حدیثوں کی روایت
کے متعلق جو طرز عمل حضرت عبداللہ ابن عباس نے اختیار کیا تھا اس میں وہ تنہا نہیں تھے
اس روش کے اختیار کرنے میں ان کے ساتھ دوسرے بھی شریک تھے۔

اب حضرت علی کے سامنے دوہرا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا پہلے تو یہی تھا کہ ان جھوٹی
حدیثوں کے نہ ہونے ازالے کے لیے کیا کیا جائے اب یہ سوال بھی سامنے تھا کہ اس
زہر سے بچنے کی خاطر یہ رجحان جو بڑھتا جا رہا ہے کہ قطعی طور پر حدیثوں کی روایت کا
سلسلہ ہی بند کر دیا جائے اس کو روکنے کی کیا تدبیر لی جائے ؟

اسی دوہرے مسئلے کے حل کے لیے اور اسی صورت
حال کے مقابلے کے لیے حضرت علیؑ کو اپنے

جھوٹی حدیثوں کا سد باب

اس رویہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی جو حدیثوں کی تفصیل روایت سے متعلق آپ
اب تک اختیار کیے ہوئے تھے ظاہر بات تھی کہ براہ راست خود حضرت علیؑ کی آنکھوں
دیکھی اور کانوں سے سنی روایات کے مقابلے میں ان بے نہ زبیا اور جھوٹی روایتوں کی بجلا
مسلمانوں کی نظر میں کیا وقعت باقی رہ سکتی تھی جو ابن سبا اور اس کے کارندوں نے
پھیلائی تھیں۔ اسی صورت حال کے پیش نظر حضرت علیؑ کم اللہ وجہہ نے روایت
حدیث کے بارے میں اپنا طرز عمل بدل دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے
متعلق جو معلومات بھی آپ کے پاس تھیں ان کی عام اشاعت تحریر اور تقریر دونوں

ذریعوں سے وسیع پہنچا۔ نے پر آپ نے شروع کر دی۔ اس کے علاوہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اس سے بہتر اور کوئی تدبیر سو بھی نہ سکتی تھی ۛ

روایت حدیث پر قسم کا مطالبہ | ایک طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی مرویات کی عام اشاعت کا طریقہ اختیار کیا جس کا مفصل حال گزر رہی چکا ہے دوسری طرف آپ نے اپنی یہ عادت بنالی کہ جب بھی کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات آپ کے سامنے بیان کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے۔ قسم کے بغیر آپ کوئی روایت قبول نہ کرتے۔ حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں :

حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کے قبول کرنے میں اس قدر محتاط تھے کہ حدیث بیان کرنے والے سے قسم لیا کرتے تھے۔

وَكَانَ (أَيَّ عَلَى كَرَمِ اللَّهِ وَجْهَهُ) أَمَامًا
مُتَحَرِّيًا فِي الْأَخْذِ بِحَيْثُ أَنَّهُ يَسْتَحْلِفُ
مَنْ يَحْدُثُهُ بِالْحَدِيثِ (تَذَكُّرَةُ الْهَفَافِ)

عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھیوں کا زور توڑنے کے لیے آپ بار بار منبر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد دہراتے جس میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے کے لیے جہنم کی وعید ہے آپ فرماتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

میری طرف جھوٹی بات ہرگز منسوب نہ کیا کر دو جو
میری طرف منسوب کر کے جھوٹی بات بیان کر لگا
وہ آگ میں جھونکا جائے گا۔

لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ
يَكْذِبُ عَلَيَّ يَلْجُ فِي النَّارِ
(مسند احمد جلد ۱)

کبھی اسی حدیث کی اہمیت واضح کرنے کے لیے خود اپنی طرف اشارہ کر کے فرماتے :

یہ آسمان سے گریڑوں پر میرے لیے زیادہ آسان
ہے اس بات سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
طرف منسوب کر کے کوئی غلط بات کہوں۔

لَا أَنْ أَخْبَرَ مِنَ السَّمَاءِ أَحَبُّ
إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَكْذِبَ عَلَى
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (مسند احمد)

غرض حضرت علی نے اپنی مرویات کی عام اشاعت کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ پر اعتماد میں قوت پیدا کرنے کے لیے اپنی یہ عادت بنالی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی بات اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک بیان کرنے والے سے قسم نہ لے لیتے۔ نہ صرف دوسروں سے قسم لیتے بلکہ آپ سے بھی اگر کوئی کسی حدیث کے بارے میں استفسار کرتا تو آپ خود بھی جواب میں قسم کھاتے ہوئے فرماتے :

ای دریت الکعبۃ (مسند احمد جلد ۱) | ہاں! رب کعبہ کی قسم (حضور نے ایسا ہی فرمایا ہے)

طرز عمل میں تبدیلی کے دیگر عوامل | روایت حدیث کے سلسلے میں حضرت علی کے

پیشرو خلفاء کی طرح تقلید روایت کا طریقہ اختیار کیے رکھا مگر بعد میں یہ طریقہ ترک فرما دیا اور حدیثوں کی عام اشاعت پر زور دینے لگے اس کی اصل وجہ تو وہی حالات تھے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے مگر ان حالات کے علاوہ کچھ اور بھی ایسے عوامل تھے جو ہمیں حضرت علیؓ کے طرز عمل کی تبدیلی میں محرک عنصر کے طور پر کام کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً حضرت علیؓ کو اللہ ربہ کو کوفہ میں ایسے لوگوں سے واسطہ زیادہ پڑا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دلت سے تو سرفراز ہوئے تھے لیکن شرف صحابیت سے محروم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو اپنے کانوں سے سننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت انہیں حاصل نہ تھی۔ ان کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو جاننے کا شوق اور ولولہ فطری طور پر بہت زیادہ تھا جب صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد کو کوفہ پہنچی تو یہ لوگ اپنے پیغمبر کے حالات جاننے کے لیے بتیا بانہ ان پر ٹوٹ پڑے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنے محبوب پیغمبر کو صرف سنا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ تھا وہ جب ان ہستیوں سے ملتے ہوں گے جن کی آنکھیں دیدار نبوی سے مشرف رہی تھیں اور جنہیں براہ راست مجلس نبوی میں حضوری کی سعادت میسر آئی تھی تو کس کس طرح وہ ان حضرات پر اپنے سوالوں کی بارش نہ کرتے ہوں گے صحابہ تو صحابہ تابعین کے گرد لوگ اس طرح جمع رہتے کہ ان کو لینا بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔ ابن سعد نے طبقات میں حسن بصریؒ کے متعلق ثابت البنانیؒ کی

شہادت بیان کی ہے کہ

ان کو لوگ نہ دن کو لیٹے کامو قہ دیتے
نہ سونے کا۔

مَنْعُوهُ الْقَائِلَةُ وَمَنْعُوهُ النَّوْمُ
(ابن سعد جلد ۷)

جب تابعین کے ساتھ مشائخ انصاریہ نبوی کا یہ حال تھا تو صحابہ کو تو کیا کیا تنگ نہ کرتے ہوں گے۔
حضرت عبداللہ ابن عون جو تابعی بھی نہیں تبع تابعین میں سے ہیں خود اپنا حال مناتے ہوئے
فرمایا کرتے :

لوگوں نے میرا راستہ روک رکھا ہے کسی ضرورت
سے بھی میں نہیں نکل سکتا یعنی لوگ مجھ سے حدیث
بلوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔

قَدْ قَطَعُوا عَلَيَّ الطَّرِيقَ مَا أَتَدِرُ
أَنَّ أُخْرِجَ لِحَاجَةٍ يَعْنِي حَتَّى
لَسْتُ لِي عَنْ الْحَدِيثِ (ابن سعد جلد ۷)

غرض معلوم ہوتا ہے تعلیل روایت کے معاملے میں حضرت علی کے طرز عمل کی تبدیلی میں کچھ اس صورت
حال کو بھی دخل تھا مدینہ منورہ میں جب تک رہے تو وہاں احادیث نبویہ کے بارے میں نہ
بلوچھنے والوں کی اتنی کثرت تھی اور نہ بتانے والوں کی کوئی کمی مگر کوفہ میں صورت حال بالکل
مختلف تھی۔ بلوچھنے والے بے شمار اور بتانے والے ان کے مقابلے میں محدود۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ شروع شروع میں حضرت علیؑ نے اپنے پیش رو خلفاء کے طرز کو نبھانا چاہا اور
کثرت روایت سے پرہیز ہی فرماتے رہے مگر زیادہ عرصہ تک یہ معاملہ متذکرہ بالا صورت
حال کی موجودگی میں نبھ نہ سکا۔

یہ سوال کہ حضرت علیؑ کے طرز عمل کی اس تبدیلی سے کیا وہ مصلحت فوت نہیں ہوئی
جس کی وجہ سے عہد نبوت اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں حدیثوں کی عام
اشاعت و کتابت کی حوصلہ شکنی کی جاتی رہی تھی۔ عام اشاعت کی بنا پر یہ خطرہ کہ آئندہ
آنے والوں کے درمیان ان روایتوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جائے گی کیسا
اب باقی نہ رہا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ حضرت علیؑ کی خلافت کا زمانہ عہد
نبوت سے کچھ آٹنا دور نہ تھا لیکن ایک طرف تو سیاسی حالات کی وہ پیش رفت جس
نے حضرت عثمان کے آخری دور میں فتنے کی شکل اختیار کر لی تھی اور جس کی بنا پر

تقدس واحترام کے وہ جذبات جو امت مسلمہ کے امور کے متعلق شیخین رضی اللہ عنہما کے عہد میں لوگوں کے اذہان میں پائے جاتے تھے اضمحلال پذیر ہونے لگے تھے دوسری طرف عبداللہ بن سبا اور اس کے کارندوں کی پیدا کردہ وہ صورت حال جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے جس نے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت کو ہلا کر رکھ دیا تھا ان دونوں باتوں نے مل کر واقعی اس خطرے کا وجود باقی نہ رہنے دیا تھا جس کے پیش نظر روایت حدیث کی عام اشاعت سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانہ میں یا اس کے بعد جو چیزیں لکھی گئیں یا جن کی زبانی عام اشاعت کی گئی ان کو امت مسلمہ میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جس کا اندیشہ تھا۔

مکتوب مجموعوں کی تیاری | بہر حال روایت حدیث میں حضرت علیؑ کے طرز عمل کی اس تبدیلی کا ایک سبب بڑا فائدہ یہ ہوا کہ صحابہ کو احادیث بنوہ کو تحریری شکل میں لانے کا خوب خوب موقع ملا جہاں حال یہ ہو کہ خود رسول کا خلیفہ براہ راست اپنے ہاتھ سے لکھ لکھ کر لوگوں کو احادیث کے مجموعے دے رہا ہو وہاں بھلا دوسروں کو اس کام سے روکنے والی کیا چیز ہو سکتی تھی۔ ہم نے کتابت حدیث اور صحابہ کے عنوان کے تحت جن جن صحابہ کرام کے بارے میں تفصیل کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی مرویات کے مکتوب مجموعے تیار کیے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر نے یہ حدیثیں حضرت علیؑ کے طرز عمل کی اس تبدیلی کے بعد ہی قلم بند کی تھیں۔ ان میں سے صرف دو اصحاب یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما تو یقیناً اس سے مستثنیٰ ہیں اس لیے کہ ان دونوں اصحاب نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت پر بلا اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں احادیث کو قلم بند کیا تھا۔ بہر حال ان دو مستثنیات کو چھوڑ کر باقی جن جن صحابیوں کی طرف بھی یہ منسوب کیا گیا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی روایتیں قلم بند ہو چکی تھیں اور جن کا ذکر

گذشتہ اوراق میں تفصیل سے ہو چکا ہے ان سب نے یہ کام بظاہر حضرت علیؓ کے طرز عمل میں متذکرہ تبدیلی ہی کے بعد کیا تھا۔ حضرت ابوہریرہ کا پانچ ہزار سے اُپر احادیث پر مشتمل کتابی ذخیرہ حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر کتابیں، حضرت عائشہ کے علم کے ان کے شاگردوں کے ہاتھوں تیار شدہ مکتوب مجموعے، حضرت عبداللہ ابن عمر اور حضرت جابر کے صحیفے وغیرہ یہ سب علمی خزانے بظاہر حضرت علیؓ کے طرز عمل میں تبدیلی کے بعد ہی وجود میں آئے۔ اس لحاظ سے حضرت علیؓ کے طرز عمل کی یہ تبدیلی وقت کا ایک اہم تقاضا اور قدرت کی طرف سے ایک انمول عطیہ ثابت ہوئی ۛ

حفاظتِ حدیث

اور

تابعین و تبع تابعین

حفاظتِ حدیث سے متعلق اصل حقیقتِ حال کی وضاحت میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اگرچہ اپنی جگہ پر اس قدر کافی ہے کہ اب مزید کسی تفصیل و بیان کی ضرورت باقی نہیں رہی تاہم اب ہم مختصر طور پر ان کوششوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو تابعین اور تبع تابعین نے حفاظتِ حدیث کے سلسلے میں انجام دیں۔ قارئین نے اب تک محسوس کر لیا ہوگا کہ زیرِ نظر تحریر کا مقصد حدیث کی تاریخ مرتب کرنا نہیں ہے بلکہ ابتداء ہی سے ہمارے پیشِ نظر صرف یہ رہا ہے کہ منکرینِ حدیث کی جانب سے حدیث کے ذخیرے کو بے اعتماد بنانے کے لیے حفاظتِ حدیث کے ضمن میں شکوک و شبہات کے جو پسائے کھڑے کیے گئے ہیں ان کا بے بنیاد اور اندر سے کھوکھلا ہونا ثابت کر دیا جائے اور قارئین گواہی دیں گے کہ الحمد للہ ہم اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ حدیث کی حفاظت کے لیے تابعین اور تبع تابعین نے بھی صحابہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حفظ اور کتابتِ دونوں سے کام لیا ہے۔

جہاں تک حفظ سے کام لینے کا تعلق ہے قارئین دیکھ چکے ہیں کہ صحابہ کے زمانے سے ہی حفظِ حدیث کا رواج عام ہو چکا تھا یہ رواج بعد میں بھی نہ صرف قائم رہا بلکہ اور زیادہ ترقی

کرتا گیا لوگ جس طرح قرآن کو سبتاً سبتاً یاد کرتے تھے اسی طرح حدیث کے حفظ کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ قرآن کے حفظ کے لیے جس طرح شروع ہی سے بچوں کو قرآن یاد کرنے پر لگا دیا جاتا ہے اسی طرح قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث بھی زبانی یاد کرنے کے لیے لوگ اپنے بچوں کو اساتذہ کے پاس بھیجا کرتے تھے چنانچہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بعض لوگ اپنے بچوں کو اسی مقصد کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ محمد بن سیرین کو ان کے والد نے بچپن ہی سے حضرت ابو ہریرہ کے سپرد کر دیا تھا۔ محمد بن سیرین کے ایک بھائی یحییٰ نامی بھی تھے وہ بھی حضرت ابو ہریرہ کے پاس حدیث پڑھنے آیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کے غلام عکرمہ اپنی تعلیمی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے :

<p>حضرت ابن عباس میرے پاؤں میں قرآن اور حدیث کی تعلیم دینے کے لیے بیٹری ڈال دیتے تھے۔</p>	<p>كَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَضَعُ الْكَبَدَ فِي رِجْلِي عَلَى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ وَالسُّنَنِ - (تذکرۃ الحفاظ ص ۹)</p>
---	--

حضرت عبداللہ ابن عباس کا اپنے شاگردوں کے ساتھ یہ طرز عمل دراصل اس فکر اور اس توجہ کی نشاندہی کرتا ہے جو احادیث کو زبانی یاد کرانے میں اساتذہ اپنے شاگردوں پر صرف کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن حفظ کرنے والوں کا آموختہ سنا جاتا ہے حدیث یاد کرنے والوں کا آموختہ بھی لوگ اسی طرح سنتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور خصوصی شاگرد حضرت عروہ بن زبیر کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے صاحبزادوں کو جو حدیثیں پڑھاتے اور زبانی یاد کرتے ان کا آموختہ باقاعدہ سب بیٹوں کو سامنے بٹھا کر سُنا کرتے تھے چنانچہ آپ کے بیٹے بیٹے ہشام بن عروہ اپنے تعلیمی دور کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے کہ میرے والد مجھے

اور میرے دوسرے بھائیوں عبداللہ، عثمان اور اسماعیل وغیرہ کو حدیثیں پڑھا دیتے تو پھر ان کو ہم سے دوبارہ سنتے اور کہتے :

کَمَرُوا عَلَيَّ وَكَانَ يُعْجِبُ مِنْ | (جو کچھ یاد کیا ہے) مجھے سناؤ اور وہ میری یادداشت
حفظی (تاریخ کبیر بخاری ص ۱۱۱) | کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس بھی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے کہ جو کچھ تم نے مجھ سے سُن کر یاد کیا ہے وہ میرے سامنے دوہراؤ۔ آپ کے شاگرد حضرت سید ابن جبیر بتلاتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس مجھ سے کہا کرتے :

أَنْظُرْ كَيْفَ تَحَدِّثُ عَنِّي فَإِنَّكَ | مجھے بتاؤ تم مجھ سے حدیثیں کس طرح
قَدْ حَفِظْتَ عَنِّي حَدِيثًا كَثِيرًا | روایت کرو گے کیونکہ تم نے حدیثوں کا
(ابن سعد جلد ۶ ص ۱۱۱) | ایک کثیر ذخیرہ مجھ سے سُن کر یاد کیا ہے۔

مذکرہ حدیث جس طرح قرآن کا ایک مرتبہ یاد کر دینا کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ بار بار اس کا دُور کرتے رہنا ضروری ہے اسی طرح نہ بانی یاد کرانی ہونی
احادیث کے بارے میں بھی ہر استاد اپنے شاگردوں کو یہی تاکید کرتا رہتا تھا کہ انہیں بار بار دُور کرتے رہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے وہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے :

أَكْثِرُوا ذِكْرَ الْحَدِيثِ فَإِنَّكُمْ | حدیث کو بار بار دُور کرتے رہو اگر ایسا نہ کرو
إِنْ تَمَّ تَفَعَّلُوا يَدْرُسُ عَلَيْكُمْ | گے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا۔
(جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۱۱۱)

حضرت عبداللہ ابن مسعود ان الفاظ میں بیان فرماتے:

تَذَاكَرُوا الْحَدِيثَ فَإِنْ حَيَاتُكُمْ | بار بار حدیث کو دُور کرتے رہو۔ یہی وہی ہے کہ
مَذَكَّرْتُمْ (معرورہ علوم الحدیث ص ۱۱۱) | زندہ رکھنے کی یہی ایک شکل ہے۔

حدیث کا مذاکرہ اصل میں قرآن کے دُور کی طرح ہے جس طرح حفاظ قرآن باہم مل کر ایک دُور سے کو اپنا یاد کیا ہو قرآن بنایا کرتے ہیں اسی طرح باہم مل کر نہ بانی یاد

کی ہوئی احادیث کا اعادہ کرنے کو مذاکرہ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ احادیث کے باہمی مذاکرہ سے کا طریقہ صحابہ ہی کے زمانے میں رواج پا گیا تھا چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ کے حلقہ درس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے عطا کرتے ہیں۔

<p>ہم حضرت جابر بن عبد اللہ کے پاس ہوتے اور وہ ہمیں حدیثیں سناتے بھر جب ان کے پاس سے باہر آتے تو ان کی بیان کردہ حدیثوں کو ہم باہم دوہراتے۔</p>	<p>كُنَّا نَكُونُ عِنْدَ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ نَسْمَعُهُ شَا فَاذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِ تَذَاكُرْنَا حَدِيثَهُ (ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۳۵۴)</p>
---	--

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ تذاکرہ الحدیث (ان سعد) حدیث کا مذاکرہ کرتے نہ ہو۔

بلکہ حضرت ابوسعید خدریؓ تو یہاں تک فتویٰ دیتے کہ

<p>حدیث کا مذاکرہ قرآن پڑھنے سے بہتر ہے۔</p>	<p>مذاکرۃ الحدیث افضل من قراءۃ القرآن (تدریب منہ ۱۸)۔</p>
--	---

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عباس حدیث کا مذاکرہ کرتے رہنے کو شب بیدار رہ کر عبادت کرنے سے زیادہ افضل قرار دیتے تھے۔ تدریب الراوی ہی میں ہے کہ حضرت ابن عباس اپنے ناناؓ کو مذاکرہ حدیث کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے :

<p>علم کا مذاکرہ کرنا شب بیداری کی عبادت سے زیادہ بہتر ہے۔</p>	<p>مذاکرۃ العلم ماعتاً خیر من أحياء لیلۃ (تدریب منہ ۱۸)</p>
--	---

جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں علم نام ہی حدیث کا تھا۔ غرض حدیث کے مذاکرہ کا رواج صحابہ کے زمانے میں ہی عام ہو چکا تھا اور جس طریقے کو صحابہ نے پسند کیا تھا اس طریقے کو بھلا ان کے شاگرد کیسے چھوڑ دیتے بعد میں تو یہ طریقہ تعلیم حدیث کا ایک لازمی جزو بن گیا ہر استاد اپنے شاگردوں کو مذاکرہ حدیث کی تاکید کرتے

رہنا اپنا فرض خیال کرتا تھا حضرت حسن بصری اپنے شاگردوں کو فرماتے :

<p>علم کی آفت اس کا بھول جانا اور اس کا مذاکرہ چھوڑ دینا ہے ۔</p>	<p>غَالِمَةُ الْعِلْمِ النَّيَانُ وَتَرْكُ الْمَذَاكِرَةِ (جامع بیان العلم ص ۱۳)</p>
---	--

عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اپنے تلامذہ سے کہتے :

<p>حدیث کو زندہ رکھنا اس کو دوہراتے رہتے ہیں پے پس دوہراتے رہو ۔</p>	<p>إِنْ أَحْيَا الْحَدِيثَ مَذَاكِرَتُهُ فَتَذَاكِرُوا (جامع ص ۱۴)</p>
--	--

عرض حدیث کا مذاکرہ کرتے رہنا حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کے فرائض میں داخل سمجھا جاتا تھا۔ صرف تعلیم ہی کے دوران نہیں بلکہ ایام تعلیم کی مشغولیتوں سے غافل ہونے کے بعد بھی محدثین اپنی پڑھی ہوئی اور یاد کی ہوئی حدیثوں کو دوہراتے رہتے۔ تھے بالکل اسی طرح قرآن کے حافظ حفظ سے غافل ہونے کے بعد بھی اس کا دور کرتے رہتے ہیں بعض محدثین کو اگر سننے والا کوئی نہ ملتا تو مذاکرہ حدیث کا فرض پورا کرنے کے لیے مکتب خانے چلے جاتے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو جمع کر کے انہیں اپنی یاد کی ہوئی حدیثیں سناتے ۔ اسماعیل بن رجاہ کے بارے میں آتا ہے کہ

<p>اسماعیل مکتب خانے کے بچوں کو اکٹھا کرتے اور ان سے حدیثیں بیان کرتے تاکہ بھول نہ جائیں ۔</p>	<p>إِنَّهُ كَانَ يَجْمَعُ حُصْبَانَ الْكِتَابِ فَيُحَدِّثُهُمْ لِمَا يَنْسِي (جامع بیان العلم ص ۱۴)</p>
--	---

عطاء نرہاسانی کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کی بھی یہی عادت تھی کہ جب کوئی نہ ملتا تو قرب جوارہ کے غریب کو جمع کرتے اور ان کو اپنی یاد کی ہوئی حدیثیں سناتے مقصود یہی ہوتا کہ جو یاد کیا ہے وہ ذہن سے نکل نہ جائے ۔ جامع بیان العلم ہی میں ایک روایت ہے کہ عطاء نرہاسانی کی یہ عادت تھی کہ

<p>جب کوئی ان کو نہ ملتا تو مسالین کی جماعت میں</p>	<p>إِذَا لَمْ يَجِدْ أَحَدًا أَحْتِ</p>
---	---

المساكين فخذ لهم يومئذ بذلك | آکر احادیث بیان کرتے مطلب حدیثوں
محفظ (جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۱۱۱) | کو یاد رکھنا تھا۔

بت ابراہیم نخعی اپنے شاگردوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کرتے :

إذا سمعت حديثاً فحدث به | جب تم کوئی حدیث سنو تو سننے ہی دوسروں
حين سمعته ولو أن تحدث | سے بیان کرنا شروع کر دو خواہ کسی ایسے
بد من لا يشتميه | ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو جو تم سے حدیث

(جامع بیان العلم ص ۱۱۱) | سنا نہ چاہتا ہو۔

مقصود یہی تھا کہ کوئی سننے نہ سننے جو باتیں یاد کی ہیں وہ سنانے سے اور زبان سے
دور ہراتے رہنے سے ذہن میں خوب محفوظ ہو جائیں۔

قرآن ہی کی طرح حدیث کے | غرض یہ تمام روایات اس پر شاہد ہیں کہ
بھی حفظ کا اہتمام | محدثین کے درمیان قرآن ہی کی طرح
حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام تھا ان میں

بعض لوگوں سے تو صراحتاً اس قسم کے الفاظ بھی منقول ہیں کہ ہمیں احادیث بذریعہ
قرآن کی طرح اہتمام کے ساتھ یاد کرنا چاہیے مثلاً ابن عباسؓ کہنے اسماعیل بن عبد الرحمن
کا قول نقل کیا ہے وہ کہا کرتے تھے :

ينبغي لنا أن نحفظ حديث | ہم لوگوں کو چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
رسول الله صلى الله عليه وسلم | کی حدیثوں کو اسی طرح یاد کریں جس طرح ہم
كما نحفظ القرآن | قرآن یاد کرتے ہیں۔

(تاریخ دمشق جلد ۲ ص ۱۱۱)

مشہور حافظ حدیث ابن خزیمہ کے بارے میں تذکرہ الحفاظ میں ذہبی نے ابراہیم نیشاپوری
کے حوالے سے لکھا ہے کہ

كان ابن خزيمة يحفظ التفهيمات | فقہی مباحثوں کو ابن خزیمہ اسی طرح یاد کرتے

من حدیثہ کما یحفظ القاری | تھے جس طرح قاری قرآنی سورتوں کو یاد
السورۃ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۶۱)۔ کرتا ہے۔
اسی طرح اسرائیل بن یونس اپنے دادا ابواسحاق کی روایت کردہ حدیثوں کے متعلق
خود کہا کرتے تھے :

كنت احفظ حدیث الج | میں ابواسحاق کی روایتوں کو اسی طرح یاد کرتا
اسحاق کما احفظ السورۃ من تھا جس طرح میں فسرآن کی سورت یاد
القرآن (تذکرہ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۱۱) کرتا تھا۔

بہر حال اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ راویان حدیث نے احادیث بنویہ زبانی
یاد کرتے ہیں اسی طرح پوری توجہ اور محنت صرف کی جس طرح حفاظ قرآن کلام اللہ یاد
کرتے ہیں پوری جانفشانی سے کام لیتے ہیں عام طور پر صحیح حدیث کی شرائط کو بیان
کرتے ہوئے عدالت اور حفظ وغیرہ کے جو الفاظ ہمیں ملتے ہیں اس میں حفظ سے مراد
یہ نہیں ہے کہ راوی کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی ہو تو صحیح حدیث کا راوی بن سکتا ہے
بلکہ مراد یہی ہے کہ راوی نے حدیث کے یاد کرنے میں پوری توجہ اور محنت صرف کی ہو
خواہ قوت حافظہ اس کی معمولی ہو یا غیر معمولی۔ یاد کر لینے کے بعد معمولی حافظے والے آدمی
کی یاد کی ہوئی چیز اسی طرح بھروسے اور اعتماد کے تباہ ہو جاتی ہے جس طرح کسی غیر معمولی
حافظے والے کی۔ آخر یاد کرنے سے قرآن کے تیس پارے حفظ ہو جاتے ہیں اور ہر کوئی
حفاظت سنان پر اعتماد کرتا ہے تو اسی لگن اور اسی محنت سے محدثین اگر حدیث کا ذخیرہ
ذہن میں محفوظ کر لیتے تھے تو ان پر بے اعتمادی کا کیا سوال۔

محدثین کی قوت حافظہ اور یادداشت کے جو حیرت انگیز واقعات ہمیں رجال
کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ اس وقت تک ہی عجیب نظر آتے ہیں جب تک ہم انہیں
محض غیر معمولی یادداشت کا کرشمہ سمجھتے۔ ہیں لیکن جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں
کہ محدثین احادیث بنویہ کو بتقا بتقا ایک ایک دو در حدیث کر کے بڑی جانفشانی سے یاد

کرتے تھے اور پھر اپنا یاد کیا ہوا محفوظ رکھنے میں پوری توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے تو ان واقعات میں تعجب اور حیرانی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اگرچہ اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہ نسبت پچھلوں کے اگلوں کا حافظہ زیادہ قوی تھا تاہم قوت حفظ و یادداشت میں زیادہ تردد نمل محدثین کی توجہ محنت اور جانفشانی کو تھا۔

کتابت حدیث میں شغف کا عالم | احادیث نبویہ کو اس قدر محنت اور توجہ سے حفظ کر لینے کے بعد اگرچہ اس

بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی کہ حفاظت حدیث کے لیے فن کتابت سے کام لیا گیا تھا یا نہیں تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ حفظ کے ساتھ ساتھ تابعین و تبع تابعین نے احادیث کو تسلیم بند کرنے کا بھی اسی طرح اہتمام کیا جس طرح صحابہ کرام کو اپنے زمانے میں انہوں نے کرتے دیکھا اور سنا تھا۔ اس سلسلے میں جو جو خدمات تابعین و تبع تابعین کے ہاتھوں انجام پائیں ان کا تفصیلی ذکر تو آپ کو تاریخ و تدوین حدیث کی کتابوں میں ملے گا تاہم یہاں بھی ہم مختصراً ان خدمات کے پس منظر کے طور پر اپنے قارئین کو یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ تابعین و تبع تابعین کے زمانے میں حفاظت حدیث کے لیے فن کتابت سے کام لینے میں کسی قسم کی کوتاہی کو روا نہیں رکھا گیا۔

احادیث کو تسلیم بند کرنے میں محدثین کے شغف کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ صرف اسی ایک واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر کے بارے میں آتا ہے کہ لکھتے لکھتے جب ان کے کاغذ بھر جاتے تو جو کچھ سامنے آتا وہ اسی پر لکھنا شروع کر دیتے حتیٰ کہ اور کچھ نہ ملتا تو دارمی کی روایت کے مطابق اپنے ہاتھوں پر ہی لکھنا شروع کر دیتے۔ ہاتھ تو ہاتھ ان کو اور کچھ نظر نہ آتا تو اپنے جوتے پر ہی لکھنے لگتے یہاں تک کہ وہ بھی بھر جاتا چنانچہ طبقات ابن سعد کی ایک روایت میں ہے

سعید بن جبیر حضرت عبداللہ بن عباس سے
سُن کر لکھا کرتے تھے جب صفحہ بھر جاتے

کان سعید بن جبیر یکتب عن
ابن عباس فاذا ما اتملّت

صحفہ کتب فی لعلہ حق | تراپنے جوتے پر لکھتے حتی کہ وہ بھی
بہلا ہاد (ابن سعد جلد ۱ ص ۱۸) - | بھر جاتا -

حضرت سید ابن جبیر حضرت عبداللہ بن عباس کے ممتاز ترین شاگردوں میں سے ہیں
حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس بھی تحصیل حدیث کے لیے جایا کرتے تھے کبھی کبھی خود
اپنی تعلیمی سرگزشت سناتے ہوئے لکھا کرتے تھے کہ

كنت أسير بين ابن عمرو ابن | میں عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن عباس کے
عباس فكنت اسمع الحديث | پاس جاتا تو ان دونوں سے حدیث سن کر اونٹ
منها فأكتبه على واسطة | کے کجاوے کی تختیوں پر لکھ لیتا پھر جب
الرجل حتى أنزل فأكتبه - | اترتا تو اسے لکھ لیتا -
(جامع بيان العلم جلد ۱ ص ۱۸)

محمد بن اساتذہ اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ جو حدیث سنو اسے قید
تحریر میں لے آؤ۔ حضرت انس اپنے بیٹوں سے فرمایا کرتے یا بُنَيَّ قِيدُوا هَذَا لَعَلَّ
مِيرَے بچو اس علم حدیث کو قید تحریر میں لے آؤ (دارمی) یہی نہیں کہ احادیث کو قلم بند کرنے
کی تاکید کرنے پر ہی اکتفا کرتے بلکہ روایات اس پر لٹا ہوا ہیں کہ اپنے سامنے بٹھا
بٹھا کر لکھواتے چنانچہ دارمی ہی میں ہے راوی کہتا ہے کہ

رَأَيْتُ ابَانَ يَكْتُبُ عِنْدَ أَنَسٍ | میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انسؓ کے
پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں - | (دارمی)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کے مولیٰ حضرت نافع کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے
شاگردوں کو اپنے سامنے بٹھا لیتے اور جو حدیثیں حضرت نافع سناتے جاتے شاگرد لکھتے
جاتے۔ دارمی ہی کی ایک روایت میں ہے بلکہ طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود
ہے سلمان بن موسیٰ کہتے ہیں کہ انہوں نے

أَنَّهُ رَأَى نَافِعًا مَوْلَى ابْنِ عَمَرَ | ابن عمرؓ کے مولیٰ نافع کو دیکھا کہ لوگ انکے
سامنے بیٹھے لکھ رہے ہیں - | علی علم و یکتوباً بین یدہ (دارمی)۔

یہی نہیں کہ شاگرد اپنے طور پر لکھتے تھے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نافع باقاعدہ اپنے شاگردوں کو املا کرتے تھے ایک روایت میں اس کی تصریح موجود ہے سنن دارمی ہی کی روایت ہے کہ

نافع مولیٰ ابن عمر اپنے طالب علموں کو علم (حدیث) کا املا کرتے اور طالب علم ان کے سامنے بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔

نافع مولیٰ ابن عمر یملی العلم
علیٰ طلابہ وطلابہ یکتبون
بین یدیدہ۔ (سنن دارمی جلد ۱ ص ۱۲۶ تا ۱۲۹)

حضرت عطاء بن ابی رباح مشہور تابعی ہیں دارمی ہی کی ایک روایت کے مطابق وہ خود بھی احادیث لکھتے بچوں کو بھی لکھاتے اور طلبہ بھی ان کے سامنے بیٹھ کر لکھتے رہتے۔ کتابت حدیث کے لیے ان کی لگن کا عالم یہ تھا کہ بچوں کو بلال بلا کر بٹھاتے اور کہتے کہ حدیثیں لکھو جن کو لکھنا نہ آتا ان کو خود لکھ کر دیتے جن کے پاس کاغذ نہ ہوتا ان کو کاغذ بھی اپنے پاس سے دیتے چنانچہ ابی حکیم الہمدانی کہتے ہیں :

میں عطاء بن ابی رباح کے پاس تھا اور ہم اس وقت بچے تھے آپ نے فرمایا بچو ادھر آؤ اور لکھو تم میں جو اچھا نہیں لکھتا اسے ہم لکھ دیں گے اور جس کے پاس کاغذ نہیں ہے ہم اسے اپنے پاس سے کاغذ دیں گے۔

قلت عند عطاء بن ابی رباح
ونحن غلمان فقال یا غلمان اتقوا
أکتبوا فمن کان منکم لا یحسن
کتبنا له ومن لم یکن معه
قرطاس أعطینا من عندنا۔
(المحدث الفاضل)

حضرت عامر الشعمیؓ جو کوفہ کے بلند پایہ تابعین میں سے ہیں اور جنہوں نے حضرت علیؓ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عائشہؓ اور دیگر متعدد صحابہ سے روایت کی ہے اپنے شاگردوں کو کتابت حدیث کی تاکید کرتے ہوئے کہا کرتے :

جب تم مجھ سے سنو تو لکھ لو خواہ دیوار پر بھی کیوں نہ ہو۔

إذا سمعتم منی شیئاً فاکتبوا
ولو فی حائط (جامع جلد ۱ ص ۳۳)

”فما دہ بن دعا مۃ السدوسی کے بارے میں ہے کہ جب کوئی ان سے کتابت حدیث کے بارے میں سوال کرتا تو جواب میں بڑے ہی پتے کی بات ارشاد فرماتے آپ سائل سے مخاطب ہو کر کہتے :

تجھے لکھنے سے کون منع کرتا ہے جبکہ لطیف و
نجیر کہتا ہے کہ وہ لکھتا ہے (پھر یہ آیت
پڑھتے) فرمایا اس کا علم میرے رب کے
پاس لکھا ہوا ہے ۔

وَمَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَكْتُبَ وَ اخْبِرْ
اللطيفُ الخبيرُ إِنَّهُ يَكْتُبُ قَالَ
عَلَيْهَا عِنْدَ رَبِّي كِتَابُ الْآيَةِ
(تفسير العلم ص ۱۳)

مکتوب مجموع | غرض اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتابت حدیث کے ساتھ اس
درجے کے شغف کی موجودگی میں احادیث کے کتنے مجموعے
کتابی شکل میں تیار ہو گئے ہوں گے امام زہری کے علاوہ جن کی کتابیں کئی اونٹوں کا
بوجھ بنتی تھیں دیگر وہ لوگ جن کے بارے میں تصریح کے ساتھ روایات میں یہ آتا ہے
کہ ان کے پاس احادیث کے مکتوب مجموعے موجود تھے ان میں عروۃ بن زبیر (۹۳ھ)
خالد بن معدان السلاعی (۱۰۴ھ) ابو قلابہ عبد اللہ بن زید الجری (۱۰۴ھ) حسن بھری
(۱۱۰ھ) مکحول شامی (۱۱۲ھ) محمد باقر علی بن الحسین (۱۱۴ھ) بکیر بن عبد اللہ بن الاشج
(۱۱۷ھ) قیس بن سعد المالکی (۱۱۷ھ) اور قتادہ بن دعا مۃ السدوسی (۱۱۸ھ)
کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ بھی متعدد تابعین اور ان کے تلامذہ کے
بارے میں یہ ذکر رجال کی کتابوں میں ملتا ہے کہ ان کے پاس احادیث نبویہ کے
مکتوب ذخیرے تھے ۔

صحیفۃ ہمام ابن منبہ | حضرت ہمام ابن منبہ کے بارے میں گذر ہی چکا ہے کہ
انہوں نے اپنے استاد حضرت ابو ہریرہ کی روایات
کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ اگرچہ یہ مجموعہ صحیفۃ ہمام ابن منبہ کے نام سے مشہور ہے مگر
بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے کا نام الصحیفۃ الصمیمۃ ہے
لے کشف الظنون ص ۷

اپنی عمر کے آخری ایام تک حضرت ہمام ابن منبہ اپنے اس صحیفے کا باقاعدہ درس دیتے رہے اور املا کراتے تھے آپ کے بعد آپ کے شاگرد معمر بن راشد یعنی نے اس صحیفے سے روایت کا سلسلہ جاری رکھا پھر معمر سے ان کے تلمیذ رشید عبدالرزاق بن نايف الحمیری اور پھر ان سے ان کے شاگرد ابوالحسن احمد بن یوسف السلی اس صحیفے کو روایت کرتے رہے اور پھر اسی طرح نسف بن نسل یہ صحیفہ روایت ہوتا رہا۔ عبدالرزاق بن نايف الحمیری سے امام احمد بن حنبل نے اس صحیفے کو روایت کیا اور اسے اپنی مسند کے باب ابو ہریرہ کی ایک خاص فسل میں جو کاتوں میں ضم کر دیا ہے:

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مساعی علاوہ ازیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مساعی سے جمع و تدوین حدیث کا جو

مہتمم بالشان کام انجام پایا وہ سب کے سامنے ہے۔ آپ نے جمع و تدوین حدیث کا کام جن لوگوں کے سپرد کیا تھا ان میں نمایاں لوگ حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن خرم تمام بن محمد بن ابی بکر اور محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہیں۔

ابوبکر بن محمد عامل مدرسہ تھے ان کو احادیث بنویں جمع کرنے کا حکم دیتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا تھا:

جو کچھ تمہارے ہاں حدیث رسول میں سے ہے یا حدیث عمرہ سے ثابت ہے وہ مجھے لکھ بھیج کر کہ علم کے مٹ جانے اور غائب ہو جانے کا ڈر ہے۔

اَكْتَبَ اِلَيَّ مَا ثَبَتَ عِنْدَكَ مِنَ
الْحَدِيثِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَبِحَدِيثِ
عُمَرَ فَإِنِّي خَشِيتُ حُدُوسَ
الْعِلْمِ وَذَهَابَهُ۔

(سنن دارمی جلد ۱ ص ۱۲)

یہ عمرہ بنی کا اس روایت میں ذکر ہے عمرہ بنت عبدالرحمان ہیں جنہوں نے حضرت عائشہ کے پاس پرورش پائی تھی اور جو حضرت عائشہ کے علم کی امین سمجھی جاتی تھیں۔ یہ خالہ تھیں

۱۔ صحیفہ ہمام ابن منبہ ماثیہ ص ۵۲ ۳۔ صحیفہ ہمام ابن منبہ ماثیہ ص ۵۵-۵۶

حضرت ابو بکر بن محمد کی ۔

اسی قسم کا حکم حضرت عمر بن عبدالعزیز نے قاسم بن محمد بن ابی بکر کو دیا تھا جو مدینہ کے فقہا میں سے تھے یہ بھی اپنی پھوپھی حضرت عائشہؓ کے علم کے امین خیال کیے جاتے تھے کیونکہ انہوں نے بھی حضرت عائشہؓ ہی کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور ان سے ہی علم حاصل کیا تھا ۔

تیسرے شخص جن کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جمع حدیث کا کام سونپا تھا امام ابن شہاب زہری ہیں ۔ احادیث جمع کرنے میں ان کے ضعف کا عالم یہ تھا کہ گھر گھر جاتے اور جو شخص ملتا اس سے حدیث بنوی کے بارے میں سوال کرتے ۔ جوانوں اور بچوں کے لوگوں اور بوڑھوں سے حتیٰ کہ پردہ دار خواتین تک سے احادیث معلوم کر کے قلم بند کرتے جاتے ۔ احادیث جمع کرنے میں ان کی اس نکل کا حال بیان کرتے ہوئے ابراہیم بن سعد بن ابراہیم اپنے والد کے حوالے سے کہتے ہیں کہ

میں نے والد صاحب سے کہا کہ زہری کو کیسے فوجیت ہوئی تو کہنے لگے کہ وہ مجالس میں پہلے آتے اور مجلس میں بوڑھے جوان ہر ایک سے سوال کرتے پھر وہ انصاری کے گھروں میں سے کسی گھر جاتے تو وہاں بوڑھے جوان بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورت جو بھی ملتا اس سے پوچھتے تھے کہ پردہ دار خواتین سے بھی ۔

قلت لابی بن قاصد ابن شہاب قال کان یأتی المجالس من صغرها ولا یلتقی فی المجالس کھلاً الا سألہ فلا شاباً الا سألہ ثم یأخف الدار من دور الانصار فلا یلتقی فیہا شاباً الا سألہ ولا کھلاً ولا عجزاً ولا کھلاً الا سألہ حتی یحاذی ربات المجالس ۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۳۹)۔

امام ابن شہاب زہریؒ کی انہی کوششوں کے نتیجہ میں وہ مکتوب ذخیرہ تیار ہوا تھا جس کے بارے میں آتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے کئی اونٹ

درکار ہوتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان تین حضرات کے علاوہ بھی اپنے تمام عمال کے نام یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث ملے جمع کر لو۔ سنن داری میں ہے کہ آپ نے اپنے عمال کو لکھا:

<p>رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو دیکھو تو اس کو لکھ لو کہونکہ علم کے مٹ جانے اور اہل علم کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔</p>	<p>الظہر احدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاكتبوا فانی خفت مدون العلم و ذهاب اہله (ابن ماجہ ص ۱۱۱)</p>
--	--

غرض حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس حدیث نبویہ جمع کرنے کا جو طریقہ بھی ممکن تھا وہ اختیار کیا۔ اس طرح جو ذخیرہ اکٹھا ہوا اس کو ابن شہاب زہری نے ترتیب و تہذیب سے مرتب کیا۔ یہی وہ ترتیب و تہذیب ہے جسے ہم تدوین حدیث کا پہلا قدم قرار دیتے ہیں یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ان کوششوں کے نتیجے میں حدیث کا جو مکتوب ذخیرہ تیار ہوا اسے ہم تدوین حدیث کا پہلا قدم قرار دے رہے ہیں کتاب حدیث کا نہیں۔ حکمران حدیث اپنی مقصد برآری کی خاطر تدوین اور کتابت دونوں کو گڈا کر دیتے ہیں اس لیے مخالفت حدیث کے سلسلے میں ان دونوں کے فرق کو ابھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔ تاہم دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک کتابت حدیث کا تعلق ہے وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی بعد میں وہ روز افزوں ترقی کرتی گئی اور حدیث کے لاتعداد مکتوب مجموعے تیار ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں جو کچھ ہوا وہ ان مکتوب مجموعوں کی باقاعدہ تدوین تھی جس کی آخری شکل ابن شہاب زہری کے ہاتھوں وجود میں آئی اور اسی پیمانہ کو اولین مدون حدیث کے لقب سے یاد کیا گیا۔ علمائے حدیث کا قول ہے:

<p>اول من دقن العلم ابن شہاب (علوم الحدیث ص ۴۵)</p>	<p>پہلا شخص جس نے علم (حدیث) کو مدون کیا وہ ابن شہاب ہیں۔</p>
---	---

امام ابن شہاب زہری خود بھی اپنے ہمارے میں کہا کرتے تھے :

<p>اس علم کو مجھ سے پہلے کسی نے مدون نہیں کیا۔</p>	<p>لَمْ يَدُونْ هَذَا الْعِلْمَ أَحَدٌ قَبْلَ تَدْوِينِي (تدیب الرازی ص ۱۸)۔</p>
--	--

غرض امام ابن شہاب زہری کے ہاتھوں تدوین شدہ حدیث کے اس ذخیرے کو مختلف رسائل کی شکل میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام ملک میں پھیلا دیا چنانچہ امام زہری ہی کا بیان ہے :

<p>ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا تو ہم نے مختلف رسائل لکھے حضرت عمر نے ان تمام علاقوں میں جن پر ان کا اقتدار تھا یہ رسائل بھیجے۔</p>	<p>أَمْرًا عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ لَجْمِجِ السَّنَنِ فَكُنَّا هَا دَفْتَرًا دَفْتَرًا فَبَعَثَ إِلَى كُلِّ أَرْضٍ لَهُ عَلَيْهَا سُلْطَانٌ دَفْتَرًا۔ (جامع بیان العلم جلد نمبر ۱ ص ۱۸)</p>
--	--

امام زہری کی اس تالیف کے بعد تو پھر مختلف تالیفات کا تانا بانا بندھ گیا۔ امام زہری کی راہ پر چلتے ہوئے مختلف شہروں کے بڑے بڑے جلیل القدر محدثین تدوین حدیث کے کام میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں ابن جریج نے، مدینہ طیبہ میں امام مالک بن انس اور صاحب المغازی محمد بن اسحاق نے، بصرہ میں ربیع بن صبیح اور سعید بن عمرو بن حماد بن سلمہ نے کوفہ میں سفیان ثوری نے، شام میں امام اوزاعی نے، یمن میں معمر نے، مصر میں لیث بن سعد نے، واسط میں ہشیم نے، رے میں جریر بن عبدالحمید نے اور خراسان میں عبداللہ بن مبارک نے تدوین حدیث کے میدان میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ تدوین حدیث کا یوں سمجھ لیجئے یہ پہلا دور تھا جو دوسری صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہا کیونکہ اس سلسلے کے سب سے آخری آدمی حضرت عبداللہ بن مبارک ہیں جن کی وفات ۱۸۱ھ میں ہوئی۔ اس دور کے مدونات میں سے ہم تک فقط مرطا امام مالک پہنچی ہے۔ اس دور میں دو قسم کی تالیفات مرتب ہوئیں ایک قسم وہ

جس میں صحیح اسناد کا التزام نہیں کیا گیا بلکہ جو حدیث پہنچی درج کر دی گئی اور دوسری قسم وہ جس میں صحت کا التزام کیا گیا مگر پھر بھی مرفوع احادیث کا التزام کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ مرسل، منقطع اور آثار صحابہ حتیٰ کہ اقوال تابعین کو بھی مرفوع احادیث کے ساتھ مخلوط رکھا گیا۔

تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں جب تدوین حدیث کا دوسرا دور شروع ہوا تو محدثین نے ضرورت محسوس کی کہ احادیث مرفوعہ کو مراسیل و آثار سے بالکل میسر کر دیا جائے چنانچہ اس دور کی تصانیف میں مرفوع احادیث کو دوسری تمام چیزوں سے علیحدہ کر دیا گیا اور احادیث کو صحابہ کی ترتیب پر جمع کیا گیا۔ اس قسم کے مجموعوں کو مسند کا نام دیا گیا۔ مشہور بلاد اسلامیہ میں بڑے بڑے محدثین نے مساند تالیف کیں چنانچہ کوفہ میں عبداللہ بن مرسل نے، بصرہ میں مسدود بن مسرید نے اور مصر میں یعقوب بن شیبہ مالکی نے صحابہ کی ترتیب پر نزائیف مرتب کیں۔ یعقوب بن شیبہ مالکی نے تو اتنا ضخیم مسند لکھنا شروع کیا تھا کہ اگر اختتام تک پہنچتا تو تقریباً دو سو جلدوں کا ذخیرہ ہوتا۔ علی ہذا القیاس سمرقند میں حافظ حسن بن احمد بن محمد نے مساند لکھیں امام فہمی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اتنی بڑی کتاب لکھی تھی کہ اس میں ایک لاکھ بیس ہزار احادیث کا ذخیرہ تھا اسی قبیل سے مسند امام احمد بن حنبل ہے اس میں انہوں نے اپنی حفظ کی ہوئی سترہ لاکھ پچاس ہزار احادیث میں سے انتخاب کر کے ایک لاکھ چالیس ہزار احادیث اپنی مسند میں جمع کیں ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے مسند بھی ہیں لیکن علماء کا خیال ہے کہ یہ دونوں مسند

۱۔ مرفوع وہ حدیث ہے جس میں کوئی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل یا قول کی خبر دے جبکہ مرسل وہ حدیث ہے جس میں تابعی پہلے صحابی راوی کا ذکر نہ کرے اور منقطع وہ حدیث ہے جس کی اسناد میں مختلف راوی مختلف مقامات سے حذف کر دیے گئے

ہوں۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ

خود اماموں کے تالیف کردہ نہیں ہیں بلکہ بعد میں کسی نے جمع کیے ہیں۔ بہر حال تدوین حدیث کے اس دوسرے دور کی تصانیف میں مرفوع احادیث غیر مرفوع احادیث سے علیحدہ ہو گئیں تاہم ایک کام اس دور کی تصانیف میں بھی باقی رہا وہ یہ کہ احادیث مرفوعہ کی تخریج میں صحت کا پورا پورا التزام نہیں کیا گیا۔ صحیح، حسن اور ضعیف سب ملی جلی رہیں۔

یہ کام تدوین حدیث کے تیسرے دور میں انجام پایا جو تیسری صدی، ہجری کے تقریباً نصف سے شروع ہوتا ہے اس دور میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے امام بخاری کو اس خدمت کے لیے منتخب کیا۔ امام بخاری نے اپنی حفظ کی ہوئی پچھ لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے صحیح بخاری مرتب کی۔ ہر حدیث کے انتخاب میں پورے حزم و احتیاط اور غایت اہتمام سے کام لیا اول ہر حدیث کی صحت کو مکمل غور و فکر سے جانچا پھر ہر حدیث کی تخریج سے پہلے غسل کیا اور در رکعت صلوٰۃ الاستخارہ پڑھی اس کے بعد جب اس حدیث کی تخریج پر پوری طرح رائے جم گئی تب اس کو اپنی صحیح میں درج کیا اسی اہتمام کے ساتھ پوری کتاب کی تصنیف سے سولہ سال کی مدت میں فارغ ہوئے وہ حدیثیں جو اس کتاب میں جمع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد مکررات، محلات اور مقابلات سب ملا کر نو ہزار بیاسی بنی۔

امام بخاری کے بعد امام مسلم نے اپنی صحیح مرتب کی۔ انہوں نے اپنی صحیح کا انتخاب تین لاکھ ایسی روایات سے کیا جن کو انہوں نے براہ راست اپنے شیوخ سے سنا تھا پھر اس میں بھی صرف اپنی ذاتی تحقیق پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں درج کیں جن کی صحت پر مشائخ وقت کا بھی اتفاق تھا اس پر بھی مزید یہ کہ کتاب مکمل ہونے پر اپنے زمانے کے زیر دست حافظ حدیث حضرت ابو زرہ عمی خدمت میں اسے پیش کیا حضرت ابو زرہ علی حدیث اور فن جرح و تعدیل کے امام مانے جاتے تھے۔ صحیح مسلم کی جس جس روایت کے بارے میں انہوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا امام مسلم نے اسے اپنی کتاب سے خارج کر دیا اس طرح پندرہ سال کی محنت شاقہ کے بعد

بارہ ہزار احادیث صحیحہ پر مشتمل یہ مجموعہ تیار ہوا۔

علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کے بعد اصح الکتاب یعنی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ صحیح یہی دو کتابیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔ ساری امت ان دونوں کتابوں کے قبول و اعتقاد پر متفق ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی اشاعت کے بعد تو مدونات حدیث کا کبھی نہ ختم ہونے والا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جن کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے تاریخ حدیث کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے چونکہ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد ان روایتوں کی حیثیت جن پر حدیث کی یہ کتابیں مشتمل ہیں متواتر روایتوں کی ہو گئی ہے اور اپنے مصنفین کی طرف نسبت کے اعتبار سے یہ تمام کتابیں ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بالاتر ہو چکی ہیں اس لیے حفاظت حدیث کے سلسلے میں جو زیر نظر تحریر کا اصل موضوع تھا اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی ۔

جُزْوَ دُوم

حُجَّتِ حُدُوث

هُوَ الَّذِي

بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ
يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.

(الجمعة، ٢٠)

قرآن کی جامعیت

منکرین حدیث کی جانب سے حفاظت حدیث کے سلسلے میں جو شکوک و شبہات عام سادہ لوح مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کے لیے اٹھائے جاتے ہیں ان سب کا تفصیلی جائزہ زیر نظر تحریر کے پہلے حصے میں لیا جا چکا ہے۔ اب ہم منکرین حدیث کے ان اعتراضات کی طرف رخ کرتے ہیں جو حجیت حدیث کو مشکوک بنانے کے لیے ان لوگوں کی جانب سے طرح طرح کے انداز بدل کر بار بار پیش کیے جاتے ہیں۔

منکرین حدیث کا دعویٰ اور دلائل

وہ بات جو اس سلسلے میں نہایت شد و مد کے ساتھ اور بہت ہی نمایاں انداز میں پیش کی جاتی ہے یہ ہے کہ قرآن اپنے آپ میں ایک جامع اور مفصل و مکمل کتاب ہے اس کی موجودگی میں ہمیں کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں۔ منکرین حدیث اس بات کو زیادہ سے زیادہ جاذب توجہ بنانے کے لیے نئے نئے انداز اختیار کرتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ ہم عامل بالقرآن ہیں ہم سے زیادہ قرآن پر عمل کرنے والا کوئی نہیں کبھی کہتے ہیں ہمارے لیے جو کچھ ہے قرآن ہے تمام احکام شریعت کا منبع وہی ہے اور کبھی بڑے ہی فصیح و بلیغ انداز میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ ماخذ دین ہونے کی حیثیت سے قرآن ہمیں ہر کسی دوسری چیز سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر بڑی جاذب توجہ ہیں اور ظاہر نظر میں بڑی حسین نظر آتی ہیں خصوصاً جب یہ باتیں ایک عام آدمی کے سامنے بڑے ہی منطقی انداز میں اور پورے خطیبانہ رنگ کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں تو فوراً ان کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں کون مسلمان ایسا ہے جو اس بات سے انکاری ہو سکتا ہے کہ قرآن ایک جامع اور مکمل و مفصل

کتاب ہے کون ایسا ہے جو قرآن کو تمام احکام شریعت کا منبع نہیں مانتا یا کون مسلمان ایسا ہے جو قرآن کے ماخذ دین ہونے کی حیثیت کو چیلنج کرتا ہو لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے کیا منکرین حدیث کی وہی مراد ہے جو سید سادے طریقے سے ان باتوں سے ایک عام آدمی کی سمجھ میں آتی ہے۔ بے چارے سادہ لوح عام مسلمانوں کو کیا پتہ کہ ان خوبصورت الفاظ کے پیچھے معاذین حدیث نے خود تراشیدہ معانی کا کیسا تانا بانا بنا ہوا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ منکرین حدیث دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی اتباع اور آپ کے طریقہ کار کی پیروی کی کوئی ضرورت نہیں۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات قرآن کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا، احکام قرآنی پر جس طرح عمل کر کے دکھایا اور قرآنی نظام پر مبنی جس طرح ایک مکمل معاشرہ قائم کر کے دکھایا ان سب کو ایک طرف رکھ دو اس لیے کہ یہ سب کچھ اس وقت کے حالات و واقعات کے مطابق تھا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اس وقت کی زندگی پر منطبق کر کے دکھایا اسی طرح ہم بھی آج کی زندگی پر اپنی سمجھ اور اپنی عقل کی مدد سے قرآن کو منطبق کر سکتے ہیں۔ منکرین حدیث کا دراصل دعویٰ یہ ہے کہ ہم صاحب وحی کی مدد کے بغیر ہی وحی الہی کی اصل مراد اسلام کر لینے کی صلاحیت سے اسی طرح بہرہ ور ہیں جس طرح خود صاحب وحی تھا ان کی نظر میں اللہ کا پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کا کام ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد اسے لوگوں سے کچھ کہنے سننے کا کوئی حق نہیں رہتا اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کی حیثیت ایک عام آدمی کی سی رہ جاتی ہے۔

قرآن کی ہامیت اور اس کے منبع احکام شریعت ہونے کا اگر یہی مفہوم ہے جو منکرین حدیث پیش کرتے ہیں تو ہر صادق القول مسلمان یقیناً اس سے براہِ رت کا اظہار کرے گا کوئی سچا مسلمان یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور نبی تو تسلیم کرے مگر آپ کے اقوال

اور آپ کے افعال کو حجت ماننے سے انکار کر دے۔

قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم کیا ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دلائل کا جائزہ لے لیا جائے جو منکرین حدیث کی طرف سے اس سلسلے میں اپنے مزعومہ مفہوم کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں :

قرآن مفصل ہے | منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں جن آیات قرآنی کو بطور استشہاد پیش کیا کرتے ہیں ان میں نمایاں حیثیت ان آیات کو حاصل ہے جن میں قرآن کے لیے تفصیلاً لُکُلُ شَیْءٍ اور تَبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں مثلاً سورہ نحل میں ہے :

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ (النحل ۸۹) | اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری جو ہر چیز کا کھلا بیان ہے۔

منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ جب قرآن نے اپنے بارے میں خود اعلان کر دیا ہے کہ وہ ہر چیز کی پوری تفصیل اور ہر شے کے پورے بیان کا حامل ہے تو پھر قرآن سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ قرآن میں ہر مسئلہ کی تفصیل موجود ہے قرآن نے تمام اصول و فروع اور تمام کلیات و جزئیات کو مفصل طور سے اور کھول کھول کر بیان کر دیا ہے تو پھر حدیث کی ضرورت ہی کیا رہ گئی۔ منکرین حدیث کے نزدیک تفصیلاً لُکُلُ شَیْءٍ اور تَبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کے الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ شریعت کا کوئی معمول سے معمولی مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جو قرآن میں تفصیل و وضاحت سے نہ ملتا ہو۔

قرآن کی جامعیت کے بارے میں منکرین حدیث کا یہ دعویٰ اسی قدر مضحکہ خیز ہے کہ خود آپ اپنی تردید کر رہے دنیا میں ایسی کسی کتاب کا وجود ممکن ہی نہیں جس میں تمام جزئیات محصور ہوں۔ جزئیات تو لامحدود ہیں اور ہر ہر قدم پر نئی نئی حاجتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ جزئیات کا عالم تو یہ ہے کہ قرآن کو نازل ہوئے آج چودہ سو سال ہونے کو آئے اور آج تک اس کی تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکا قرآن کی جزئیات

بیان کرنے کے لیے حدیث کی سینکڑوں جلدیں وجود میں آ گئیں تفسیر و فقہ کے کمرلوں صفحات پر مشتمل ضخیم ذخیرے مرتب ہو گئے مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان سب میں مل کر بھی تمام جزئیات محصور ہو گئی ہیں اگر ان چودہ صدیوں میں صرف ان مسائل کو جمع کیا جائے جو وضو اور غسل و طہارت کے لیے پیش آتے ہیں تو قرآن کریم سے کم ضخیم جلد تیار نہ ہو۔ ایسا ہی معاملہ دیگر مسائل کا ہے اور ابھی بہت سی جزئیات ایسی بھی ہوں گی جو ابھی وجود ہی میں نہیں آئیں قیامت تک نہ جانے کتنی مزید جزئیات سے واسطہ پڑے گا۔ غرض یہ دعویٰ تو بالکل ہی بدیہی البطلان ہے کہ قرآن تمام اصول و فروع اور تمام کلیات و جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تفصیلاً لکل شیء کا اگر یہی مطلب ہے جو منکرین حدیث سمجھے ہیں تو پھر ہمیں ماننا پڑے گا کہ مرسئ علیہ السلام کو جو سات یا دس تختیاں اللہ نے عطا کی تھیں ان میں بھی دنیا کی تمام ضروریات و جزئیات مذکور تھیں کیونکہ قرآن نے ان تختیوں کے لیے بھی تفصیلاً لکل شیء کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورہ اعراف کی یہ آیت :

اور ہم نے اس کو (مرسئ کو) تختیوں پر ہر چیز لکھ دی نصیحت کی بات اور ہر چیز کی تفصیل۔

وَكُنَّا لَهُ فِي الْأَوَّاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ (الاعراف ۱۳۵)۔

کیا تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان تختیوں میں دنیا کی تمام جزئیات و فروع کا بیان ہوگا۔ ان کے بارے میں بائبل کا بیان ہے کہ ان میں احکام عشرہ تھے۔ کیا یہ کہنا عقل کی بات ہوگی کہ ان دس احکام میں انسانی زندگی کی تمام ضروریات و جزئیات سمائی ہوئی تھیں۔ منکرین حدیث سے کوئی پوچھے کہ کیا قرآن کریم میں جہاں کہیں کُل کا لفظ آیا ہے ہمیشہ استفراق ہی تھی کہ لیے آیا ہے یعنی کُل کے لفظ سے کیا ہمیشہ وہ عموم مراد لیا

گیسا ہے جو تمام افراد کو شامل ہو۔ قرآن نے شہد کی مکتبی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے :

ثُمَّ يَكَلِّهِ مِنْ كُلِّ الشَّارِبِ (انحل - ۶۹) | پھر ترہم کے پھلوں سے (دس) چوستی پیر۔

تو کیا منکرین حدیث کے قاعدے کے مطابق یہاں یہ سمجھا جائے گا کہ شہد کی مکتبی کو اللہ کی جانب سے یہ اہام کیا گیا تھا کہ دنیا کا کوئی پھل نہ چھوڑے بھلا ایک شہد کی مکتبی کے لیے یہ ممکن ہی کہاں ہے کہ دنیا کے تمام پھلوں سے دس پیرس کر اپنے چھتے میں جمع کرے۔ اسی طرح قرآن نے جب یہ کہا کہ

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّاسِ بِالْحَجِّ يَا أُولَئِكَ لِلَّهِ
وَعَلَىٰ كُلِّ صَنَائِرٍ (الحج - ۲۷) | اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ تمہارے پاس
پیدل بھی آئیں گے اور ہر قسم کی دہلی اونٹنیوں پر بھی۔

تو کیا کل صائیر سے دنیا کی تمام دہلی اونٹنیاں مراد تھیں۔ ظاہر ہے کوئی بھی صاحب عقل کل کے لفظ سے اس معاملے میں نہیں پڑ سکتا ہر کوئی ہی کہے گا کہ یہاں مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ لوگ ہر طرح حج کے لیے پونچیں گے خواہ انہیں پیدل آنا پڑے اور خواہ ان کی سواریاں مشقت سفر سے ہلکان ہو ہو جائیں۔

غرض کل کا لفظ ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ استغراق حقیقی کے لیے استعمال ہوا ہو جس طرح پہلی آیت میں کل کے لفظ سے دنیا کے تمام پھل مراد نہیں لیے جاسکتے اور جس طرح دوسری آیت میں دنیا کی تمام دہلی اونٹنیاں مراد لینا درست نہیں اسی طرح تبسیانا لکل شئی یا تفصیلا لکل شئی میں کل کے لفظ کو شریعت اسلامیہ کے تمام اصول و فروع اور کلیات و جزئیات پر حاوی سمجھنا ہرگز درست نہیں۔ کل کے صحیح مفہوم کو مزید اچھی طرح سمجھنے کے لیے ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے کون نہیں جانتا کہ قرآن میں ملکہ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا جو قصہ مذکور ہوا ہے اس کی روشنی میں یہ بات یقینی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس لوازمات حکومت و سلطنت ملکہ سبا سے کہیں زیادہ ہفتے مکر دیکھے قرآن ملکہ سبا کا ذکر کرتے ہوئے کرتا ہے :

وَأَوْفَيْتُ مِنَ كُلِّ شَيْءٍ (النحل: ۲۳) | اور اسے ہر چیز دی گئی ہے۔
اب بتلائیے یہاں کل کو آپ کس معنی میں لیں گے۔ لازماً آپ ہی کہیں گے کہ یہاں 'کل' استغراق حقیقی کے لیے استعمال نہیں ہوا، یہاں کل 'شئی' کے عموم میں اس کے تمام افراد شامل نہیں۔

لہذا جس طرح کل السموات سے تمام قسم کے پھل کل ضامر سے دُنیا کے تمام اُونٹ اور کل شئی سے دُنیا کی تمام اشیاء مراد نہیں ہیں اسی طرح تبیاناً لکل شئی سے قرآن کا شریعت کی تمام کلیات و جزئیات کو شامل ہونا مراد نہیں لیا جاسکتا اس لیے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی کتاب تمام انسانی ضروریات و جزئیات کا احاطہ کرے۔

اس کے علاوہ یہ دعویٰ کہ قرآن تمام اُصول و فروع اور کلیات و جزئیات کو تفصیلاً بیان کرتا ہے حقیقت اور مشاہدے کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں بہت سے ایسے احکام ہیں جن کے متعلق مسائل کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں قرآن نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے مگر نمازوں کے اوقات رکوع و سجود وغیرہ اور زکوٰۃ کی مفادیر و مدت وغیرہ جیسی تفصیلات سے بالکل خاموش ہے۔ روزے کا حکم تو قرآن میں موجود ہے مگر اس سے متعلق بہت سے ایسے احکام ہیں جن کا قرآن میں صراحتہً کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح حج اور مناسک حج کا حال ہے۔ ذبیحہ، نکاح، خرید و فروخت اور قصاص کی کوئی تفصیلات قرآن میں نہیں ملتیں۔ اب بتلائیے قرآن ہر قسم کی تمام تفصیلات بیان کرنے والا کہاں رہا۔

غرض تفصیلاً لکل شئی یا تبیاناً لکل شئی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ قرآن میں شریعت کے ہر مسئلے کی تفصیل موجود ہے بلکہ اس قسم کی آیات قرآنی کا یہاں اس مفہوم یہ ہے کہ قرآن نے دین کے تمام بنیادی اُصول اور تمام مہمات شریعت کو بغیر کسی ایچ پیچ کے پوری وضاحت و تفصیل سے اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اشتباہ و ابہام کا شائبہ تک باقی نہیں رہا۔

قرآن نے کچھ نہیں چھوڑا | منکرینِ حدیث کی طرف سے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں سورۃ النعام کی یہ آیت بھی پیش کی جاتی ہے :

مَا فَرَقْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (النعام - ۳۸) | ہم نے کتاب میں کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا ۔

اور کہا جاتا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ فرمادیا ہے کہ ہم نے قرآن میں کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا سب کچھ اس میں لکھ دیا ہے تو پھر قرآن کے علاوہ کسی چیز کی خواہ وہ حدیثِ رسول ہی کیوں نہ ہو کیا ضرورت رہی ۔ آیت قرآنی کے اس ٹکڑے کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنا منکرینِ حدیث کی علمی بددیانتی کا شاہکار ہے ۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم اس وقت تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پوری آیت کے ساتھ ملا کر ان کو نہ پڑھا جائے ۔ پوری آیت اس طرح ہے :

وَمَا مِنْ حَابَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا حَائِطٍ
يُطَيَّرُ بِهَا خَلْقٌ إِلَّا أَمْرًا أَتَيْنَاكَ
مَا فَرَقْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ
إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ
(النعام - ۳۸) -

اور جو بھی زمین پر چلنے والا جانور ہے اور جو بھی اپنے دونوں بازوؤں سے اڑنے والا پرندہ ہے وہ سب تمہارے ہی طرح کے گروہ ہیں اور ہم نے اپنی کتاب میں کوئی چیز (بے لکھے) نہیں چھوڑی پھر یہ سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کیے جائیں گے ۔

اب پوری آیت پڑھنے سے بات کھل کر سامنے آگئی ۔ سیاق و سباق صاف بتلا رہا ہے کہ یہاں کتاب سے مراد قرآن نہیں ہے اور کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا تعلق شریعت کے مسائل و احکام سے نہیں ہے دراصل یہاں کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے جو علمِ الہی کی امین ہے ۔ اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیات میں قیامت کے روز تمام مخلوق کے جمع کیے جانے کا ذکر ہو رہا ہے اور بتلایا جا رہا ہے کہ حشر کے میدان میں انسانوں کے ساتھ ہر قسم کے جانور بھی دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ قیامت کے دن زندہ ہو کر اٹھنے میں جانور بھی اسے انسانو تمہاری ہی طرح کے گروہ ہیں اور

اگرچہ یہ سب جانور اپنی کثرت کی وجہ سے عرفاً بے انتہا ہوں لیکن ہمارے حساب میں سب منضبط ہیں کیونکہ ہم نے اپنے رجسٹر یعنی لوح محفوظ میں کوئی چیز بھی جو قیامت تک ہونے والی ہے بے لکھے نہیں چھوڑی۔

ذرا سوچ کر بتلائیے آیت کے اسی مفہوم کو کوئی دُور کی بھی نسبت ہے اس مفہوم سے جو منکرین حدیث سیاق و سباق سے بے نیاز ہو کر اپنی مقصد برداری کے لیے اس آیت سے نکل لیتے ہیں۔

الکتاب کا لفظ اور بھی متعدد جگہ قرآن میں لوح محفوظ اور علم الہی کے لیے استعمال ہوا ہے مثلاً سورۃ النعام، ہی میں ہے :

اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے
اور کوئی پتہ نہیں کر تا مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے
اور کرنی داندہ زمین کی تادلیکوں میں نہیں پڑتا اور
نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر یہ کہ (یہ سب) روشن
کتاب میں (موجود) ہیں۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا
تَسْقُطُ مِنْ رَّزْقٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا
وَلَا حِجَابٌ فِي ظِلْمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا
رُطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ
مبين.

(النعام - ۵۹)۔

ظاہر ہے روشن کتاب سے مراد لوح محفوظ ہی ہے کائنات کے ذرے ذرے کا علم جس میں منضبط ہے۔ اسی طرح سورۃ سبا کی اسی آیت میں بھی کتاب مبین کے الفاظ لوح محفوظ ہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں :

اس سے کوئی دُورہ برابر بھی غائب نہیں نہ آسمان
میں اور نہ زمین میں اور نہ کوئی سپر اس سے
چھوٹا اور نہ کوئی بُری مگر (یہ کہ یہ سب) کتاب
مبین میں (درج) ہے۔

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي
السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا
أَصْغَرُ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي
كِتَابٍ مبين - (سبا - ۳)۔

غرض کتاب سے ضروری نہیں کہ قرآن ہی مراد لیا جائے۔ کتاب کے لفظ کو قرآن نے لوح محفوظ اور علم الہی کے لیے بھی استعمال کیا ہے چنانچہ منکرین حدیث کی پیش کردہ اس

آیت مافترطنا فی الکتاب من شئی یسین بھی الکتاب سے لوح محفوظ ہی مراد ہے قرآن مراد نہیں۔

قرآن کافی ہے | ایک اور آیت جو منکرین حدیث اس سلسلے میں پیش کیا کرتے ہیں سورہ عنکبوت کی یہ آیت ہے :

کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ کے اوپر کتاب نازل کی ہے جو ان کو سنانی مہماتی رہتی ہے بے شک اس کتاب میں ایمان والوں کے لیے بڑی رحمت اور نصیحت ہے۔

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ
الْكِتَابَ يَتْلُو عَلَيْهِمْ
ذَلِكَ لَرَحْمَةٍ وَذِكْرٍ لِّقَوْمٍ
يُؤْمِنُونَ - (عنکبوت - ۵۱)

اس آیت سے استشہاد کرتے ہوئے منکرین حدیث کہا کرتے ہیں کہ جب قرآن خود کہہ رہا ہے کہ وہ ہمارے لیے کافی ہے اور سراپا رحمت و نصیحت ہے تو پھر حدیث کے سہارے کی کیا ضرورت ہے۔

اس آیت کو بھی منکرین حدیث نے اپنے ماہر اند فن کا کمال دکھلاتے ہوئے اصل سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پیش کیا ہے اس آیت میں کہا کچھ اور جارہا ہے اور منکرین حدیث کچھ اور ہی معنی اپنی طرف سے اسے پہنائے جا رہے ہیں منکرین حدیث کا یہ استدلال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی قرآن کی آیت لَا تَقْرُؤُ الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ مُسْكِرُونَ میں سے صرف لَا تَقْرُؤُ الصَّلَاةَ کے الفاظ لے کر کہے کہ قرآن تو کہتا ہے نماز کے قریب بھی مت جاؤ۔ جس قدر مضحکہ خیز یہ استدلال ہے اس سے زیادہ مضحکہ خیز بلکہ احمقانہ یہ استدلال ہے کہ سورہ عنکبوت کی متذکرہ بالا آیت سے حدیث کی عدم احتیاج ثابت ہوتی ہے۔ اس آیت سے پہلے جو آیت ہے وہ ذرا پڑھیے اس سے پہلے کی آیت میں مشرکین مکہ کے اس مطالبے کو نقل کیا گیا ہے کہ یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نشانیاں کیوں نہیں دکھلاتے۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ | انہوں (مشرکین مکہ) نے کہا اس (نبی) پر اس کے

رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں نازل
ہوتیں کہ دیکھتے نشانیاں اللہ کے اختیار میں
ہیں میں تو بس کھلا ہوا درلے والا ہوں۔

مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ
اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ۔

رعنکوت - ۵۰

اس کے فوراً بعد مشرکین مکہ کے اس مطالبے کا رد کرتے ہوئے فرمایا اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَلْحَجُّ
یعنی یہ لوگ اور کوئی نشانی کیوں طلب کرتے ہیں ان کے پاس تو سب بڑی نشانی
اللہ کی کتاب آچکی کیا وہ ان کے لیے کافی نہیں ہے اس رد میں اور عظیم ترین معجزے
کے ہوتے ہوئے جو سراپا رحمت و نصیحت ہے دوسرا معجزہ طلب کرنا سراپے عقلی
کی بات ہے اس سیاق و سباق کو سامنے رکھتے ہوئے ہر کوئی خود فیصلہ کر سکتا
ہے کہ یہاں سنت و حدیث کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے ان آیات میں تو مشرکین مکہ کے
ایک غیر معقول مطالبے کا رد کرنا مقصود ہے۔ حیرت ہوتی ہے منکرین حدیث حقائق
قرآنی کو کس جرات کے ساتھ توڑتے مروڑتے رہتے ہیں انہیں نہ خدا کا خوف ہے
اور نہ اس بات کا کوئی خیال کہ علمی دیانت داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

کیا حدیث کی مشغولیت گمراہی ہے؟ | مذکورہ بالا استدلال کے بارے
میں تو حسن ظن سے کام لیتے ہوئے

بحال یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید کسی غلط فہمی کی بنا پر یا مہارنہ علمی صلاحیت سے محرومی کی بنا پر ان آیات
سے سنت و حدیث کے خلاف استشہاد کر لیا گیا ہو مگر ہم منکرین حدیث کا ایک اور
استدلال پیش کرنے لگے ہیں جو قرآنی تحریف اور حدیث دشمنی کا کھلا شاہکار ہے۔ اس
استدلال میں جو طرز عمل اختیار کیا گیا ہے اس کے پیش نظر تو یقین نہیں آتا کہ ان لوگوں
کی طرف سے سنت و حدیث کی مخالفت دیانتدارانہ طور پر محض کسی غلط فہمی کی بنا پر کی
جار می ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ لوگ سورہ لقمان کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

لوگوں میں سے کون انسان ایسا بھی ہے جو اللہ
سے غافل کر سکے یا جس خریدنا ہے تاکہ بے سمجھے بوجھے
اللہ کی راہ سے لوگوں کو بھٹکائے اور اس راہ کی
ہمنی اڑائے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنُ يُشْتَوِي لَهْوَ الْحَدِيثِ
لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ
يَتَّخِذَ هَاهُنَا هُنَا لَهْوَ الْغِيَاثِ (لقمان - ۶)۔

اور بڑی دیدہ دلیری سے کہتے ہیں کہ دیکھئے اس آیت میں حدیث کی مشغولیت کو گراہی قرار دیا گیا ہے۔ الحیاذ باللہ کہاں لھو الحدیث اور کہاں حدیث نبوی۔ حدیث دشمنی میں یہ لوگ کتنی دُور نکل گئے ہیں قسراں کے اندر محضی تحریف کرتے ہوئے یہی انہیں شرم نہیں آتی۔ ان لوگوں کی کتابوں میں اس آیت کا جو ترجمہ ملتا ہے وہ قرآنی آیات میں بلا واسطہ محضی تحریف کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ حافظ اسلم صاحب جو ان لوگوں کی صفوں میں بہت بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

”اور لوگوں میں سے وہ ہیں جو حدیث کے مشغلے کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکادیں۔“ (مقام حدیث جلد ۱ ص ۱۵۶)

حالانکہ ہم نہیں سمجھتے کہ حافظ صاحب اتنی بات بھی نہ جانتے ہوں کہ حدیث کے معنی عربی زبان میں بات کے ہیں اس لغوی معنی کے اعتبار سے حدیث کا لفظ خدا کی بات، رسول کی بات، صحابہ اور عام مسلمانوں کی بات بلکہ کافروں کی بات حتیٰ کہ شیطان کی بات پر بھی بولا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک معنی کے لیے حدیث کا لفظ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے مثلاً

اللہ نزل احسن الحدیث (النمر: ۲۳) | اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے۔

اس آیت میں حدیث کا لفظ کلام الہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح ایک آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگوشی کو حدیث کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے :

وَإِذَا مَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ | جب پیغمبر نے ایک بات اپنی کسی بیوی سے
حدیثاً۔ (التحريم : ۳) | چپکے سے فرمائی۔

صحابہ اور عام مسلمانوں کی گفتگو پر لفظ حدیث کا اطلاق اس آیت میں ہوا ہے :

وَلَا مَسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ۔ | اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو۔
(احزاب : ۵۳)۔

اعداء اسلام اور کفار و مشرکین کی گفتگو پر لفظ حدیث کے اطلاق کے لیے یہ آیت

پیش کی جاسکتی ہے۔

مخبر بخوضوا فی حدیث | ہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔
(الفسار : ۱۴۰)

یعنی کافر اور مشرک اگر اپنی مجالس میں اسلام کا مذاق اڑا رہے ہوں تو مومنین کو چاہیے کہ ان کی ہم نشینی سے اجتناب کریں حتیٰ کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔

ان تمام آیات میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حدیث کا لفظ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے بات ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس اصطلاحی معنی میں حدیث کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا جو محدثین اور فقہاء کے درمیان معروف ہے۔ منکرین حدیث کی طرف سے پیش کردہ زیر بحث آیت میں بھی لہذا حدیث سے وہ تمام شیطانی باتیں مراد ہیں جن میں مشغول ہو کر انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ انسانیت کے لیے گمراہی اور فساد کا باعث بن جاتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباس کا قول ہے :

لہذا حدیث ہوا الخیار و المشاہدہ (قرطبی) | لہذا حدیث سے مراد گانا اور اس کے شاہر چیزیں ہیں گویا ہر بیکار اور غیر مفید مشغلہ جو حق کی طرف سے غفلت اور بے رغبتی پیدا کرنے والا ہو لہذا حدیث کے تحت داخل ہے اس طرح اس آیت کو حدیث کے اس اصطلاحی معنی سے دور کا بھی تعلق نہیں جو محدثین اور فقہاء کے توسط سے امت میں شروع سے منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ منکرین حدیث کی جسارت پر تعجب ہوتا ہے وہ لفظ جو شیطانی باتوں اور بیکار مشغلوں کے لیے قرآن میں استعمال ہوا تھا اپنی مذموم مقصد برآری کی خاطر اس لفظ کو حدیث رسول جیسے پاک و مطہر کلام پر چسپاں کر دیا اور ان لوگوں کی علمی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ اپنے حق میں دلیل دینے کے جوش میں یہ تک بھول گئے کہ یہ آیت مکی ہے یا مدنی۔ سورہ لقمان مکی سورتوں میں سے ہے مکی دور میں مشرکین مکہ کے ظلم و ستم کا جو حال تھا اس سے کون واقف نہیں مسلمان بے چارے مکی دور میں ایسی کس میری کے عالم میں تھے کہ حدیث تو کجا قرآن کی کتابت و ترتیب کا موقع بھی انہیں بسہولت میسر نہ

تھا۔ نئی زندگی کے پُر آشوب زمانے میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مسلمان حدیث کے مشغلے یا مجموعے خریدتے پھرتے سچی بات یہ ہے کہ قرآن نے تو یہودیوں کے لیے کہا تھا کہ یَحْرَفُونَ الْكَلِمَةَ عَنْ مَوَاضِعِہَا (وہ کلام کو اس کے اصل مقام سے بدل دیتے ہیں) مگر آج اللہ کا یہ قول منکرین حدیث پر حرف بحرف صادق آ رہا ہے۔

قرآن کی جامعیت کا اصلی مفہوم | غرض منکرین حدیث کی کسی بھی دلیل سے قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا

کہ قرآن میں شریعت کے تمام اصول و فروع اور تمام کلیات و جزئیات مفصلاً مذکور ہیں اور اس لیے ماخذ دین ہونے کے لحاظ سے حدیث رسول اور سنت رسول کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس سلسلے میں منکرین حدیث کی طرف سے پیش کیے جانے والے دلائل کا حشر تو قارئین نے دیکھ ہی لیا۔ آئیے اب ہم قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم تو کسی طرح عقل میں آنے والا نہیں کہ اس نے احکام دین کے تمام غیر متناہی جزئیات کا احاطہ کر لیا ہے فرائض و واجبات، مستحبات و منہی کی تمام حدود اس نے قائم کر دی ہیں، ارکان و شرائط اسباب موانع کی تمام تفصیلات اس میں مذکور ہیں یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں کہ قرآن کی کسی آیت پر کوئی 'جمال' کسی عموم میں کوئی 'تقیید' اور کسی مراد میں کوئی 'ابہام' نہیں رہا۔ کسی کتاب کے جامع ہونے کا نہ یہ مطلب ہوتا ہے نہ عقلاً یہ ممکن ہے اگر درحقیقت قرآن کی جامعیت اور اس کی وضاحت تفصیل اسی درجہ کی ہوتی تو رسول کی بعثت بے نائدہ رہتی قرآن کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث فرمانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اپنے آپ میں جامع ہونے کے باوجود تعلیم و ترویج کا محتاج ہے نبی کا کام یہ ہے کہ وہ اس کتاب کے مطالب سمجھائے اور اس پر عمل کرنا سکھلائے۔

قرآن اس لحاظ سے یقیناً جامع ہے کہ اس نے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق تمام کلیات کھول کھول کر بیان کر دی ہیں وہ ماضی کی خبروں، مستقبل کی

اطلاعوں اور حال کے احکام کا احاطہ کیے ہوئے ہے وہ جہاں بانی کے رموز و اسرار کے لیے مکمل آئین ہے گدائی کے عمیق و دقیق اصول بھی اس نے انتہائی سادہ اور جامع الفاظ میں بیان کر دیے ہیں۔ یہی نہیں کہ دینیات کا کوئی گوشہ اپنی اصولیت اور کلیت کے لحاظ سے اس سے باہر نہیں بلکہ سیاست، معیشت، معاشرت، مسائل، اخلاق و دینیات کے تمام اصول و قوانین بھی وہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

مگر قرآن کی یہی جامعیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کی تعبیرات اصولیت اور کلیت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوں اس کے لفظ لفظ میں حقائق و معارف کے دریا پورید ہوں اس کا ایک ایک اشارہ معارف الہیہ کا مخزن ہو اس کا ایک ایک لفظ اعجازی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ قرآن کی جامعیت ہی کے نتیجے میں لازم ہے کہ قرآنی آیات میں سے کوئی نسبت خفی ہو تو کوئی مجمل کوئی مشکل ہو تو کوئی کتاب کا پہلو لیے ہوئے ہو۔

حدیث رسول کی احتیاج | اور قرآن کی جامعیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انہی اصولی و کلی تعبیرات کی اصل مرادات ستین

کرنے کے لیے ہم حدیث رسول کے محتاج ہیں۔ نبی کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو کس کے بس کی یہ بات ہے کہ وہ ان حقائق و معارف پر مطلع ہو سکے جو قرآن کے جامع ہونے کی وجہ سے اس کے ایک ایک لفظ میں پوشیدہ ہیں۔ نبوت کی رہنمائی کے بغیر ان اشارات کو کون سمجھ سکتا ہے جو قرآن نے اپنی جامعیت کی بنا پر اپنے وجود میں سموئے ہوئے ہیں اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق کی رمزیں صرف عشق آشنا ہی جان سکتا ہے تو یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ اشارات ربانی کی اصل مراد کو صرف رب آشنا ہی پاسکتا ہے۔ قرآن جو اپنے جامع ہونے کی بنا پر اعجازی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کے ہدایت کی ایک ایک تہ اور ایک ایک شکن میں صد ہا علوم چلے ہوئے ہیں اس کے ذاتی و حقائق پر اطلاعات پلنے کے لیے ایک ایسے واسطے کا ہونا لازمی ہے جو ایک لحاظ سے ذات حق سے قریب تر ہو اور ایک لحاظ سے بندوں میں شامل ہو وہ لامحدود ذات و صفات کی حامل ہستی سے صادر ہونے والے کلام کے علوم و معارف پر

بلا واسطہ خود اسی ہستی سے اطلاع پائے اور پھر اسی کی رہنمائی میں عامہ خلائق کو ان پر مطلع کرے۔ اس کلام میں کوئی خفا ہو تو وہ اس کا اظہار کرے کوئی اجمال ہو تو اس کی تفصیل کر دے کوئی ابہام ہو تو اس کو کھول دے۔ اس کلام کے کسی حصے سے مختلف محتملات مفہوم ہوتے ہوں تو اصل احتمال متعین کر دے۔ اس کلام میں جتنے احکام بیان کیے گئے ہیں ان میں سے جس حکم کی توجیہ بیان کرنا ضروری ہو اسکی توجیہ بیان کرے جس حکم کی حدود کا تعین ضروری ہو اس کی حدود متعین کرے۔ کسی حکم کے خواص و آثار بتلانے ضروری ہوں تو ان خواص و آثار پر مطلع کرے۔ غرض قرآن کی جامعیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام اصولی و کلی تعبیرات کی اصل اصل مرادات متعین کر دے :

بعثت کے تین اہم مقاصد | قرآن کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یقیناً مدت العمر قرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے۔ اللہ تعالیٰ اسی احسان کو یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے :

اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تذکرہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ
بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

(آل عمران - ۱۶۳)

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے تین اہم مقاصد بتلائے گئے ہیں ایک یہ کہ آپ اللہ کی کتاب لوگوں کو پڑھ کر سنائیں دوسرے یہ کہ آپ لوگوں کا فرد کے لحاظ سے بھی اور اجتماعی ہیئت کے لحاظ سے بھی تہذیب کی تربیت سے ان کی

انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور تفسیر سے یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں اور اس کی منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر قرآن کی جامعیت کا وہی مطلب ہوتا جو منکرین حدیث بیان کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا صرت ایک ہی مقصد ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اللہ کی کتاب لوگوں کو پڑھ کر سنادیں اور بس۔ بلکہ اس کی بھی ضرورت نہ تھی قرآن کریم لکھا لکھایا ایک کتاب کی صورت میں لوگوں کے ہاتھ میں بٹھا دیا جاتا اور اس کے لیے ظاہر ہے کسی رسول کے مبعوث کہنے کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی کسی بھڑایا اونچے درخت پر نازل کر دیا جاتا جہاں سے لوگ خود اٹھا کر اسے لے آتے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ پہلے ایک فخرارسل کو مبعوث فرمایا پھر وحی کے ذریعے قرآن کو اس پر نازل کیا اور پھر اس کے ذمے متقل طوع پر یہ کام لگایا کہ وہ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ سکھلائے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن جامع ہونے کے باوجود تعلیم و توحیح کا محتاج ہے۔ اور اس بات کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ کسی کتاب کی تعلیم و توحیح کتاب سے ظاہراً علیحدہ ہوتے ہوئے بھی حقیقتاً اس کتاب سے کوئی جدا اور علیحدہ چیز نہیں ہوا کرتی۔ کسی کتاب کا متن اور اس کی شرح اگرچہ لفظاً مختلف ہوتے ہیں مگر معنایاً دونوں باہم متحد ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم و توحیح کے لیے جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کر کے دکھایا اور جسے ہم سنت یا حدیث کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ اگرچہ اپنے وجود کے اعتبار سے قرآن سے علیحدہ ہے مگر انہی حقیقت کے اعتبار سے وہ قرآن ہی کا ایک حصہ ہے اس سے زائد یا اس سے باہر کوئی چیز نہیں کہ قرآن کی جامعیت کے منافی ہو۔ قرآن متن ہے اور حدیث اس کی شرح۔

تعلیم و توحیح قرآن | قرآن کی تعلیم و توحیح کی ذمہ داری بعثت کے مقاصد میں سے
 کتنا اہم مقصد ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت و نبوت کی تفصیل بیان کی وہاں دیگر مقاصد کے ساتھ ساتھ اس مقصد کا بطور خاص ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ بقرہ میں جب حضرت ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام کی اس دُعا کا ذکر آیا جس میں انہوں نے اپنی اولاد میں سے ایک رسول مبعوث کیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو اس وقت بھی حالانکہ وہ محض ایک دُعا تھی بعثت کے اس مقصد کو خاص طور سے دُعا کے الفاظ کا ایک مستقل جُز بنا دیا گیا۔ ارشاد ہے :

اور جب ابراہیم و اسمعیل اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو انہوں نے دُعا کی..... اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود اپنی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر نائے ابدان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ
الْبَيْتِ وَاسْمَعِيلُ... رَبَّنَا وَابْعَثْ
فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ
آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيهِمْ۔ (البقرة : ۱۲۹)

اسی طرح ایک اور مقام پر تحویل قبلہ کے حکم کی حکمتوں کے ضمن میں بتلانا صرف یہ ہے کہ جس طرح تحویل قبلہ کا حکم دے کر ہم نے تم پر انجام کیا ہے اسی طرح تم ہی میں سے ایک رسول بھیج کر تم پر اتمام نعمت کر دیا ہے مگر اس موقع پر بھی بعثت کے یہی تینوں مقاصد علیحدہ علیحدہ اہتمام کے ساتھ بیان فرمائے۔ ارشاد ہے :

جی طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر نائے ابد تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ
يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ
(البقرة : ۱۵۲)

سورہ جمعہ میں بھی اپنی ہائی و برتری کے بیان کے فوراً بعد جب اللہ تعالیٰ نے العزیز العظیم کہہ کر اپنا حکیم ہونا ظاہر فرمایا اور اپنی حکمت کو اس طرح پر خطایا :

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا
مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ
يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ
الْحِكْمَةَ (المجمعة : ۲)

دہی ہے جس نے انہوں کے درمیان خود انہیں میں سے
ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر
سنا رہا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور
حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

تربعت کے مقاصد بطور خاص گناہوں اور اس میں تعلیم کتاب کو علیحدہ ذکر فرمایا
غرض جہاں کہیں بھی بحث کا ذکر آگیا تو اس کے مقاصد گناہ ہونے اللہ تعالیٰ نے
تعلیم و ترویج قرآن کا ضرور ذکر فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم و ترویج قرآن کے بغیر بحث کا
مقصد پورا نہ ہوتا تھا دوسرے لفظوں میں قرآن اپنی ذات میں جامع اور مفصل ہونے کے
باوجود تعلیم و ترویج کے بغیر اپنے مقصد نزول کے اعتبار سے نامکمل رہتا تھا۔

اب اس میں تو کسی کو کلام ہی نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بحث کے تمام
مقاصد با حسن وجہ پورے فرمائے۔ آپ نے قرآنی آیات سنا دینے پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے
اقوال اپنے افعال اور اپنے طرز عمل سے لوگوں کو کتاب کی تعلیم بھی دی اس کتاب کی منشاء کے
مطابقی کام کرنے کی حکمت بھی سکھائی اور ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں کو دور کر کے
ان کے اندر اچھے اوصاف و اطوار بھی پیدا کیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و ترویج قرآن کا فریضہ کس طرح انجام دیا اس کی
وضاحت کے لیے چند ایک مثالیں پیش خدمت ہیں تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے اور قرآن
کی جامعیت کا اصل مفہوم پوری طرح کھل کر سامنے آجائے نیز قرآن اور حدیث کا باہم ربط واضح
ہو جائے۔

مجمعات کی تفصیل | تعلیم و ترویج قرآن کے کام کی پہلی قسم وہ ہے جس میں قرآن نے بعض محفل
احکام صادر کیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تفصیل
بیان فرمائی۔ مثال کے طور پر قرآن نے جا بجا نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے ستر سے زیادہ مقامات پر
کسی کسی پیرائے میں اس کا ذکر ہے مگر نماز کے تفصیلی احکام اور اس کے اوقات وغیرہ کے ذکر
سے قرآن خاموش ہے قرآن نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس تاکید حکم کی تعمیل آخر

کس طرح پر کی جانے اس کے لیے کیا کچھ کرنا ہوتا ہے اس میں قیام ہے تو اس کی کیا ہیئت ہے اس کے دوران کیا کچھ پڑھنا ہے رکوع کی کیا کیفیت ہے رکوع ایک ہے کہ دو رکوع کے دوران پڑھے جانے والے کلمات کیا ہیں، سجدوں کی تعداد کتنی ہے، نماز میں بیٹھ کر بھی کچھ پڑھنا ہے یا نہیں، رکوع و سجدہ قیام و قعود کی باہم ترتیب کیا ہے نماز سے باہر آنے کا طریقہ کیا ہے، نماز کے ارکان 'فرائض' سنن و مستحبات وغیرہ کا بھی قرآن نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ نماز میں سہو ہو جانے تو کیا کرے کن کن صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے مکروہات نماز کیا ہیں کن کن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور کن اوقات میں حرام نماز کے اوقات کی صحیح صحیح تعیین کیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے نماز سے متعلق دیگر احکام اور مختلف تفصیلات کے بارے میں قرآن بالکل خاموش ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کی تعلیم دی ان تمام تفصیلات کو بتایا یا سکھایا۔

اسی طرح روزے کا حکم قرآن میں موجود ہے مگر اس کے تفصیلی احکام کے ذکر سے قرآن خاموش ہے قرآن آپ کو یہ نہیں بتاتے گا کہ کن کن حالات میں روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور کن صورتوں میں کفارہ لازم آتا ہے۔ ندیرہ دینے کی اجازت ہے تو کن لوگوں کے لیے وہ کیا حالات ہیں جن میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے وہ کونسی صورتیں ہیں جن میں رکھا ہوا روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے۔ اس قسم کی جتنی تفصیلات روزے سے متعلق ہیں قرآن نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ تمام تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کیں۔

نماز اور روزے ہی کی طرح دوسرے دو ارکان دین حج اور زکوٰۃ کا بھی حال ہے حج اور زکوٰۃ کا حکم تو قرآن میں مل جلتے گا مگر مناسک حج اور مسائل زکوٰۃ کی تفصیلات قرآن میں نہیں ملیں گی۔ حج ادا کرنے کا طریقہ، حرام کسے کیڑوں کی تعداد، حدود میقات کا تعیین، طواف کے پکڑوں اور سعی کے اشواط کی تعداد، مل اور علی کا طریقہ، قربانی کے تفصیلی احکام اور حج کی بنیادیں وغیرہ غرض حج سے متعلق تمام تفصیلی احکام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تعلیم فرمائے۔ زکوٰۃ کے متعلق بھی تمام تفصیلات آپ ہی نے بتائیں۔ زکوٰۃ کا انصاف اس کی شرح اس کی مدت، مختلف قسم کے اموال پر زکوٰۃ کے مختلف نصاب، ہر ایک مال پر زکوٰۃ کی مختلف

شرح، حیوانات کی زکوٰۃ کے تفصیلی احکام زمین کی پیداوار کی صورتیں اور عشر و خراج کے مسائل وغیرہ یہ سب تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ہمیں معلوم ہوئیں۔
یہی حال شریعت کے اور بہت سے مسائل کا ہے مثلاً ذبیحہ، نکاح و طلاق، خرید و فروخت اور قصاص وغیرہ کی تمام تر تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ذریعے ہی ہم تک پہنچیں قرآن میں بنیادی طور پر ان کے احکام ضرورہ موجود ہیں مگر ان کی بہت سی ضروری تفصیلات سے قرآن خاموش ہے۔

اب ان تمام تفصیلات کی عدم موجودگی کی بنا پر کیا قرآن کو غیر جامع خیال کیا جائیگا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ذریعے معلوم شدہ یہ تمام تفصیلات کیا قرآن سے باہر یا قرآن سے زائد کوئی چیز سمجھی جائیں گی۔ ظاہر ہے دونوں باتوں کا جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ نہ صورت یہ ہے کہ قرآن ان احکام کے ذکر سے یکسر خاموش ہے کہ اس کی جامعیت میں کوئی فرق آنے اور نہ یہ صورت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تفصیلات بیان کی ہیں جن کی اصل قرآن میں موجود نہیں کہ ان تفصیلات کو زائد قرآن کوئی چیز قرار دیا جائے بلکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ قرآن نے جو احکام انہی جامعیت کی بنا پر مجمل طور پر بیان کیے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان کی تفصیلات کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس لیے یہ تمام تفصیلات قرآن سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی قرآن ہی کا ایک حصہ ہیں۔

یہی بات بالکل اسی انداز میں مشہور صحابی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو سمجھائی تھی جس نے آپ کے سامنے یہ مطالبہ پیش کر دیا تھا کہ

لَا تَحْدِثُونَا إِلَّا بِالْقُرْآنِ | قرآن کے سوا ہمارے سامنے کچھ نہ بیان کرو۔

حضرت عمران بن حصین نے اس شخص کو اپنے قریب بلایا اور اس کو سمجھانا شروع کیا۔
آپ نے فرمایا :

أَرَأَيْتَ لَوْ وَكَلَّتْ أُنْتِ وَأَصْحَابُكَ | کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارے رفقاء قرآن پر

تکبیر کر رگے تو کیا قرآن میں تم پاسکتے ہو کہ ظہر کی نماز
چار رکعتوں پر اور عصر کی بھی چار اور مغرب کی نماز
تین رکعتوں پر مشتمل ہے۔

إِلَى الْقُرْآنِ أَكُنْتَ تَجِدُ فِيهِ صَلَوةً
الظُّهْرَ أَرْبَعًا وَصَلَوةَ الْعَصْرِ
أَرْبَعًا وَالْمَغْرِبَ ثَلَاثًا

(الوافقات جلد ۲ ص ۲۶ رجامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱)

پھر اسی طرح آپ نے مناسک حج کا ذکر کرتے ہوئے اس شخص سے پوچھا

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارے رفقاء قرآن پر تکبیر
کر لو گے تو کیا قرآن میں تم پاسکتے ہو کہ بیت اللہ کا
طواف سات دفعہ کرنا چاہیے اور صفا و مروہ کا طواف
بھی سات دفعہ کرنا چاہیے۔

أَرَأَيْتَ لَوْ دَكَلَّتْ أَنْتَ وَاصْبَابُكَ
إِلَى الْقُرْآنِ أَكُنْتَ تَجِدُ السَّطَوَاتِ
بِالْبَيْتِ سَبْعًا وَالطَّوَّافَ بِالصَّفَا
وَالْمَرْوَةِ سَبْعًا۔ (ایضاً)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ نے مناسک حج کا ذکر کرتے ہوئے عرفات میں
وقوف اور رمی جمار کے مسئلے کے بارے میں بھی اس شخص سے پوچھا کہ کیا ان کی تفصیلات تمہیں کہیں
قرآن میں ملتی ہیں۔ اس کے بعد چور کے ہاتھ کاٹنے کے حکم کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے اس
کو سمجھاتے ہوئے پوچھا کہ بھلا بتاؤ قرآن میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا اسلامی حکم انوں کو جو
ذمہ دار بنایا گیا ہے تو کیا اس کا تعین بھی قرآن میں کہیں کیا گیا ہے کہ ہاتھ کس طریقے سے
اور کہاں سے کاٹا جائے۔ آپ نے فرمایا

اور ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے، یہاں سے
یا وہاں سے۔

وَالْيَدِ مِنْ أَيْنَ تَقْطَعُ أَيْمَنُ
هَهُنَا أَوْ مِنْ هَهُنَا۔ (ایضاً)

راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ نے پہلے گٹے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ کیا یہاں سے؟
پھر گٹنی پر اور پھر اس کے بعد کندھے کے قریب ہاتھ لے جا کر پوچھا کہ کیا یہاں سے؟
غرض حضرت عمران بن حصینؓ نے مختلف احکام کا حوالہ دے کر اس شخص کو سمجھانے
کے انداز میں پوچھا کہ کیا ان احکام کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں اور پھر آخر میں فرمایا یہ

احکام خدا کی کتاب میں مجمل ہیں اور سنت ان کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں

انَّ كِتَابَ اللَّهِ إِلَيْكُمْ هَذَا وَإِنَّ
السَّنَةَ تَفْسَرُ ذَلِكَ (اليفاع)

کتاب اللہ نے اس کو مبہم رکھا پھر سنت رسول
نے اس کی تفسیر کر دی۔

مبہمات کی توضیح | مجمل احکام کی تفصیل بیان کرنے کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے بعض ان شبہات کا ازالہ بھی فرمایا جو قرآنی آیات کی صحیح
مراد سمجھنے میں صحابہ کرام کو پیش آتے تھے یا آئندہ آنے والوں کو پیش آسکتے تھے
مثلاً یہ بتایا کہ قرآنی آیت الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ
الْأَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُونَ (جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے ایمان میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا
یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی ہدایت یافتہ ہیں) میں ظلم سے مراد شرک ہے۔ یا یہ کہ

حَتَّىٰ يَبِيضَ لَكُمْ الْحَبْطُ وَلَا بَيْضٌ مِنَ الْحَبْطِ إِلَّا سُودٌ (کھاتے پیٹے رہو) یہاں تک سیاہ و
سفید دھماگے میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے) میں سیاہ و سفید دھماگوں سے شب کی تاریکی اور
دن کی سفیدی مراد ہے۔ اس قسم کی متعدد مثالیں ہم نے حفاظت حدیث پر گفتگو کرتے وقت
حدیث اور حفاظت خداوندی کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کی ہیں قارئین ان پر
دوبارہ نظر ڈال لیں :

مشکلات کی تفسیر | علاوہ ازیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قرآنی مشکلات کا
حل بھی فرمایا مثلاً

(۱) قرآن میں بار بار آتا ہے کہ مرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر زندہ ہوتا ہے اب ذہن
میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مٹی ہو کر ریزہ ریزہ ہو کر پھر نئے سرے سے زندگی کیوں کر
ہوگی صحابہ کے استفسار پر اس اشکال کو حل فرماتے ہوئے آپ نے فرمایا کبھی بارش
سے قبل تم نے زمین کی حالت دیکھی ہے کیسی خشک اور کیسی بے آب و گیاہ نظر آتی ہے مگر
بارش کے بعد وہی زمین پھر سے سرسبز اور تر و تازہ دکھائی دینے لگتی ہے وہ تنکے جو ابھی
زمین پر مردہ لیٹے ہوئے تھے ایک چھینٹا پڑتے ہی اکڑتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں اسی

طرح مرنے کے بعد تم بھی پھر جی اٹھو گے۔

(۲) تقدیر کے مسئلے میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمارے اعمال پہلے سے طے شدہ اور لکھے جا چکے ہیں تو اب آئندہ عمل کی جدوجہد کرنا بے کار ہے یا پھر یہ ماننا ہے کہ ہم نے فرمایا اگر تم سید لکھے جا چکے ہو تو تم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم نیک کام نہ کرو اور اگر خدا خواستہ تقدیر دوسری طرف جا چکی ہے تو نیک عمل کرنے کی تم ہزار کوشش کرو تم کہ ہی نہ پاؤ گے۔ تم سمجھتے ہو کہ عمل کی جدوجہد کرنا تقدیر سے باہر کوئی بات ہے ایسا نہیں بلکہ تقدیر جس طرح سزا و جزا کو محیط ہے اسی طرح اعمال صالحہ اور اعمال بد کو بھی محیط ہے لہذا عمل کیے جاؤ تم سے وہی عمل صادر ہوں گے جو تمہاری تقدیر کے موافق ہیں۔ پھر آپ نے اس حقیقت پر متنبہ کرنے کے لیے کہ نیکی کی توفیق اور بدی سے احتراز سب اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام سے میسر آتا ہے یہ آیت پڑھی **فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی دَالِقًا وَّصَدَقَ بِالْحَسَنٰتِ فَيَسْتَكْبِرُ ۚ** **وَلَيْسَ لَهُ اَمَّا مِّنْ بَخْلٍ وَّاَسْتَحْنٰی وَّكَذَّبَ بِالْحَسَنٰتِ فَيَسْتَكْبِرُ ۚ** (سورہ نازعات) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کو سچا سمجھا سو ہم اس کے لیے راجت کی چیز آسان کر دیں گے اور جس نے غل کیا اور لا پیردانی ہوتی اور اچھی بات کو جھٹلایا سو ہم اس کے لیے مصیبت کی چیز آسان کر دیں گے۔

یہ اجمال و ابہام اور اشکالات قرآنی وغیرہ سے متعلق ایک ایک مثالوں پر لکھا صرف اس خیال کے پیش نظر ہے کہ تفہیم کے لیے اتنا ہی کافی ہے ورنہ قرآن سے ایسی بہت سی مثالیں ہر ہر عنوان کے تحت پیش کی جاسکتی ہیں۔

اشارات کی تشریح | قرآن نہی کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی مثالوں میں ایک قسم ان اشارات کی تشریح بھی ہے جو

قرآن میں متفرقا موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو قصہ طلب ہیں جب تک وہ واقعہ پورا معلوم نہ ہو ان آیات کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قصوں کی تفصیل بیان فرمائی۔ مثال کے طور پر سورہ توبہ میں ہے **وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَوْا**

(اور ان تینوں پر بھی (توجہ فرمائی) جو پیچھے رہ گئے تھے) اب جب تک جنگِ تبوک کا سارا واقعہ اور بعض مخلص صحابہ کا جنگ میں شامل نہ ہو سکنے کا قصہ معلوم نہ ہو یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ وہ تین اصحاب کون تھے جن کا اس آیت میں حوالہ دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کی قصہ طلب بہت سی آیات ہیں۔

(۲) قصصوں کے علاوہ قرآن کے بعض تفسیری اجزا بھی ایسے ہیں جن کا علم صاحبِ وحی کے بتلائے بغیر نہیں ہو سکتا اور ان کو معلوم کیے بغیر متعلقہ آیات قرآنی کا پورا مفہوم ہی واضح نہیں ہوتا۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ (جنہوں نے ظلم کیا تھا انہوں نے جو کلمات کہنا انہیں بتائے گئے تھے وہ بدل ڈالے) قرآن میں اس سے ما قبل کی آیت میں ان کلمات کا ذکر موجود ہے جو بنی اسرائیل کو شہر مود میں داخل ہوتے وقت پڑھتے رہنے کے لیے بتلائے گئے تھے وَتَوَلَّوْا حِطَّةً یعنی جب دروازے میں داخل ہو تو حِطَّةً (اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے) کہتے ہوئے داخل ہونا لیکن قرآن نے ان مہمل اور گستاخانہ کلمات کا کوئی ذکر نہیں کیا جو ضد میں آکر بنی اسرائیل نے بکے تھے۔ قرآن ان کا ذکر کرتا بھی کیوں وہ اس قابل ہی کب تھے کہ انہیں نقل کیا جاتا۔ بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیان کر کے اس قوم کی نافرمانی و سرکشی کا حال ظاہر فرمایا آپس نے بتلایا کہ انہوں نے حِطَّةً کہے۔ بجائے حَبَّةً فِي شَعْرَةٍ کے مہمل کلمات بکنے شروع کر دیے۔

تاریخین ان مثالوں کو محض سرسری نظر سے دیکھتے نہ چلے ہاتھ بلکہ اچھی طرح غور کرتے جائیں کہ قرآن سے متعلق یہ تمام توضیحات و تشریحات نبوی لفظاً اپنے الگ وجود کی حامل ہوتے ہوئے بھی معنا کی طرح بھی قرآن سے زائد یا قرآن سے باہر نہیں ہیں اور اسی بنا پر کسی لحاظ سے بھی قرآن کی جامعیت کے منافی نہیں بلکہ فی الحقیقت قرآن کی جامعیت کا ثبوت ہیں۔

تعلیم و توضیح قرآن ہی کے ضمن میں وہ احکام بھی آتے
مقابلین میں تخصیص | ہیں بن کو قرآن دو مقابل حیثیتوں سے صادر کرتا

ہے اور کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ان متقابلین میں سے کسی ایک میں داخل و شامل سمجھی جائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کے بارے میں فیصلہ فرما دیتے ہیں کہ یہ چیز ان دو حکموں سے فلاں حکم کے تحت شمار ہوگی۔ مثلاً

(۱) قرآن نے طہیات کو حلال اور نجاست کو حرام قرار دیا ہے لیکن بعض ایسا ایسی ہیں جن کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ طہیات میں شامل ہیں یا نجاست میں مثلاً درندے اور شکاری پرند نیز خرگوش ناخن اور بیڑ وغیرہ کے متعلق قطعی طہ پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس قسم میں داخل ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ پہلی قسم طہیات میں اور دوسری قسم نجاست میں شامل ہے۔ آپ کے الفاظ ذی ناپ من السباع اور ذی مخالب من الطیر نے اس الجھن کو سلجھا دیا۔

(۲) قرآن نے مردار کو حرام اور ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے اب سوال یہ پیدا ہے کہ جو پچہ ذبیحہ کے پیٹ سے ذبح کرتے وقت مردہ حالت میں نکل آئے اس کو حلال سمجھا جائے کہ حرام۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمادیا کہ ”ماں کو ذبح کرنا اس کے بچے کو ذبح کرنا ہے“ یعنی ماں کو ذبح کرنے سے پیٹ میں موجود بچہ بھی ذبیحہ ہی کے حکم میں ہو جاتا ہے :

قیاسی ملحقہات کی تعیین | بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرآن کسی علت کی بنا پر ایک حکم صادر کرتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض دوسری جزئیات میں وہی علت پائے جانے کی بنا پر ان جزئیات کو بھی اُس حکم کے تحت درج کر دیتے ہیں :

(۱) قرآن نے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے اس حکم میں علت یہ تھی کہ اس وجہ سے ان میں قطع رحمی پیدا ہو جائے گی۔ دو بہنوں کے درمیان جو شرعاً صلہ رحمی واجب تھی اس کو نقصان پہنچتا تھا اس علت کو دیکھتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دوسرے ایسے رشتوں کو بھی اسی حکم میں درج فرما دیا جن میں یہی قطع

رحمی کا خطرہ موجود تھا مثلاً پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی ۔

(۲) قرآن نے بوا اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ عام رواج تھا کہ قرض کی مہلت بڑھا کر اصل رقم میں اضافہ کر دیا کرتے تھے۔ قرضخواہ کہتا کہ یا تو رقم ادا کر دو ورنہ رقم میں سود کو شامل کر لو۔ قرآن نے اس کو اس لیے حرام قرار دیا تھا کہ قرض کی رقم میں جو اضافہ کر دیا جاتا تھا وہ کسی چیز کے عوض میں نہیں ہوتا تھا وہ ایک قسم کا ناجائز منافع تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علت کے پیش نظر قرض میں ہر قسم کا ناجائز نفع حاصل کرنا منع فرما دیا مثلاً ایک شخص کسی کا مقروض ہے تو قرضخواہ کو یہ حق نہیں کہ وہ اس دباؤ میں مقروض کے مکان میں مفت رہا کرے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا ناجائز نفع ہے جو وہ اپنے قرض کے دباؤ میں بلا وجہ حاصل کر رہا ہے۔

بات کچھ طویل ہو گئی مگر تفہیم مقصود کے لیے یہ طوالت بھی ضروری تھی تاہم کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مجمل احکام کی تفصیلات ہوں یا مبہم آیات کی توضیحات، قرآنی مشکلات کی تہنیت ہوں یا قرآنی اشارات کی تشریحات، دو متقابل احکام کے درمیان تخصیصات ہوں یا قیاس کے طریقے پر تعین شدہ قرآنی آیات کے ملحقات ہوں یہ تمام تفصیلات تعلیم و ترویج قرآن میں داخل و شامل ہونے کی بنا پر قرآن سے باہر یا قرآن سے زائد کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ دراصل قرآن ہی کا ایک حصہ ہیں اور ہمیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن کی جامعیت احادیث رسول کے تسلیم کرنے سے مانع نہیں ہے بلکہ خود قرآن کی جامعیت ہی اس کی متقاضی ہے کہ اس کے اصولی احکام کی تفریعات اور اس کے کلی امور کی جزئیات بیان کی جائیں کیونکہ کسی کتاب کے جامع ہونے کا مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں منتشر اور مختلف جزئیات کے احکام کو اصول اور کلیات کی شکل میں جمع کر دیا گیا ہو۔

جامعیت قرآن کی مزید وضاحت | قرآن کی جامعیت کے اصل مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے امام شاطبی فرماتے ہیں :

قرآن کریم مختصر ہونے کے باوجود جامع کتاب ہے

القرآن علی اختصار جامع ولا

یكون جامعاً لاف الجمع فيه امور
کلیات۔ (الوافقات ج ۳ ص ۳۶۷)

اور یہ جامعیت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس میں
کلیات مذکور ہوں۔

کسی کلام کے جوامع الکلم ہونے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں ایسی کلیات مذکور ہوتی ہیں جو اپنی تمام ماتحت انواع و افراد کو پوری طرح حاوی ہوتی ہیں اس کے ساتھ ہی وہ ان افراد کے حکم پر بھی دلالت کرتی ہیں جو اس کے الفاظ کی قید سے خارج ہو گئے ہیں۔ تاہم جوامع الکلم کے الفاظ میں ایسی تنگی بھی نہیں ہوتی کہ مراد کے خلاف کچھ اور وہم پیدا ہونے لگے۔ اس کے علاوہ اس کے الفاظ اتنے مبہم بھی نہیں ہوتے کہ جو مراد ان کی بتلائی جائے وہ ان سے ظاہر نہ ہو۔ کلام کی جامعیت کا کمال اس میں ہے کہ اپنے تمام تر اختصار کے باوجود اس کے الفاظ اتنے صاف ہوں کہ جب ان کی تفصیل و تشریح کی جائے تو ہر تفصیل اور ہر تشریح پر وہ اس طرح صادق نظر آئیں گویا اسی کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ قرآن کے علاوہ کوئی بھی کلام جامعیت کے ان اوصاف پر پورا نہیں اترتا۔ قرآن کے علاوہ ہر کلام میں دو خامیوں میں سے ایک خامی ضرور نظر آتی ہے وہ اگر شان جامعیت میں ممتاز ہوگا تو اس میں اخلاق و ابہام کا عیب ضرور نظر آئے گا اور اگر واضح اور صاف ہوگا تو اس میں شان جامعیت مفقود ہوگی۔ ان دو متضاد صفتوں کا اجتماع آیات قرآنیہ ہی میں نظر آتا ہے البتہ بعض احادیث بنویہ بھی اس کی منظر ہیں۔

متن اور شرح کی نسبت | غرض قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اسے تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں ہے یا وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی معلم و مفسر کی ضرورت نہیں۔ اوپر جو تفصیلات تعلیم و توضیح قرآن کی ہم نے دی ہیں ان کو سامنے رکھ کر دیکھئے آپ لازماً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ قرآن اور حدیث میں متن اور شرح کی نسبت ہے پھر یہ متن شرح میں اور شرح متن میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا انفرادی انکار دوسرے کا اقرار و انکار میں جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں باہم ایک ایسا ریلہ ہے کہ قرآن کو تسلیم کر کے حدیث کا انکار ممکن نہیں اور حدیث کا انکار کر کے قرآن کو ماننے کی کوئی صورت نہیں بلکہ اگر آپ متن اور شرح کے درمیان جو نسبت اور

تعلق ہے اس پر غور کریں گے تو حدیث کی اہمیت فزوں سے فزوں تر نظر آئے گی۔ جس طرح متن شرح کا محتاج ہے اسی طرح قرآن کو حدیث کی ضرورت ہے۔ امام اوزاعی کا جو قول ہے :

<p>کتاب اللہ سنت کی طرٹ زیادہ محتاج ہے یہ نسبت سنت کے کتاب اللہ کی طرٹ۔</p>	<p>اَلْکِتَابُ اَحْوَجُ اِلَى السَّنَةِ مِنَ السَّنَةِ اِلَى الْکِتَابِ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹)</p>
---	--

تو اس کا یہی مطلب ہے کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو توضیح کا محتاج ہے۔ ہم قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ جاننے کے لیے اس ہستی کے یقیناً محتاج ہیں جو قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔ شیخ مطرف بن یثیر سے کسی شخص نے کہا کہ آپ ہم سے قرآن کے سوا اور کچھ مت بیان کیجئے آپ نے جواب دیا :

<p>ہذا کی قسم قرآن کے بدلے ہم بھی کوئی اور کتاب نہیں چاہتے لیکن ہم اس سے قطع نظر نہیں کر سکتے جو قرآن کا سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔</p>	<p>فَاللّٰهُ مَا نَزَّيْدُ بِالْقُرْآنِ بَدَلًا وَلٰكِنْ نَزَّيْدُ مَنْ هُوَ اَعْلَمُ بِالْقُرْآنِ۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹)</p>
--	--

مطلب یہی ہے کہ ہم قرآن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے بغیر سمجھنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ امام اوزاعی کے متذکرہ بالا قول کی مراد بیان کرتے ہوئے حافظ ابو عمر فرماتے ہیں :

<p>امام اوزاعی کا مطلب ہے کہ سنت قرآن کے لیے فیصل ہے اور اس کی مراد بیان کرتی ہے۔</p>	<p>يُرِيدُ اَنْهَا تَقْضَى عَلَيْهِ وَتَبَيَّنَ الْمُرَادُ مِنْهُ (المجلدات ج ۲ ص ۱۸)</p>
---	---

قرآنی احکام کے لیے فیصل | سنت قرآن کے مجملات کی تفصیل اس کے مبہمات کی توضیح اور اس کی مشکلات کی تیسیر کرتی ہے اور اس لحاظ سے قرآنی احکام کے لیے واقعی فیصل کے مقام پر ہے۔ حافظ ابو عمر نے امام اوزاعی کے قول کی جو مراد بیان کی ہے اس کی تائید خود امام اوزاعی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے حسان بن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ

كَانَ الْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَحْضُرُ
جِبْرِيلُ بِالسَّنَةِ الَّتِي تَفْسِّرُ
ذَلِكَ (الموافقات ج ۲ ص ۱۰۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اتر کر تھی تھی
اور پھر جبریل آپ کے پاس وہ سنت لے کر آتے
جو اس کی تفسیر کر دیتی تھی۔

امام اوزاعی کے اس قول کو کہ کتاب اللہ سنت کی زیادہ محتاج ہے منکرین حدیث اپنی کم فہمی
کی بنا پر نہ جانے کیا کیا معنی پہناتے ہیں۔ امام اوزاعی کے اس قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں
کہ اس طرح وہ سنت کو قرآن پر فوقیت دینا چاہتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے وہ یہ بات
کہہ کر قرآن کی جامعیت ثابت کرنا چاہتے ہیں تشریح کا محتاج وہی کلام ہوا کرتا ہے جو جامع
ہوتا ہے جیسا کہ ہم ابھی اوپر بتا چکے ہیں کہ جامع کلام اپنے تمام افراد و انواع کو حاوی ہوتا
ہے۔ اب ظاہر ہے ان افراد و انواع کا علم حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے گی جو چیز
بھی اس ضرورت کو پورا کرے گی ہم کہیں گے کہ وہ جامع کلام اس چیز کا محتاج ہے۔ اس
کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ احتیاج کلام کے نفس مضمون کے اعتبار سے
نہیں بلکہ کلام کے مخا طبین کے اعتبار سے ہوتی ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن
سنت کا محتاج ہے تو دراصل ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے مخا طبین قرآن کو سمجھنے کے
لیے سنت کے محتاج ہیں۔

امام شاطبی امام اوزاعی کے قول کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

لِأَنَّ الْكِتَابَ يَكُونُ مُحْتَمَلًا لِأَصْرِهِ
فَاكْثَرُ نَفَائِ السَّنَةِ يُتَعَيَّنُ أَحَدُهَا
فَيُوجَعُ الْخَطُّ السَّنَةِ وَيُتَوَكَّلُ
مُقْتَضًى الْكِتَابِ -
(الموافقات ج ۱ - ص ۱۰۸)

قرآن کی عبارت میں کبھی دو باتوں کا اور کبھی اس سے
بھی زیادہ کا احتمال ہوتا ہے حدیث اگر ان میں سے
ایک احتمال کو متعین کر دیتی ہے پس سنت کی طرف
رجوع کیا جاتا ہے اور قرآن کے دوسرے احتمال
کو ترک کر دیا جاتا ہے۔

یعنی جب سنت کتاب اللہ کی مراد متعین کر دے تو پھر کتاب اللہ کے اجمال اور لفظی احتمالات
پر عمل نہ کیا جلتے کمال کے طور پر قرآن نے کہا والسا راق والسا راقۃ فاقطعوا

اُیْتِدَیْھُمْ (اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ المائدہ: ۳۸) مگر یہ نہیں بتلایا کہ ہاتھ کاٹنے کی یہ سزا کتنا مال چراتے پر ہے نیز اس کی بھی کوئی تفصیل نہیں کی کہ سزا دینی ہو تو ہاتھ کس قدر کاٹا جائے۔ اب قرآن کے اس حکم میں کئی احتمالات ہیں ممکن ہے ہاتھ کاٹنے کی سزا صرف اس وقت دی جاسکتی ہو جب خاصی کثیر مقدار میں کوئی مال چور کیا جائے مگر ساتھ ہی یہ بھی احتمال ہے کہ ہر چوری پر ہاتھ کاٹ دیا جائے خواہ چھوٹی چوری ہو خواہ بڑی۔ اسی طرح سزا کی کیفیت میں بھی ہو سکتا ہے کہ ہاتھ بالکل جڑ سے یعنی مونڈھے کے قریب سے ہی کاٹ دینے کا حکم دیا گیا ہو یا ممکن ہے کہ کئی سے کاٹنا مراد ہو اور یہ بھی امکان ہے کہ صرف پہونچے پر سے کاٹنے کے لیے کہا گیا ہو۔ سنت نے ان تمام احتمالات کو صاف کر کے بتلادیا کہ جس مال کی چوری پر ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے اس کی مقدار کم از کم دس درہم کے برابر ہونی چاہیے نیز ضروری ہے کہ وہ مال محفوظ بھی ہو تاکہ اس پر چوری کا لفظ صادق آسکے۔ اسی طرح سزا کی کیفیت و مقدار کے بارے میں بتایا کہ جب ہاتھ کاٹا جائے تو پہونچے پر سے کاٹا جائے۔ اب غور کیجئے قرآن نے ایک حکم دیا جس میں کئی احتمالات تھے سنت نے ایک احتمال متعین کر دیا اب اس تعین کے بعد اس قرآنی حکم کے دوسرے احتمالات کو ترک کر دیا جائے گا اور سنت کے متعین کردہ احتمال کو قول فیصل کے طور پر قبول کر لیا جائے گا۔

یہی بات ہے جس کو حافظ ابن عبد البر نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے

<p>السنة قاضية على الكتاب۔ (جامع بیان العلم)</p>	<p>سنت کتاب کے (احکام کے) بارے میں فیصلہ کرنے والی ہے۔</p>
--	--

اس کا مطلب معاذ اللہ یہ تو نہیں ہے کہ سنت کتاب اللہ کے احکام کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے والی ہے بلکہ قاضی علی الکتاب کا مطلب یہی ہے کہ سنت قرآن کی اصل مراد کے بارے میں قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ اوپر کی مثال میں ہم نے دیکھا کہ چوری کی سزا کے حکم میں سنت نے اگر فیصلہ کیا کہ قرآن کی اصل مراد کیا ہے۔

غرض قرآن اور حدیث میں متن اور شرح کی نسبت ہے اور اس حیثیت سے حدیث قرآن کی جامعیت کے منافی نہیں اس کی مؤید ہے۔ بقول امام شاطبی

فكان السنة بمنزلة التفسير والشرح لمعاني احكام الكتب (الموافقات ج ۱ ص ۱۷)	گو یا سنت کتاب اللہ کے احکام کے لیے بمنزلہ تفسیر اور شرح کے ہے۔
---	--

حدیث کی مستقل حیثیت

رہی وہ احادیث جو بظاہر ایسے احکام پر دلالت کرتی نظر آتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے اور نفیاً یا اثباتاً کسی طرح بھی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ مثلاً وہ احادیث جن میں شفعہ کے احکام مذکور ہیں یا وہ احادیث جن سے فتادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ کو جلاوطن کرنے کا حکم ہے یا اسی طرح دادی کی وراثت کے حکم پر مشتمل حدیث تو ان احادیث کو ہم قرآن کی تفسیر اور شرح کیونکر کہیں گے اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسی احادیث سے جن احکام کا اثبات ہوتا ہے وہ اگرچہ صراحتاً و عبارتاً قرآن میں مذکور نہیں ہوتے تاہم وہ کسی نہ کسی طرح نصوص قرآن ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ کسی صحیح حدیث سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں ہوتا جو قرآن میں وارد نہ ہو وہ کسی نہ کسی نص یا تاعد سے کے تحت ضرور داخل ہوتا ہے امام شاطبی فرماتے ہیں :

ليس في السنة الا ما اصله القرآن (الموافقات ج ۲ ص ۲۷)	حدیث میں کوئی حکم ایسا نہیں جس کی اصل قرآن میں نہ ہو۔
---	--

اس کے علاوہ قرآن نے ایک کلی اصول بتلا دیا ہے کہ

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمُ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر - ۷)	جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کر دے اس سے رک جاؤ۔
---	---

اس آیت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کوئی الحقیقت قانون خداوندی کا ایک حصہ بنا دیا ہے اب آپ جس کام کے بھی کرنے کا حکم دیں گے یا جس کام سے بھی روکینگے

نوادہ اس کی اصل قرآن میں صراحتاً ہو خواہ مخفی ہر حالت میں رہ اس آیت کے تحت داخل ہو کر قرآن ہی کا حکم بن جائے گا۔

اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جسم گدوانے والی عورتوں پر لعنت بھیجنے کو قرآنی حکم سے تعبیر کیا تھا۔ ایک مرتبہ قبیلہ بھی ماسو کی ایک عورت حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آئی اور کہنے لگی اے ابو عبد الرحمن! میں نے سنا ہے آپ ان عورتوں پر لعنت بھیجتے ہیں جو اپنے اعضا کو گود کران میں زنگ بھرداتی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب میں فرمایا ہاں! میں اس پر لعنت کیوں نہ بھیجوں جس پر اللہ اور اس کے رسول نے لعنت کی ہو اور جو خود قرآن میں بھی مذکور ہو، اس عورت نے کہا قرآن تو از ادل تا آخر میں نے بھی پڑھا ہے مگر یہ بات تو قرآن میں مجھے کہیں نہیں ملی آپ نے فرمایا اگر تو قرآن کو کچھ کرٹھکتی تو مجھے اس میں یقیناً یہ بات مل جاتی کیا قرآن میں یہ آیت نہیں ہے وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس آیت کا حوالہ دے کر قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم گویا واضح کر دیا (الموافقات ج ۴ - ص ۲۷)

اسی طرح حضرت عبدالرحمن بن یزیدؓ نے ایک شخص کو حالت احرام میں سلے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا تو اسے منع فرمایا اس نے کہا قرآن کی کسی آیت میں حکم دھلائیے آپ نے جواب میں یہی آیت تلاوت فرمادی۔

اس قسم کے تمام آثار اسی حقیقت کا پتہ دے رہے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم قابل اتباع ہے اس لیے کہ آپ کا کوئی حکم قرآن سے باہر نہیں ہے آپ کے ہر حکم کی اصل قرآن میں موجود ہے اور یہی قرآن کی جامعیت کا منہ بوتا ثبوت ہے۔ قرآن کی جامعیت کے مفہوم میں یہ توسع خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے بھی ثابت ہے۔ ایک بار ایک دیہاتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے لڑکے نے زنا کر لیا ہے میں نے اس کی سزا کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا تو کچھ لوگوں نے مجھے بتلایا کہ اسے رجم کر دینا چاہیے میں نے اس کے

بدلے میں سو بکریاں اور ایک باندی ادا کر دی اس کے بعد کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے لڑکے کے لیے تو سو کوڑے اور سال بھر جلا وطنی کی سزا ہے آپ نے یہ سن کر فرمایا لَا قَاضِيْنَ بَيْنَكُمْ اِلَّا اللّٰهُ (میں کتاب اللہ کے مطابق تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا) پھر اس کے بعد فرمایا کہ تیری باندی اور بکریاں تجھے واپس ہیں اور تیرے لڑکے پر سو کوڑے اور سال بھر جلا وطنی کی سزا۔ اس کے ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت انیس کو حکم دیا کہ تم اس عورت کے پاس جاؤ جس سے یہ زنا کا فعل منسوب کرتا ہے اگر وہ اقرار کر لے تو اسے رہنم کر دو انیس گئے اس نے اقرار کر لیا اور رجم کر دی گئی۔

(بخاری ترجمان السنہ)

اس واقعے میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلے کو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ قرار دیا ہے حالانکہ کتاب اللہ میں رجم اور جلا وطنی کی سزا کیس مذکور نہیں اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قرآن کی جامعیت کا مفہوم کیا تھا :

قرآن کی جامعیت اور اسوہ رسول | قرآن کی جامعیت کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ قرآن صرف ایک علمی کتاب ہی نہیں ہے بنی نوع انسانی کے لیے ایک دستور العمل بھی ہے گویا قرآن کی دو حیثیتیں ہیں ایک علمی دوسری علمی۔ علمی حیثیت سے قرآن کو سمجھنے کے لیے اگر ہمیں ایک معلم کی تعلیم کی ضرورت ہے تو علمی حیثیت سے قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں ایک ہادی کے نقشہ عمل کی بھی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کی جامعیت کے تقاضے کے تحت ہم تعلیم نبوی کے ساتھ ساتھ اسوہ نبوی کے بھی محتاج ہیں۔ دینی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو اول تو عملی مشق کے بغیر سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو جب تک کوئی عملی نمونہ سامنے نہ ہو ان کو عمل میں لانا ممکن نہیں ہوتا مثلاً طب اور ٹی کمپری ہی کا علم ہے اس علم میں ہمارے حاصل کرنے کے لیے صرف کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ عملی تجربہ اس کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا ہے اسی طرح انجینئرنگ کا فن ہے یا دیگر سائنسی علوم

ہیں ان کا صرف پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے اور ان علوم میں پوری مہارت حاصل کرنے کے لیے قطعاً نا کافی ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے قرآن صرف ایک علمی کتاب ہی نہیں عملی ہدایت نامہ بھی ہے اس کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسے نقشہ عمل کی بھی ضرورت ہے جس کو دیکھ دیکھ کر ہم قرآن کے عملی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ یہ نقشہ عمل ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی صورت میں عطا فرمایا گیا ہے۔

<p>تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک عمدہ نمونہ تقلید ہے۔</p>	<p>لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ - (احزاب - ۲۱) -</p>
---	---

اور قرآن چونکہ ایک جامع کتاب تھی اس لیے اس کے نقشہ عمل کو بھی تمام نقشوں میں جامع تر بنایا گیا۔ قرآن کے ہر چھوٹے بڑے عمل کی ایک مکمل تصویر اس نقشہ میں مہیا کر دی گئی قرآن کریم میں اگر نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے احکام مذکور تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں ان عبادات کا مکمل نقشہ ہم پہنچایا گیا۔ قرآن اگر امارت و امت غزوات و جہاد، نظم و نسق اور فصل خصومات سے متعلق ہدایات کا حامل تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو ان ہدایات کی مکمل تفصیلات کا آئینہ بنایا گیا۔ قرآن نے ازدواجی زندگی، باہمی معاملات اور جنگ و صلح کی تدابیر جیسے مسائل کی نشاندہی کرنا انسانیت کی تکمیل کے لیے اگر ضروری سمجھا تو ان مسائل کی نزاکتوں کے تمام رنگ اس نقشے میں ایک ایک کر کے بھرے گئے حتیٰ کہ قرآن نے انسان کو صحیح انسانی زندگی گزارنے کا ایک بنیادی لائحہ عمل عطا کیا تھا تو اس کے عملی نقشے میں انسانی زندگی کے مولیٰ مولیٰ گوشوں مثلاً بول و براز، طعام و شراب، رفتار و رفتار خند و گریہ اور نوم و بیداری وغیرہ تک کے خطوط واضح کیے گئے۔ غرض قرآن جامع تھا اسی لیے اس کے عملی نقشے کو بھی انتہائی جامع بنایا گیا جو کچھ قرآن میں اصولی اور کلی طور پر کہا گیا تھا وہ سب تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ اس نقشے میں دکھلا دی گئیں۔ حضرت عائشہؓ نے اسی حقیقت کی نشاندہی کی تھی جب کسی شخص نے ان سے سوال کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے تو آپ نے فرمایا

كَانَ خَلْقَهُ الْقُرْآن (قرآن ہی آپ کا خلق تھا) خلق میں اقوال اور افعال سب داخل ہیں مطلب یہ تھا کہ آپ کا کوئی قول اور کوئی فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اسے کسی تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں یا وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی معلم و مفسر کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا مفہوم جیسا کہ ہماری امت تک کی گفتگو سے واضح ہو چکا ہے مختصراً یہ ہے کہ قرآن خدا شناسی اور آدابِ عبادت کے تمام اصولوں پر مادی ہے اس نے انسانی زندگی سے متعلق تمام اصول ایسے جامع اور سادہ الفاظ میں بیان کیے ہیں کہ دنیا کے مختلف مذاہب کی مختلف ضروریات میں سے کبھی کوئی ضرورت ایسی پیش نہیں آ سکتی جس کے متعلق قرآن کریم کے ان الفاظ میں بوجہ ردِ شنی نہ ملے۔ قرآن جامع ہے اس معنی میں کہ اس نے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق تمام کلیات کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ قرآن جامع ہے ایسے کہ وہ ماضی کی خبروں، مستقبل کی اطلاعی اور حال کے احکام کا احاطہ کیے ہوتے ہے۔ قرآن جامع ہے اس لحاظ سے کہ وہ سیاست، معیشت اور معاشرت کے مسائل کے لیے ایک مکمل آئین کی حیثیت کا حامل ہے اور قرآن جامع ہے اس طور پر کہ اس کے ایک ایک لفظ میں حقائق و معارف کے دریا پوشیدہ ہیں جن پر اطلاع پانے کے لیے ہم حدیث رسول کے محتاج ہیں۔



حدیث کی تشریحی حیثیت

احادیث کی تین قسمیں | علماء اس بات پر متفق ہیں کہ احادیث بنویہ کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اول وہ احادیث جو قرآنی احکام کی مؤید اور اجمال و تفصیل میں ان کے موافق ہیں ہوتا یہ ہے کہ قرآن کریم میں پہلے سے کوئی حکم موجود ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مزید تائید و حمایت فرمادیتے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی فرضیت کے احکام قرآن میں پہلے سے موجود تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر ان احکام کی مزید تائید و توثیق فرمادی کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا بیع کرنا۔

(۲) دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہیں جن سے قرآن کے مطلق احکام کی تفسیر، محلات کی تفصیل اور عام احکام کی تخصیص ہوتی ہے۔ اسی قسم میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جو مبہمات قرآنی کی توضیح، اس کی مشکلات کی تیسیر اور اس کے اشارات کی تشریح کرنے والی ہیں۔ اس قسم کی احادیث کی مثالیں ”ہم قرآن کی جامعیت کے عنوان کے تحت ابھی بیان کر چکے ہیں۔

(۳) تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جو ایسے احکام پر دلالت کرتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے اور نفیاً یا اثباتاً کسی طرح بھی ان کا ذکر نہیں کرتا مثلاً وہ احادیث جن میں مذکور ہے کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں کیا جاسکتا۔ یا وہ احادیث جن میں شفیعہ کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ اسی طرح وہ احادیث جن میں شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ زانی کو جلاوطن کرنے کے حکم یا دادی کی نشت کے حکم اور اسی قسم کے دیگر احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

احادیث بنویہ کی یہ تقسیم محض نفسِ مضمون کے اعتبار سے ہے ورنہ جہاں تک حدیث کے تشریحی مقام کا تعلق ہے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حدیث کی یہ تینوں قسمیں دین میں برابر کی حیثیت سے حجت ہیں اگرچہ حدیث کی تیسری قسم بعض علماء کے نزدیک اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے راجح الی الکتاب ہو کر حجت ہے جبکہ بعض علماء اسے ایک الگ مستقل ماخذِ تشریح قرار دے کر حجت مانتے ہیں ظاہر ہے یہ محض لفظی نزاع ہے۔ ورنہ اپنے ثبوت کے اعتبار سے دونوں فریق کے نزدیک احادیث کی تیسری قسم بھی اسی طرح حجت ہے جس طرح اول الذکر درج ہیں۔

مگر اللہ ہدایت دے منکرین حدیث کو وہ حدیث کی ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کو بھی دین میں حجت ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ حدیث کی آخری دو قسمیں تو ان کے نزدیک قابلِ اعتناء ہی نہیں پہلی قسم کی احادیث کے بارے میں بھی وہ اپنا معروف گوگو کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں بنیادی طوہر نہ تو وہ اس قسم کی احادیث کو جو قرآن کی مؤید ہیں تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ان احادیث کا انکار بلا واسطہ اور بالکل بدیہی طوہر پر قرآن کا انکار بن جاتا ہے مگر جب احادیث کے فیخر سے کو مشکوک اور ناقابلِ اعتماد قرار دینے پر اترتے ہیں تو ہر قسم کی احادیث کو پیٹھتے لیے چلے جاتے ہیں اور اس طرح قرآن کی مؤید احادیث بھی خود بخود حجیت کے خانے سے خارج ہو جاتی ہیں۔

اگر یہ کہہ کر تو وہ حدیث کی حجیت کا خواہ اس کا تعلق مذکورہ تینوں قسموں میں سے کسی بھی قسم سے ہو جھگڑا ہی چکا دیتے ہیں کہ رسول کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کا کلام سنا دے قرآن سنا کر رسالت کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ رسالت کا حق ہم پر صرف یہ ہے کہ جو قرآن رسول نے پڑھ کر ہمیں سنایا ہے اس کو ہم رسول کے اعتماد پر اللہ کا کلام تسلیم کر لیں اس کے بعد رسول اور ہم برابر ہیں جس طرح ان کے پاس عقل ہے ہمارے پاس بھی ہے جس طرح وہ قرآن سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ لیتے ہیں۔ دین کے معاملات میں رسول کی رائے کا بھی وہی وزن ہے جو ہماری رائے کا۔ مختصر یہ کہ قرآن سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں رسول کی رہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں۔

العیاذ باللہ نقل کفر کفر نباشد ۔

اب اس کے بعد حدیث کی کونسی قسم ایسی رہ گئی جو منکرین حدیث کے نزدیک قابل حجت سمجھی جاتی ہو۔ پہلے منکرین حدیث کو ان کے حال پر چھوڑتے ہیں اور اب اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ یہ تینوں قسم کی احادیث ماخذین ہونے کی حیثیت سے کبس مقام پر ہیں :

مؤید قرآن احادیث کی حجیت | جہاں تک پہلی قسم کی احادیث کا تعلق ہے وہ قرآنی احکام کی مؤید اور اجمال و تفصیل میں

ان کے موافق و مطابق ہونے کے لحاظ سے عین قرآن ہیں اس لیے ان احادیث کو تو ماخذ دین ماننے بغیر چارہ نہیں جو ان کو ماخذ دین نہیں مانتا وہ دراصل قرآن ہی کو ماخذ دین تسلیم نہیں کرتا اور جو قرآن کو دین کی بنیاد نہیں مانتا وہ اس وقت ہمارا مخاطب ہی نہیں :

موضح قرآن احادیث کی حجیت | یہی دوسری قسم کی احادیث جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہیں اور قرآن کا بیان ہونے کی حیثیت کی

حامل ہیں ان کی حجیت و عدم حجیت پر گفتگو کرنے سے پہلے دراصل اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ کیا ہم بھی قرآن کی مرادات صحیح صحیح متعین کرنے کی اہلیت سے اسی طرح بہرہ ور ہیں جس طرح ایک رسول یا نبی ہوتا ہے کیونکہ دعویٰ عدم حجیت کا اصل معنی فی الحقیقت یہی ہے کہ قرآن نہی کے لیے رسول کی رہنمائی کی ضرورت ہی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

مرادات قرآنی کا صحیح تعین اور ہم | کیا کوئی شخص اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کریم اپنی ذات میں ایک مجزہ ہے

اور اس کی پیدا بخاری شان صرف الفاظ ہی کے لحاظ سے نہیں معانی کے لحاظ سے بھی ہے نہ الفاظ کی ترکیب و ترتیب اور انداز بیان ہی میں مخلوق کے ہاتھوں اس کا مثل لایا جانا ممکن ہے اور نہ ہدایت و احکام کی جامعیت ہی کے لحاظ سے اس کی نظیر کا بنا لیا جانا مخلوق کے قبضہ قدرت میں ہے چنانچہ قرآن کے بار بار چیلنجوں کے باوجود دنیا آج تک قرآن کی ایک چھوٹی سے چھوٹی آیت کی مثل نہ لاسکی الفاظ کی طرح ہی قرآن کی معنوی دستوں

نے بھی دنیا کو عاجز کر کے رکھ دیا قرآن جیسی جامع علوم و معارف کوئی کتاب یا اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جزو جیسا کوئی جزو چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی تیار نہ کیا جاسکا۔ ذرا سوچ کر بتائیے ایسا کیوں ہوا۔ جن والنس مل کر بھی قرآن جیسا کوئی کلام کیوں نہ بنا سکے اس کا جواب لازماً آپ ہی دیں گے کہ ان کے ذہن و ذکا اور ان کی فہم و عقل میں وہ ہمرگیری اور لامحدودیت نہیں ہے جو ایسے اعجازی کلام کے لیے درکار ہے۔ بس آپ کے اسی جواب میں ہماری مراد بھی مضمر ہے اسی تنگی فہم، محدودیت ذہن اور اسی قلتِ علم کی بنا پر جن والنس اس قابل بھی نہیں ہیں کہ وہ قرآن جیسے وسیع و عمیق معجزانہ کلام کے تمام مشمولات کو بلا کسی ایسی رہنمائی کے جو صاحب کلام ہی کی جانب سے ہوا نہ خود سمجھ سکیں۔ صاحب کلام کی طرف سے یہ رہنمائی نبوت کی صورت میں مہیا کی گئی قرآن کے الفاظ میں سموئے ہوئے لاتعداد معارف اور قرآنی کلمات میں چھپے ہوئے بے شمار علوم کا ادراک نبوت و رسالت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نبی بھی بھیجا جو وحی الہی ہی کی روشنی میں قرآنی علوم و معارف اللہ کے بندوں کو سمجھا سکے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اسی طرح اس کی صفات بھی لامحدود ہیں اور انہی لامحدود صفات میں سے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت صفت کلام بھی ہے اس صفت کا بھی دوسری صفات الہیہ کی طرح لامحدود ہونا لازمی ہے دوسری طرف انسان اپنے ظاہر و باطن، جسم و روح، قلب و دماغ، فکر و فہم اور عقل و فراست غرض ہر لحاظ سے محدود اور متناہی ہے بھلا اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی اس محدودیت کے ساتھ ایک لامحدود و لا متناہی ذات سے صادر ہونے والے ایسے کلام کو جو لامحدود المعارف ہے محض اپنے طویل و پریم سمجھ سکے اس کے لیے تو کسی ایسی ہی ہستی کی ضرورت ہے جو ایک لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی لامحدود ذات سے قریب تر ہو اور ایک لحاظ سے بندوں میں شامل رہے۔ اسی ہستی کو ہم نبی کہہ کر پکارتے ہیں اسی ہستی نے لامحدود ذات حق کو پہچان کر اس کے کلام کے

علوم و معارف پر اطلاع پائی اور پھر اسی کی زیر نگرانی عامہ خلافت کو وہ علوم و معارف سمجھائے اور سکھلائے بنی کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو ایک عام آدمی کے بس کی یہ بات ہی نہیں کہ وہ قرآنی علوم پر اطلاع پاسکے۔

قرآن ہمارے پاس ایسے علوم لے کر آیا ہے جو نسل انسانی کو آخری معراج تک پہنچانے کے ضامن ہیں، ہماری سیاست، میشت، معاشرت، اخلاق، دین، مذہب، عرض ہماری زندگی کا ہر گوشہ قرآن کی روشنی کا محتاج ہے ایسی صورت میں ذرا سوچئے تو سہی اگر قرآن کو عام انسانی فہم پر بھجھو دیا جاتا تو کیا ہوتا ہر شخص اپنی افتاد طبع اپنے علم، اپنے نظریات اور اپنے حالات کے مطابق قرآن کی شرح بیان کرتا اور ہر کوئی یہ اصرار کرتا کہ قرآن کی جو مرادات میں نے متعین کی ہیں وہی درست ہیں اپنی کومانو اور اپنی پرمعلیٰ کرد۔ ہر شخص کا یہ دعویٰ ظاہر ہے بلا دلیل ہوتا اور ہمارے پاس کوئی معیار نہ ہوتا جس پر پرکھ کر ہم کہہ سکتے کہ نلاں نے قرآن کی صحیح مراد کہا لیا اور نلاں اس کو بایلیتے میں ناکام رہا۔ کتاب اللہ محض راستے زنی اور دماغی مشافی کا میدان بن کر رہ جاتی اور حقیقت کا سراغ لگنا ناممکن ہو جاتا۔ اللہ کا دین جیسا کہ کتاب اللہ کے نزول سے پہلے مجہول تھا نزول کے بعد اس سے زیادہ مجہول بن جاتا اور قرآن کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ظاہر بات ہے جو کتاب خالصتاً عمل کرنے کے لیے نازل ہوئی ہو وہ اگر محض دماغی کدو کا دش کا مشغلہ بن کر رہ جائے تو اس کے نازل کرنے کا جو اصل مقصد تھا وہ تو باق سے جاتا رہا ۛ

بیان قرآن کی ذمہ داری اور رسول | راستے زنی اور دماغی مشافی کا تختہ مستم بننے سے حفاظت ہی منظور تھی کہ کتاب اللہ

کے بیان کی ذمہ داری بطور خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی گئی۔ ارشاد ہوا

ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے تاکہ وہ (ہدایات) جو کئیے اتری ہیں آپ لوگوں پر خوب واضح کر دیں۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴)۔

اگر ہر انسان قرآن کے احکام کو حسب منشاء خداوندی سمجھنے پر تیار نہ رہتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان و تشریح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ ”لِلنَّاسِ“ کا لفظ بتلا رہا ہے کہ قرآن کے بیان کو ہر شخص سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس قصور کی وجہ سے ہی قرآنی احکام کی تشریح و توضیح کے لیے رسول بھیجا جاتا ہے اور اس کے ذمے یہ خدمت سپرد کی جاتی ہے کہ جو چیز لوگ خود نہیں سمجھ سکتے آپ ان کو سمجھا دیں۔

اب اگر احادیث کے اس ذخیرے کو آپ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو قرآن کے بیان پر مشتمل ہے تو آپ کے اس انکار کی بنیاد وہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ اس حکم کی خلاف ورزی کی کہ اللہ نے آپ کے ذمے قرآن کو بیان کر دینے کی جو ذمہ داری سونپی تھی اسے پورا نہ کیا یا پھر آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بیان کی ذمہ داری پوری تو کی تھی مگر جو کچھ آپ نے بیان کیا تھا وہ محفوظ نہیں رہا۔ دونوں صورتوں میں ذرا سوچ لیجئے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ پہلی صورت تو انتہائی خطرناک ہے اس کے کہنے سے پہلے اس کے مضمرات پر غور کر لیجئے جو شخص یہ کہنے کی جسارت کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی اسے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔ دوسری صورت بھی کچھ کم خطرناک مضمرات کی حامل نہیں ہے۔ دوسری صورت کا ماننے والا گویا مان رہا ہے کہ قرآن بحیثیت معنی و بیان محفوظ نہیں رہا اس کا صاف مطلب یہ نکلے گا کہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قرآنی احکام کی وضاحت تو کرادی مگر اس کی حفاظت نہ کی اور اس طرح معاذ اللہ خود اپنے وعدے کے خلاف کیا کہ ایک طرف وَإِنَّا لَمُخْلِطُونَ کا اعلان بھی کیا جاتا رہا اور دوسری طرف اسے ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا جو اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ (حفاظت کے موضوع پر تفصیلی گفتگو ہم ذیل نظر تحریر کے پہلے حصے میں کر چکے ہیں قارئین دوبارہ نظر ڈال لیں) بہر حال یہ دونوں صورتیں حدیث کے انکار کی نہیں قرآن اور رسالت کے انکار کی صورتیں بنتی ہیں۔

اس سے پہلے بھی ہم کہیں کہہ چکے ہیں کہ بیان قرآن کی ذمہ داری کا قرآن نے

جا بجا مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اب جو شخص بیان قرآن پر مشتمل احادیث کو نہیں مانتا وہ دراصل مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران اور سورۃ جمعہ کی ان متعدد آیات کا انکاری ہے جن میں قرآن کے بیان کو تعلیم کتاب کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد بتلایا گیا ہے۔

حیرت ہوتی ہے۔ اپنی عقل کے بل پر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والوں کو اتنی ہی بات بھی سمجھ کیوں نہیں آتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو درمیان سے علیحدہ کر دیا جائے تو قرآن کی صحیح مرادات تک پہنچنا ناممکن ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا ہی احسان فرمایا کہ اپنے کلام کی مرادات کی تلاش ہمارے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ہم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جس نے اس کلام کو پہلے خود صاحب کلام سے پڑھا اس کے مولیٰ و

۱۔ سورۃ بقرہ کی آیت ہے کَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) اور سورۃ آل عمران کی آیت ہے لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے) اسی طرح سورۃ جمعہ کی آیت ہے هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (وہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے - ۲)

مطالب کو خود صاحب کلام سے سمجھا اور پھر خود صاحب کلام ہی کی ہدایتِ خاص اور حفاظتِ خاص کے سایے میں اپنے امتیوں کو پڑھایا سمجھایا اُس کی اصل مرادات کو متعین کیا اور اس کے احکام پر عمل کر کے دکھلایا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس طرح ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یقیناً تا قیامت قرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے۔

اب بات صاف ہو گئی جب قرآن کی صحیح مرادات متعین کرنے کی ہم میں اہلیت ہی نہیں اور قرآن کو سمجھنا موقوف ہے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے پر تو حدیث کی ضرورت سے ہم بے نیاز کیسے ہو سکتے ہیں۔ حدیث کی یہ دوسری قسم جس کی حیثیت و عدم حیثیت اس وقت زیر بحث ہے ان کی حیثیت قرآن کے بیان ہی کی تو ہے قرآن اگر حجت ہے تو اس کا بیان حجت کیوں نہیں۔ جس کتاب کے متن کو ماخذین ہونے کی حیثیت حاصل ہے اس کتاب کی شرح کو ہم کس دلیل کے تحت ماخذین ملنے سے انکار کر سکتے ہیں اور شرح بھی وہ شرح کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری شرح ممکن ہی نہیں اس لیے کہ وہ شرح بھی اسی کی طرف سے ہے جس کی طرف سے متن ہے۔ جو ماقن ہے وہی خارج بھی ہے۔ کسی کلام کی جو شرح خود صاحب کلام متعین کر دے وہی درست اور اصل شرح ہے اس کے علاوہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ صاحب کلام کے اصل مقصود سے ہٹ کر اپنی طرف سے اس کلام کی شرح کرتا پھر اگر کرے گا تو کسی صاحب عقل کے نزدیک وہ شرح صاحب کلام کی شرح کے مقابلے میں کبھی قابل قبول نہ ہوگی۔

بیان قرآن بھی منزل من اللہ ہے | اور یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی جو مرادات

متعین فرمائیں وہ اپنی طرف سے نہیں فرمائیں بلکہ جس طرح قرآن منزل من اللہ تھا اسی طرح اس کی مرادات کا تعین بھی منزل من اللہ تھا۔ چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آیات قرآنی کو سامنے رکھ کر غور فرماتے ہوں کہ اس آیت کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے اور ایک یہ ان میں سے نلاں مطلب چونکہ اس آیت کے الفاظ پر زیادہ چسپاں ہے اس لیے یہی مراد خداوندی ہو گا۔ جس طرح قرآن کے الفاظ آپ پر وحی کیے جاتے

تھے اسی طرح اس کے معانی اور اس کی شرح بھی آپ کے قلب مبارک پر وحی کی جاتی تھی جس طرح قسّان کے الفاظ منزل من اللہ تھے اسی طرح اس کے محملات کی تفصیل اس کے مبہمات کی توضیح اور اس کی مشکلات کی تیسیر بھی منزل من اللہ تھی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون اور اپنا کلام خود ہی اتارنے کا ذمہ لیا کہ مخلوق اس قسم کا جامع اور اُٹلی قانون بنانے پر قادر نہ تھی اسی طرح اس کے شرح و بیان کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی لی کیونکہ مخلوق بلا بتائے اس قانون کی اصل مرادات کو از خود پالینے پر قادر نہ تھی چنانچہ اس حقیقت کا قرآن کریم میں واضح طور سے اعلان فرمایا گیا۔ ارشاد ہوا :

إِن عَلَيْنَا جَمْعَهُمْ وَقُرْآنَهُ ۖ فَإِذَا
قُرْآنَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ ثُمَّ إِنَّ
عَلَيْنَا بَيَانَهُ -

(القصۃ ۱۷ : ۱۹)

اس قرآن کا (آپ کے سینے میں) جمع کر دینا اور
آپ کی زبان سے اسے پڑھوانا ہمارے حق
ہے جب ہم اس قرآن کو پڑھیں تو آپ صرت
سننے رہیں پھر ہمارے ہی ذمے اس قرآن کا بیان
بھی ہے۔

ان آیات میں پہلے الفاظ قرآن کے بارے میں اطمینان دلایا گیا کہ ان کو بلا کم و کاست سینہ نبوت میں اتار دینا اور محفوظ کر دینا ہمارے ذمے ہے پھر الفاظ قرآنی کے معانی و بیان اور ان کی مرادات واضح کر دینے کے بارے میں تسلی دی کہ اس کا ذمہ بھی ہم نے ہی لیا ہوا ہے ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ یعنی پھر اس قرآن کا بیان بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔ اب بتلائیے بیان قسّان کے منزل من اللہ ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح الفاظ قرآنی کے صرف نقل کرنے والے ہیں اسی طرح معانی قرآنی کے بھی صرف ناقل ہی ہیں۔ نہ قرآن کے الفاظ آپ کے اپنے ہیں نہ ان الفاظ کے معانی آپ نے اپنی طرف سے متعین کر لیے۔ الفاظ کا نزول بھی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوا اور معانی و مطالب کی تعیین بھی اللہ تعالیٰ ہی نے فرمائی۔ جب یہ بات ہے تو پھر اس طرز عمل کا کیا جواز ہے کہ دو چیزیں جو منزل من اللہ ہیں ان میں سے ایک کو تو دین میں حجت تسلیم کیا جائے مگر دوسری کی حجیت سے انکار کر دیا جائے۔ حجت

ماننا ہے تو دونوں کو ماننا پڑے گا ورنہ پھر دونوں کا انکار کیسے بغیر چارہ نہیں درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

یہاں یہ کتنا کسی طرح درست نہیں کہ ثمرہ اِنّ عَلَيْنَا بَيَانٌ میں بیان سے مراد الفاظ قرآنی کو سنا دینا ہے اس لیے کہ الفاظ کے سنا دینے کو بیان نہیں کہنے قرأت کہتے ہیں جس کی ذمہ داری اِنّ عَلَيْنَا جمعہ و قرآنہ کہہ کر پہلے ہی علیحدہ بیان فرمادی گئی بیان تو کسی پوشیدہ بات کو کھول دینے یا کسی غیر معلوم بات کو علم میں لے آنے کا نام ہے۔ بیان کے لفظ کو اگر الفاظ سنا دینے کے معنی میں لیا جائے تو اس کا ذکر ہی بیکار ٹھہرتا ہے اس لیے کہ الفاظ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں پہلے سے موجود ہیں جیسا کہ سابقہ آیات میں بتلادیا گیا ہے اس کے بعد الفاظ کے معانی و مطالب ہی ہیں جو الفاظ سن لینے کے بعد بھی مخفی رہ سکتے ہیں۔ معلوم ہوا بیان کا لفظ معانی و مطالب ہی کے لیے لایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اس پر بھی تو غور کیجئے کہ یہ قرأت اور بیان کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنا پھر دونوں کے لیے الگ الگ عَلَيْنَا لاکر اپنی ذمہ داری کا اعلان کرنا اور پھر دونوں کے درمیان فصل کے لیے ثَمَّ کا لانا کلام کا یہ انداز اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ الفاظ قرآن کی ذمہ داری اور بیان قرآن کی ذمہ داری دونوں جدا جدا حیثیت کی حامل ہیں ایک ذمہ داری کا دوسری سے کوئی تعلق نہیں اگر یہ بات نہ ہو تو ان دو آیتوں کے درمیان فصل بھی بلا ضرورت قرار پائے گا عَلَيْنَا کی نکرار بھی عبث ہوگی اور ثَمَّ کا لانا بھی بے کار ٹھہرے گا اور یہ کلام الہی میں محال ہے اس لیے لازماً ماننا پڑے گا کہ قرآن کی قرأت اور قرآن کا بیان دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں اور متذکرہ آیت کا ردی میں دونوں منزل من اللہ ہیں ۛ

بیان قرآن کے نزول کی صورت | اب رہا یہ سوال کہ قرآن کا بیان بھی اگر منزل من اللہ ہے تو اس کے نزول کی

صورت کیا تھی تو اس سلسلے میں اتنی بات تو واضح ہے کہ قرآن کے الفاظ اگر بذریعہ قرأت ہو چکے تھے تو قرآن کا بیان بذریعہ تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک

ہم اتفاق کیا گیا تھا چنانچہ ارشادِ ربانی ہے :

وَعَلَّمَ مَالِكُ نَكْنُ تَعْلَمُ (النار ۱۱۳) | اور ہم نے تم کو وہ باتیں تسلیم کیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

مگر اس تعلیم کے سینہ نبوی میں اتفاق کے جانے کی کیفیت کیا تھی اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں اس لیے کہ وہ سینہ نبوی میں خواہ کسی طرح بھی اتفاق گئی ہو اس نے لازماً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں پہنچ کر بالآخر کسی ملفوظ ہی کی شکل اختیار کی ہوگی۔ تعلیم کی یہ آخری شکل ہی قرآن کا بیان ہے اور اسی کا نام حدیثِ نبوی ہے۔

غرض متذکرہ بالا دوسری قسم کی احادیث کو بھی جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہیں اور قرآن کا بیان ہونے کی حیثیت کی حامل ہیں دین میں حجت مانے بغیر چارہ نہیں۔ جو شخص قرآن کا مانع دین ہونا تسلیم کر چکا ہے اس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ قرآن کے بیان کو بھی ماخذ دین کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ ایک کو مان کر دوسرے کے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مستقل تشریحی حیثیت کی حامل احادیث | اب آئیے تیسری قسم کی ان احادیث کی طرف جو بظاہر ایسے احکام پر

دلائل کرتی نظر آتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے۔ ان کے بارے میں جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم وضاحت کر چکے ہیں پہلی بات تو یہی ہے کہ یہ احادیث صرف ظاہرِ نظر میں ہی قرآن سے باہر نظر آتی ہیں ورنہ محققین کے نزدیک کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس کی اصل قرآن میں موجود نہ ہو کسی بھی صحیح حدیث سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں ہوتا جو کسی نہ کسی نص یا قاعدے کے تحت قرآن میں وارد نہ ہو۔ اس کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم خود قرآن ہی کی رو سے قانونِ خداوندی کا ایک حصہ ہے۔ قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ اپنے ماننے والوں کو ایک مستقل ہدایت کے طور پر یہ حکم سنا دیا ہے کہ

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لو اور جس سے
منع کر دے اس سے رک جاؤ۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا
نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر۔ ۷)

رسول کا حکم قرآن ہی کا حکم ہے | یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم بھی دیں وہ

قابل اطاعت ہے۔ گویا آپ انسانی زندگی کے جس مسئلے کے بارے میں جو حکم صادر فرمادیں گے وہ اس آیت کے تحت داخل ہو کر قرآن ہی کا حکم بن جائے گا اگرچہ اس کی اصل قرآن میں صراحتاً موجود نہ ہو۔ یہ آیت اگرچہ مالِ فے کی تعلیم کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے مگر چونکہ آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت صرف اموال کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احکام بھی اس میں داخل ہیں اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی حکم یا مال یا اور کوئی چیز آپ کسی کو عطا فرمادیں وہ اس کو لے لینا چاہیے اور اس کے مطابق عمل کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اسی طرح جس کام اور جس چیز سے آپ رک دیں اس سے رک جانا چاہیے۔ یوں بھی آتی کے بالمقابل نھی کا لفظ لانا اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں آتی دراصل امر کے معنی میں ہے جو نھی کا صحیح مقابل ہے صحابہ کرام نے اسی مفہوم کو اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کو اس آیت کی بنا پر قرآن ہی کا حکم قرار دیا ہے اس کی چند مثالیں ہم قرآن کی جامعیت کے عنوان کے تحت آثار صحابہ میں سے پیش کر چکے ہیں۔ امام شافعی کے بارے میں بھی منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا کہ تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن سے دے سکتا ہوں پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے ایک شخص نے عرض کیا کہ ایک محرم نے زینور (تنیّا) ما ملّا لہ اس کا کیا حکم ہے امام شافعی نے محولہ بالا آیت پڑھ کر حدیث سے اس کا حکم بیان فرمادیا۔

منکرین حدیث نے اس آیت کے شان نزول کو بنیاد بنا کر اپنی قرآن دانی کا ایک اور عجیب غریب ثبوت یہاں کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ مَا آتَاکُمْ... الخ کی آیت صرف

۱۔ تفسیر قرطبی

مال فئے کی تقسیم کے بارے میں ہے حدیث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بھئی کے بالمقابل رات ہونے کی بنا پر آتی کو اَصْر کے معنی میں لینا ان کے نزدیک محض ایک غلط فہمی ہے۔ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کی خاطر منکرین حدیث دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آتی کا لفظ قرآن میں بھال کہیں آیا ہے دینے ہی کے معنی میں آیا ہے اور حدیثیں اقوال ہیں اس لیے ان پر دینے کے لفظ کا اطلاق درست نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چیز دی ہے وہ قرآن ہے۔

منکرین حدیث کا یہ استدلال خود اپنے اندر ہی تضاد بیانی کا شکار ہے ایک طرف وہ اس آیت کو صرف مال فئے کی تقسیم کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ کہتے ہیں کہ آتا کہہ سے قرآن کا دینا مراد ہے حدیثوں کا نہیں کیونکہ وہ اقوال ہیں۔ اگر اس آیت کا تعلق صرف مال کے دینے نہ دینے سے ہے تو پھر قرآن یا حدیث کے دینے نہ دینے کا کیا ذکر۔ خود ہی ایک بات کہتے ہیں اور خود ہی اس کے خلاف دلیل قائم کرتے ہیں اس بوالعجبی کی آخر کیا توجہ کی جائے۔ کیا یہ تصور کیا جائے کہ بے چارے بات کہہ کر بھول جاتے ہیں لیکن اس پر لوگوں کی زبان پر بے ساختہ اگر یہ آگیا کہ دروغ گو را حافظہ باشد تو پھر کیا جواب ہوگا اور اگر بھول جانے والی بات نہیں ہے تو پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ آپ نے اپنے قول پر خود ہی ہماری طرف سے دلیل قائم کر دی۔ اتنی بات تو آپ نے خود ہی تسلیم کر لی کہ آتا کہہ کا لفظ قرآن دینے کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے گویا اس پر تو آپ ہم سے متفق ہیں کہ یہ آیت مال فئے کی تقسیم کے ساتھ ہی خاص نہیں دیگر معنی کو بھی شامل ہے اب ذرا یہ بتلائیے کہ آتا کہہ کا لفظ اگر قرآن دینے کے معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے تو حدیث دینے کے معنی میں کیوں نہیں ہو سکتا آپ کا کہنا یہ ہے کہ حدیثیں تو اقوال ہیں ان کو دیا نہیں جاتا بلکہ کہا جاتا ہے۔ تو کیوں صاحب کیا آپ کے نزدیک قرآن اقوال کا مجموعہ نہیں ہے اگر اقوال

الح علم حدیث اند (مولانا) محمد اسلم جراح پوری

کے اس مجموعے کو دیا جاسکتا ہے تو اقوال کے دوسرے مجموعے حدیث کو کیوں نہیں دیا جاسکتا کیا آپ نے قرآن کریم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ایسی ہی ایک جلد بندی بندھائی کتاب تصور کر لیا ہے جیسی ہمارے زمانے میں اب کتب خانوں میں دستیاب ہے یا پھر کہیں آپ یہ خیال تو جھٹکتے نہیں بیٹھے کہ قرآن بھی تورات کی طرح ایک کتاب کی صورت میں نازل ہوا تھا اگر ایسا نہیں ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی متفرق آیتیں متفرق اوقات میں نازل ہوتی تھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے سامنے ان آیتوں کو پڑھ کر ہی سنا تے تھے اس کے باوجود آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی آیات قرآنی پر اگر آتی کا لفظ بولا جاسکتا ہے تو اسی زبان مبارک سے نکلی ہوئی احادیث پر آتی کا لفظ کیوں نہیں بولا جاسکتا۔

اس کے علاوہ منکرین حدیث کا یہ کہنا بنیادی طور پر ہی غلط ہے کہ اقوال کے لیے آتی کا لفظ نہیں بولا جاتا اس لیے کہ خود قرآن نے اقوال کے لیے آتی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورہ ص میں ہے :

وَاتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ | اور ہم نے انہیں حکمت اور فیصلہ کرنے والی
الْخِطَابَ. (ص: ۲۰) | بات عطا کی تھی۔

خطاب کے معنی بات، قول اور تقریر کے ہیں اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد پر کیے گئے کچھ انعامات کا ذکر کیا ہے انہی میں سے ایک انعام یہ بھی تھا کہ آپ بڑے اور بچے درجے کے خطیب تھے ان کے زورِ بیان اور ان کی قوتِ خطابت کے اظہار کے لیے نفل الخطاب کا لفظ استعمال کیا گیا یعنی ایسی تقریر جو نہایت واضح اور جامع ہو۔ تقریر ظاہر ہے اقوال کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس کے لیے قرآن نے آتی کا لفظ استعمال کیا ہے :

مزید برآں آتی کا لفظ قرآن میں جا بجا ایسے معنی میں مستعمل ہوا ہے جو حدیث پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں۔ مثلاً متعدد جگہ آتی کا لفظ علم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورہ مجادلہ میں ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعِلْمُهُمْ رَحَاتٍ | اور ان کے جنہیں علم دیا گیا ہے درجات
(المجادلہ: ۱۱) | (بلند کرے گا)۔

اگر علم کے لیے آتی کا لفظ بولا جاسکتا ہے تو حدیث بھی ایک علم ہے۔ اسی طرح قرآن نے ایک جگہ حکمت کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے اور حدیث کے حکمت ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں اس لیے کہ خود قرآن نے حدیث کو حکمت سے تعبیر کیا ہے۔ اچھے مقام پر اس کی تفصیل آ رہی ہے۔ غرض قرآن میں حکمت کے لیے آتی کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ (لقمان-۱۲) | اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔
اسی طرح قرآن نے عقل و فہم کے لیے بھی آتی کا لفظ استعمال کیا چنانچہ سورہ مریم میں ہے۔
وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَ حَبِيبًا | اور ہم نے اس کو لڑکھن ہی میں عقل و فہم
(مریم: ۱۲) | دے دی تھی۔

بہر حال اگر علم کے لیے حکمت کے لیے اور عقل و فہم کے لیے آتی کا لفظ بولا جاسکتا ہے تو حدیث پر بھی بولا جاسکتا ہے جو یقیناً علم بھی ہے حکمت بھی ہے اور عقل و فہم کا سرچشمہ بھی ہے۔ مختصر یہ کہ ما آتاکم الرسول فخذوه وما نهيكم عنه فانتهوا کے الفاظ عام ہیں اور اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم اور جو چیز بھی تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔ بنا بریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم قابل اطاعت ہے آپ انسانی زندگی کے جس مسئلے کے بارے میں جو حکم صادر فرمادیں گے وہ اس آیت کے تحت داخل ہو کر قرآن ہی کا حکم بن جائے گا اور اس طرح وہ احادیث جو بظاہر ایسا حکام پر دلالت کرتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے اس آیت کی رو سے قرآن ہی کے احکام میں سے ایک حکم کی منظر و ثبت بن جائیں گی۔

اطاعت رسول کے وجوب کی مستقل حیثیت | علاوہ ازیں قرآن کریم کی متعدد آیات میں رسول کی اطاعت کو

مستقل حیثیت سے واجب قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً بیس جگہ اطاعت رسول کا

حکم ہے اور اکثر آیات ہیں اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت دونوں کا ذکر ایک ساتھ لگاس طرح علیحدہ علیحدہ کر کے بیان کیا ہے کہ دونوں اطاعتوں کی علیحدہ الگ مستقل حیثیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ النساء کی مشہور آیت ہے :

<p>يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النساء: ۵۹)</p>	<p>اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولو الامر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کئی بات میں نزاع ہو جائے تو اس کو پھر دوسلہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو</p>
--	---

اس آیت میں اطیعوا اللہ سے مراد قرآن ہے اور اطیعوا الرسول احادیث نبوی کا واجب طاعت ہونا ثابت کر رہا ہے اس آیت میں غور کرنے کی بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے امر کا صیغہ اطیعوا ہلکا بار دہرایا گیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کی طرح ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اپنی جگہ کوئی امتیازی منتقل حیثیت نہ رکھتی ہوتی تو اطیعوا کے لفظ کو دوبارہ لانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ جس طرح اولو الامر کی اطاعت کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ماتحت درج کیا گیا ہے اسی طرح رسول کی اطاعت کے لیے بھی جدا گانہ امر فرمانے کے بجائے اللہ کی اطاعت کے تحت درج کیا جاتا اور کہا جاتا اطیعوا اللہ والرسول واولی الامر منکم مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ وہ دو اطاعتیں جو مستقل حیثیت رکھتی تھیں ان کو علیحدہ علیحدہ مستقل حیثیت سے بیان کیا گیا اور تفسیری اطاعت جس کی حیثیت غیر مستقل تھی اس کو پہلی دو اطاعتوں کے تابع بنا کر بیان کیا گیا۔

مروج نزاع | اطاعت رسول کی مستقل حیثیت اور زیادہ واضح کرنے کے لیے اسی آیت میں یہ بھی بتلادیا گیا کہ اگر کسی معاملے میں کوئی نزاع برپا ہو جائے تو

فیصلے کے لیے آخری سند حضرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں
فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو

جائے تو اس کو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف پھیر دو) ظاہر ہے اگر اطاعت رسول کی مستقل حیثیت نہ ہوتی تو نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی اور صرف فِرْدَوْسِ اِلٰی اللہ کہا جاتا۔ یہ رسول کا صراحت کے ساتھ علیحدہ ذکر کرنا صاف بتلا رہا ہے کہ مرجع نزاع ہونے کے لحاظ سے رسول کی ذات بھی مستقل حیثیت کی حامل ہے یعنی نزاعات کے موقع پر رسول کا فیصلہ بھی حکم آخر ہوگا رسول سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ ہمیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اولوالامر کی ذات مورد نزاع بن سکتی ہے کیونکہ مرجع نزاع بتلاتے وقت اس کے ذکر کو حذف کر دیا گیا ہے اور تاریخ بھی اس پر تباہ ہے کہ خلفاء اوصیائہ کو اپنی اطاعت کے لیے قرآن و حدیث پیش کرنا پڑی ہیں بلکہ بعض مواقع پر انہیں اپنے قول سے رجوع بھی کرنا پڑا ہے اس کے مقابلے میں تاریخ میں ایسی مثال ایک بھی نہیں ملتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بعد صحابہ نے کبھی آپ سے اس پر دلیلی پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہو۔

معلوم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث واجب الاطاعت ہے خواہ اس کی اصل قرآن میں نہیں معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعض احادیث کی اصل قرآن میں موجود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا مکلف ہی نہیں بنایا کہ اس کی اصل کتاب اللہ میں تلاش کی جائے۔ ہم سے تو مطالبہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسول کی اطاعت اللہ ہی کا ایک حکم سمجھ کر کریں۔

اس سلسلے میں یہ بات البتہ خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے **اطاعتیں دو مگر مطاع ایک** کہ اللہ اور اس کے رسول کی علیحدہ علیحدہ دو اطاعتیں واجب ہونے کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ مطاع بھی دو بن گئے مطاع دراصل دونوں جگہ خدا ہی کی ذات رہتی ہے قرآن نے اس حقیقت کو بڑے واضح الفاظ میں بتلایا ہے ارشاد ربانی ہے :

جو رسول کی اطاعت کرے اسی نے اللہ کی اطاعت کی۔

مَنْ يَطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اطاعَ اللہ۔ (النار: ۸۰)۔

یعنی رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی اطاعت دراصل خدا ہی کی ہوگی اطاعت کے تعدد سے مطاع میں تحدید نہ سمجھنا چاہیے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رسول کا کوئی بھی حکم جس کی اطاعت کی جا رہی ہے اس لحاظ سے اگرچہ ایک مستقل حیثیت کا حامل ہے کہ قرآن میں اس تفصیل کے ساتھ مذکور نہیں جس تفصیل کا احاطہ بیان رسول نے کیا ہے تاہم اس اعتبار سے کہ یہ تمام تفصیل بعینہ قرآن ہی کی کسی اصل کی فرع ہے اس کی حیثیت مستقل ہونے کے بجائے قرآن ہی کے تابع ہو جاتی ہے۔ پہلی حیثیت کے لحاظ سے مطاع بظاہر رسول کی ذات نظر آتی ہے مگر فی الحقیقت دوسری حیثیت کے اعتبار سے مطاع خدا ہی کی ذات رہتی ہے۔ پس احادیث رسول پر عمل کرنے والا لحاظ بیان و تفصیل تو رسول کا مطیع کہلاتا ہے لیکن بلحاظ اصل و مراد خدا ہی کا مطیع ہوتا ہے گویا احادیث پر عمل کرنے والا دراصل قرآن ہی پر عمل کرنے والا رہتا ہے فرق ہے تو صرف اتنا کہ قرآن پر عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کے الفاظ پر عمل کرتا ہے اور حدیث پر عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کی مراد پر عمل کرتا ہے اس بنا پر اطاعتیں اگرچہ دو نظر آتی ہیں مگر مطاع دراصل ایک ہی رہتا ہے۔

منکرین حدیث کو دراصل سب سے بڑا مغالطہ یہی لگا ہے کہ وہ دواطاعتوں کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ مطاع بھی دو بن گئے۔ رسول کی اطاعت میں یہ سمجھنا کہ مطاع اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہوتی بڑی غلط فہمی ہے نیز قرآن سے نادافعی کی دلیل ہے۔ اسی غلط فہمی اور نادافعی کی بنا پر منکرین حدیث کو ہر اس آیت میں کھینچا تانی کرنا پڑی جس میں رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ مستقل حیثیت سے بیان کیا گیا تھا،

رسول کے لفظ سے قرآن مراد لینا

مثلاً محولہ بالا آیت ہی کے بارے میں کہا گیا کہ رسول سے مراد آیات الہیہ یعنی خود قرآن ہے

پیغمبر مراد نہیں ہے مگر یہ گمنا ظاہر ہے بالکل ہی بلا دلیل تھا۔ قرآن میں کہیں بھی رسول کا لفظ کتاب آیات الہیہ کے لئے نہیں آیا جہاں کہیں بھی آیا ہے پیغمبر کے لئے آیا ہے یا پھر فرشتے کے لئے آیا ہے۔ بلکہ ایسی آیات بھی متعدد موجود ہیں جن میں ایک ساتھ رسول کا بھی ذکر ہے اور آیات کا بھی ذکر ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ دو جدا جدا چیزیں ہیں وہ تمام آیات

حن میں تلاوت قرآن کو رسول کا منصب بتلایا گیا ہے اسکی ظہر میں پیش کی جاسکتی ہیں: اسکے علاوہ ذیل کی آیت تو اس باب میں اتنی صریح ہے کہ کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَإِذْ أُنزِلَ إِلَيْكَ الْكِتَابُ بِالْحَقِّ وَإِذْ أُنزِلَ إِلَيْكَ الْكِتَابُ بِالْحَقِّ
اللَّهُ وَ إِلَى التَّرْسُولِ رَأَيْتَ الْمُنْفِقِينَ
يَسْتَدْرِكُونَ عَنْكَ صِدْقًا (النار: ۶۱)

اس آیت میں ما انزل اللہ سے مراد قرآن ہے اس کا ذکر کرنے کے بعد رسول کا ذکر مستقل حیثیت سے کیا گیا ہے اور صاف بتلادیا گیا ہے کہ دین میں اعلیٰ مرجع دو ہیں۔ ایک قرآن اور دوسرا رسول۔ دونوں مستقل حیثیت سے واجب الطاعت ہیں ان دونوں سے منہ موڑنا منافق کا کام ہے نہ کہ مومن کا۔ گویا رسول کو مستقل حیثیت سے دین کا مرجع ماننا ملّا را ایمان ہے۔ اس آیت میں کسی طرح بھی رسول کو قرآن کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ کیا منکرین حدیث یہاں بھی رسول کو قرآن کے معنی میں لیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ قرآن میں بلا ضرورت تکرار لفظی سے کام لیا گیا ہے۔

بھلا کوئی پوچھے رسول سے مراد اگر قرآن ہے تو پھر اس آیت کے آپ کیا معنی بیان کریں گے لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّوْبَا بِالْحَقِّ (اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔ ۱۷) کیا آپ یہ کہیں گے کہ اللہ نے اپنی کتاب کا خواب سچا کر دکھایا۔ خواب انسان دیکھا کرتا ہے کتاب نہیں دیکھا کرتی۔ اسی طرح قرآن کتاب ہے یَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (اے رسول ہو نچادے جو تجھے پرنازل کیا گیا ہے۔ المائدہ۔ ۶۷) رسول کا مطلب اگر کتاب ہے تو ذرا سوچے کتاب پر بھی کبھی کچھ نازل کیا جاتا ہے؟

اطاعت کو موافقت کے معنی میں لینا | جب کی طرح بات بنتی نظر نہ آئی تو کہا گیا کہ اطیعوا الرسول میں دراصل اطاعت سے مراد

موافقت ہے مطلب ہے کہ اللہ کی اطاعت کرنے میں رسول کی موافقت اختیار کر دے یہ بات پہلے سے بھی زیادہ عجیب تھی اطاعت کے معنی اگر موافقت کے ہیں تو آیت میں دونوں جگہ ایک ہی معنی لینے چاہئیں اطیعوا اللہ کا بھی پھر ہی ترجمہ کرنا چاہیے کہ اللہ کی موافقت اختیار کر دے ایک ہی آیت میں ایک ہی لفظ کے دو معنی بیک وقت کیسے قبول کیے جاسکتے ہیں۔

اطاعت رسول کو اطاعت الہیہ کی تفسیر قرار دینا | جب یہ بات بھی نہ چلی تو کہنے لگے کہ اطیعوا اللہ کی تفسیر اطیعوا الرسول سے کی جا رہی ہے یعنی اللہ کی اطاعت کا حکم دیکر اسکی تشریح کی جا رہی ہے سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ کی اطاعت کا مطلب کیا ہے لیکن ہوا یہ تو جیسے بھی کسی طرح ذہن کو اپیل نہ کر سکی ظاہر بات ہے کہ داؤد تفسیر یا دودھم مصداق لفظوں یا فقروں کے درمیان آتا

ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے اللہ اور رسول کو کسی طرح بھی باہم مراد ثابت نہیں کیا جاسکتا اور پھر تفسیر کی ضرورت تو وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی بات مبہم ہو جو بات پہلے ہی سے واضح ہو اس کی تفسیر کی حاجت نہیں ہوا کرتی اَطِيعُوا اللَّهَ (اللہ کی اطاعت کرو) میں کو نسا ابہام ہے جاہل سے جاہل آدمی کو بھی اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکتی پھر آخر اس تفسیر کی ضرورت ہی کیا پیش آئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ جو لفظ پہلے سے واضح ہے اس کی تفسیر ایک ایسے لفظ سے کی جا رہی ہے جو اس کے مقابلے میں مبہم ہے، طریقہ تو یہ ہے کہ مبہم کی تفسیر واضح سے کی جاتی ہے مگر یہاں معاملہ الٹ ہے اللہ بالکل واضح ہے ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ خدا کا نام ہے اس کے دوسرے کوئی معنی ہی نہیں اللہ کے معنی میں کسی قسم کے بھی ابہام کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اب کیسے یہ بات قبول کر لی جائے کہ اس واضح کی تفسیر ایک ایسے لفظ سے کی جا رہی ہے جو مقابلتا مبہم ہے رسول کے کئی معنی ہیں مختلف معانی کی محتملات نے اسے اللہ کے لفظ کے مقابلے میں مبہم بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اللہ کے لفظ کو مبہم مان بھی لیا جاتے اور اس لیے اس کی تفسیر کی ضرورت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ایک دو جگہ اس مبہم کی تفسیر کر دینا کافی تھا قرآن میں بیسیوں جگہ اَطِيعُوا اللَّهَ کو اَطِيعُوا الرَّسُولَ کے ساتھ ملا کر اسی طرح بیان کیا گیا ہے آخر ہر جگہ بالالتزام اس تفسیر کی کیا ضرورت تھی معمولی سے معمولی مصنف بھی اس قسم کا تکرار اپنی تصنیف میں روا نہیں رکھتا۔

آپ نے دیکھا اپنی بات کی پیچ نبھانے کے لیے منکرینِ حدیث کو آیاتِ قرآنی میں کیسی کیسی دور انداز کارِ تاویلات کا سہارا لینا پڑا۔ اسی پر بس نہیں جب مذکورہ بالا مضحکہ خیز توجیہات میں سے کوئی توجیہ بھی عقل کے معیار پر پوری اترتی نظر نہ آئی تو منکرینِ حدیث نے ایک اور رخ پلٹا۔ اگرچہ دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس کا اعتراف کر لیتے اور اپنے غلط خیال سے رجوع کر لیتے مگر انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور کمنا شروع کر دیا کہ اطاعتِ رسول کا حکم صرف آپ کی حیات تک تھا اس لیے کہ

اطاعتِ رسول کے لیے
حیاتِ نبوی کی شرط

اطاعت کا لفظ صرف نفلوں کے لیے مستعمل ہوتا ہے گزرے انسانوں کی اطاعت نہیں کی جاسکتی پیروی کی جایا کرتی ہے منکرین حدیث کے نزدیک اطاعت انسانوں کی ہوتا کہتی ہے اقول کہ نہیں اقول کے لیے اطاعت کا نہیں پیروی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

کرنے کو تو منکرین حدیث نے یہ اعتراض کر دیا مگر یہ تک اقوال کی اطاعت نہ سوچا کہ قرآن بھی تو اقول الہی کا مجموعہ ہے تو پھر اس

کے لیے بھی اطاعت کا لفظ استعمال نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی تو ہم براہ راست نہیں کر سکتے وہاں بھی تو اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے کلام کی اطاعت کی جائے۔ اگر اللہ کے کلام کے لیے اطاعت کا استعمال درست ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے لیے اطاعت کا استعمال کیوں درست نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس پر بھی غور کیجئے کہ اسی زیر بحث آیت میں نزاعات کے وقت فیصلے کے لیے دو مرجع بنائے گئے ہیں ایک اللہ دوسرے اللہ کا رسول۔ پھر جب اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیات میں اس وقت تک خود آپ کی ذات مبارک کی طرف رجوع کیا جائے اور جب آپ دنیا سے رحلت فرما جائیں اور براہ راست آپ سے استفادہ کی صورت باقی نہ رہے تو آپ کے اقوال و افعال کی طرف رجوع کیا جائے بلکہ اگر نظر غائر دیکھا جائے تو آپ کی حیات میں بھی مرجع نہایت بڑی حد تک آپ کے اقوال و افعال ہی تھے اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت دس بارہ لاکھ مربع میل کے وسیع و عریض علاقے یعنی پورے جزیرہ عرب پر پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے وسیع ملک میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لیے ہر معاملے کا فیصلہ براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا لامحالہ اس زمانے میں بھی معاملات کے فیصلے کرنے کے لیے قرآن کے بعد جس طرف رجوع کیا جاتا تھا وہ آپ کے اقوال و افعال ہی تھے۔ غرض یہ کہ کسی طرح درست نہیں کہ اقول رسول پر اطاعت کا اطلاق نہیں کیا

جاسکتا اور اس لیے اطاعتِ رسول کا حکم صرف اس وقت تک تھا جب تک براہِ راست آپ کی اطاعت ممکن تھی یعنی جب تک آپ بقید حیات تھے۔ لغت عرب میں بھی اطاعت کے معنی میں اس قسم کی کوئی تحدید ثابت نہیں کہ یہ لفظ صرف زندہ انسانوں پر بولا جاتا ہو یا اقوال کے لیے اس کا استعمال درست نہ ہو۔ نے کی کوئی نظیر ملتی ہو۔ منکرینِ حدیث اس قسم کی کوئی نظیر قرآن سے یا مستند لغتِ عرب سے پیش نہیں کر سکتے جو ان کے دعوے کو ثابت کرنے والی ہو اس کے برعکس ہمارے پاس اس بات کے ثبوت ہیں کہ اطاعت کا استعمال صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک ہی محدود نہ تھا خلیفہٗ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظیر موجود ہے آپ نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا اس میں اپنی اطاعت کی حدود واضح کرتے ہوئے فرمایا اَطِيعُوا نِي مَا اطَعْتُ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ (اس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں) دیکھ لیجئے یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے اہل زبان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرما جانے کے بعد آپ کی پیروی کے لیے لفظ اطاعت استعمال کیا ہے۔ ہر مذہب کا بہترین زمانہ وہ ہوتا ہے جو صاحبِ مذہب سے قریب ہو اس زمانے کے لوگ صاحبِ مذہب کے مقصد کو جتنا زیادہ سمجھ سکتے ہیں زمانہ بعید کے لوگ اتنا نہیں سمجھ سکتے اور صاحبِ مذہب کی لالی ہوئی ہدایت کی تشریح جو اس کے اصحاب یا قریب زمانے کے لوگ کرتے ہیں وہی صحیح ہوتی ہے اس لیے قرآن و حدیث کا جو ترجمہ جو مطلب صحابہ کرام اور سلفِ صالحین بتا گئے ہیں درست صرف اسی کو تسلیم کیا جائے گا یہ کیسے مان لیا جائے کہ تیرہ چودہ سو برس تک اَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ کا صحیح مطلب کوئی بھی نہ سمجھ سکا حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو قرآن کے مخاطبِ اول تھے۔

غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو مستقل حیثیت سے واجب قرار دیا ہے۔ بتا بریں قرآن ہی کا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول اور ہر فعل کو ایک مستقل اور علیحدہ حیثیت سے واجب الاطاعت تسلیم کریں۔ گویا قرآن پر اس وقت تک پورا غلبہ ممکن ہی نہیں جب تک ہم حدیث رسول کو بھی قانون خداوندی کا ایک حصہ نہ مان لیں۔

اطاعت رسول کی مستقل حیثیت اور قرآن
 حدیث رسول کی مستقل حیثیت قرآن کی نظر میں
 کتنی اہم ہے اس کا اندازہ اس بات سے
 لگائیے کہ رسول پر اس کی اطاعت کے بغیر ایمان

لانا قرآن کے نزدیک ایمان ہی نہیں ہے۔ سورۃ نساء میں ارشاد ہے :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ
 يُحْكَمُوا لَكَ وَبَيْنَا شَجَعْتُمْ يَدَهُمْ ثُمَّ
 لَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا
 قَضَيْتُمْ وَيُسَلِّمُوا اَسْلَامًا۔
 (النساء : ۶۵)۔

پس (اے نبی) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ
 ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے
 فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اس کے بعد تیرے
 فیصلے سے اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں
 اور پوری طرح اسکے سامنے سر جھکا دیں۔

یعنی رسول پر ایمان لانے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ زبان سے بس آمین کہہ لیا
 جائے بلکہ کوئی شخص اس وقت تک مومن ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہر معاملے میں رسول
 کو اپنا علم نہ بنا لے۔! اسی جو اختلاف بھی ہو اس میں اسی کا فیصلہ صرف آخر نہ بنانے ہی
 نہیں بلکہ وہ فیصلہ اپنے مخالفت ہو تو بھی اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کرے۔

رسول کو فیصلہ سننے کے بعد قرآن کسی کو یہ حق بھی نہیں دیتا کہ وہ اس فیصلے کے
 بارے میں کسی قسم کی پوچھ کرے بلکہ ایمان لانے والوں سے اس کا مطالبہ یہ
 ہے کہ رسول کا فیصلہ سنتے ہی وہ کہہ دیں کہ بس ہم نے سنا اور مان لیا چنانچہ
 سورۃ نور میں ہے ۔

مومنوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے
 رسول کی طرف بولے جائیں تاکہ رسول ان کے درمیان
 فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور
 مان لیا۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ اِذَا دُعُوا
 اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ
 اَنْ يَّقُولُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (النور: ۵۱)۔

کریا مومن کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے سامنے سمع و طاعت کا رویہ اختیار نہ کرے۔ قرآن کے نزدیک رسول تین بات کا فیصلہ کر دے تو اس کے بعد کسی کو اس معاملے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا چنانچہ ارشاد ہے :

<p>جب خدا اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو کچھ مومن رو دیا صورت کو پھر اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔</p>	<p>مَا كَانَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَلَا الْمُؤْمِنَاتِ إِذَا خِفِيَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخَبِيرُونَ مِنْ أَمْرِهِمْ.</p> <p>(۱۱: حزاب : ۳۶)</p>
--	--

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سمع و طاعت اور خود سر دگی کا یہ رویہ صرف ایمان یافتہ عبادات وغیرہ ہی کے ساتھ فاعل نہیں بلکہ اس کے تحت معمولی معمولی اطاعتیں بھی درج ہیں چنانچہ سورہ نور کی یہ آیت ملاحظہ ہو :

<p>جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔</p>	<p>إِنَّ الَّذِينَ بَيَّنَّ بَنَاتِ زَوْجِكَ أَوْلِيَّكَ الَّذِينَ يَوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ.</p> <p>(نور : ۶۲)</p>
--	---

معلوم ہوا استیضہ کن جیسی معمولی اطاعت بھی اتنی اہم ہے کہ ایمان باللہ والرسول کی حدود میں داخل ہے۔ غور کیجئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بغیر نہیں جانا بھی درست نہیں تو آپ کے کسی شرعی حکم کی حدود سے باہر نکلنا کیسے درست ہوگا۔

۲۔ حال یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ اطاعت رسول کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنا اور اہل قرآن ہی کے ایک حکم کو تسلیم کرنا ہے اس لیے جس حکم کے بارے میں ہمیں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حکم ہے تو پھر ہمیں اس تلاش کی ضرورت نہیں کہ اس کی اصل تفسیر میں صراحتاً موجود ہے یا نہیں ہمارے لیے اسکی اطاعت لازمی مختصر یہ کہ تیسری قسم کی وہ احادیث بھی جو بنابر ایسے احکام پر دلالت کرتی نظر آتی ہیں جن سے تفسیر خاموش ہے دین میں اسی طرح حجت ہیں جس طرح وہ احادیث جو قرآنی

احکام کی مؤید یا قرآنی احکام کا بیان ہیں۔

رسول کا ہر عمل وحی الہی کی اتباع میں ہے

در اصل حدیث رسول کی تشریحی حیثیت کا تعین کرتے وقت اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا اور جو کچھ کر کے دکھایا خواہ

اس کی حیثیت قرآن کی تائید کی ہو خواہ وہ قرآن کا بیان ہو اور خواہ اس کا تعلق ان مسائل و احکام سے ہو جن سے قرآن بظاہر خاموش ہے وہ سب کا سب وحی الہی کی اتباع میں ہے سورہ نجم میں ہے :

اور وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں بناتے
وہ تو تمام تر وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم: ۲-۳)

وحی متلو و غیر متلو علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ دو قسم کی تھی ایک تو قرآن کریم کی آیات جن کے الفاظ اور معانی دونوں منزل میں اللہ تھے اس وحی کو علماء کی اصطلاح میں وحی متلو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے دوسری قسم وحی کی وہ ہے جو قرآن کریم کا حصہ نہیں بنی لیکن اس کے ذریعے آپ کو بہت سے احکام عطا فرمائے گئے اس وحی کو وحی غیر متلو کہتے ہیں یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ وحی کی اس قسم میں عموماً صرف مضامین آپ پر نازل کیے گئے ان مضامین کی تعبیر کے لیے الفاظ کا انتخاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا۔ یہ وحی غیر متلو صحیح احادیث کی شکل میں محفوظ ہے۔

وحی متلو کو وحی جلی اور وحی غیر متلو کو وحی خفی کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

قرآن کے علاوہ وحی کا نزول یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی اس پر خود قرآن

گواہ ہے۔ سورہ نساء میں ہے :

وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء: ۱۱۳)

اور اللہ نے تجھ پر نازل کی کتاب اور حکمت
اور تجھے سکھایا وہ کچھ جو تو نہیں جانتا تھا۔

معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب کے علاوہ ایک چیز حکمت بھی نازل کی گئی تھی اس سے انکار نہیں کہ قرآن بھی سراپا حکمت ہے لیکن وادعطف کے ساتھ کتاب کے بعد حکمت کا بطور خاص ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں قرآن کے علاوہ دوسری شے مراد ہے اب ظاہر ہے کہ قرآن کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے علاوہ اور کیا چیز ہے جسے حکمت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ حکمت و دانائی بھی وحی کی گئی تھی جس کی روشنی میں آپ قرآن کریم کے لائے ہوئے لائحہ حیات کو عملی جامہ پہنانے کا کام انجام دیتے تھے۔ قرآن کریم کی دیگر متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس حکمت کی لوگوں کو تعلیم بھی دیتے تھے قرآن کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض بنوت گنواتے ہوئے جا بجا کہا ہے **وَلِيُعَلِّمَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** (وہ لوگوں کو کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) **وَلِيُعَلِّمَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** (وہ تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) کتاب کے بعد یہ حکمت کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے سوا اور کیا ہے یہ حکمت دراصل وہ علم و دانش اور وہ بصیرت و فراست ہے جو قرآن کے ساتھ ساتھ آپ پر وحی کی گئی اور جس کے ذریعے آپ نے زندگی کی راہوں میں صحیح اور غلط کا فرق واضح فرمایا جس کی مدد سے زندگی کے مسائل حل کیے اور جس کی روشنی میں آپ نے اخلاق و روحانیت، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور قانون و سیاست کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

یہاں یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ حکمت کے لفظ سے ہی **حکمت کا صحیح مفہوم** قرآن ہی مراد ہے اور کتاب اور الحکمت کے درمیان جو واڑ

ہے وہ تفسیری ہے عطف کا نہیں۔ اس لیے کہ جو شخص عربی زبان کی معمولی سی شہدہ بدھ بھی رکھتا ہے وہ بھی اتنی بات جانتا ہوگا کہ واؤ کو تفسیری صرف اسی صورت میں قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ دو لفظ جن کے درمیان یہ حرف آیا ہو باہم مترادف المعنی ہوں یا قرینے سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ مشکل انہیں مترادف قرار دینا چاہتا ہے لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں واؤ کا استعمال یا تو دو الگ الگ چیزوں کو جمع کرے کے لیے ہوگا یا عام کو خاص پڑ یا خاص کو عام پر عطف کرنے کے لیے ہوگا ایسے مقامات پر واؤ کے تفسیری ہونے کا دعویٰ بالکل مہمل ہے۔ اب یہاں دیکھئے جہاں تک لغت کا تعلق ہے ظاہر ہے کتاب اور حکمت دو مترادف الفاظ نہیں ہیں دونوں کے معنی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں نہ ہی قرآن کی بات تو وہ بھی حکمت کو کتاب کے ہم معنی قرار نہیں دیتا۔ قرآن نے جگہ جگہ حکمت کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن کبھی اس کو کتاب کے معنی میں نہیں لیا۔ غور کیجئے سورہ نحل میں ہے :

ادعِ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ | اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے
(نحل: ۱۲۵) | ساتھ دعوت دو۔

کیا آپ اس آیت کا یہ ترجمہ کریں گے کہ اپنے رب کے راستے کی طرف قرآن کے ساتھ دعوت دو۔ اسی طرح سورہ بقرہ میں ہے :

وَمَنْ يُوْتِ الْحُكْمَةَ فَقَدْ اَوْجِزَ | جسے حکمت دی گئی اسے بڑی دولت
خَيْرًا كَثِيرًا (بقرہ: ۲۶۹) | دے دی گئی۔

زرا بتلائیے کیا یہاں حکمت سے کتاب مراد لی جاسکتی ہے۔ سورہ لقمان میں حکیم لقمان کے متعلق فرمایا گیا :

وَاذْكُرْ لِقَٰنَ لِقَٰنٍ الْحُكْمَةَ (لقمن: ۱۲) | ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی۔

کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ حکیم لقمان کو اللہ تعالیٰ نے کتاب عطا کی تھی۔ دراصل قرآن میں کہیں بھی کتاب بول کر حکمت مراد نہیں لی گئی اور حکمت بول کر کتاب مراد نہیں لی گئی۔ کتاب کا

لفظ جہاں کہیں بھی آیا ہے آیات الہی کے مجموعے کے لیے آیا ہے اور حکمت کا لفظ جہاں کہیں استعمال ہوا ہے اس دانائی اور فہم و بصیرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس سے انسان حقائق کے سمجھنے اور فکر و عمل میں صحیح رویہ اختیار کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ چیز کتاب میں بھی ہو سکتی ہے، کتاب کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے اور کتاب کے باہر بھی۔ چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں قرآن یا کتاب کے لیے حکیم کی صفت استعمال کی ہے اس کے معنی یہ تو ضرور ہیں کہ کتاب کے اندر حکمت ہے مگر یہ معنی نہیں ہیں کہ کتاب خود حکمت ہے یا حکمت صرف کتاب میں ہے اور اس کے باہر کوئی حکمت نہیں ہے جیسا کہ منکرین حدیث مخالفہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یٰٰنابریں دَاۤنِزِلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ کَاۤیَہِ مَطْلَبَیْنَا کِیْ طَرَحِ دَرَسْت نَدِہُوْکَا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہ سرت کتاب نازل کی گئی بلکہ اس کے صحیح معنی بھی ہوں گے کہ آپ پر کتاب کے ساتھ وہ دانائی بھی نازل کی گئی جس سے آپ اس کتاب کا منشاء ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور انسانی زندگی میں اس کو بہترین طریقے سے نافذ کر کے دکھا دیں اسی طرح یٰٰعِلِمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آپ صرف کتاب کے الفاظ پڑھوا دیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو کتاب کا مطلب سمجھائیں اور انہیں اس دانش مندی کی تعلیم و تربیت دیں جس سے وہ دنیا کے نظام زندگی کو کتاب اللہ کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو جائیں۔

غرض کتاب کے ساتھ حکمت کے نزول کا ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن ہی کی شہادت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔ قرآن ہی کی ایک اور شہادت اس باب میں اس سے بھی زیادہ صریح ہے۔ قرآن نے ایک مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کی تین صورتیں بتائی ہیں ان میں سے قرآن ہی ہمیں بتلاتا ہے کہ وہ صرف ایک قسم کی وحیوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے باقی دو صورتیں قرآن کے علاوہ ہیں۔

وحی کے نزول کی تین صورتیں | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کی تین صورتوں کا ذکر سورہ شوریٰ کی

اس آیت میں کیا گیا ہے :

وَمَا كَانَ لَبَشْرًا أَنْ يَتَكَلَّمَ اللَّهُ إِلَّا
وَحْيًا أَوْ مِنْ ذُرَارٍ حِجَابٍ أَوْ يُرِيلَ
رُسُولًا فَيُوحِّيَ بِأَذْنِهِ مَا يَشَاءُ
(الشوریٰ: ۵۱)

کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو کرے مگر (ہاں یا تو) وحی کے طریقے پر یا پردے کے پیچھے سے یا کسی قاصد (رشتے) کو بھیج دے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہے۔

اس آیت کے مطابق وحی کی ایک صورت تو یہ تھی کہ براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں کوئی بات ڈال دی جاتی تھی۔ اس قسم کی وحی میں نہ فرشتے کا کوئی واسطہ ہوتا تھا اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت سامعہ اور حواس کا۔ اس میں کوئی آواز آپ کو سنائی نہیں دیتی تھی بلکہ بس ایک بات قلب میں جاگزیں ہو جاتی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے وحی کی اس قسم کو وحیاً کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی وحی کو اذنین ذراریہ حجاب کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے یعنی پردے کے پیچھے سے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرماتا تھا اس میں بھی کسی فرشتے کا واسطہ نہیں ہوتا تھا لیکن آپ کو آواز سنائی دیتی تھی۔ تیسری قسم کی وحی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے جبریل علیہ السلام کے ذریعے آپ تک اپنا پیغام پہنچاتا تھا۔

صرف ایک قسم کی وحی قرآن ہے | اب آپ قرآن ہی سے سنئے کہ وحی کی ان تین صورتوں میں سے صرف

تیسری قسم کی وحیاں قرآن میں جمع کی گئی ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے :

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ
نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ ...
اے بنی کہہ دیجئے کہ جو کوئی دشمن ہو جبریل کا
اس بنا پر کہ اس نے یہ قرآن اللہ کے حکم سے
آپ کے قلب پر نازل کیا ہے.....
(البقرہ: ۱۹۷)

بعض یہودی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منکر کر کہ قرآن جبریل علیہ السلام کے کرتوت
ہیں یہ کہا کرتے تھے کہ ان سے تو ہماری عداوت ہے اگر میکائیل وحی لایا کرتے تو ہم مان
لیتے ان کی رد فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ کوئی شخص اگر جبریل سے عداوت
رکھتا ہے تو اس عداوت کو قرآن کے نہ ماننے میں کیا دخل۔ کیونکہ جبریل علیہ السلام تو سفیر
محض ہیں سو سفارت کے طور پر انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے۔
بہر حال اس آیت نے یہ بتلادیا کہ قرآن جبریل علیہ السلام کے ذریعے نازل کیا گیا ہے۔
یہی بات اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ سورہ شعراء میں لکھی گئی ہے:

وَأَنَّهُ لَنَزَّلُ بِالْعُلَمِينَ
نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ لَا عَلَى
قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ
بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ
اور بے شک یہ (قرآن) پروردگار عالم کا
آثار ہوا ہے اسے روح الامین نے آپ
کے قلب پر اتارا ہے تاکہ آپ ڈرانے والوں
میں سے ہوں صاف عربی زبان میں۔
(الشعراء: ۱۹۵-۱۹۲)

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ قرآن پورے کا پورا روح الامین
یعنی حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے اتارا گیا ہے تو ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم پر وحی کیسے جانے کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر سورہ شوریٰ میں کیا گیا ہے وہ
قرآن کے علاوہ ہیں۔

عام انسانوں سے اللہ کی
ہمکلامی اور وحی
یہاں یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ سورہ شوریٰ
والی آیت میں صرف بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے
نہیں بلکہ ہر بشر کے ساتھ اللہ کے ہم کلام ہونے کے
طریقوں کا ذکر ہے مگر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی توجیہ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں اس آیت کے

پہلے دو حصوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہونے کے دو طریقوں کا ذکر ہے جبکہ آخری حصے میں عام انسانوں سے بات کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ یہ بات اسی لیے درست نہیں کہ اس آیت کے فوراً بعد اللہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ بندے سے اللہ کی ہم کلامی کے متذکرہ تینوں طریقوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے جانے سے ہے۔ قرآن اٹھا کر دیکھ لیجئے اس آیت کے فوراً بعد ارشاد ربانی ہے :

اور اسی طرح (اے نبی) ہم نے تمہاری طرف وحی کی اپنے حکم کی روح تم کو پیہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہے علمایاں کیا ہے مگر ہم نے اس کو ایک نور ہمارا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں رہنمائی کرتے ہیں اور یقیناً تم راہ راست کی طرف رہنمائی کرتے ہو۔

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَفِي نُورِنَا إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

(شرعی: ۵۲)

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس آیت سے پہلے اللہ کی ہم کلامی کے جن تین طریقوں کا ذکر ہوا ہے ان تینوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے جانے سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایہ رہا ہے کہ انہی تین طریقوں سے ہم نے اپنے فرماں کی روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ فرمان کی روح سے مراد وہ تمام ہدایات ہیں جو مذکورہ تینوں طریقوں سے آپ پر وحی کی گئی۔ یہاں روح کا لفظ دیکھ کر بلا سوچے سمجھے منکرین حدیث کہہ دیا کرتے ہیں کہ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا سے روح الامین یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں بھلا کوئی بوجھے کہ کیا جبرئیل علیہ السلام کی ذات بھی وحی کی جاسکتی ہے۔ اگر روح کے لفظ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہوتے تو أَوْحَيْنَا کے بجائے أَرْسَلْنَا کہا گیا ہوتا۔

اسی طرح اس آیت سے پہلے والی آیت کے آخری حصے کو عام انسانوں سے اللہ کی ہم کلامی کے ساتھ مخصوص کرنا بھی قطعاً غلط ہے۔ منکرین حدیث کے خیال کے مطابق آیت کے آخری حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ عام انسانوں سے اللہ کی ہم کلامی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کی

طرف رسول بھیجتا ہے پھر اس رسول پر وحی نازل کرتا ہے اور اللہ کا رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہنچاتا ہے حالانکہ آیت کے الفاظ ہیں اَوْفِرْسِلْ رَسُوْلًا فَمِنْ حِیِّ بِاِقْرَبِهٖ مَّا لِبَشَرٍ (یا کسی قاصد کو بھیج دے اوردہ اللہ کے اذن سے وہی کرے وہی کچھ جو اللہ چاہتا ہے) اس فقرے میں اگر ”رسول“ سے مراد فرشتے کے بجائے بشر رسول لیا جائے تو اس کے معنی یہ بن جائیں گے کہ رسول بھی عام انسانوں پر وحی کرتا ہے۔ کسی عجیب بات ہے وحی کے تو معنی ہی اِشَارَةُ طَیْفٍ اور کلامِ حق کے ہیں۔ یہ لفظ نہ تو لغت ہی کی رو سے اس تبلیغ کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جو اللہ کا رسول علانیہ خلقِ خدا کے درمیان کرتا ہے اور نہ قرآن ہی میں کہیں اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے یہاں تو رسول کا لفظ صاف طور پر اس فرشتے کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی طرف وحی لانے کے کام پر مامور ہے یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام۔

قرآن کے علاوہ وحی کے نزول پر قرآنی شہادتیں | غرض قرآنی آیات کی روشنی میں جو اس باب میں بالکل صریح ہیں کہ قرآن تمام تر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے نازل ہوا ہے یہ بات بایہ ثبوت کو پہنچ

جاتی ہے کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحیوں پر مشتمل ہے۔ وحی کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر سورہ شورہ والی آیت میں کیا گیا ہے وہ قرآن کے علاوہ ہیں۔ ان دو صورتوں سے جو ہدایات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی جاتی تھیں ان کے بارے میں بھی شواہد خود قرآن ہی کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً

۱) ہر کوئی جانتا ہے کہ قرآن کریم جس ترتیب کے ساتھ اس وقت موجود ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس ترتیب سے نازل نہ ہوا تھا بلکہ ضرورت اور حالات کے مطابق نزول کی ترتیب اس سے مختلف تھی ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کا تبیین وحی کو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے گی چنانچہ وہ آپ کے بتائے ہوئے مقام پر درج ہو جاتی تھی اب قرآن کی اس نزولی ترتیب کو بدلنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی مرضی سے تو ممکن نہیں اس لیے کہ قرآن نے

واضح طور سے فرمادیا تھا :

قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا أَتَأْتِنَا
بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ يَدَّبُّ بِمُؤَلِّفٍ
مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَيِّنَ لَهُ مِنْ مِثْلَيْ
نَفْسِي إِنْ أَتَّبَعَ إِلَّا مَا يَوْحِي
إِلَيْهِ (يونس : ۱۵)

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کوئی کھٹکا نہیں
ہے وہ کہنے لگتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن
لاؤ یا اس کو بدل دو آپ کہہ دیجئے مجھ سے یہ کیسے
ہو سکتا ہے کہ میں اسے اپنے جی سے بدل دوں میں
تو بس اسی کی پیروی کروں گا جو میرے پاس وحی
سے پہنچتا ہے۔

معلوم ہوا قرآن کی نزول تدریج کی یہ تبدیلی وحی الہی کے مطابق تھی لیکن قرآن میں یہ وحی
کیسے مذکور نہیں ہے ظاہر ہے یہ وحی قرآن کے علاوہ تھی۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعُوا (الاعراف ۲۰۴)

یہ طرہی وہ چیز جاتی ہے جو لکھی ہوئی ہو مگر قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اے نبی جب
قرآن نازل ہوا کرے تو لکھ لیا کرو و ہذا ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآنی
آیات کو قید تحریر میں لانا وحی غیر قرآنی کے تحت تھا۔

(۳) مسجد حرام کو قبلہ بنائے جانے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے
تقریباً سترہ مہینے تک بیت المقدس کو قبلہ بنائے رکھا۔ تحویل قبلہ کا حکم دیتے وقت
اللہ تعالیٰ نے اس بات کی توثیق فرمائی کہ بیت المقدس کا قبلہ بنایا جانا بھی ہمارے
ہی حکم سے تھا جیسا کہ ارشاد ہے :

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا
إِلَّا لِنُعَلِّمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّا
يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ (بقرہ : ۱۴۳)

اور جس قبلہ پر آپ (اب تک) تھے اسے تو ہم
نے اسی لیے رکھا تھا کہ ہم پہچان لیں رسول کا اتباع
کرنے والوں کو اے پادشاهوں واپس جلتے والوں میں سے

جب بیت المقدس کا قبضہ بنایا جانا وحی الہی کے تحت تھا تو قرآن تو اس حکم سے بالکل ساکت ہے سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نہیں آتی تھی تو یہ قبیلے کا حکم آپ کو کس ذریعے سے ملا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ احکام ایسے بھی ملتے تھے جو قرآن کے علاوہ ہوتے تھے۔ یہ آیت جہاں اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی دلائل ہی آیت پروری صراحت کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احکام کا اتباع کرنے پر بھی مامور ہیں جو قرآن میں مذکور نہ ہوں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم نے یہ قبضہ مقرر ہی اس لیے کیا تھا کہ ہم دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے منہ موڑتا ہے اسی بات پر دلالت کہ رہا ہے گویا اللہ تعالیٰ کے یہاں مسلمانوں کے ایمان بالرسالت کی آزمائش ہی اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ رسول کے ذریعے سے جو حکم بھی دیا جائے اس کے بارے میں دیکھا جائے کہ وہ اسے بے چون و چرا تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔

دہم، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کو ایک راز کی بات بتائی انہوں نے اس راز کی بات کا دوسروں سے ذکر کر دیا۔ آپ نے باز پرس فرمائی تو وہ پوچھنے لگیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہہ دی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا مجھے علم و خبر نے خبر دی ہے۔ قرآن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

اور جب نبی نے ایک بات اپنی کسی بیوی سے چپکے سے فرمائی پھر جب ان بیوی نے وہ بات (کسی اور کو) بتلا دی اور اللہ نے نبی کو اس کی خبر کر دی تو نبی نے اس کا کچھ حصہ بتلا دیا اور کچھ کو مٹا لگے پھر جب نبی نے ان بیوی کو وہ بات بتلائی تو وہ بولیں آپ کو کس نے خبر دی آپ نے کہا مجھے علم و خبر

وَإِذْ أَسْرَأَ النَّبِيُّ إِلَىٰ لَبْعَنٍ أَرْوَاجٍ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ فَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَمَّاكَ هَذَا قَالَ نَبَّأَنِي

الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ

خدا نے بنایا۔

(التوہیم : ۳)

اس آیت میں **وَأُظْهِرَ اللَّهُ عَلِيمُ** (اور اللہ نے بنی کما س کی خبر کر دی) کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس ساری کارروائی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا تھا **قَالَ نَبِيُّنَا الْخَبِيرُ** (آپ نے کہا مجھے علیم و خبر خدا نے بتایا) کے الفاظ بھی اسی پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ وحی کے ذریعے ہی آپ کو معلوم ہوا۔ اب بتلائیے قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آپ کی بیوی نے آپ کی راز کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے۔ اگر قرآن کریم میں یہ آیت موجود نہیں ہے تو اس کے علاوہ آپ اور کیا کہیں گے کہ یہ وحی قرآن کے علاوہ تھی۔

(۵، سورۃ حشر کی ایک آیت ہے:

فَأَقْصَتُ مِنْ لَيْسَةٍ أَوْ
تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَى
أَحْصَنِهَا فَيَا ذُنَّ اللَّهَ

کجھوروں کے جو درخت تم نے کاٹے اور جو کھڑے
رہنے دئے یہ دونوں کام اللہ کی اجازت
سے تھے۔

(الحشر : ۵)

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے قبیلے بنی نضیر کی مسلسل بدعہدیوں سے تنگ آ کر جب مدینے سے متصل ان کی بستیوں پر چڑھائی کر دی تو دوران محاصرہ اسلامی فوج نے گرد و پیش کے باغات کے بہت سے درخت کاٹ ڈالے تاکہ حملہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو جائے اس پر مخالفین نے شور مچا دیا کہ باغوں کو اجاڑ کر اور ہرے بھرے پھل دار درختوں کو کاٹ کر مسلمانوں نے فساد فی الارض بپا کیا ہے۔ مخالفین کے اس بے جا شور و غوغا کا جواب دینے کے لیے قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں بتلایا گیا کہ اسلامی فوج نے جو کچھ کیا ہے اللہ کی اجازت سے کیا ہے۔ اب ذرا بتلائیے کہ اللہ کی یہ اجازت قرآن کی کس آیت میں ہے۔ اگر یہ اجازت قرآن میں نہیں دکھلائی

جاسکتی تو معلوم ہوا یہ اجازت اس وحی کے ذریعے تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ اترتی تھی۔

(۶) سورہ انفال جیسا کہ معلوم ہے جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے اس سورت میں پوری جنگ بدر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس تبصرے کا آغاز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَلَمَّا يَجِدْكُمْ اللَّهُ إِحْدَى
الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهُمَا لَكُمْ وَتَوَدَّوْنَ أَنَّ
غَيْرَ ذَاتِ الشُّرُكَةِ تَكُونُ لَكُمْ
وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنِّي يَحَقَّ الْحَقُّ بِكَلِمَتِهِ
وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ۔

(انفال : ۷)

اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا دو
جماعتوں میں سے ایک کے لیے کہ وہ تمہارے
ہاتھ آجائیں گی اور تم چاہ رہے تھے کہ غیر مسلم
جماعت تمہارے ہاتھ آجائے درآغا لیکر اللہ
کو منظور یہ تھا کہ حق کا حق ہونا ثابت کر دے
اپنے احکام سے اور کافروں کی جبرط کاٹ دے۔

یہ آیت بتلا رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مسلمانوں کو لیکر مدینے سے
نکلے تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو یہ بتلا دیا تھا کہ قریش کے تجارتی تانلے اور
مشرکین مکہ کے لشکران دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت مسلمانوں کے ہاتھ
آجائے گی۔ اب پورے قرآن شریف میں اس آیت کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس
میں اللہ کے اس دعوے کا ذکر ہو ظاہر ہے۔ یہ وعدہ وحی غیر قرآن کے ذریعے کیسا
کیا تھا۔

(۷) قرآن میں نماز سے پہلے اذان دیے جانے کا ذکر آیا ہے مثلاً سورہ مائدہ میں ہے :

وَإِذَا نَادَيْنَا لِلْحَمْدِ
الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هَاهُنَا قُلُوبًا۔

(مائدہ : ۵۸)

اور جب تم نماز کی طرف (بلانے کے لیے)
اذان دیتے ہو تو وہ (مشرکین) اسے
کھیل کود بنا لیتے ہیں۔

اسی طرح سورہ جمعہ میں ہے :

اِذَا نَدَىٰ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ
الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ
اللَّهِ - (الجمعة : ۹)

جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے
تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔

ان دونوں آیتوں میں نماز جمعہ اور عام نمازوں سے پہلے اذان دئے جاتے کا ذکر ایک رائج
شدہ نظام کی حیثیت سے کیا گیا ہے لیکن ہمیں قرآن میں وہ آیت کہیں نہیں ملتی جس میں
حکم دیا گیا ہو کہ نماز کے لیے اذان دیا کر دلا محالہ ماننا پڑے گا کہ یہ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کو اس وحی کے ذریعے دیا گیا تھا جو قرآن کے علاوہ تھی۔

(۸) قرآن صلوٰۃ خوف کا ذکر کرتے ہوئے جہاں یہ کہتا ہے کہ اگر عام قاعدے کے مطابق
نماز یا جماعت ادا کرنے میں کسی دشمن کی طرف سے خوف ہو تو نماز جس طرح بھی ممکن ہو
سکے پڑھ لو خواہ پیادہ یا ہو کر خواہ سواری کی حالت میں تو اس کے فوراً بعد کہتا ہے :

فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا
عَلَّمَكُمْ (البقرة : ۲۳۹)

پھر جب تم امن میں آ جاؤ تو اللہ کو یاد کرو (یعنی
نماز پڑھو) جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے۔

نماز کی یہ تعلیم کیا کوئی بتا سکتا ہے اللہ نے قرآن کی کس ہیئت میں دی ہے۔ اگر قرآن
میں یہ تعلیم موجود نہیں ہے تو پھر یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان
کیا ہوا اور سکھایا ہوا نماز کا طریقہ اللہ نے آپ کو اس وحی کے ذریعے تعلیم فرمایا تھا
جو قرآن کے علاوہ تھی۔

بہر حال یہ چند آیات مثال کے طور پر پیش کر دی گئی ہیں اسی قسم کی اور متعدد آیات
اس بارے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ تمام آیات قرآنی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی اور جب یہ بات ثابت
ہو گئی تو پھر ایک قسم کی وحی کو قابل اطاعت سمجھنا اور دوسری قسم کی وحی سے انکار کر دینا
کوئی معنی نہیں رکھتا۔

وحی پر ہمارے ایمان کی اصل بنیاد | معاملہ وحی قرآنی کا ہو یا غیر قرآنی کا
اس سلسلے میں سب سے اہم بات غور

کرنے کی یہ ہے کہ وحی پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت و اتباع کرنے کی اصل بنیاد کیا ہے۔ وحی خواہ کسی نوعیت کی بھی ہو سوال یہ ہے کہ کیا وہ ہمارے پاس براہ راست آئی ہے کہ ہم از خود اس کے منزل من اللہ ہونے یا نہ ہونے کو معلوم کر سکیں ظاہر ہے ایسا نہیں ہے وحی ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ ہدایت میرے پاس خدا کی طرف سے آئی ہے گویا ہم وحی کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لانے سے پہلے رسول کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لاتے ہیں پھر اس کے بیان پر اعتماد کر کے اس پر اترنے والی وحی کو اللہ کی بھیجی ہوئی وحی مانتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ہمارے ایمان کی وجہ قسم ان نہیں ہے بلکہ قسم ان پر ہمارے ایمان کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بھی معقول آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ جب یہ بات ہے تو ذرا سوچئے کہ جس رسول کے اعتماد پر ہم نے قرآن کو وحی مانا ہے وہی رسول اگر ہمیں یہ بتلائے کہ قرآن کے علاوہ بھی مجھ پر وحی آتی ہے اور مجھے قرآن کے علاوہ بھی ہدایات و احکام ملتے ہیں تو اس کی تصدیق نہ کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تنبیہ کے انداز میں ارشاد فرمایا ہے:

خبردار رہو کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ	اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ
اس کا مثل بھی (دیا گیا)۔	مَعَهُ (ابوداؤد)

پھر قرآن ہی کی طرح اس مثل کا بھی داعی اطاعت ہونا واجب کرتے ہوئے فرمایا:

جو کچھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرام کیا وہ (اطاعت میں) ایسا ہی ہے جیسا	وَ اِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)
اللہ نے حرام کیا۔	

ایک اور موقع پر اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بتلا باکہ میں قرآن کے علاوہ بھی تمہیں احکام سناتا ہوں اور تم پر اس کی اطاعت بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح قرآن میں دئے جانے والے احکام کی۔ ارشاد ہے :

<p>خبردار قسم ہے اللہ کی میں نے تمہیں حکم دیا ہے نصیحت کی ہے اور مدد کا ہے بہت سی چیزوں کے بارے میں۔ یہ چیزیں بقدر قرآن کے ہیں بلکہ اس سے نائد بھی ہیں۔</p>	<p>أَلَا وَابْتَغُوا اللَّهَ قَدْ أَمَرْتُ وَوَعظْتُ وَنَهَيْتُ عَنْ مَنَابِئِهِ إِنَّمَا يَكُنُّ الْقُرْآنُ أَوْ أَكْثَرُ (ابوداؤد)</p>
---	--

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محلول بالا ارشادات کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ جب اللہ کا رسول خود بتلا رہا ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی اس پر وحی آتی ہے تو آخر اس پر اتاری جانے والی ایک وحی اور دوسری وحی میں فرق کس بنا پر۔ جب ایمان ہالہ رسالہ ہی وحی پر ہمارے ایمان کی اصل بنیاد ہے تو اطاعت کرنے والے کے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ رسولؐ نے خدا کا ایک حکم قرآن کی کسی آیت کی شکل میں ہمیں پہنچا دیا ہے یا اپنے فرمان یا عمل کی شکل میں۔ اطاعت کرنے والے کے لیے تو دونوں وحیاں اس حیثیت سے واجب الاتباع ہیں کہ وہ دونوں منزل بن اللہ ہیں۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے :

<p>جو کچھ تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔</p>	<p>إِتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّنْ رَّبِّكُمْ - (اعراف : ۳) -</p>
--	--

”جو کچھ بھی نازل کیا گیا ہے“ کے الفاظ دیکھ لیجئے اپنے مفہوم میں کس قدر واضح ہیں یعنی وہ تمام تعلیمات و ہدایات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہیں خواہ وہ آیات قرآنی کی صورت میں ہوں یا کسی اور صورت میں وہ سب کی سب واجب الاتباع ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار کتاب اللہ اور اپنی سنت کو علیحدہ علیحدہ بیان کر کے دونوں کی اطاعت کا حکم دیا۔ حضرت مالک بن انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا
مَا تَسْكُمُ بِهِمَا كِتَابُ اللَّهِ وَسُنَّةُ
رَسُولِهِ (مولانا امام مالک)۔

میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک انہیں
تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے وہ اللہ کی کتاب
اور میری سنت ہے۔

اس حدیث کو بیہمتی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ہی سے ایک
اور روایت امام بخاری بھی لائے ہیں اس میں سنت سے انکار کرنے والے کو نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے جنت سے محرومی کی وعید سنائی ہے۔ ارشاد نبوی ہے :

كُلُّ أُمَّتٍ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ
إِلَّا مَنْ أَجَبَ قِيلَ وَمَنْ أَجَبَ
قَالَ مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ
وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَجَبَ

انکار کرنے والے کے سوا میری امت میں سے
ہر شخص جنت میں جائے گا پوچھا گیا کہ انکار کرنے
والا کون ہے آپ نے فرمایا جس نے میری اطاعت
کی جنت میں داخل ہوا اور میں نے میری نافرمانی
کی اس نے انکار کیا۔

(بخاری)

ایک اور موقع پر آپ نے اختلاف کے موقع پر اپنی سنت اور اپنے صحابہ کے طریقے پر
مجھے رہنے کی بڑے ہی پرتاثر انداز میں تاکید فرمائی چنانچہ حضرت عرابض بن ساریہ رضی
اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میں فجر کی نماز
پڑھائی پھر اس کے بعد ایسا اثر انگیز وعظ کرا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہنے
لگے اور جیل لرز نے لگے صحابہ نے عرض کیا حضور یہ تو آخری وعظ معلوم ہوتا ہے کچھ وصیت
فرماد مجھے آپ نے فرمایا میں تمہیں اللہ سے ڈرتے رہنے اور میری طاعت پر مجھے رہنے
کی وصیت کرتا ہوں خواہ میرے بعد تمہارا امیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو میرے بعد
میں کو جینا نصیب ہوا وہ برابر اختلاف دیکھے گا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا :

فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ
الرَّاشِدِينَ الْمُهَدِّدِينَ مَسَكُوا بِهَا
وَعَصُوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ (ترمذی،
ابوداؤد، ابن ماجہ، جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۸۲)

تم پر واجب ہے کہ میری سنت کو اور میرے
ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو
لازم پکڑو انہی پر بھروسہ کرو اور انہی کو
محفوظ پکڑے رہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان واضح ارشادات کے بجوہی جو شخص آپ کی سنت کے واجب الاتباع ہونے سے انکار کرتا ہے وہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کرتا ہے :

صحابہ کے درمیان حدیث کی تشریحی حیثیت

حدیث رسول کی تشریحی حیثیت پر غور کرتے وقت ایک اور مسئلہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ ہر مذہب کا بہترین زمانہ وہ ہوتا ہے جو صاحب

مذہب سے قریب ہو جیسا اس زمانہ کے لوگ صاحب مذہب کی مراد کو درست طور پر سمجھ سکتے ہیں زمانہ بعید کے آدمی نہیں سمجھ سکتے۔ ہندوؤں سے پوچھئے ان کے مذہب کا بہترین زمانہ وہ تھا جو بیکار اور اس کے شاگردوں کا تھا بیکار کے اقوال کو جتنا اس کے شاگرد سمجھتے تھے دوسرا کوئی نہ سمجھتا تھا یہودیوں سے استفادہ کیجئے وہ اصحاب موسیٰ کو حضرت موسیٰ کی لائی ہوئی آسمانی تعلیمات و ہدایات کا بہتر طور پر سمجھنے والا قرار دیں گے۔ عیسائیوں سے سوال کیجئے وہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں کو انجیل کا صحیح سمجھنے والا اور حضرت مسیح کی صحیح پیروی کرنے والا بتائیں گے غرض ہر مذہب کا بہترین زمانہ اس کا ابتدائی زمانہ ہوتا ہے۔ مذہبی احکام کی جو تعبیر اس زمانہ کے لوگوں میں مستند قرار پا جائے وہی تعبیر صحیح اور درست مانی جاتی ہے یہی مسئلہ حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطبین یعنی صحابہ کرام کے درمیان حدیث تشریحی حیثیت کی حامل مٹی یا نہیں۔ اس نقطہ نظر سے جب ہم تاریخی مواد کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام کے درمیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہمیشہ تشریحی حیثیت کی حامل رہیں۔ صحابہ کرام کے دور میں حدیث کی تشریحی حیثیت کا مسلم ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس پر گفتگو کرنا بدیہی کو نظری بنانا ہے۔ کتب احادیث اٹھا کر دیکھئے شریعت کے کسی ایک باب میں نہیں بلکہ قتال، حج، جنایت، بیع، وراثت، عدت، مزارعت، غرضیکہ شریعت کے تقریباً تمام ابواب میں ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا

ہے کہ صحابہ کے درمیان حدیث تشریحی خیمیت کی حامل تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہ حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کی خلافت تک بلکہ اس کے بعد بھی ہر دو میں حلال و حرام کے مسائل میں ہمیشہ حدیثیں ہی پیش کی جاتی رہیں اور ہر نزاع و اختلاف کے مواقع پر سب احادیث ہی کو فیصلہ تسلیم کیا۔ ہم یہاں مُشتے نمونہ از خروار سے کے طور پر چند واقعات پیش کرتے ہیں جن سے ہمارے دعوے کی سچائی روزِ روشن کی طرح واضح ہو جانے لگی۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اختلاف صحابہ کرام کے درمیان آپ کے دفن کے متعلق ہوا۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اس اختلاف کا فیصلہ ایک حدیث ہی کی بنیاد پر ہوا جو اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے سنائی تھی آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے۔ (موطا وابن ماجہ)

(۲) اسی طرح سفینہ نبی ساعدہ میں خلافت کے مسئلے پر حیب جنگ کا ساماں تھا تو ایک صحابی حضرت بشیر انصاریؓ کی زبان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک اَلْأَمَّةُ مِنْ تَرِيثِ كَيْفَ الْفَاظِ نَظَرُ كَيْ دِيرَ تَقِي ہر طرف سناتا چھا گیا اور ہر ایک کا سُرطاعت کے لیے جھکا ہوا نظر آتے لگا۔ (مند داری)

(۳) حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک عورت آئی اور اپنے پوتے کے ترے میں سے حصّہ ملنے کی دعویدار ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں تیرا حصّہ کتاب اللہ میں نہیں پاتا حضرت مغیر بن شعبہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی حصّہ دلویا۔ یہ فرمایا تمہارے اس قول پر کوئی شائبہ ہے محمد بن مسلمہ بولے میں شہادت دیتا ہوں آپ نے دادی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اس کو چھٹا حصّہ دلوا دیا۔ (تذکرہ اہل الجلباب ص ۷۱)

(۴) حضرت عمرؓ کی پیرائے بخی کہ بیوی تو شہر کی دیت کی رقم میں سے وراثت نہیں ملنی چاہئے لیکن جب حضرت ضحاک بن سفیانؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اشیم انصاری کی بیوی کو شوہر کی دیت دلوانی تھی تو حضرت عمرؓ نے فوراً اپنے قول سے رجوع فرمالیا۔ (ابوداؤد دینار الساریہ ص ۱۸۳) (۵) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر جھگڑے میں کسی عورت کا حمل راقط ہو جائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہیے۔ یہ سن کر حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ میری دونوں بیویوں میں لڑائی ہو گئی ایک نے دوسرے کے کدال دے ماری جس کے صدمے سے دوسری لوندی کا حمل ساقط ہو گیا مقدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا آپؐ نے اس پر ایک لوندی یا غلام بطور دیت لازم فرمائے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ دیتے۔ (الرسالۃ ص ۲۷)

(۶) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک بار عدت سے متعلق ایک معاملہ فیصلہ طلب تھا آپؓ نے حضرت فریحہ بنت مالک بن سنان کے پاس اپنا آجی بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سلسلے میں کیا حکم دیا تھا۔ انہوں نے بنایا کہ آپؐ نے اسی گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا تھا جس میں وہ اس وقت رہا تشر پذیر تھیں تو حضرت عثمانؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیا۔ (جامع بیان العلم جلد ۲)

(۷) حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ کے درمیان طویل جنگ کے دوران دونوں طرف سے اپنی اپنی حفاظت کے لیے حد شیش ہی پڑھی گئیں۔ تمام تر اختلافات کے باوجود کسی طرف سے بھی یہ آواز کبھی نہیں اٹھی کہ اس حدیث تو قابل استناد ہی نہیں ان سے دلیل کیوں پکڑتے ہو۔

(۸) حضرت عبداللہ بن عمرؓ مزارعت میں معاہدہ کے قائل تھے اور چنانچہ خود معاہدہ کیا کرتے تھے لیکن جب حضرت عائشہؓ بن خدیجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ممانعت روایت کی تو آپؐ نے معاہدہ کرنا چھوڑ دیا اور اپنے

قول سے رجوع کر لیا۔ (جامع بیان العلم جلد ۲)

(۹) حضرت عبداللہ ابن عباس نے ایک مرتبہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا ہے یہ سن کر حضرت عروہؓ کے منہ سے نکل گیا کہ شیخین تو تمتع کی ممانعت کرتے تھے اس پر حضرت عبداللہ بن عباس کو غصہ آگیا اور فرمایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم ابو بکر و عمر کا نام لیتے ہو میرا گمان یہاں بالوں سے نیا ہی آئے گی (ترجمان السنۃ از مولانا بدر عالم)

(۱۰) حضرت زید حائضہ کے لیے بھی طواف صدر کرتا واجب سمجھتے تھے لیکن جب حضرت عبداللہ بن عباس نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ کو طواف صدر ترک کرنے کی اجازت دی ہے تو حضرت زید نے فوراً اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ (ترجمان السنۃ)

یہ چند واقعات نمونے کے طور پر پیش کر دیے گئے ہیں ورنہ اگر آثار صحابہ میں سے اس قسم کے واقعات تلاش کیے جائیں تو مستقل ایک تصنیف بن سکتی ہے بہر حال یہ چند واقعات بھی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ صحابہ کرام کے درمیان حدیث کی تشریحی حیثیت کو ایک عقیدے کا درجہ حاصل تھا۔ اس کے بعد جو شخص حدیث کی تشریحی حیثیت کا انکار کرتا ہے وہ ایسی بات کہہ رہا ہے جس کو ان حضرات کی سند حاصل نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطب تھے اور آپ سے انتہائی قریب ہونے کی بنا پر آپ کی لائی ہوئی ہدایت کے اصل مرتبہ و مقام کو درست طور پر سمجھنے کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

عہد رسالت کے فیصلوں میں رد و بدل کا الزام | اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان

واقعات و اعتراضات کا بھی جائزہ لے لیا جائے جن کو بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کر کے منکرین حدیث یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلوں کو تغیر حالات کے مطابق قابلِ ترمیم سمجھتے تھے

اور یہ بات ان کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ صحابہ کرام کے درمیان حدیث کو تشریحی حیثیت حاصل نہ تھی۔

اس سلسلے میں اپنی مقصد برآری کے لیے منکرین حدیث نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور کو اصل تختہ مشق بنایا ہے۔ بحیث حدیث کے بارے میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے اصل طرز عمل پر ہم نے اس کتاب کے پہلے حصے میں اس مقام پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے جہاں منکرین حدیث کے اس بے بنیاد الزام کا رد کیا گیا ہے کہ محاذ اللہ یہ دونوں حضرات انکار حدیث کے نائل تھے۔ تاہم اس بحث پر دوبارہ نظر ڈال لیں یہاں ہم صرف ان واقعات کا ذکر کرنے لگے ہیں جو سے بے سرو پا غلط نتائج اخذ کر کے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوئے فیصلوں میں ترمیم و تبدل کو جائز سمجھتے تھے۔

جیش اسامہ کی روانگی | اس ضمن میں جو واقعات منکرین حدیث کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ

وہ ہے جس میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جیش اسامہ کو شام کی طرف بھیجے جانے کے موقع پر بعض صحابہ کرام کے اس اصرار کا ذکر ہے کہ ان خطرات کے پیش نظر جن کا طوفان اس وقت عرب میں اٹھنا ہوا نظر آ رہا تھا اس لشکر کشی کو ملتوی کر دیا جائے اور اس اصرار کے جواب میں حضرت ابوبکر نے کہا تھا کہ جس کام کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں کر چکے تھے اسے بدل دینے کا میں کسی طرح مجاز نہیں۔ اس واقعہ کو پیش کر کے منکرین حدیث کہتے ہیں کہ اس لشکر کشی کے التوا پر صحابہ کا اصرار یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے ہوا باقی تمام صحابہ اس بات کو جائز سمجھتے تھے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوئے فیصلے کو بدلایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس واقعے میں جب یہ ذکر آتا ہے کہ آخر میں حضرت عمرؓ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اسامہؓ کو ہی اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں کیونکہ بڑے بڑے

صحابہ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں تو منکرین حدیث اہل کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر تک اس بات کے تائیل تھے کہ حالات کے بدلنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بدلے جاسکتے ہیں بلکہ اس موقع پر تو تغیر حالات کا بھی سوال نہیں تھا حضرت عمر اس سالار لشکر کو جس کو اللہ کے رسول نے اپنی زندگی میں مقرر کیا تھا سرف اس لیے بدلنا چاہتے تھے کہ صحابہ اس سے خوش نہیں تھے۔

اس واقعہ سے منکرین حدیث جو غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں اس کا بے بنیاد ہونا تو ابھی ثابت ہوا جاتا ہے مگر اس بحث و تحقیق کے دوران اللہ نے ایک حق بات انہی کے منہ سے نکلوا دی کم از کم حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں تو انہوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ محبت حدیث کے تائیل تھے اور کسی صورت میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلے کو بدل دینے کا کسی کو عجز نہ سمجھتے تھے رہا دوسرے صحابہ کرام کا سوال تو ان کے متذکرہ بالا اصرار سے وہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا جو منکرین حدیث نکلانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ صورت حال یہ نہ تھی کہ حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلے کو بدلنے سے انکار کر رہے ہوں اور صحابہ اس پر مصر ہوں کہ انہیں شرع آپ اس فیصلے پر عمل کرنے کے پابند نہیں ہیں اس لیے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر آپ اس فیصلے کو بدل دیجئے بلکہ اس کے برعکس رہاں تو معاملہ یہ تھا کہ لشکر کشی کے التوا پر یہ اصرار اور تبدیلی قیادت کی خواہش کا یہ اظہار صرف اسی وقت تک تھا جب تک حضرت ابو بکرؓ نے رسول اللہ کے فیصلے کا حوالہ نہیں دیا تھا جو نبی حضرت ابو بکرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کا حوالہ دیا سب صراحتاً اطاعت میں جھکے نظر آنے لگے حضرت عمرؓ سمیت کسی نے بھی اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا جیسا اسامہ روایت ہوا، اسامہ ہی اس کے تائیل رہے اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ نے ان کی قیادت کو راضی خوشی قبول کر لیا ۛ

طلاق ثلاثہ کے مسئلے میں
حضرت عمرؓ کا فیصلہ

دوسرا واقعہ جس سے منکرین حدیث استدلال کرتے ہیں یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک

شمار کر کے طلاق رجعی قرار دیا جاتا تھا حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے تین ہی شمار کر کے طلاق مغلطہ مثلثہ قرار دے دیا۔ منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کا حالات کے مطابق بدل دینا درست جانتے تھے۔

منکرین حدیث کا یہ استدلال بھی کسی طرح درست نہیں اس لیے کہ اس معاملے میں اصل صورت حال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تین طلاق تین ہی سمجھی جاتی تھیں چنانچہ احادیث شاہد ہیں متعدد مقامات میں آپؐ نے ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کر کے فیصلہ دیا ہے لیکن ہوتا یہ تھا کہ جو شخص نہیں مرتبہ طلاق کا الگ الگ تلفظ کرتا تھا وہ اگر یہ عذر پیش کرتا کہ اس کی نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور باقی دو مرتبہ اس نے طلاق کا لفظ محض تاکید کے طور پر کہا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا یہ عذر قبول فرما لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ صرف اتنا ہے کہ جب لوگ کثرت سے تین طلاقیں دے کر ایک طلاق کی نیت کا عذر پیش کرنے لگے تو انہوں نے طلاق کے معاملے کو کھیل بنائے جانے سے بچانے کی خاطر یہ اعلان کر دیا کہ اب یہ عذر قبول نہیں کیا جائے گا اور تین طلاقیں دینے کی صورت میں تین ہی طلاقیں نافذ العمل سمجھی جائیں گی اس کو تمام صحابہ نے بالاتفاق قبول کر لیا ظاہر ہے حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ عہد رسالت کے کسی قانون میں ترمیم کی حیثیت کا حامل نہ تھا اس لیے کہ نیت کے عذر کو قبول کرنا قانون نہیں ہے اس کا انحصار تو تاضی کی اس رائے پر ہے کہ وہ نیت بیان کرنے والے کو صادق القول سمجھتا ہے یا نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس طرح کا عذر پیش کرنے والے جانے پہچانے چند گنے چنے لوگ تھے جن کی راستبازی اول تو

لوں بھی آپ کے نزدیک بے گمرد و غبار ہوگی دوسرا نہ روئے دجی بھی ان لوگوں کی راست بازی سے آپ کے واقف ہو جانے میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عذر قبول کر لیا۔ لیکن حضرت عمر کے زمانے میں ایران سے مصر تک اور یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سلطنت کے شخص کا یہ عذر عدالتوں میں لازماً قابل تسلیم نہ ہو سکتا تھا بالخصوص جبکہ لوگوں نے بکثرت تین طلاق دے کر ایک طلاق کی نیت کا عذر پیش کرنا اپنا ویرہ بنالیا ہوا اس لیے اس مسئلے میں حضرت عمر کے فیصلے کی نوعیت یہ نہ تھی کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے کسی فیصلے یا آپ کے بنائے ہوئے کسی قانون میں کوئی تغیر و تبدل کر دیا تھا بلکہ اصل نوعیت یہ تھی کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ ایک قانون کی اصل روح کو برقرار رکھنے کا انتظام فرمایا تھا :

مفتوحہ اراضی کی تقسیم | اسی ضمن میں ایک اور مثال دیتے ہوئے منکرین حدیث یہ بھی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں لیکن حضرت عمر نے اپنے عہد میں مفتوحہ زمینوں کی یہ تقسیم بند کر دی اور اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ہٹ کر اپنی صوابدید کے مطابق ایک نیا طرز عمل اختیار کر کے یہ جتلا دیا کہ تغیر حالات کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں سے ہٹ کر بھی ایک نیا فیصلہ رد و بہ عمل لایا جاسکتا ہے۔

یہاں بھی منکرین حدیث نے بے بنیاد مغالطہ دینے کی کوشش ہے حضرت عمر نے اپنے عہد میں صحابہ کے مشورے سے مفتوحہ اراضی کا جو بندوبست کیا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں رد و بدل کی مثال نہیں قرار دیا جاسکتا اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کبھی نہیں فرمایا تھا کہ مفتوحہ اراضی ہمیشہ مجاہدین میں تقسیم کی جاتی رہیں اگر ایسا کوئی حکم آپ نے دیا ہوتا اور حضرت عمر نے اپنے عہد میں اس کے خلاف عمل کیا ہوتا تو کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے میں

رد و بدل کر دیا یا پھر یہ بات اس وقت صادق آسکتی تھی جبکہ حضرت عمرؓ نے ان زمینوں کو جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں مجاہدین میں تقسیم کیا تھا ان سے واپس لے لیا ہوتا ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بھی پیش نہیں آئی تو پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے ہٹ کر ایک نیا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس معاملے میں اصل صورت حال یہ ہے کہ مفتوحہ زمینوں کو لازماً مجاہدین میں تقسیم کر دینا سرے سے کوئی اسلامی قانون تھا ہی نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مفتوحہ اراضی کے معاملے میں حسب موقع و ضرورت مختلف مواقع پر مختلف فیصلے فرمائے تھے۔ بنو نظیر، بنو قریظہ، خیبر، فدک، وادی القریٰ، مکہ اور طائف کی مفتوحہ زمینوں میں سے ہر ایک کا بندوبست عہد رسالت میں الگ الگ طریقوں سے کیا گیا تھا۔ انہی کوئی ضابطہ یا قانون نہیں بنایا گیا تھا کہ آئندہ مفتوحہ اراضی کا بندوبست لازماً فلاں فلاں طریقے پر کیا جائے ایسی صورت میں حضرت عمرؓ کا اپنے زمانے میں مفتوحہ اراضی کا کوئی بھی بندوبست عہد رسالت کے کسی ضابطے یا قانون کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا جاسکتا ۛ

مؤلفۃ القلوب اور حضرت عمرؓ کا استدلال | منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں بلا سوچے سمجھے مؤلفۃ

القلوب کے مسئلے کو بھی زیر بحث لاتے ہیں کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کو صدقات کی مدد سے امداد دی جاتی تھی حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اسے ختم کر دیا معلوم ہوا حضرت عمرؓ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں رد و بدل کو جائز سمجھتے تھے۔

یہاں اعتراض کرنے کے جوش میں منکرین حدیث یہ بھی بھول گئے کہ صدقات کی مد میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا تھا۔ ذرا سورہ نوبہ کی وہ آیت دوبارہ نکال کر دیکھ لیجئے جس میں صدقات کی آٹھ مدت کا بیان ہوا ہے غور سے دیکھئے اس میں مؤلفۃ القلوب کی مد شامل

ہے یا نہیں کیا اب منکرین حدیث یہ کہیں گے کہ حضرت عمرؓ معاذ اللہ قرآن کے فیصلوں کو بھی حسب ضرورت تبدیل کر دینے کے قائل تھے اگر منکرین حدیث نے قہوراً غور و فکر سے کام لے لیا ہوتا تو مؤلفۃ القلوب کے مفہوم ہی پر غور کر لیا ہوتا۔ صدقات کی مد میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ صدقات میں سے

ان لوگوں کو بھی مال دیا جاسکتا ہے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو حضرت عمرؓ کا استدلال یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلامی حکومت کو تالیف قلب کے لیے مال دینے کی ضرورت تھی اس لیے آپ اس مد سے لوگوں کو دیا کرتے تھے لیکن اب اسلامی حکومت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ اس غرض کے لیے اب کسی کو مال دینے کی حاجت نہیں رہی اس لیے اب ہم اس مد میں کوئی پیسہ خرچ نہیں کریں گے۔ اب غور کر کے بتائیے کیا اس سے ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا ہوا کوئی فیصلہ بدل ڈالا کیا واقعی آپ کا فیصلہ یہی تھا کہ تالیف قلب کی حاجت ہو یا نہ ہو ہر حال کچھ لوگوں کو ضرور مؤلفۃ القلوب قرار دیا جائے اور صدقات میں سے ہمیشہ ہمیشہ ان کا حصہ نکالا جاتا رہے۔ کیا خود قرآن نے بھی یہ لازم قرار دیا ہے کہ تالیف قلب کی مد پر ہر حال میں صدقات میں سے کچھ کچھ ضرور خرچ کیا جائے۔

در اصل بات کچھ بھی نہیں منکرین حدیث کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کے پیچھے دلیل و برہان کی قوت موجود ہے یا نہیں وہ بلا سوچے سمجھے ایک دعویٰ کر بیٹھے ہیں اور پھر اس کو نبھانے کے لیے کبھی قرآن و حدیث میں دو روز کا ر تاویلات سے کام لیتے نظر آتے ہیں اور کبھی حالات و واقعات کو توڑتے مروڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں بھی وہ یہ دعویٰ تو کر بیٹھے کہ صحابہ کرام تغیر حالات کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں رد و بدل کرنا جائز سمجھتے تھے مگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کو ثابت نہ کر سکے۔ جتنی مثالیں وہ اس سلسلے میں دیتے ہیں وہ سب کی سب ان کے حق میں جانے کے بجائے انہی کے خلاف ثبوت فراہم کرتی نظر آتی

ہیں اور یہ حقیقت اور زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے کہ صحابہ کرام بالاتفاق حدیثِ رسول کی تشریحی حیثیت کے قائل تھے۔

حدیث کی تشریحی حیثیت کے ثبوت میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کو سامنے رکھ کر آدمی سوچے صحابہ کرام کی جماعت جو وحی الہی کی اولین مخاطب ہے وہ حدیث کی تشریحی حیثیت کی قائل ہے خود صاحبِ وحی یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ حدیث کی اتباع کو اپنے اقیقوں پر واجب قرار دیتی ہے اور اس پر مزید خود وحی الہی حدیثِ رسول کی اطاعت کو قرآن کی اطاعت کے مترادف ٹھہراتی ہے پھر اس کے بعد جو شخص حدیث کی تشریحی حیثیت کا انکار کرتا ہے وہ بلاشبہ صحابہ کی جماعت سے علیحدہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قطعاً طاعت سے باہر اور قرآن کی پیروی سے منحرف ہے یا نہیں؟

خبر واحد کی حجیت

حدیث کی تشریحی حیثیت کو مشکوک بنانے اور اسے کمزور کرنے کی خاطر منکرین حدیث خبر متواتر اور خبر واحد کی بحث بھی چھیڑا کرتے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خبر واحد کی حجیت پر بھی تفصیل سے کلام کیا جائے۔

جو باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچی ہیں ان کو دو حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ حصہ جو تواتر کے ساتھ آیا ہے اور اس سے حاصل شدہ علم قطعی اور یقینی ہوتا ہے اور دوسرے وہ حصہ جو تواتر کے ساتھ نہیں آیا اور اس سے حاصل شدہ علم ظن غالب کے درجے میں ہے اصول حدیث کی اصطلاح میں ہم اسی بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ حدیث کی دو قسمیں ہیں : ایک خبر متواتر اور دوسری خبر واحد۔ خبر متواتر اس خبر کو کہتے ہیں کہ جس کے بیان کرنے والے اس قدر مختلف اور بے شمار ہوں کہ عقل سلیم اتنے مختلف طبقوں کے آدمیوں کا مل کر ایک جھوٹ گھڑ لینے کو محال سمجھے اور خبر واحد وہ خبر ہے جس کے بیان کرنے والے اس قدر کثیر اور بے شمار نہ ہوں جس قدر متواتر میں ہوتے ہیں خواہ وہ ایک یا دو ہوں یا تین اور چار ہوں۔ اس طرح پر ہر وہ خبر جو متواتر نہ ہو اصطلاحی طور پر خبر واحدی کہلاتی ہے۔

تمام امت کا اس پر تو اتفاق ہے کہ خبر متواتر سے علم قطعی اور یقینی حاصل ہوتا ہے اور خبر واحد سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے، خبر واحد کو مفید علم یقین کوئی بھی نہیں کہتا مگر اختلاف جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ ظنیت کی بنا پر خبر واحد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ جمہور کے نزدیک خبر واحد اگر سچے اور ثقہ راوی سے مروی ہو تو معتبر قابل قبول اور واجب العمل ہے جبکہ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ خبر واحد سے چونکہ علم ظنی حاصل ہوتا ہے اور ظنیت میں خطا و نسیان کا احتمال ہر وقت باقی رہتا ہے

خواہ وہ سچے اور ثقہ راوی ہی سے مروی کیوں نہ ہو اس لیے اس سے استدلال درست نہیں پھر اسی بنیاد پر منکرین حدیث یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ احادیث کا تمام مجموعہ ظنی ہے اس لیے بالسطح رد کر دینے کے لائق ہے کیونکہ جو چیز ظنی ہوتی ہے وہ ثابت شدہ نہیں ہوتی اور جو ثابت شدہ نہ ہو وہ لائق اتباع نہیں ۛ

اصولی غلطی | اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جو چیز ظنی ہوتی ہے وہ ثابت شدہ نہیں ہوتی مگر منکرین حدیث کا یہ کہنا اصولی طور پر غلط ہے کہ جو چیز ثابت شدہ نہ ہو وہ قابل اتباع نہیں۔ انسان اکثر و بیشتر معاملات میں صرف اُس تحقیق پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہے جس سے ظن غالب حاصل ہوتا ہے اگر وہ اس تحقیق میں شک کرے اور علم یقین کے بغیر سہرات ماننے سے انکار کر دے تو وہ دنیا کے کام کا نذر ہے۔ ہمارا زندگی کے بیشتر معاملات ایسے ہیں جن میں ہم اخبار آماد یعنی ایک دو راویوں کی دی ہوئی خبروں کو تسلیم کرتے ہیں اور انہی پر اپنے فیصلوں اور اپنے علم و عمل کا مدار رکھتے ہیں۔ جہاں تک اخبار آماد میں خطا و لیاں کے احتمال کا تعلق ہے تو بات دراصل یہ ہے کہ محض خبر ہونے کی حیثیت سے تو ہر خبر میں سچ اور جھوٹ ہونے کا امکان احتمال ہوتا ہے مگر ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے لیے ہم محض خبر کے ہونے ہی پر نظر نہیں رکھتے بلکہ خارجی قرائن سے مدد لیکر صدق یا کذب کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ خبر متواتر میں راویوں کی تعداد کی زیادتی وہ خارجی قرینہ ہے جس کی بنا پر ہم اسے قطعی اور یقینی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ہم اخبار آماد کی امکانی باخ پڑتال کر کے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ اسی ترجیح سے ہمیں صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر اس ظن پر ہم اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح علم یقین حاصل ہونے کی صورت میں کرتے ۛ

یقینیات کی شرط اور دنیوی معاملات | اتباع کے لیے یقینیات کو اگر لازمی شرط قرار دے دیا جائے

تو دنیا میں جینا محال ہو جائے ہماری زندگی کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں ہم صرف یقینیات کی پیروی کرتے ہیں اور منظونات کو بالکل رد کر دیتے ہیں؟ منظونات کو بالکل رد کر دینے کا قاعدہ زندگی میں نہ کبھی چلا ہے نہ چل سکتا ہے عقل سلیم کا تقاضا یہی ہے اور اسی کی پیروی ہم زندگی کے تمام معاملات میں کرتے ہیں کہ تمام منظونات کو بیک تلم رد کر دینے کے بجائے ان کے درمیان تمیز کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ جانچ کر دیکھتے ہیں اور تحقیق کے مختلف ذرائع سے کام لیکر یہ دریافت کرتے ہیں کہ کونسی چیز یقین سے کس درجہ قریب یا کس درجہ بعید ہے جو چیز بعید ہو اسے رد کر دیتے ہیں جو چیز قرب و بعد کے درمیان ہو اس میں توقف کرتے ہیں تا آنکہ کسی ایک وجہ کو ترجیح ہو جائے اور جو چیز قریب یا اقرب ہوتی ہے اس کو بہ لحاظ اس کے درجہ قرب کے قبول کر لیتے ہیں۔ یہی اصول ہے جس پر دنیا کے سارے معاملات چل رہے ہیں۔

اگر ایک ثقہ اور سچے آدمی کی خبر کو محض اس وجہ سے رد کر دیا جائے کہ وہ درجہ تراثر کو نہیں پہنچی تو کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے۔ دنیا کے تقریباً تمام کاروبار اخبار آحاد پر چل رہے ہیں تجارت کا سارا نظام انہی کی بنیاد پر قائم ہے بہت سی خبریں ہم کو تار اور اخبارات کے ذریعے سے ملتی ہیں جن میں عقلاً صدق و کذب دونوں پہلوؤں کا احتمال ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس شخص نے ہمیں نار دیا ہے وہ فی الواقع آیا وہی شخص ہے جس کا نام تار پر لکھا ہوا ہے؟ اس کے علاوہ جو خبر وہ دے رہا ہے ہمیں نہیں معلوم وہ اسے کس ذریعے سے معلوم ہوئی؟ نیز اس کا ذریعہ معتبر ہے یا نہیں؟ اسی قسم کے بہت سے احتمالات کی گنجائش ہر تار کی خبر میں موجود ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کا سارا کاروبار ہی ان خبروں کی بنیاد پر چل رہا ہے وہ ان احتمالات کے چکروں میں نہیں پڑتے محض ظاہری فرائض سے جانچ لیتے ہیں کہ تار انہی کے کارندے کا دیا ہوا ہے یا نہیں اور جب ایک فن غالب اس خبر کے سچ ہونے پر انہیں ہو جاتا ہے تو اس پر اپنے لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے اگر آج اس اصول کو مان لیا جائے کہ محض فن غالب پر عمل درست نہیں تو کیا

کوئی بے چارہ تاجر تجارت کر سکتا ہے۔

اسی طرح سرکاری وغیرہ سرکاری دفاتر کے تمام معاملات، رسل و رسائیں، نامہ و پیام، تار اور ٹیلی فون کا تمام تر مدارِ خبر و ادوار پہنچ رہا ہے۔ دفاتر کے تمام پیغامات کا رادیو ایک بے چارہ بے علم چپڑا ہی تو ہوتا ہے ذرا تصور کیجئے دفتر کا کوئی افسر کسی کارکن کو بلانے کے لیے چپڑا ہی بھیجے اور وہ کارکن اپنے افسر کا حکم پا کر یہ کہنے لگے کہ چونکہ یہ خبر چپڑا ہی ایک فرد و احد لایا ہے اس میں جھوٹ کا احتمال موجود ہے اس لیے میں اس خبر پر اعتماد نہیں کرتا اور یہ کہہ کر چپڑا ہی کو واپس کر دے تو کیا ایسے کارکن کو دفتر میں رکھے جانے کے قابل سمجھا جائے گا اور اگر دفتر کے سارے کارکن اسی اصول پر عمل کرنے لگیں تو کیا دفتر کا نظام ایک دن بھی چل سکتا ہے؟

ہماری زندگی کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم اور نازک معاملہ عدالت کا ہے۔ عدالتوں میں خالص اور مٹھوس عقلی امتحان پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے تصاضی یا جج کے سامنے جتنے مقدّمات پیش ہوتے ہیں ان کے ثبوت کے لیے بہت کم کیا شاذ و نادر ہی شہادتیں تو اتر کی حد کو پہنچتی ہیں اکثر و بیشتر معاملات میں جج کے سامنے صرف اخبار آحاد ہی پیش ہوتی ہیں جنہیں وہ جرح و تعدیل، قرائن و آثار اور قیاس عقلی کی کسوٹی پر پرکھ کر سبج اور جھوٹ کے امکانی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو راجح قرار دیتا ہے اور جو پہلو راجح ہوتا ہے اسی پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھتا ہے اور اس طرح فیصلہ کرتا ہے جیسے اس کے نزدیک وہ مقدمہ یقین کی حد تک ثابت ہو گیا ہے۔ فرض کیجئے کوئی جج ہر شاہد کو جھوٹا اور ہر شہادت کو غلط ٹھہرا کر اپنا کام شروع کرے اور ہر واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے اس بات پر اصرار کرے کہ یا تو واقعہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے یا پھر تو اتر کی حد کو پہنچتی ہوئی شہادتیں اس کے سامنے پیش ہوں تو کیا ایسا جج کسی ایک مقدمے کا فیصلہ بھی کبھی کر سکے گا یا انجاء آحاد پر اسے اعتماد کرنا پڑے گا یا عدالت کی کرسی چھوڑنی پڑے گی۔

اور تو اور ہم میں سے ہر شخص کو یہ بات کہ وہ اپنے باپ کی جائزہ اولاد ہے صرف اپنی ماں کی روایت سے معلوم ہوتی ہے اس خبر و ادوار میں جس کے لیے کوئی دوسرا شاہد سرے

سے مل ہی نہیں سکتا خبریت کے لحاظ سے صدق و کذب دونوں پہلوؤں کا یکساں احتمال ہے لیکن کوئی شریف آدمی اس میں کذب کے پہلو کو ترجیح دینا تو درکنار کسی ادنیٰ درجے میں بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوگا کہ اسے اپنے باپ کی جائز اولاد ہونے میں شک ہے۔ اس خبر واحد کو ظنیت کی بنا پر اگر رد کر دیا جائے تو بتائے ان قرابتوں اور رشتے داریوں کا کیا بن جن کی بنیاد پر نکاح اور شادی بیاہ چل رہے ہیں اور وراثتیں تقسیم ہو رہی ہیں۔

یقینیات کی شرط اور مذہبی معاملات | دینی معاملات ہی میں نہیں مذہبی معاملات میں بھی یہی صورت ہے

یقینیات کی شرط لگا کر اور ظنیت کی بنا پر خبر واحد کو بالکل رد کر کے آپ ایک قدم آگے نہیں چل سکتے فرض کیجئے آپ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جاتے ہیں وضو کے پانی کے بارے میں آپ پوچھتے ہیں کیا پاک ہے؟ خادم مسجد خبر دیتا ہے کہ ہاں پاک ہے آپ اس کی اطلاع کو خبر واحد قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں آگے بڑھتے ہیں صفوں کے بارے میں استفسار کرتے ہیں کہ کیا پاک ہیں پھر وہی خبر واحد آپ کو ملتی ہے کہ جی ہاں پاک ہیں، امام نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوتا ہے خبر دیتا ہے کہ میں با وضو ہوں، میرے کپڑے پاک ہیں آپ اس کو خبر واحد کی بنا پر رد کر دیتے ہیں فراموشی سے اس طرح ہر خبر کو خبر واحد ہونے کی بنا پر اگر آپ رد کرتے رہے تو کیا ایک وقت کی نماز بھی آپ پڑھ سکتے ہیں؟

مذہبی معاملات میں سب بڑی چیز جس پر ہمارے ایمان کا دار و مدار ہے قرآن حکیم ہے اس کتاب کا کلام الہی ہونا ہمیں خبر واحد ہی کے ذریعے سے معلوم ہوا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کی وحی ہے جس نے ہمیں یہ خبر دی کہ قرآن حکیم کلام الہی ہے، نفس خبر ہونے کے لحاظ سے تو اس خبر میں بھی صدق و کذب دونوں پہلوؤں کا احتمال ہے۔ خبر واحد اگر بالکل رد کر دینے کے قابل ہے تو کیا قرآن حکیم کا کلام الہی ہونا بھی معاذ اللہ مشکوک و ناقابل قبول ٹھہرے گا؟ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم کہ قرآن کلام الہی ہے خبر واحد ہی کے ذریعے ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی آتی تھی وہ تن تنہا حضرت جبریل علیہ السلام ہی لے کر آتے تھے۔ قرآن خود کہتا ہے اِنَّا نَقُولُ رَسُوْلًا كَرِيْمًا (یہ قرآن) تو لے

ایک رسول کریم (جبرئیل) کا۔ الحاقہ - ۱۰) تو کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل کی لائی ہوئی وحی کو قبول کرنے سے محاذ اللہ انکار کر دینا چاہیئے تھا؟
 کون نہیں جانتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی ہر امت کی طرف ایک ہی ہادی و نذیر آیا، ایک ہی پیغمبر نے لوگوں کو خدائے بزرگ و برتر کا پیغام پہنچایا۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام تنہا تنہا ہی اپنی اپنی امتوں کی طرف مبعوث ہوئے اور ہر ایک نے اکیلے اکیلے ہی خدائی دین کی نقل و روایت امت کے سامنے پیش کی یہ خبر واحد نہیں تو اور کیا تھی؟ کیا خدا سے محاذ اللہ بھول ہو گئی کہ اس نے دین کی روایت خبر واحد کے ذریعے کرادی جس سے صرف علم ظنی حاصل ہوتا ہے؟
 اور ظن موجب عمل نہیں۔ اب جن لوگوں نے پیغمبر کا انکار کیا تو کیا محاذ اللہ بالکل درست کیا کہ خبر واحد ہوتی ہی رد کر دینے کیلئے ہے؟ خدا پر کچھ تو عقل سے کام لیجئے۔ خبر واحد کو بالکل رد کر کے سوچئے تو سہی کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔

اخبار آحاد کو بالکل رد کر دینے سے دین کے معاملے میں عملاً جو خرابی واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جزئیات میں انسان رسالت کی رہنمائی سے محروم ہو جاتا ہے اور دین پر عمل کرنے کی تفصیلی صورتوں میں قیاسی رائے کا دخل اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس سے خود اصولی احکام کی اصل روح کے بھی ضائع ہو جانے کا خوف ہے۔ علاوہ ازیں جب تفصیلات میں سرے سے کوئی سند ہی نہ ہوگی تو ہر شخص اپنی رائے اور اپنے رجحان کے مطابق جو صورت چاہے گا اختیار کرے گا نتیجتاً تفرقہ، انتشار اور اختلاف گوراہ ملے گی ہر شخص جزئیات کو اپنی رائے سے مقرر کرے گا اور کسی رائے کو بھی کوئی ایسی قوت حاصل نہ ہوگی جس کی بنا پر اسے دوسری رائے کے مقابلے میں ترجیح دی جا سکے اور مسلمانوں کی کسی برسی جماعت پر اس کی بیروی لازم ہو جائے۔ ہر کوئی بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس سے جزئیات میں کس قدر فساد و فتنہ برپا ہوگی، نظام جماعت کو کتنا نقصان پہنچے گا اور کس طرح بعض صورتوں میں مقاصد شریعت تک فوت ہو جائیں گے۔ اسلام کے نظام شریعت میں غور کریں وہ چیز جو اس نظام کو ایک مستقل علیٰ ڈھانچہ مہیا کرتی ہے اور وہ چیز جو مسلمانوں کی تہذیب

مذہب، معاشرت، معیشت اور سیاست غرض ان کی پوری اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ کو ایک مستقل تفصیلی شکل میں ڈھالتی ہے وہ وہی علم تو ہے جو اخبار آماد سے ہم کو اصل ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس و نجی زندگی، آپ کی عادات، آپ کے اطوار، آپ کے اخلاق، آپ کی تعلیم و تبلیغ کا طریقہ، آپ کا طرز معاشرت، زندگی کے مختلف شعبوں میں آپ کی ہدایات اور آپ کا طرز عمل، پھر آپ کے خلفاء و دیگر صحابہ و اہل بیت کے اثبات ہی وہ چیزیں ہیں جن سے مل کر اسلام کا پورا نظام شرعی تیار ہوتا ہے اور جو اسلام کی عملی زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتی ہیں مگر کون نہیں جانتا کہ ان چیزوں کے حصول کا ذریعہ صرف اخبار آماد ہی ہیں جن کو اگرناطیہ رد کر دینے کا اصول اپنایا جائے تو اسلام محض ایک ایسا ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس پر گوشت پوست کچھ نہ ہو۔

خبر واحد کی حجیت اور قرآن کریم | خبر واحد کی حجیت پر اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ خالصتاً عقلی حیثیت سے تھا، آئیے اب ہم

یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اس بارے میں کیا فیصلہ ہے :

۱۔ اس کے لیے ہم اپنے تاریکین کی توجہ سب سے پہلے ان بیسیوں آیات قرآنی کی طرف دلاتے ہیں جن میں قرآن نے مختلف پیغمبروں کی دعوت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن جگہ جگہ کہتا ہے اِذْ قَالَ لَهُمُ اخُوهُمْ نُوْحٌ - اِذْ قَالَ لَهُمُ اخُوهُمْ هُوْدٌ - اِذْ قَالَ لَهُمُ اخُوهُمْ صَالِحٌ اور اِذْ قَالَ لَهُمُ اخُوهُمْ لُوطٌ یہ مختلف انبیاء کا اپنے اپنے زمانے میں اپنی قوم کو دعوت دینا اور پھر قوم کے جھٹلانے پر قرآن کا بار بار یہ کہنا کہ فَكَذَّبُوهُ فَاَهْلَكْنَاهُمْ اور فَكَذَّبُوهُ فَاَهْلَكْنَاهُمْ يَوْمَ الظَّلَامَةِ اور ثُمَّ غَرَقْنَاهُ ابداً لِّبَقِيْنِ اور ثُمَّ دَمَرْنَا الْاٰخَرِيْنَ یہ سب کیا ہے یہ خبر واحد کی حجیت کا منہ بولتا ثبوت ہی تو ہے۔ ایک نبی تنہا اپنی قوم کو ایک خبر دیتا ہے قوم اسے جھٹلاتی ہے اور اس کی پاداش میں عذاب الہی میں گرفتار ہو جاتی ہے اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ خبر واحد کا جھٹلانا سبب ہوا عذاب الہی ہے اگر قرآن کی نظر میں خبر واحد حجت نہ ہوتی تو قوم کے عذاب الہی میں گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ قرآن کریم کی یہ بیسیوں آیات گویا خبر واحد کی حجیت اور اس کے واجب التسليم

ہوئے کا زبردست ثبوت ہیں۔

ان آیات کے بارے میں ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ رسول اور نبی کی شخصیت ایک غیر معمولی شخصیت ہے ان کی دی ہوئی خبر کا ماننا درحقیقت رسالت اور نبوت کے تدریجی دباؤ کا اثر ہے نہ کہ اصول فن کا تقاضہ۔ یعنی رسول کی دی ہوئی خبر واحد کوئی نفی یا اصولی خبر واحد نہیں کہ مندرکہ بالا آیات کی نظروں سے اسے قرآن سے ثابت شدہ مانا جائے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اس کی قرآن سے ناواقفیت کی دلیل ہے، قرآن نے کہیں بھی کسی پیغمبر کی دی ہوئی خبر کو پیغمبری یا رسالت و نبوت کے دباؤ سے منوانے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف اصول روایت اور فنی قواعد کے لحاظ سے ہی اس کے ماننے اور واجب الاعتبار سمجھنے پر زور دیا ہے۔ چنانچہ قرآن ایک مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر واحد کی توثیق کرتا ہے تو وصف رسالت کو اس کی بنیاد نہیں بناتا بلکہ اصول روایت کو بالتصریح اس کا مدار معیار ٹھہراتا ہے۔ ارشاد ہے :

تم ہے تارے کی جب وہ ڈوبنے لگے کہ یہ
تمہارے ساتھ کے رہنے والے نہ بھٹکے اور
نہ غلط راستے پر ہولے اور نہ وہ اپنی خواہش
نفسانی سے باتیں بناتے ہیں ان کا کلام تو تمام تر
وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۖ مَا ضَلَّ
صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۚ وَمَا يَنْطِقُ
عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ
يُوحَىٰ
(النجم : ۱-۳)

اس آیت کے الفاظ میں غور کیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے پہنچی ہوئی اس خبر واحد کو قرآن واجب الاعتبار ٹھہرا رہا ہے تو یہ کہہ کر نہیں کہ آپ نبی اور رسول ہیں بلکہ بطور خاص صاحبکم تمہارا ساتھ کار رہنے والا کہہ رہا ہے گویا خبر واحد کے منوانے میں قرآن رسالت کا دباؤ دونوں پر نہیں ڈالنا چاہتا پھر اس کے ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے قرآن جن صفات قیسمہ کی نفی کر رہا ہے وہ سب وہی ہیں جو اصول روایت میں مطاعن کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی بنا پر روایت مخدوش ہو جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کہنا یہ چاہتا ہے کہ اس خبر واحد کو اس لیے مان لو کہ اس کے راوی ہیں مطاعن

روایت میں سے کوئی مطعن موجود نہیں ہے۔ دیکھ لیجئے قرآن سب سے پہلے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ضلالت کی نفی کرتا ہے کیونکہ بے راہ روا اور ناواقف کی بات ہرگز قابل اعتبار نہیں ہوتی پھر آپ کی ذات سے غوایت کی نفی کرتا ہے ظاہر ہے راہ سے بھٹکا ہوا اور غلط راستے پر چلنے والا الٹی ٹیسی سمجھ رکھتا ہے اور الٹی ہی بات کہتا ہے جس کی بنا پر اس کی روایت بھی قابل التفات نہیں ہوتی۔ پھر اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بنانے والے بھی نہیں ہیں کیونکہ ایسا شخص خود غرض ہوتا ہے اور خود غرض کی بات بھی لائق اعتبار نہیں ہوتی۔ یہ بے راہ روی، ناواقفیت، کج راہی اور خود غرضی سب مطاعن روایت ہی تو ہیں جن کی نفی کر کے قرآن یہ بتلانا چاہتا ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر واحد کو اس لیے تسلیم کر لو کہ آپ میں کوئی نہمت اور کوئی طعن موجود نہیں ہے۔ آخر میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ان مطاعن روایت کے موجود نہ ہونے کی علت بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ ان مطاعن کی غیر موجودگی راوی کے صاحب دہی ہونے کی بنا پر ہے جو پیغمبر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا اور نبوت و رسالت ایک ایسا اعلیٰ مقام ہے کہ اس کے ساتھ بے راہ روی، ناواقفیت اور خود غرضی جیسے مطاعن کبھی جمع نہیں ہو سکتے گویا نبوت کے وصف کو اول تو قرآن نے صراحتاً ذکر ہی نہیں کیا پھر اشارۃً ذکر بھی کیا تو منصب کی حیثیت سے نہیں بلکہ مطاعن روایت کی غیر موجودگی ثابت کرنے کے لیے بطور علت کے ذکر کیا۔ یہ اسلوب کلام صاف بتلا رہا ہے کہ خبر واحد کی حجیت کو رسالت کے دباؤ سے نہیں منوایا جا رہا ہے بلکہ اس کو معیار روایت پر پورا پورا اترنے اور مطاعن روایت سے پاک ہونے کی وجہ سے واجب التسلیم قرار دیا جا رہا ہے۔

غرض وہ بیسیوں آیات قرآنی جن میں انبیاء کی طرف سے اپنی اپنی قوم کو فرداً فرداً دعوت دینے کا ذکر ہے وہ سب کی سب، اس بات کا زبردست ثبوت ہیں کہ قرآن کے نزدیک خبر واحد حجت ہے۔ تاہم ان آیات قرآنی کے علاوہ ایسی آیات بھی متعدد پیش کی جاسکتی ہیں جن سے غیر رسول اشخاص کے حوالے سے دی گئی خبر واحد کی حجیت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ مثال

کے طور پر۔

(۲) قرآن انحاب قریہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

اور ایک شخص اس شہر کے کسی دور مقام سے دوڑتا	وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ
ہوا آیا اور کہنے لگا کہ اے میری قوم والو رسولوں	يَسْعَىٰ قَالَ يَاقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ
کی راہ پر چلو۔	(یس - ۲۰)

اور پھر جب قوم کے لوگوں نے اس شخص کی بات نہ مانی تو ان پر عذاب الہی آنے کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے :

وہ (سزا) تو بس ایک پیچھے تھی کہ سب	ان كانت الا صيحة واحدة
اسی دم بجھ کر رہ گئے۔	فاذا هم خدون (یس - ۲۹)

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس شخص کی دی ہوئی خبر واحد اس کی قوم کے لوگوں پر حجت نہ ہوتی تو اس کی بات نہ ماننے پر اس کی قوم کے لوگ عذاب کے مستحق نہ ہوتے اور عذاب الہی ایک ہی چنگھاٹ میں وہ جل بجھ کر رہ جاتے۔ یہ عذاب کا بالمتصریح ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کی دی ہوئی خبر واحد قرآن کی نظر میں اس کی قوم کے لوگوں پر حجت تھی۔

(۳) اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ایک قبطی مارا جاتا ہے تو ایک شخص آپ کو اکرا اطلاع دیتا ہے کہ فرعون آپ کے قتل کے درپے ہے اس لیے آپ اپنی جان بچا کر نکل جائیے۔ اس واقعے کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :

اور ایک شخص شہر کے کنارے سے دوڑا ہوا آیا	وَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ
کہنے لگا اے موسیٰ اہل دربار آپ کے متعلق مشورہ	يَسْعَىٰ قَالَ يَوْمُئِذٍ إِنَّ الْمَلَأَىٰ تَحْمُرُونَ
کر رہے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیں سو آپ چلے جائیں	بَلِّغْ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ اِنِّى لَكَ مِنَ
میں آپ کا بڑا غیر خواہ ہوں سو موسیٰ وہاں سے	التَّحْسِينِ هُوَ فَخَرَجَ مِنْهَا خَالِفًا
خوف اندیشے کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔	يَتَرْتَبِ (القصص - ۲۰-۲۱)

ظاہر ہے اس شخص کی لائی ہوئی خبر خبر واحد ہی تھی کیونکہ بلاشبہ وہ ایک فرد واحد کی خبر تھی کسی جماعت کی نہ تھی لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس کی خبر مان لی اور اس کا اتنا اثر لیا کہ آپ کے دل پر خوف طاری ہو گیا بلکہ صرف اثر ہی نہیں لیا اس خبر کی بنیاد پر آپ شہر سے نکل بھی کھڑے ہوئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خبر واحد حجت نہ تھی تو حضرت موسیٰ نے اس کو قبول کیوں کیا۔ اس آیت میں اِنِّیْ لَمِّیْ مِنَ الصَّحٰیحِیْنَ کے الفاظ قابل غور ہیں خبر دینے والا خود اپنی خبر کی توثیق یہ کہہ کر کر رہا ہے کہ میں یہ خبر اپنی ہوائے نفس یا کسی دوسرے کے بہکائے سکھائے سے غلط نہیں دے رہا ہوں محض آپ کی خبر خواہی کی خاطر آپ کو مطلع کرتے آیا ہوں گویا یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ میری روایت ہر قسم کے مطاعن سے پاک ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اوصاف راوی کے سلسلے میں سب سے بڑا وصف بے لوثی ہے جس سے خبر کی پوزیشن صاف ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو حضرت موسیٰ نے اس خبر کو قبول بھی اسی لیے کہا کہ روایت اصولی روایت کے عین مطابق تھی راوی متم نہ تھا، محروح نہ تھا اور ہوائے نفسانی سے خبر نہیں دے رہا تھا۔

بہر حال دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے فرد واحد نے جو پیغمبر نہیں ہے ایک عام آدمی ہے ایک خبر روایت کی اور ایک پیغمبر نے اس روایت کو قبول کر کے نہ صرف اثر لیا بلکہ اس کی بنیاد پر عمل بھی کیا اس سے بڑھ کر خبر واحد کی حجیت کے معتبر ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر بھی خبر واحد کو قبول کیا جب آپ مصر سے نکل کر مدین میں پہنچے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی اپنے والد کی طرف سے آپ کو بلانے آئیں انہوں نے اپنے والد کا پیغام ان الفاظ میں دیا :

میرے والد تمہیں بلاتے ہیں تاکہ تم کو اس کا صلہ
دیں کہ تم نے ہماری خاطر (ہمارے ہاندروں کو)
پانی پلا دیا تھا۔

اِنَّ اٰجِیْ یَدْعُوْکَ لِیَجْزِیْکَ اَجْرٌ
مَا سَقِیْتَ لَنَا۔

(القصص - ۲۵)

حضرت موسیٰ یہ پیغام سنتے ہی حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کے ساتھ چل پڑے۔

ایک عورت کی دی ہوئی خبر اگر حضرت موسیٰ کے نزدیک ناقابل قبول نہ ہوتی تو آپ کبھی اس کے ساتھ نہ جاتے۔

(۵) پھر اسی واقعے میں آگے چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جب فرعون کے متعلق سارا واقعہ سنایا تو حضرت شعیب نے اس پر یقین کر کے حضرت موسیٰ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

لا تخف تذنبوت من القوم الظالمین ہ (قصص - ۲۵)

خیال رہے کہ حضرت موسیٰ ابھی نبی نہیں ہوئے تھے اگر خبر و احاطہ قابل قبول نہ ہوتی تو ایک غیر نبی کی دی ہوئی خبر کی ایک نبی کبھی تصدیق نہ کرتا۔

(۶) سورہ مومن میں قرآن ایک ایسے شخص کا ذکر کرتا ہے جو آل فرعون سے تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر آپ پر ایمان لے آیا تھا مگر فرعون کے خوف سے اپنے ایمان کو چھپاتے ہوئے تھا ایک موقع پر وہ اپنی قوم کے لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

وقال الذی آمن یقوموا متبعون اھدکم سبیل الرشاد (المومن - ۳۸)

اس ایک شخص کا اپنی قوم کے لوگوں کو اپنی اتباع کی دعوت دینا ظاہر ہے خبر و احاطہ ہے لیکن قرآن اس دعوت و اتباع کو ہدایت سے تعبیر کر رہا ہے اگر قرآن کے نزدیک خبر و احاطہ نہ ہوتی تو فرد و احد کی دعوت کو سیدھے راستے کی ہدایت سے ہرگز تعبیر نہ کیا جاتا۔

(۷) پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے وہ شخص اپنی قوم سے کہتا ہے:

فستذکرون ما أقول لکم (المومن - ۴۴)

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس شخص کا قول خبر و احاطہ ہونے کی بنا پر حجت نہ ہو تو قرآن کا یہ کہنا بے کار ہو جائے کہ تم اس قول کو یاد کرو گے اور ظاہر ہے قرآن کا ایک لفظ اور ایک

حرف تک بے کار نہیں لہذا معلوم ہوا کہ اس شخص کا قول خبر واحد ہونے کے باوجود قرآن کی نظر میں حجت تھا۔

(۸) پھر جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس شخص کی بات نہ مانی تو اللہ کے عذاب نے انہیں آپکڑا قرآن اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

فَوَقَّهَ اللَّهُ سَيِّئَاتِ مَا كُفَرُوا وَحَاقَ
بِآلِ فِرْعَوْنَ سُورَةُ الْعَذَابِ (المومن - ۴۵)

پھر اللہ نے اسی (مومن) کو ان لوگوں کے مکرم سے محفوظ رکھا اور اہل فرعون کو موزی عذاب نے آگھرا۔

اگر اس فرد واحد کا قول حجت نہ ہوتا تو اس کے قبول نہ کرنے پر قوم کے عذاب میں گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس شخص کی نافرمانی پر عذاب الہی کا ترتیب دلیل ہے اس بات کی کہ قرآن کی رو سے خبر واحد قابل قبول اور حجت ہے۔

(۹) قرآن کی رو سے عادل شخص کی دی ہوئی خبر واحد تو قابل قبول ہے ہی جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے قرآن کی ایک آیت ایسی بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ناسق شخص کی دی ہوئی خبر بھی بالکلہ رد کر دینے کے قابل نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کی دی ہوئی خبر کی تحقیق کر لی جائے۔ قرآن کہتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ نَاسِقٌ
بِذِّبَارٍ فَتَبَيَّنُوا أَن نَصِيبُوا قَوْلًا لِّجَاهِلِيَّةٍ
فَتَصْبَحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ مُذْمِينَ۔
(حجرات - ۶)

اے ایمان والو اگر تمہارے پاس کوئی ناسق خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانستگی میں کسی قوم پر تم مصیبت ڈھاؤ اور پھر اپنے لیے پڑ پچھاؤ۔

معلوم ہوا کہ فرد واحد کی خبر اس کے ناسق ہونے کے باوجود بھی قرآن کے نزدیک معتبر اور حجت ہونے کی شان رکھتی ہے بشرطیکہ تحقیق میں آجائے اور حجت بھی ایسے معاملات میں جن کے بگڑ جانے کی صورت میں ندامت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر فرد واحد کی خبر مطلقاً قابل رد ہوتی تو یوں کہا جاتا کہ ناسق اگر کوئی خبر لائے تو ہرگز اس کی بات کا اعتبار مت کرو لیکن ایسا نہیں کہا گیا بلکہ یہ کہا گیا کہ تحقیق کے بعد اسے مان لو اور معتبر سمجھو تحقیق کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ راوی کے فسق و فجور سے اس کی خبر میں جو بے اعتباری کی گنجائش پیدا

ہو گئی تھی وہ ختم ہو جائے اور خبر قابل اعتبار بن جائے مگر ہر حال تحقیق کے بعد بھی وہ ربے کی خبر واحد ہی اس لیے ثابت ہوا کہ خبر واحد قرآن کے نزدیک بڑے بڑے معاملات تک میں معتبر اور قابل حجت ہے۔

(۱۰) ارشاد ربانی ہے :

<p>اور مومنوں کو نہ چاہیئے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کھڑا ہو اگرے تاکہ یہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور جب اپنی قوم میں واپس آئیں تو انہیں ڈراتے رہیں عجب کیا کہ وہ محاط رہیں۔</p>	<p>وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبة - ۱۲۲)</p>
--	--

اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ مومنوں کے ہر گروہ میں سے ایک طائفہ کو چاہیئے کہ تفقہ فی الدین کے لیے کوچ کرے پھر تفقہ حاصل کر کے جب اپنے وطن لوٹے تو اپنی قوم کو ڈرائے یعنی خبر دے اور خبردار کرے کہ اے قوم رسول کی نافرمانی اور مخالفت سے بچو اس طائفہ کے ڈرانے پر اس کی قوم پر واجب ہے کہ اس کا کہا مانے اور اس کے کہے پر عمل کرے۔ اب اس آیت کے مفہوم میں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ طائفہ کا لفظ لغت کے لحاظ سے ایک شخص یا دو اشخاص پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک یا دو آدمیوں کے ڈرانے کی خبر پر جو ظاہر ہے کہ خبر واحد ہے قرآن نے عمل کو واجب قرار دیا ہے۔ اگر خبر واحد قرآن کی رو سے حجت نہ ہوتی تو طائفہ کا ڈرانا قوم کے لیے حجت نہ قرار دیا جاتا۔

۲۔ اس بات کا ثبوت کہ طائفہ کا لفظ ایک شخص یا دو اشخاص پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے اس کے لیے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں خود اسی آیت میں دلیل موجود ہے۔ اتنی بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ فرقة کے معنی ہیں گروہ یا جماعت اور اس بات کے لیے بھی کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ جماعت کے لفظ کا اطلاق کم سے کم تین آدمیوں پر ہونا ہے اب اس آیت کے الفاظ میں غور کیجئے قرآن کہہ رہا ہے کہ ہر جماعت میں سے ایک طائفہ نکل آیا کرے، ظاہر ہے تین میں سے جو لوگ نکلیں گے وہ زیادہ سے زیادہ دو اشخاص ہو سکتے ہیں

اور کم سے کم ایک شخص۔ معلوم ہوا کہ طائفے کا اطلاق ایک یا دو آدمیوں پر بالکل درست ہوگا۔

خبر واحد کی حجیت کے ثبوت میں اگرچہ قرآن سے اور بھی بہت سی آیات پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہم سمجھتے ہیں کہ جو بانی حق کے لیے یہ دس نظائر بھی کافی ہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی شخص اگر خبر واحد کی حجیت سے انکار کرتا ہے تو یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ قرآن کا انکاری ہے۔

خبر واحد کی حجیت اور عہد رسالت | ان قرآنی نظائر کی موجودگی میں خبر واحد کی حجیت کے ثبوت کے لیے اگرچہ کسی مزید

دلیل کی حاجت نہیں رہتی تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کا بھی جائزہ لے لیا جائے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں خبر واحد کے رد و قبول کے بارے میں صورت حال کیا تھی۔ اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے بے شمار ایسے واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے خبر واحد کی حجیت ثابت ہوتی ہے لیکن یہاں صرف حوالے کے طور پر چند چیدہ چیدہ واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) ایک شخص نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لیا مگر بعد میں اسے شدید ندامت کا احساس ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کو مسئلہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا وہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حقیقت حال بیان کی حضرت ام سلمہ نے جواب دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی روزے کی حالت میں الیا کر لیا کرتے ہیں۔ عورت نے واپس جا کر اپنے خاوند کو بتایا وہ ناراض ہو کر کہنے لگا ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نہیں ہیں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے لیے جو چاہے حلال کر دے وہ عورت بھی حضرت ام سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں موجود پایا آپ نے پوچھا ”یہ عورت کس لیے آئی ہے“ وجہ بتلانے پر آپ نے فرمایا کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ

”یہ تمام واقعات امام شافعی کی تصنیف ”الرسالۃ“ کے مقالہ بعنوان ”حجیت خبر واحد کے دلائل“ سے لیے گئے ہیں۔

روزے کی حالت میں بھی اس طرح کر لیا کرتا ہوں حضرت ام سلمہؓ نے تمام ماجرا کہ سنایا اور اس عورت کے خاوند کی ناراضگی کا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس کے قول کا بھی ذکر کیا۔ آپؐ نے یہ سن کر اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا میں تم میں سب سے زیادہ حقیقی اور خدا کی حدود کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں۔

اس واقعے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں بھی روزے میں اس طرح کر لیا کرتا ہوں اس امر کی دلیل ہے کہ آپؐ کی ذات سے متعلق ایک عمل کی خبر جو حضرت ام سلمہؓ نے اس عورت کو دی تھی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں خبر واحد ہونے کے باوجود معتبر اور قابل قبول تھی اگر آپؐ کی نظر میں حضرت ام سلمہؓ کا بیان حجت نہ ہوتا تو آپؐ ان سے اس بیان کے بارے میں اس طرح استفسار نہ فرماتے۔ اسی طرح اس شخص کی بیوی کی خبر اپنے خاوند کے قول کے بارے میں اگر آپؐ کی نظر میں قائل تسلیم نہ ہوتی تو آپؐ اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار نہ فرماتے۔

(۲) لوگ مسجد نما میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد تحویل قبلہ کی خبر لے کر ان کے پاس پہنچا۔ سب نے اس کا کلام سنتے ہی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس کی طرف سے ہٹا کر بیت اللہ کی طرف کر لیا۔

اہل قبا انصار میں سے سابق الاسلام تھے وہ نماز جیسے فریضہ کو صرف اسی صورت میں ترک کر سکتے تھے جب ان پر کوئی شرعی حجت قائم ہو جاتی۔ تحویل قبلہ کی خبر نہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بذات خود سنی نہ کسی جماعت نے آکر انہیں یہ خبر سنائی بلکہ صرف ایک شخص سے یہ خبر سن کر وہ کعبۃ اللہ کی جانب پھر گئے معلوم ہوا ان کے نزدیک دینی مسائل میں خبر واحد حجت تھی۔ بالفرض ان کا یہ اقدام اگر غلط ہوتا تو یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تنبیہ فرماتے کہ جب تم ایک قطعی قبلے پر قائم تھے تو تم نے صرف ایک شخص کے کہنے پر ایک فرض قطعی کو کیسے چھوڑ دیا اور براہ راست میری ہدایت یا خبر متواتر کا انتظار کیوں نہ کیا مگر یہاں تبنیہ یا اعتراض تو دیکھو کہ اپنی جانب سے فرد واحد کا بیہونا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی دین

کے بارے میں ایک ثقہ اور صادق شخص کی دی ہوئی خبر معتبر اور حجت تھی۔

یہ واقعہ تو بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خبر واحد کا قبول کرنا صرف جائز ہی نہیں فرض ہے، اگر خبر واحد کو قبول کرنا صرف جائز ہوتا تو سابق الاسلام صحابہ ایک یقینی اور قطعی فریضے یعنی بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے (کو حالت نماز میں ترک کر کے ایک غیر یقینی خبر کی بنا پر دوسرے قبلے کی جانب متوجہ نہ ہوتے اس لیے کہ ایک یقینی امر کو دوسرے یقینی امر ہی کی بنا پر ترک کیا جاسکتا ہے۔

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ابو عبیدہؓ، ابو طلحہؓ اور ابی بن کعبؓ کو شراب پلا رہا تھا کہ دفعۃً ایک شخص آیا اور اس نے خبر دی کہ شراب حرام ہو گئی یہ سن کر فوراً ابو طلحہؓ نے کہا انس اٹھو اور شراب کے ٹکے توڑ ڈالو میں نے ایک بڑا سا بھتر اٹھا کر ان پر دے مارا جس سے وہ ٹوٹ گئے۔

ان صحابہ کا جو علمی مقام تھا اور تقدم صحبت نبوی کے لحاظ سے یہ جس مرتبہ پر فائز تھے کوئی صاحب علم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے شراب پہلے شرعاً حلال ہی تھی اور عام لوگ ان دنوں شراب پیتے تھے لیکن اچانک ایک شخص اگر حرمت شراب کی خبر دیتا ہے اور شراب کے مشکوں کے مالک ابو طلحہؓ فوری طور پر ان کو توڑنے کا حکم دے دیتے ہیں ان میں سے کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ ایسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیں یا عام لوگوں سے پوچھ لیں۔ نہ کسی نے یہ اعتراف کیا کہ قبل از تحقیق یہ اضاعت مال اور اسراف بے جا ترین عقل نہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ سب ایک شخص کی خبر پر پورا پورا اعتقاد کرتے تھے۔

(۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کے ایک مقدمے میں زانی کے اقرار پر اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا اور جس عورت کے متعلق اس شخص نے زنا کا اقرار کیا تھا اس کے پاس حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور فرمایا کہ اس سے دریافت کرو اگر وہ بھی اقرار کرے تو اس کو جہم کر دو ورنہ اس شخص کو حد قذف بھی لگاؤ کہ اس نے بلا شرعی ثبوت کے ایک عورت پر زنا کی تہمت کیسے رکھی۔ حضرت انس پوچھے اس عورت نے زنا کا اقرار کیا اور وہ بھی رجم کر دی گئی۔

اس واقعے سے بھی خبر واحد کا حجت ہونا واضح ہوتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرد واحد کو رجم کا حکم دے کر بھیجنا اور ایک فرد واحد کے ذریعے سے پہنچے ہوئے حکم نبوی کے سامنے اس عورت کا اپنے آپ کو سنگساری کے لیے پیش کر دینا دونوں اپنی اپنی جگہ پر خبر واحد کی حجیت کا مؤید بولتا ثبوت ہیں۔

(۵) عمرو بن سلمہ الزرقانی اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم مقام منیٰ میں مقیم تھے کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اُرنٹ پر سوار چلا کر یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ کھانے پینے کے دن ہیں کوئی شخص روزہ نہ رکھے۔

ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی صورت میں ایک فرد واحد کو یہ پیغام پہنچانے کے لیے بھیج سکتے تھے جب اس کا قول واجب التسلیم حجت ہو ورنہ آپ اس پیغام رسانی کے لیے چند آدمیوں کو بھی مامور فرما سکتے تھے۔

(۶) یزید ابن شیبان کہتے ہیں کہ ہم عرفات میں ایک ایسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ سے کافی دور تھی، اسی اتنا میں ہمارے پاس حضرت بربیع النماری آئے اور کہا کہ میں آپ لوگوں کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قانا بن کر آیا ہوں آپ نے حکم دیا ہے کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو وہاں سے منتقل ہونے کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ میدان عرفات میں جہاں بھی قیام ہو جائے فریضہ وقوف ادا ہو جاتا ہے۔

اس واقعے سے بھی ظاہر ہے اگر خبر واحد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حجت نہ ہوتی تو ایک آدمی کے بجائے ایک جماعت کو اس پیغام رسانی کے لیے مامور فرماتے۔

(۷) سنہ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امیر حج بنا کر بھیجا، مختلف دیار و مصار کے حاجی جمع تھے آپ نے ان کو احکام حج بتلائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی سے ان کو مطلع کیا۔

احکام حج سنانے اور مناسک حج ادا کرنے کے لیے تہما حضرت ابوبکرؓ کا مامور

کیا جاننا خبر واحد کی حجیت کی کھلی دلیل ہے۔

(۸) اسی طرح سہ ماہہ ہجری میں ہی اسی حج کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا گیا تا کہ وہ کفار کو سورہ برات کی تازہ نازل شدہ آیات سنا کر ہتھیار کر دیں کہ انہوں نے خود بدعت کی ہے اب اللہ کا بھی ان سے کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک فرد واحد کو احکام قرآنی پہنچانے کے لیے روانہ فرمانا صرف اسی صورت میں کارآمد اور مفید ہو سکتا تھا جب اس کا قول لوگوں پر حجت ہوتا۔

(۹) حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے حق میں باوازا بلند تعویذی کلمات ارشاد فرمائے جو آپ کی بات یاد رکھ کر دوسروں تک پہنچائے۔
آپ نے ارشاد فرمایا :

ترتازہ رکھے اللہ اس بدے کو جس نے
میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے
نہیں سنا اس تک اس کو پہنچایا۔

نَحْرُ اللَّهِ عَبْدٌ أَسْمَعَ مَقَالَتِي
فَوَعَاهَا إِذَا هَا إِلَى مَنْ لَمْ
يَسْمَعْهَا. (مصحح)۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک شخص کے لیے اپنی بات کو محفوظ کر کے دوسرے شخص تک پہنچانے پر خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔ حدیث میں واحد کا صیغہ عبد استعمال کیا گیا ہے جو فرد واحد پر دلالت کرتا ہے معلوم ہوا فرد واحد کی اطلاع دوسرے کے لیے قابل حجت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کی اطلاع پر خوشی کا اظہار نہ فرماتے اور نہ خبر دینے والے کے حق میں آپ کی زبان مبارک سے دعائیہ کلمات صادر ہوتے :

(۱۰) یہی حجۃ الوداع کا موقع ہے اور یہی منی کا میدان ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبے کا اختتام اس مشہور متواتر فقرے پر ختم فرماتے ہیں کہ اَلَا فَيُبَلِّغُ الشَّاهِدَ الْغَائِبَ (جاہلے کہ جو حاضر ہے وہ غائب تک پہنچاتا جائے) یہاں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادات نبوی روایت کرنے والے کے لیے واحد کا صیغہ شہاد استعمال کیا ہے جو ظاہر ہے فرد واحد پر دلالت

کہتا ہے اگر فرد واحد کی اطلاع دوسرے کے لیے تابیلِ حجت نہ ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم واحد کے بجائے بالالتزام جمع کا ایسا استعمال فرماتے۔

یہ چند واقعات ہم نے مثنیٰ نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کر دیے ہیں ورنہ کون نہیں ہانتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے ایسی بے شمار نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے خبر واحد کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کے واقعات کے علاوہ ایسے نفاذ بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اطرافِ اکنات میں اپنے اعمال روانہ فرمائے مگر کہیں بھی ان میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں کیا اکثر و بیشتر آپ نے ایک ایک ہی عامل روانہ فرمایا چنانچہ حضرت قیس بن عاصم، حضرت زبیر بن عبد اللہ اور حضرت ابن نویرہؓ کو فرداً فرداً ہی اپنے قبائل کی طرف بھیجا۔ اسی طرح وفدِ بحرین کے ساتھ حضرت سعید بن العاص کو اور یمن کے بالمقابل حضرت معاذ بن جبل کو روانہ کیا۔ آپ نے جتنے عامل بھی بھیجے ہیں تاریخ کے اوراق میں ان کے نام بھی محفوظ ہیں اور وہ مقامات بھی درج ہیں جہاں انہیں بھیجا گیا لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ کبھی آپ نے بطور خاص ان میں عدد کا لحاظ کیا ہو۔ آپ نے اگر اہتمام کیا تو صرف اس بات کا کہ ایسے لوگ بھیجے جائیں جو معروف ہوں اور لوگ ان کی صداقت و امانت سے آشنا ہوں۔ تاریخ میں کہیں منقول نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاملوں کے ساتھ کسی نے یہ مناقشہ کیا ہو کہ چونکہ یہ ایک ہی فرد ہے اس لیے اس کو صدقات و عشر نہیں دئے جائیں گے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مختلف دیار و امصار کی طرف فوجی دستے روانہ کرتے تو ایک ایک صحابی کو ہی دستے کا امیر مقرر فرماتے چنانچہ جب مقام موتہ کی طرف فوج روانہ کی تو حضرت زید بن حارثہؓ کو سالار لکھ کر مقرر فرمایا ان کے شہید ہونے پر حضرت جعفرؓ کو اور پھر ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ کو امیر لکھ کر مقرر کیا جانے کی تاکید فرمائی۔

اس کے علاوہ ایک زمانے میں آپ نے دعوتِ اسلام کے لیے مختلف بلاد میں بارہ تا صد روانہ فرمائے اور صرف اس بات کا خیال رکھا کہ ہر علاقے میں ایسا شخص بھیجا

جلے جو ان اطراف میں متعارف ہوتا کہ اس کے جھوٹے ہونے کا شبہ نہ رہے اور لوگوں کو اس کا اطمینان ہو جائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہے چنانچہ حضرت وحیہ کلبی کو اس علاقے کی طرف اپنی بنا کر بھیجا گیا جہاں وہ لوگوں میں جلنے پہنچ گئے اسی طرح اپنے عمال کی طرف خطوط بھیجنے کے لیے آپ نے انہی لوگوں کو سفارت پر مامور فرمایا جو مرسل الیہ کے لیے متعارف اور قابل اعتماد ہوتا تھا کبھی آپ نے یہ اہتمام نہیں فرمایا کہ ایک شخص کے جلنے ایک جماعت کو سفارت کے لیے روانہ کیا جائے نہ ہی کسی عامل یا قاضی نے ایک فرد واحد کے ذریعے موصول شدہ خطوط پر کبھی کسی شک و شبہ کا اظہار کیا جب بھی کسی عامل کے پاس آپ کا کوئی خط پہونچا ہمیشہ فوراً اس نے اس کو نافذ کیا۔

غرض عہد رسالت کے یہ تمام واقعات اور حیات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے یہ تمام اظہار اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ خبر واحد کی حجیت کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے سند قبول حاصل ہے۔

خبر واحد کی حجیت اور عہد صحابہ [نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عہد صحابہ میں بھی ایسی واضح شہادتیں موجود ہیں۔

جو اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ صحابہ کے درمیان خبر واحد کی حجیت کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل تھی۔ اس ضمن میں بھی چند نظائر کا پیش کرنا مناسب رہے گا۔

(۱)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ آپ کی تدفین کس جگہ عمل میں لائی جائے تو کون نہیں جانتا کہ اس کا فیصلہ ایک خبر واحد ہی کی بنیاد پر کیا گیا حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ **اَلَا بُدَّیَا رِیدَ فَنونَ حیثَ یُکُونونَ** (انبیاء جہاں فوت ہوتے ہیں وہیں دفن کیے جاتے ہیں) اس خبر کو سننے کے بعد کسی ایک زمان کو بھی یہ کہتے نہیں سنا گیا کہ اس خبر پر کوئی شاہد لاؤ کسی نے بھی اس پر عمل کرنے کے لیے تو اتر کی شرط نہیں لگائی دنیا جانتی ہے کہ اس خبر واحد کی تعمیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ مبارکہ ہی میں عمل میں آئی جہاں آپ کی وفات ہوئی تھی اسی طرح سقیفہ بنی سعد کے واقعے میں ایسے موقع پر جبکہ خلافت کے مسئلے پر

صحابہ کے اختلاف نے نزاع کی شکل اختیار کر لی تھی اور عقل پر جذباتیت کے غالب آنے کا خدشہ پیدا ہو چکا تھا ایک خبر واحد ہی تھی جس نے آنا نانا صحابہ کے باہمی اختلاف کا علم کر دیا اور سب کے سر تسلیم و رضا کے اظہار میں جھکے نظر آنے لگے اس وقت بھی صرف تن تنہا حضرت ابوبکر ہی تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد روایت کرتے ہوئے سنے گئے کہ *الائمة من القریش* (خلفاء قریش میں سے ہوں گے) حضرت ابوبکر کی زبان سے ان الفاظ کے نکلنے کی دیر تھی سارے اختلافات مٹ گئے اور قریش میں سے فیصلہ منتخب کر لیا گیا۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ منہ خلافت پر متمکن ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا معاملہ پیش آیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے باغ و فتنہ کا مطالبہ ہوا اور آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سہم خیر پر اپنا حق بتایا تو اس کا فیصلہ بھی خبر واحد ہی کی بنیاد پر کیا گیا حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں سے فرمایا :

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا
يقول لا نورث ما ترکنا صدقة	ہے کہ ہم (گروہ انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا
(بخاری)	ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وہ سب صدقہ ہے۔

اور پھر اسی حدیث پر آپ نے عمل فرمایا حضرت فاطمہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے سلسلے (فنی طوبہ خبر واحد ہونے کے باوجود) سر تسلیم خم کر دیا نیز تمام صحابہ کرام نے حضرت ابوبکرؓ کے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔ اگر صحابہ کے درمیان خبر واحد حجت نہ ہوتی تو نہ حضرت ابوبکرؓ محض اپنی معلومات پر اکتفا کر کے کوئی فیصلہ دیتے اور نہ دیگر صحابہ ہی حضرت ابوبکرؓ کے اس فیصلے کو قبول کرتے معلوم ہوا خبر واحد کی حجیت صحابہ کے درمیان مسلمہ تھی۔

بلکہ اوپر کے ان دو واقعات سے تو خبر واحد کی حجیت پر صحابہ کرام کا اجماع ثابت ہوتا ہے کیونکہ ان محولہ بالا تمام اخبار آحاد کو تمام صحابہ نے بالاجماع قبول کیا ہے اور اس

حاکم سے کہ صحابہ کرام کا یہ اجماع ہم تک بالتواتر منقول ہے اگر ہم یہ کہیں تو قطعاً غلط نہ ہو گا کہ خبر واحد کی حجیت کو تواتر کی سند حاصل ہے۔

(۳) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر جھگڑے میں کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہیے؟ یہ سن کر حضرت حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ میری دونوں بیویوں کے درمیان لڑائی ہو گئی ایک نے دوسری کے خیمے کی چوب دے مادی جس کے صدمہ سے اس کا حمل ساقط ہو گیا مقدمہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا آپؐ نے قائلہ پر پانچ سو دہم بطور دیت لازم فرمائے۔ حضرت حمل سے یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ کرتے۔

حضرت حمل بن مالکؓ کی یہ روایت ظاہر ہے خبر واحد تھی اگر حضرت عمرؓ کے نزدیک خبر واحد حجیت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت حمل سے شاہد طلب کرتے یا بصورت دیگر اس کو بد کر کے اپنے عقل کے مطابق فیصلہ دیتے مگر الیہ نہیں ہوا حضرت حمل کی روایت کہ وہ حدیث سن کر حضرت عمرؓ جو فیصلہ صادر کرنا چاہتے تھے اس سے باز رہے اور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق فیصلہ دے دیا۔

(۴) جب حضرت عمرؓ ملک شام کے سفر پر تھے تو راستے میں آپ کو پتہ چلا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے اس موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد نقل کیا جس میں ذکر ہے کہ ایسے علاقے میں جانا ممنوع ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے سنتے ہی جو ظاہر ہے خبر واحد تھی آگے سفر جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مدینہ منورہ لوٹ آئے۔

(۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجوس سے جزیہ لینے کے بارے میں تردد تھا مگر جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ہی کی زبانی ان تک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پہنچا کہ مجوس سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کیا جائے نیز یہ کہ آپؐ نے مقام محج کے

مخوسوں سے جزیہ لیا تھا تو اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا سابقہ خیال ترک کر دیا اور مخوس سے جزیہ لینا شروع کر دیا۔ اس ارشاد نبوی کی روایت میں بھی حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اکیلے ہی تھے اور اس لیے فنی طور پر یہ روایت بھی خبر واحد ہی کا درجہ رکھتی تھی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خبر واحد کو بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لیا اور اپنے خیال سے رجوع کر کے مخوس کے ساتھ اہل کتاب کا سا برتاؤ کرنے لگے۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیت کے مسئلے میں اس رائے کے حامل تھے کہ بیوی کو اپنے شوہر کی دیت سے وراثت نہ ملنی چاہیے حضرت ضحاک بن سفیان کو معلوم ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لکھا تھا کہ اسیم ضیابی کی بیوی کو اس کی دیت سے حصہ دیا جائے یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خیال سے رجوع فرمایا۔

(۷) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اپنے عہد خلافت میں ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ایسے قول یا فعل کی تلاش تھی جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہو کہ شوہر کی ذفات کے بعد بیوی کے لیے اپنی عدت کی مدت شوہر ہی کے گھر میں پوری کرنی ضروری ہے یا یہ مدت وہ اپنے والدین یا اور کسی عزیز رشتے دار کے گھر میں رہ کر بھی پوری کر سکتی ہے۔ حضرت فریہ بنت مالک بن سنان کو جن کے ساتھ یہ صورت حال پیش آچکی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بارے میں ایک ارشاد معلوم تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کیا حکم دیا تھا انہوں نے بتلایا کہ آپ نے انہیں شوہر ہی کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عثمان نے یہ سنا تو اسی کے مطابق مقدمات فیصل کرنے لگے۔

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایسی خبر واحد یا بی قول کر لی جو صرف ایک عورت کی روایت کردہ تھی۔

(۸) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سن رکھا تھا کہ روفی حاجی آخری طواف یعنی

طواف وداع کیے بغیر وطن واپس نہیں جاسکتا، ان کے نزدیک عائشہ عورت بھی اس ممانعت میں شامل تھی چنانچہ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر عائشہ عورت یوم النحر میں طواف کر چکی ہو تو آخری طواف سے قبل واپس جاسکتی ہے تو انہیں بہت تعجب ہوا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں استفسار کیا انہوں نے ایک انصاری عورت کا حوالہ دیا کہ ان سے مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس امر کی اجازت دی تھی اسی کی بنیاد پر میں ایسا فتویٰ دیتا ہوں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ ان انصاری صحابہ کے پاس پہنچے انہوں نے تصدیق کی حضرت زید مطمئن ہو گئے اور اپنے موقف سے رجوع فرمایا۔

یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما جیسے فقیہ صحابہ نے بھی محض ایک عورت کی روایت کردہ خبر واحد کو بھی بلا تردد قبول فرمایا۔

(۹) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ابتدا میں مغابرہ کے تائل تھے یعنی بٹائی پر زمین دیا کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے، حضرت رافع بن خدیجؓ نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے یہ سنا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مغابرہ ترک کر دیا۔

(۱۰) حضرت عبداللہ ابن عباس کے سامنے کس شخص کا یہ قول بیان کیا گیا کہ قرآن کریم میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس میں حضرت خضر کے ساتھ جس موسیٰ کا ذکر ہے وہ وہ موسیٰ نہ تھے جن کو بنی اسرائیل کی جانب بنی بنا کر مبعوث کیا گیا تھا بلکہ کوئی اور شخصیت تھے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ سن کر کہا ”دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے مجھے ابی بن کعبؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خطبہ دیتے ہوئے ہمیں حضرت خضر و حضرت موسیٰ علیہما السلام کا واقعہ سنایا جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت خضر کے ساتھ حضرت موسیٰ وہی تھے جو بنی اسرائیل کی جانب بنی ہو کر آئے تھے۔“

یہ واقعہ بھی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس جیسے فقیہ صحابی نے ایک فرد واحد کی روایت کردہ حدیث کو تائید کے ساتھ دلیل کے طور پر پیش فرمایا جو بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک خبر واحد حجت تھی۔ یہ دس شہادتیں ہم نے عہد صحابہ سے بھی پیش کر دی ہیں یہ تمام اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ عہد رسالت کی طرح عہد صحابہ میں بھی خبر واحد کو معتبر قابل قبول اور حجت تسلیم کیا جاتا تھا۔

عہد صحابہ کے ان واقعات کی جو توجیہ منکرین حدیث کی جانب سے پیش کی جاتی ہے وہ اگرچہ اس قابل تو نہیں کہ اسے اہمیت دی جائے اور یہاں زیر بحث لایا جائے لیکن احقاقِ حق اور اتمامِ حجت کی خاطر اس کی اصل حقیقت اگر واضح کر دی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ خبر واحد کو قبول کرنے میں صحابہ کا طرد عملِ نوحی بجانب ختم کیونکہ عہد صحابہ میں شاہد کا ملنا ممکن تھا لیکن زمانہ مابعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی بلکہ مدعی کی ہوتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کے جملہ افراد پر ایک عقیدے یا عمل کی پابندی عائد کرنا چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی واسطہ در واسطہ ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے دعوے پر دو شاہد عدل پیش کرے جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سنا ہے پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک منکرین حدیث کے نزدیک ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔

اس سلسلے میں اولاً تو قابلِ غور بات یہ ہے کہ منکرین حدیث جس طرح زمانہ مابعد کے راوی پر یہ لازم ٹھہراتے ہیں کہ وہ دو شاہد عدل پیش کرے اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر تو اس ذمہ داری کا بار اس صحابی کی گردن پر ہونا چاہیے جس نے کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہے اس لیے کہ سب سے پہلا مدعی تو وہ ہے امت کے جملہ افراد پر کسی

عقیدے یا عمل کی پابندی عائد کرنے کی بنیاد تو سب سے پہلے اسی نے رکھی ہے سب سے پہلے اس کے فتنے ہے کہ وہ اپنے اس دعوے کے لیے دو گواہ لائے کہ اس نے یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اگر وہ گواہ نہیں لاتا یا دوسرا شخص اس سے گواہوں کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ بغیر گواہوں کے اس کا دعویٰ قبول کر لیا جاتا ہے تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ راوی کے لیے دراصل عدد کی شرط ہی غلط ہے۔

دوسرے غور طلب امر یہ ہے کہ خلاف واقعہ یہ بات کیونکر فرض کر لی گئی کہ صحابہ نے تمام روایتیں براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر بیان کی ہیں اس لیے ان کی حیثیت مدعی کی نہیں رہی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ صحابہ کی روایتوں میں ایسی روایتیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے خود نہیں بلکہ کسی دوسرے صحابی سے سُن کر بیان کی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

جو حدیث ہم بیان کرتے ہیں وہ تمام ہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی بلکہ ان میں وہ حدیثیں بھی ہیں جو ہم میں سے بعض بعض سے روایت کرتا تھا۔

ما كل ما نحدث به سمعناه من رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكن كان يحدث بعضنا بعضاً (مسندک للحاکم)

ایسی روایتوں کے لحاظ سے جو صحابہ نے براہ راست صاحب نبوت سے نہیں سنی ایک صحابی راوی کی حیثیت بھی ٹھیک وہی حیثیت ہو جاتی ہے جو زمانہ مابعد کے راوی کی بنتی ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی تو اصولی طور پر مسلم نہیں کہ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست حدیث سنی ہے اس کی حیثیت مدعی کی نہیں رہتی۔ جب یہ بات ہے تو آخر اس کو بار ثبوت سے سبکدوش کس بنا پر سمجھ لیا جائے۔ رہی یہ بات کہ عہد صحابہ میں شاہد کا ملنا ممکن تھا تو اول تو یہ ایک عذر لنگ سے زیادہ کچھ نہیں دوسرے یہ کوئی عقلی یا شرعی قاعدہ ہے کہ کسی مدعی کے حق میں دعوے کی دگرہ صریح اس بنا پر دے دی جائے کہ وہ گواہ پیش کر سکتا ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہوگی کہ شاہد مل جانے کے محض امکان کی بنیاد پر مدعی سے شہادت کا مطالبہ ہی نہ کیا جائے۔ غرض ایک صحابی راوی اور زمانہ مابعد کے راوی کی حیثیتوں کے

درمیان شاید اور مدعی ہونے کی کوئی تفریق قائم کرنا اور اس کو خبر واحد کی حجیت و عدم حجیت کے لیے حیار قرار دینا کسی طرح بھی معقول اور مناسب نہیں۔

ہر حال اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف قرآنی تاویلات ہیں، عہد رسالت

کے نظائر ہیں اور عہد صحابہ کی شہادتیں ہیں جو خبر واحد کی حجیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور دوسری طرف منکرین حدیث کا بلا دلیل یہ دعویٰ ہے کہ خبر واحد حجت نہیں۔ اب ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسی بات حق ہے اور قابل قبول ہے اور کونسی بات محض باطل ہے اور قابل رد ہے۔

بات صرف عہد صحابہ تک ہی محدود نہیں عہد صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین کے دور میں بھی خبر واحد کی حجیت کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب

خبر واحد کی حجیت عہد صحابہ کے بعد

”الرسالة“ میں اخبار آحاد کی حجیت کے اثبات میں جو ایک طویل مقالہ تحریر فرمایا ہے اس میں انہوں نے مدینہ و مکہ، کوفہ و بصرہ اور یمن و شام کے متعدد اصحاب کے نام گنوائے ہیں۔ جو اخبار آحاد کو باہم نقل و روایت کرتے ان کو قبول کرتے ان کی روشنی میں فتویٰ دیتے اور ان کو دین میں بلا نزاع و جدال حجت قرار دیتے تھے امام شافعیؒ نے اس ضمن میں سلف سے لیکر خلف تک بکثرت ائمہ محققین کے اسماء گرامی ذکر کیے ہیں ان میں سے چند کے نام اگر ہم یہاں شمار کرادیں تو ناند سے سے خالی نہ ہوگا۔

اہل مدینہ

(۱) محمد بن جبیر	(۲) نافع ابن جبیر	(۳) یزید بن طلحة
(۴) محمد بن طلحة	(۵) نافع ابن عجبیر	(۶) ابو سلمہ بن عبد الرحمن
(۷) حمید بن عبد الرحمن	(۸) خارجہ بن زید	(۹) عبد الرحمن بن کعب
(۱۰) عبد اللہ بن ابی قتادہ	(۱۱) سلیمان بن یسار	(۱۲) عطاء بن یسار

اہلِ مکہ

(۱) عطار	(۲) طاؤس	(۳) مجاہد
(۴) بن ابی ملیکہ	(۵) عکرمہ بن خالد	(۶) عبید اللہ بن ابی یزید
(۷) عبد اللہ بن باباہ	(۸) بن ابی عماد	(۹) محمد بن المنکدر

اہلِ کوفہ

(۱) اسود	(۲) عظمہ	(۳) شجعی
----------	----------	----------

اہلِ بصرہ

(۱) عبد الرحمن بن غنم (۲) حسن (۳) محمد بن سیرین

اسی طرح یمن میں وہب بن منبہ اور شام سے مکحول کے اسمائے گرامی تاہل ذکر ہیں یہ تمام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ایک صحابی سے روایت کرتے تھے اور اس ایک صحابی کی حدیث کی بنیاد پر فتوے صادر کرتے تھے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ اگر بالفرض کسی خاص مسئلے کے متعلق کسی کے لیے یہ کہنا جائز ہوتا کہ اس پر مسلمانوں کا ہمیشہ اجماع رہا ہے تو خبر واحد کی حجیت کے متعلق بھی میں یہ بات کہہ دیتا مگر اسے احتیاط کے خلاف سمجھ کر اتنا پھر بھی کہتا ہوں کہ اہل اسلام کے فقہاء میں سے مجھے ایک نام ہی ایسا معلوم نہیں جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ وہ خبر واحد کو حجت تصور نہیں کرتا تھا ان کے مابین یہ مسئلہ مرے سے متنازعہ تھا ہی نہیں۔

غرض خبر واحد کی حجیت عقل سے ثابت ہے قرآن سے ثابت ہے حدیث سے ثابت ہے صحابہ کرام کے آثار سے ثابت ہے اور تمام محدثین و مجتہدین و ائمہ محققین سے ثابت ہے جبکہ اس کے بالکس خبر واحد کی عدم حجیت ان میں سے کسی ایک ذریعے سے بھی ثابت نہیں جرت ہوتی ہے ان لوگوں کی کم عقلی پر جو اس بات سے تو انکاری ہیں جو ہر ذریعے سے ثابت متحقق ہے اور اس بات کو منوانے پر بصد ہیں جو ہر قسم کے ثبوت سے عامی ہے۔

بہر حال حقائق کے انکار سے حقائق کے وجود پر کوئی زد نہیں پڑا کرتی منکرین حدیث انکار کرتے ہیں تو کرتے رہیں خبر واحد ہمیشہ سے دین میں جنت تھی، جنت ہے اور ہمیشہ جنت رہے گی کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خبر واحد کو صرف اس لیے موجب عمل نہ سمجھے کہ وہ توازن کی حد کو نہیں پہنچتی۔ خبر واحد پر عمل نہ کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ خبر حد صحت کو نہ پہنچتی ہو یا اس کے معارض اس سے زیادہ کوئی صحیح حدیث موجود ہو لیکن اگر خبر واحد کا بیان کرنے والا سچا اور ثقہ ہو مطاعین روایت میں سے کوئی طعن اس میں موجود نہ ہو نیز کوئی صحیح حدیث اس خبر واحد کے معارض نہ ہو تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خبر واحد کو موجب عمل نہ سمجھے اور اسے ترک کر دے۔

منکرین حدیث کے دلائل | خبر واحد کی حجیت پر عقلی و نقلی حیثیت سے اس تفصیلی گفتگو کے بعد ہم ان دلائل کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو حدیث کی تشریحی حیثیت کو مشکوک بنانے کے لیے خبر واحد کی عدم حجیت پر منکرین حدیث کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی طرف سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا لب لباب درج ذیل چار نکات میں منحصر ہے :

(۱) خبر واحد جس طریق سے مروی و منقول ہوتی ہے وہ قطعی ہے کیونکہ راوی سے خطا و نسیان سرزد ہونے کا احتمال باقی رہتا ہے اور جس میں خطا و نسیان کا احتمال ہو وہ قطعی و حتمی نہیں ہو سکتی لہذا اس سے استدلال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(۲) اگر فروعات میں خبر واحد موجب عمل ہے تو اصول و عقائد میں بھی اسے موجب عمل ہونا چاہیئے حالانکہ اس پر فریقین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ عقائد میں خبر واحد پر عمل نہیں کیا جاسکتا بنا بریں جب عقائد میں خبر واحد پر عمل درست نہیں تو فروعات میں بھی جائز نہیں۔

(۳) حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر نماز عصر کے چار فرضوں کے بجائے دو فرض ادا کیے ذوالیدین نامی صحابی نے جب آپ کو اس سے آگاہ کیا تو ان کی بات تسلیم کرنے میں آپ کو تامل ہوا جب حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما

اور دیگر شرکاء نماز نے اس کی تائید کی تو آپ نے باقی ماندہ دو رکعتیں ادا کیں اور دو سجدہ پائے سو کیے اگر خبر واحد حجت ہوتی تو آپ صرف ذوالیہدین کے کہنے پر نماز مکمل کر لیتے اور اس میں توقف نہ فرماتے۔

(۴) متعدد صحابہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ خبر واحد پر عمل نہیں کرتے تھے مثلاً حضرت ابوبکرؓ نے دادی کی میراث سے متعلق مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت کو اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک محمد بن مسلمہؓ نے اس کی تائید نہ کر دی اسی طرح حضرت عمرؓ نے طلب اذن کے بارے میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت پر شاہد مانگا اور جب ابوسعیدؓ نے ان کے حق میں شہادت دی تب ان کی روایت کو قبول کیا ان چاروں نکات پر ہم فرداً گفتگو کریں گے مگر ان چاروں میں سے منکرین حدیث سب سے زیادہ زور چونکہ اس نکتہ پر دیتے ہیں جو خبر واحد کی قطعی حیثیت سے متعلق ہے اور جو سب سے پہلے بیان ہوا ہے اس لیے اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔ خبر واحد کی حجیت کے خلاف منکرین حدیث کی اس دلیل کی تمام تر بنیاد چونکہ اس پر ہے کہ وہ مفید ظن ہوتی ہے اور دین کی بناء ظنیت پر قائم نہیں کی جاسکتی اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ظن کے صحیح مفہوم کی تحقیق کر لی جائے ۛ

ظن کے صحیح مفہوم کی تحقیق | لفظ ظن کلام عرب میں دو معنی میں مستعمل ہے ایک گمان غالب جو کسی دلیل عقلی یا نقلی کی بنا پر پیدا

ہو مگر قطعی نہ ہو دوسرے تخمین و اندازہ اور اٹکل جس کا مطلب ہے محض اپنے خیال اور نفسانی خواہش سے بے دلیل اور بے تحقیق بات کا پیدا ہونا۔ خبر واحد جس ظن کو مفید ہوتی ہے وہ پہلی قسم کا ہے جو تمام عقلاء کے نزدیک حجت ہے۔ قابل رد جو ظن ہے وہ ہے جو دوسری قسم کو شامل ہے۔ منکرین حدیث کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ انہوں نے خبر واحد سے پیدا ہونے والے ظن کو دوسری قسم پر محمول کیا اور اسے رد کر دیا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں ظن کی مذمت وارد ہوئی ہے یہ وہ ظن ہرگز نہیں ہے جو ادلہ شریعہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کا مصداق وہ ظن ہے جو محض اپنی

جانب سے پکائے ہوئے بے بنیاد خیالات پر مشتمل ہو۔ وہ ظن جو اللہ شرمیہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے قرآن نے اس کی مذمت میں کہیں ایک حرف بھی نہیں کہا۔ منکرینِ حدیث ظن کی مذمت میں قرآنی آیات کے حوالے تو دیتے چلے جاتے ہیں مگر یہ غور کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں کرتے کہ اس سے کونسا ظن مراد ہے۔ مثال کے طور پر اسی آیت کو لے لیجئے جو ظن کی رد میں بڑی شد و مد سے پیش کی جاتی ہے یعنی

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ | اور اٹکل حق کے مقابلے میں ذرا بھی کام

شبیًا (النجم - ۲۸)

یہ سورہ نجم کی آیت ہے اس آیت کے سیاق و سباق کو دیکھ لیجئے کہا یہ جارہا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو مؤنث ناموں سے پکارتے ہیں حالانکہ اس کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں یہ لوگ محض اٹکل پر چل رہے ہیں اور اٹکل حق کے مقابلے میں ذرا بھی کام نہیں دیتی۔ اب ظاہر ہے فرشتوں کو مؤنث قرار دینے کے لیے منکرینِ آخرت کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل تھی نہ نقلی۔ بلا دلیل محض اپنے دماغ میں انہوں نے یہ پکالیا تھا کہ فرشتے مؤنث ہیں اور اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تو قرآن نے یہاں جس ظن کی مذمت کی ہے وہ وہی ہے جو خود تراشیدہ خام خیالی پر مبنی ہو۔ اسی طرح ظن کی مذمت میں قرآن کی ایک اور آیت ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ قرآن جس ظن کی مذمت کرتا ہے وہ کونسا ظن ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت ہے۔

يُظَنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ بِالْحَقِّ | یہ لوگ اللہ کے بارے میں غلط حقیقت خیالات الجاہلیۃ۔ (آل عمران - ۱۵۳)

اس آیت میں ظن الجاہلیۃ اور غمراہی کے الفاظ سے واقعی ظن کی مذمت ثابت ہوتی ہے مگر کونسا ظن کی؟ اس ظن کی جو اس پوری آیت میں بیان ہوا ہے یعنی منافقین کی یہ بدگمانی کہ مسلمانوں کو اللہ کی نصرت نصیب نہ ہوگی۔ یہ پوری آیت ذرا پڑھ کر دیکھئے نذر انزل

لے حوالہ کے لیے دیکھئے سورہ نجم کی تائیسویں اور اٹھائیسویں آیت

علیکم من بعد الخیر امنۃ لخاصۃ لعیسٰ طائفۃ منکم و طائفۃ قد اُغٹھتم
انفسہم لیظننّ باللہ غیر الحق ظن الجاہلیۃ (پھر اس نے اس غم کے بعد تمہارے
اوپر راحت نازل کی (یعنی) غور کی کہ اس کام میں سے ایک جماعت پر غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ
تھی کہ اسے اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ یہ لوگ اللہ کے بارے میں خلاف حقیقت جہالت کے سے خیالات
قائم کر رہے تھے) یہ مضمون جنگِ اُحد سے متعلق ہے اس وقت جب میدانِ اُحد میں مسلمانوں
کو ایک عارضی شکست کا سامنا کرنا پڑا تو منافقین جو مسلمانوں ہی کی صفوں میں ملے
جلے تھے گھبرا اُٹھے انہیں اپنی جان کے لالچے پڑ گئے وہ مسلمانوں سے حجتِ ذکرِ اُرد
کرنے لگے کہ تم سے جو وعدہ نصرت تھا وہ کیا ہوا۔ اب اللہ سے متعلق منافقین کی یہ
بدگمانیاں بلاشبہ خلافِ واقعیت و خلافِ حقیقت تھیں کسی دلیل کی بنیاد پر ہرگز نہ
تھیں اور قرآن ان کی انہی بدگمانیوں کو ظن الجاہلیۃ سے تعبیر کر رہا تھا۔

قرآن نے ایک اور موقع پر ظن کو خواہشاتِ نفسانی کے متوازی ذکر کر کے اس
کی مذمت کی ہے مگر وہاں بھی اگر غور سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ظنِ قرآن
کی نظر میں وہ مذموم ہے جو محض بے بنیاد خیالات پر مبنی ہو۔ سورہٴ نجم ہی کی ایک

آیت ہے :

یہ لوگ نرمی الٹکی اور اپنے نفس کی خواہش پر چلے
ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف
سے ہدایت آچکی ہے۔

اِنْ یَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوٰی
الْاَنفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ
رِیْضٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ (نجم - ۲۳)۔

غور کیجئے اس آیت میں ظن کے متوازی نفسانی خواہشات کے ذکر سے جہاں ظن کی مذمت
ہوتی ہے وہاں ظن کے متقابل ہدایت کے ذکر سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ظنِ وہی
مذموم ہے جو ہدایت پر مبنی نہ ہو محض بے بنیاد تخمینات کی پسند اور ہو۔ اس آیت کا بیاق
بھی یہ بتلا رہا ہے کہ وہ ظن جس کو و ما تہوی الالفس کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا وہ
کسی عقلی یا نسلی دلیل پر مبنی نہ تھا بلکہ اپنے دماغ سے گھڑ کر ایک غلط خیال قائم کر لیا
گیا تھا اس آیت سے پہلی آیتوں کے مضمون میں غور کیجئے ذکر یہ ہو رہا ہے کہ مشرکین

مکہ نے بعض بتوں کو جن کو وہ دیوتا یا تصور کرتے تھے اللہ کی بیٹیاں جو سمجھ رکھا ہے تو یہ سرے نام ہی نام ہیں جو انہوں نے اور ان کے باپ دادوں نے اپنی طرف سے ٹھہرایے ہیں اللہ نے تو ان کے اس عمل پر کوئی دلیل نہیں اتاری مگر انزل اللہ بھامن سلطان (اللہ نے تو اس پر کوئی دلیل اتاری نہیں ہے۔ نجم - ۲۲) پھر اس کے بعد یہ متذکرہ بالآیت ہے کہ یہ لوگ صرف اٹکل اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس ظن کی مذمت ہے وہ یہی ہے جو بلا دلیل ہو۔

قرآن نے بعض آیات میں تو یہ بات بالکل ہی واضح کر دی ہے کہ قرآن کی نظر میں ظن مذموم وہ ظن ہے جو شک اور وہم کے ہم معنی ہے جس کی بنیاد محض غلط تیاسات اور باطل اندازے ہوا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے :

<p>اور یہ لوگ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں یہ ان کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس کوئی علم تو ہے نہیں ہاں بس گمان کی پیروی ہے۔</p>	<p>وَالَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَخِي شَكٌّ مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ - الْاِتِّبَاعِ الْظُنُّ - (نساء - ۱۵۷)</p>
---	---

جن لوگوں کے متعلق اس آیت میں شک کی حالت میں ہونا بیان کیا گیا ہے انہی کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ظن کی اتباع کرتے ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ قرآن کناہر چاہتا ہے کہ ان کے ظن کی بنیاد شک ہے اگر یہاں اصطلاحی ظن مراد ہوتا تو شک کے ساتھ اس کا ذکر بے معنی ہوتا کیونکہ اصطلاحی لحاظ سے تو شک اور ظن دو متقابل چیزیں ہیں مترادف نہیں ہیں اسی طرح ایک اور مقام پر قرآن نے ظن اور غرض (یعنی باطل تخمینے) کو باہم مترادف اور ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ سورہ یونس کی ایک آیت ہے :

<p>اور وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ شرکاء کو پکارتے ہیں یہ صرف خیال کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور محض (باطل) تخمینے لگاتے ہیں۔</p>	<p>وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ اَنْ يَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُونَ (سورہ یونس - ۳۱)</p>
---	--

اس آیت کا اندازہ بیان بھی صاف بتلا رہا ہے کہ ظن کا خرص کے مترادف ہونا ہی ظن کے مذموم ہونے کا سبب ہے۔

غرض قرآن میں جہاں کہیں ظن کی مذمت بیان ہوئی ہے وہاں وہی ظن مراد ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیا جائے۔ محولہ بالا آیات میں قارئین نے دیکھ ہی لیا ان جملہ مواقع پر جتنے ظنون ہیں وہ سب سنی سنائی باتوں اور غلط قیاسات کا نتیجہ ہیں یہ سب وہ ظنون ہیں جو شریعت کے خلاف یعنی اللہ اور اس کے رسول کے بیان کردہ عقائد کے خلاف قائم کر لیے گئے ہیں۔ ان کا تو مذموم ہونا ظاہر ہے جب اللہ کی جانب سے حق بات پہنچا دی جائے تو پھر تو اس کے خلاف نہ ظن منبر ہوتا ہے نہ یقین۔ منکرین حدیث نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ظن کی مذمت اس لیے کی گئی ہے کہ وہ ظن ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ انہوں نے اتنا نہ سوچا کہ وہ ظن جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے وہ اگر یقین کے مرتبہ میں داخل ہو جائے تو اور زیادہ قابل مذمت ہو جاتا ہے جبکہ خبر واحد سے پیدا ہونے والا ظن اگر یقین کے مرتبہ پر پہنچ جائے تو منکرین حدیث کے نزدیک بھی مستحسن اور قابل اعتماد بن جاتا ہے۔ غور کا مقام ہے فرض کیجئے کسی خبر واحد کے بارے میں تحقیق کے بعد پتہ لگے کہ وہ خبر متواتر کی تمام صفات سے متصف ہے تو ظاہر ہے ہی کہا جائے گا کہ اس خبر میں جو طبیعت تھی وہ قطعیت میں تبدیل ہو گئی یعنی ظن ترقی کر کے یقین میں پہنچ گیا پھر خود منکرین حدیث کے نزدیک بھی اسی خبر پر عمل واجب ہو گا امن کا مطلب یہ ہوا کہ خبر واحد سے پیدا ہونے والا ظن یقین میں بدل جائے تو اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے اسی کے مقابلے میں وہ ظن جو محض اپنی دماغی ایجاد اور خواہش نفس کی بنا پر ہو اس کی حقیقت میں ذرا غور کیجئے وہ یقین کی حد میں داخل ہو گا تو اور زیادہ مذموم سمجھا جائے گا۔ بھلا وہ ظن جو محولہ بالا پہلی آیت میں کفار مکہ کو فرشتوں کے متعلق تھا یا وہ ظن جو دوسری آیت میں منافقوں کو اللہ کی نصرت کے بارے میں تھا یا اسی طرح وہ ظن جو مشرکین مکہ نے اپنی دیویوں کے بارے میں قائم کر لیا تھا یہ تمام ظنون جو قرآن نے بیان کیے ہیں بھلا یہ اگر یقین کے مرتبہ پر پہنچ جائیں تو کیا وقیع اور قابل اعتماد ہو جائیں گے؟ یقیناً نہیں! یہ تمام ظنون یقین ہیں

تبدیل ہو کر تو اور زیادہ مذموم بن جائیں گے۔ معلوم ہوا قرآن جس ظن کا ذکر کرتا ہے وہ مذموم ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ محض ظن ہے یقین کی حد کو نہیں پہنچا بلکہ اس لیے ہے کہ اس کی حقیقت بے تحقیق بات اور باطل قیاس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ ظنی احکام جو ظنی احادیث سے ثابت ہوں قرآن نے ان کے خلاف کہیں بھی کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔

در اصل قرآن کی اصطلاح میں ظن، یقین اور شک کے بالمقابل کسی حالت کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تخمینے کا نام ہے جو واقعات کی نوعیت کے لحاظ سے یقین اور وہم دونوں حالتوں کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن ایک مقام پر نماز کا ذکر کرتے ہوئے خاشعین کے متعلق کہتا ہے :

وہ بہت گراں ہے مگر خاشعین پر نہیں جنیں یہ خیال رہتا ہے کہ انہیں اپنے پروردگار سے ملنا بھی ہے۔	وَالَّذِينَ كَبُرُوا عَلَى الْخَاشِعِينَ الَّذِينَ يَقُولُونَ اَللّٰهُمَّ مَلَا قَوْلُنَا (البقرة: ۲۵-۲۶)
---	---

اس آیت میں ظن یقین کے ساتھ جمع ہے اس لیے کہ نماز پڑھنے والے خاشعین کو قیامت کا ظن نہیں بلکہ کامل یقین حاصل تھا جیسا کہ قرآن خود اس بات کی گواہی دیتا ہے :

اور آخرت پر وہ پورا یقین رکھتے ہیں۔	وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (البقرة - ۴)
-------------------------------------	---

جب کہ دوسری مثال میں دیکھئے ظن وہم کے ساتھ بھی جمع ہے قرآن کفار کے متعلق کہتا ہے :

کیا انہیں اپنا خیال نہیں کہ انہیں ایک بڑے سخت دن میں زندہ اٹھایا جانا ہے یہ مدد دے جس میں سب لوگ پروردگار کے روبرو کھڑے ہونگے۔	اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَللّٰهُمَّ مَبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ، يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِوَجْهِ الْعَلِيِّ (الغافين : ۴-۶)
--	--

ظاہر ہے کفار کو قیامت کا یقین کب تک صرف وہم گئے درجے میں ایک مہموم سا خیال ضرور تھا جیسا کہ قرآن نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے :

ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے جس قیامت کا یونہی خیال سا ہے ہم ہرگز اس پر یقین لانے والے نہیں۔	مَا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُتَّبِعِيْنَ (جاثية : ۲۲)
---	---

چونکہ ظن یقین کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا تھا اس لیے وما نحن بمستيقنین کے الفاظ اس بات کی تصریح کر رہے ہیں کہ کفار کا یہ ظن وہ ظن نہیں جس کے بعد یقین پیدا ہو سکے بلکہ یہ ان ادہام کے قبیلے کی چیز ہے جو جانب مخالف کے بارے میں یقین رکھتے ہوئے بھی دماغ میں اپنا گذر رکھ سکتی ہے۔

یہ دونوں مثالیں اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن کی نظر میں ظن یقین کے بالمقابل کسی چیز کا نام نہیں بلکہ اس خیال آرائی کا نام ہے جو انسانی فطرت کی سلامتی اور کجی کے اعتبار سے یقین اور وہم دونوں حالتوں کو اپنی ذات میں سموئے ہوئے ہے سلیم الطہرت انسان اکثر واقع کے مطابق ہی ظن کیا کرتا ہے جیسا کہ ناشعین کا تقارب کے بارے میں ظن کرنا اور کج فطرت انسان ہمیشہ اٹکل کے تیر چلاتا ہے اور وہم کی بھول بھلیوں میں ٹانگ ٹپیاں مارتا ہے جیسا کہ کفار کا قیامت کے بارے میں مویہوم سا خیال رکھنا۔

غرض اب تک کی بحث سے معلوم ہوا کہ وہ ظن جو قابلِ مذمت ہے وہ علم کی کسی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ محض خیال آفرینی اور قیاس آرائی ہے جبکہ اس کے بالعکس خبر واحد سے پیدا ہونے والا ظن علم ہی کی ایک قسم ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن و حدیث نے بتائی یا صحابہ سے منقول ہوئی وہ علم ہے خواہ وہ قطعیت کے درجے میں ہو یا ظنیت کے درجے میں۔

صحابہ کے آثار میں غور کرنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ بات جو ان تک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی ان کے لیے علم کی حیثیت کی حامل تھی ظن کے لفظ کا استعمال ان کے درمیان صرف اس رائے کے لیے کیا جاتا تھا جو محض اپنی عقل سے کسی شرعی ہدیا کے بغیر قائم کی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن اپنے خطبے میں فرمایا:

اے لوگوں! جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کا تعلق ہے سو وہ درست تھی کیونکہ اللہ آپ کی رہنمائی کرتا تھا ہماری رائے تو صرف ظن اور تکلف ہے۔

ایہا الناس ان الراۓ انہا کان من رسول اللہ صحیباً لان اللہ کان یرید و انہا ہو منّا النطق والتکامد (رجاء بیان العلم)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جو رائے اللہ کی ارادۃ اور اصابت کے ساتھ ہو حقیقی معنی میں صرف اسی کا نام رائے ہے اور صرف وہی درست اور ٹھیک ہے یعنی علم کی حیثیت صرف اسی کو حاصل ہے اس کے علاوہ جو رائے بعض اپنی جانب سے ہو اللہ کی ارادۃ اس میں شامل نہ ہو یعنی جس کی بنیاد قرآن اور حدیث پر نہ ہو وہ رائے کلمائے جانے کی مستحق ہی نہیں اس کو صرف ظن اور تکلف ہی کہا جاسکتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی معاملے کے متعلق انہیں کتاب و سنت میں کوئی فیصلہ نہ ملتا تو توقف فرماتے اور فیصلہ نہ دیتے پھر فرماتے اگر تم جاہل ہو تو میں تمہیں اپنے ظن اور اہل کل سے بتلا دوں گویا یہ جتلا دیتے کہ ہر وہ بات جو کتاب و سنت کے علاوہ ہے وہ ظن اور اہل کل سے نہ یاد کچھ نہیں۔

اپنی جانب سے تخمینہ اور خیال آرائی کے لیے صحابہ کبھی ظن اور تکلف کے الفاظ ساتھ استعمال کرتے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے قول سے ظاہر ہے اور کبھی صرف ظن کا لفظ استعمال میں لاتے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے کلام سے واضح ہے جبکہ کبھی اپنے تخمینوں کو صرف تکلف کے لفظ سے تعبیر فرماتے چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ان الفاظ پر غور کیجئے :

<p>اگر کسی کے پاس کوئی علم ہو تو وہ لوگوں کو سکھلا دے اور اگر علم نہیں رکھتا تو وہ بات منہ سے نہ نکالے جس کا اس کو علم نہیں تاکہ متکلفین میں اس کا شمار نہ ہو جائے۔</p>	<p>مَنْ كَانَ عِنْدَهُ عِلْمٌ فَلْيُعَلِّمِ النَّاسَ وَإِنْ لَمْ يَعْلَمْ فَلَا يَقُولَنَّ مَا لَيْسَ لَهُ بِهِ عِلْمٌ فَيَكُونَ مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۵)</p>
---	--

حضرت ابوموسیٰؓ کے ان الفاظ سے معلوم یہ ہوا کہ جب کبھی بات کا علم نہ ہو تو اپنی بے علمی چھپانے کے لیے اپنی جانب سے جو بات گھر لی جائے وہ تکلف ہے۔ آپ غور کریں تو

ظن کی حقیقت یہی یہی ہے کہ وہ محض اس خیال کا نام ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیا جائے۔

ظن اور تکلف کے علاوہ اپنی طرف سے تخمینہ اور خیال آرائی کے لیے کبھی کبھی صحابہ مطلقاً رائے کا لفظ بھی استعمال کرتے تھے جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کا ایک قول ہے آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں اگر قرآن کی کسی آیت میں صریح اپنی رائے سے کوئی بات کہوں یا ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ مگر ایسی صورت میں وہ رائے جو کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کے تحت ہوتی تھی اس کو مطلقاً رائے نہیں کہا جاتا تھا بلکہ کتاب و سنت کی قید لگا کر اس کو عمیز کر دیا جاتا تھا چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس کے ایک قول میں اس تقسیم کی طرف اشارہ موجود ہے آپ فرمایا کرتے

جی نے کوئی ایسی رائے و بجا دی جو قرآن میں نہیں اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہے وہ نہیں بانٹا کہ کلی قیامت میں اس کا کیا حشر ہو گا۔

من أحدث رأيًا ليس في كتاب
الله ولم ينفذ به سنة من
رسول الله لم يدر على ما هو منه
إذا نفي الله عز وجل

(اعلام الموقعين ج ۱ ص ۴۵)

غرض صحابہ کے یہ تمام اقوال اس بات پر شاہد ہیں کہ ظن جسے صحابہ تکلف اور رائے سے بھی تعبیر کرتے تھے وہ علم کی کسی قسم کا نام نہیں تھا بلکہ صرف تخمینہ یا توں کو ظن کہا جاتا تھا اس کے مقابلے میں ہر وہ بات جو کلام اللہ یا سنت رسول اللہ کے ذریعے ان تک پہنچتی صحابہ کے نزدیک اسے علم کا درجہ حاصل تھا متذکرہ بالا اقوال صحابہ میں ظن اور تکلف کے بالمقابل علم کا بطور خاص ذکر بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ظن اور علم ان کے یہاں دو متقابل چیزوں کا نام تھا۔

جس طرح اپنی رائے اور اپنے تخمینوں کے لیے ظن کے لفظ کا استعمال صحابہ کے
یہاں رائج تھا اسی طرح ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو خواہ وہ
خبر واحد ہی کے درجے میں کیوں نہ ہو اس کے لیے صحابہ کے یہاں علم کی اصطلاح کا
رواج تھا۔ اس کے لیے بہترین شہادت وہ واقعہ ہے جو ملک شام کی طرف حضرت
عمرؓ کے تاریخی سفر میں پیش آیا اور جس کا ذکر ہم اوپر بھی کہیں کر چکے ہیں طاعون زدہ
علاقوں میں رہتے نہ رہنے کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جب حضرت
عبدالرحمن بن عوفؓ نے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی تو نقل کرنے سے پہلے فرمایا ”یر
پاس اس مسئلے کے متعلق ایک علم ہے۔“ ظاہر ہے یہ حدیث خبر واحد تھی کہ اس کے
راوی اکیلے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ہی تھے اس خبر واحد کو حضرت عبدالرحمن بن
عوفؓ نے علم سے موسوم کیا اور اسی علم کی بنیاد پر حضرت عمرؓ آگے سفر جاری رکھنے
کے بجائے واپس مدینہ لوٹ آئے۔

صحابہ کے بعد تابعین اور ائمہ مجتہدین و محدثین کے درمیان بھی ظن اور علم یا رائے
اور علم دو متقابل چیزوں کے طور پر مستم رہے ابن سعد نے طبقات میں حضرت عطاء
بن ابی رباح کے حال میں لکھا ہے کہ ابن جریج کہا کرتے تھے :

عطاء جب کوئی روایت بیان کرتے تو میں پوچھتا
کہ علم ہے یا رائے اگر حدیث ہوتی تو کہتے علم ہے
اور اگر رائے ہوتی تو کہتے کہ رائے ہے۔

كَانَ عَطَاءٌ إِذَا حَدَّثَ بِشَيْءٍ
قَالَ: "عِلْمٌ أَوْ رَأْيٌ فَإِنْ كَانَ
أَمْرًا قَالَ: "عِلْمٌ وَإِنْ كَانَ رَأْيًا قَالَ:
رَأْيٌ" (طبقات ابن سعد ۱ ص ۲۴۵)

امام اوزاعی فرمایا کرتے تھے کہ علم صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے صحابہ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں ہے۔

ظن کی حجیت | ظن کے صحیح مفہوم کی اس تحقیق کے بعد کیا اس امر میں کسی شبہ کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ ظن صرف وہ مذموم اور قابل رد ہے جو محض تکلف اور خود ساختہ رائے پر مبنی ہو۔ رہا وہ ظن جو خبر و احاطہ سے حاصل ہوتا ہے اس کے قابل مذمت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ علم ہی کی ایک قسم ہے اسے قبول کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔ دیکھا جائے تو انسان کے تمام دلائل کی پروا صرف ظن ہی کی عزت محدود ہوتی ہے اس کے بعد یقین کا حاصل ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی بخشش پر منحصر ہے۔ انسان تو جس حد تک مکلف ہے وہ صرف تحصیل ظن ہے یقین کی وہ منزل جس میں جانب مخالفت کا گذر تک نہ ہو بہت نادر ہے۔ اگر تمام شریعت کی بنیاد ایسے ہی یقین پر قائم مانی جائے تو فروعات تو درکنار اصول کے بہت سے مسائل بھی دلائل کی روشنی میں اس قسم کے یقین کی عزت ثابت ہونا مشکل ہیں۔ اسی لیے تحصیل یقین کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر ان کی تمام باتوں کو بے دلیل مان لیا جائے۔ احکام الہیہ میں غور کیجئے جہاں ہمیں بلا تردد یقین رکھنے کا مکلف بنایا گیا ہے وہاں دلائل کی تحصیل کا حکم نہیں دیا گیا اور جہاں اجتہاد و استدلال کا حکم دیا گیا ہے وہاں یقین کے آخری مراتب کا مکلف نہیں بنایا گیا بلکہ ظن ہی کو یقین کا حکم دے دیا گیا ہے اس لیے کہ انسان کے دلائل کی پروا محدود ہی صرف تحصیل ظن تک ہے۔

اگر ہر قدم پر یقین کا حاصل کرنا فرض کر دیا جاتا تو دین و دنیا دونوں کے نظام معطل ہو کر رہ جاتے جیسا کہ اس مضمون کی ابتدا میں ہم نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دراصل شہادت اور خارجی دلائل کی روشنی میں جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اس کا نام ظن ہے ہی نہیں وہ یقین ہی ہے خواہ عقلی طور پر اس میں کتنے ہی شبہات باقی رہیں مثلاً اگر ایک کنویں میں نجاست کا گرنا ثابت نہیں ہو سکا تو اس کو پاک منہ یقینی ہو گا حالانکہ یہ احتمال ہر وقت ممکن ہے کہ اس میں نجاست گر گئی ہو اور اس کا ہمیں علم نہ ہو لیکن جب اس احتمال کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں تو اس کا اعتبار

بھی نہیں۔ ہر حال اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسائل فروعیہ میں ہرگز اس یقین کا اعتبار نہیں ہے جو تواتر سے حاصل ہوتا ہے بلکہ ہر وہ یقین جو دلائل کی رہبری و رہنمائی میں حاصل ہو جائے وہ بھی بلا تردد معتبر ہے اب خواہ آپ اس کا نام یقین رکھ لیں خواہ اسے ظن سے تعبیر کریں۔

در اصل منکرین حدیث کو غلط فہمی محدثین کے اس بیان سے لگ گئی کہ خبر متواتر علم یقین کو مفید ہوتی ہے اور خبر واحد علم یقین کو مفید نہیں ہوتی وہ محدثین کے اس بیان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے انہوں نے سوچا کہ جب خبر واحد مفید علم یقین نہ ہوتی تو یقیناً مفید علم ظن ہوتی یقیناً خبر متواتر کے علاوہ جتنی حدیثیں ہیں وہ سب ظنیات کا مجموعہ ہیں اور ظن ہی کو مفید ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جن علم کو خبر متواتر کے ساتھ مخصوص کیا ہے وہ صرف علم بدیہی ہے یعنی وہ علم جو کسی دلیل و برہان کے بغیر حاصل ہوتا ہے جیسا کہ آفتاب کے وجود کا علم کہ ہر مسلم و کافر، ہر جوان اور بوڑھا اور ہر احمق و عاقل شخص اس کے وجود کا علم رکھتا ہے اور اس کے لیے کسی دلیل کا محتاج نہیں لیکن ظاہر ہے ایسا علم صرف اپنے مشاہدات پر ہی حاصل ہو سکتا ہے اس کے سوا اگر ہزاروں افراد بھی کسی بات کو نقل کریں تو اس قسم کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر دیکھئے لاکھوں کروڑوں انسان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ کا عقیدہ رکھتے ہیں یا لاکھوں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو آدراگان کے قائل ہیں مگر ان کروڑوں انسانوں کی خبر کے بعد بھی یقین تو درکنار اس کا ظن بھی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں خبر متواتر کی اور شرطوں کے علاوہ سب سے بڑی یہ شرط مفقود ہے کہ اس کا مبنی امر محسوس نہیں بلکہ امر معقول ہے اور اتنی بات تو منکرین حدیث بھی مانتے ہیں کہ خبر متواتر کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا مبنی امر محسوس ہو۔ نیز اس خبر کو سننے ہی سامع کو یقین حاصل ہو جائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے۔

معلوم ہوا محدثین نے خبر واحد سے جس علم کی نفی کی تھی وہ علم بدیہی تھا منکرین حدیث اپنی نا سمجھی کی بنا پر خبر واحد سے مطلق علم ہی کی نفی کر بیٹھے۔ محدثین کے حذکرہ بالا

قول کا مطلب یہ تھا کہ خبر واحد سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ خبر متواتر کی طرح علم بدیہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی ظنی ہوتا ہے اور کبھی نظری۔ یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر سے علم حاصل ہونے میں سب لوگ یکساں ہوتے ہیں خواہ ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہو یا نہ ہو لیکن خبر واحد سے علم حاصل کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جن میں نظر و فکر کی اہلیت موجود ہو خبر واحد سے ہر شخص کو یکساں علم حاصل نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر میں سند سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی جبکہ خبر واحد میں یہ ضرورت باقی رہتی ہے۔

اب خبر متواتر کے ساتھ علم بدیہی کی شرط رکھ کر غور کیجئے اگر تمام دین کی بنیاد علم بدیہی ہی پر قائم کی جائے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلے گا کہ تمام دین کو قطعی طور پر حاصل کرنے کے بجائے پورے دین سے ہی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ عقائد اصول شرائط، مخیبات اور دین کے تمام نظری مسائل سب ظنی ہو جائیں گے اور منکرین حدیث کی دلیل کے مطابق قابل اعتبار نہ دیں گے۔

منکرین حدیث ذرا یہ تو بتلائیں کہ اگر ظن ان کی نظر میں ایسا ہی قابل رد ہے تو ان احکام کے متعلق ان کی کیا رائے ہے جو قرآن کریم سے ظنی طور پر ثابت ہیں کیا وہ بھی خبر واحد کی طرح ان کے نزدیک معاذ اللہ قابل رد ٹھہریں گے؟ قرآن کا ایک ایک حرف اگرچہ متواتر ہے لیکن اس کے باوجود اس کے جو مسائل فروعیہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں ان کے متواتر ہونے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ ضروری نہیں کہ جبکا ثبوت قطعی ہو اس کی دلالت بھی قطعی ہو آیات قرآنیہ یقیناً تمام کی تمام قطعی الثبوت ہیں ان کے ثبوت میں ذرہ برابر کسی قسم کا شبہ نہیں لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہر آیت قطعی الدلالت بھی ہے۔ ظاہر ہے نہیں، آیات قرآنی دلالت علی المعنی میں باہم مختلف ہیں بعض آیات کی دلالت کسی معنی اور مفہوم پر قطعی ہے جبکہ بعض آیات کی دلالت کسی خاص مفہوم اور خاص معنی پر ظنی ہے مثال کے طور پر قرآن کا کوئی لفظ ہے کہ اس کے معنی میں ائمہ لغت کا اختلاف

ہے یا کوئی اعرابی مسئلہ ہے کہ ائمہ نحو اس میں مختلف رائے رکھتے ہیں یا اسی طرح کوئی کوئی بلاغی مسئلہ ہے کہ ائمہ بلاغت کے اس میں مختلف اقبال ہیں تو ایسی صورت میں وہ انظر قرآنی متعدد معانی کو محتمل ہو گا چنانچہ اس کی دلالت اپنے معنی پر قطعی نہ ہوگی بلکہ ظنی ہوگی اور جو احکام اس قسم کے الفاظ پر مشتمل آیات سے ثابت ہوں گے ظاہر ہے وہ بھی ظنی ہوں گے قطعی نہ ہوں گے، لہذا اگر اخلاقی حادثہ ظنی ہونے کی وجہ سے قابل رد ہیں تو منکرین حدیث ذرا بتلائیں کہ وہ احکام جو قرآن کریم سے ظنی طور پر ثابت ہیں یک وہ بھی آپ کے نزدیک معاذ اللہ قابل رد ہیں۔

اسی طرح منکرین حدیث کی ان احکام قرآنی کے متعلق کیا رائے ہے جن کا معنی کوئی امر غیر محسوس ہے کیا وہ سب متواتر کی تصریح پر پورے اترتے ہیں؟ معنی غیر محسوس ہونے کی بنا پر متواتر کی فہرست سے تو وہ نکل گئے کیا ان احکام کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے گا؟ سوچنے کی بات ہے قرآن کو متواتر کہنے کا کیا مطلب ہے؟ یہی ناکہ یہ وہی قرآن ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اس کے علاوہ جتنے اس کے غیر محسوس احکام ہیں جتنے عالم غیب کے اسرار و حقائق ہیں کیا وہ سب بھی متواتر ہیں؟ کیا تواتر کی ساری شرائط ان میں موجود ہیں؟ کیا سامع کو سننے کے ساتھ ہی فوراً ان تمام غیر محسوس احکام پر عالم غیب کے ان تمام اسرار و حقائق پر بلا دلیل یقین حاصل ہو جاتا ہے؟ ظاہر ہے ایسا نہیں ہے قرآن اگر متواتر ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کے الفاظ تواتر کے ساتھ سنے گئے ہیں جب احکام کا مرحلہ آئے گا تو اکثر آیات کا مفہوم غیر محسوس ہونے کی بنا پر متواتر نہ رہے گا اور جو متواتر نہ ہو وہ مفید یقین نہیں ہوتا تو یک منکرین حدیث ان تمام احکام کا انکار کر دیں گے؟

غرض دین کے تمام احکام کو اگر تواتر کی شرط کے ساتھ مشروط کر دیں گے تو فردعی مسائل تو درکنار بہت سے اصولی احکام کو بھی ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا لہذا یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ خبر واحد سے حاصل ہونے والا علم ظنی ہونے کے باوجود قابل قبول اور موجب عمل ہے بشرطیکہ وہ خبر کسی سچے اور ثقہ راوی سے مروی ہو نیز کوئی دلیل قطعی اس

کئے معارض نہ ہو۔

شریعت نے کسی خبر کی تصدیق کا معیار تو اترا رکھا ہی نہیں جہاں بھی زور دیا ہے راوی کی عدالت پر اور اس کے صدق پر زور دیا ہے۔ شریعت نے جان تک کے معاملے میں دو شخصوں کے بیان کا اعتبار کر لیا ہے اور ایک جگہ بھی خبر کی تصدیق کے لیے تو اترا کی شرط نہیں لگائی اگر دو شخصوں کے بیان پر ایک مسلمان کو قصاصاً قتل کیا جاسکتا ہے یا ایک چور کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے یا ایک شخص پر حد قذف لگائی جاسکتی ہے یا لاکھوں کروڑوں کی مالیت تقسیم کی جاسکتی ہے تو کیا یہ اس بات کا بدیہی ثبوت نہیں ہے کہ شریعت نے یقین کا معیار تو اترا نہیں رکھا کیا یہ سمجھنا کسی طرح بھی درست ہو گا کہ شریعت نے ایک مسلمان کا قتل، ایک معصوم ہاتھ کا قطع ایک بے گناہ پر حد قذف اور لاکھوں کروڑوں کی مالیت کی تقسیم جیسے معاملات کو یقین حاصل ہوئے بغیر محض ظن کی بنا پر ہائز قرار دے دیا ہے۔ دینی ثبوت کے لیے یقین کا مطالبہ تو معقول ہو سکتا ہے مگر تو اترا کی شرط لگانا بالکل بے محنت بات ہے۔ منکرین حدیث بات یہ ثابت کر کے دکھائیں کہ شریعت نے تو اترا کے علاوہ یقین کو یقین ہی نہیں کہا یا پھر یہ ثابت کریں کہ خبر واحد کسی صورت بھی مفید یقین ہوتی ہی نہیں اگر خارجی قرائن ملا کر کبھی خبر واحد بھی یقین کا نائدہ دے سکتی ہے اور شریعت کے نزدیک یہ یقین معتبر بھی ہے تو پھر یہ تفریق کہ اس قسم کا یقین دین میں معتبر ہے اور اس قسم کا نہیں بالکل غیر معقول اور لالچنی بحث ہے۔ حق یہ ہے کہ یقین کا افادہ صرف تو اترا میں منحصر نہیں بلکہ حب متفرق دلائل اور خارجی و داخلی قرائن کی ایک امر کی شہادت دیتے پہلے جائیں تو اس میں لفظی تو اترا نہ سہی مگر ایک قسم کا معنوی تو اترا ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور اس مجموعے سے یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

خبر واحد کی ظہیرت پر اب تک جو گفتگو ہوئی ہے اس سے یہ بات اگرچہ ثابت ہو چکی ہے کہ خبر واحد مفید علم ظہری ہونے کے باوجود قابل استناد اور موجب عمل ہے تاہم اس ضمن میں ایک آخری بات کہہ کر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور منکرین حدیث کی دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

علامہ ابن حزم نے الاحکام^۱ میں خبر واحد کی حجیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اخبار آحاد کی حجیت کا حجام تک تعلق ہے تو وہ ظنی نہیں بلکہ قطعی ہے اس لیے کہ عمر صحابہؓ نے کرآن تک اس بات پر علامہ کا اجماع مستعد ہوتا چلا آ رہا ہے کہ خبر واحد حجیت ہے اب اس پر کس کا اختلاف بھی ہو تو وہ ظاہر ہے اجماع پر افرانداز نہیں ہو سکتا اس لیے ثابت ہوا کہ خبر واحد کی حجیت کی تعمیل ایک ظنی دلیل کی پیروی نہیں بلکہ ایک قطعی دلیل یمن اجماع کا اتباع ہے۔

أصول وفروع کا فرق | آپ آئیے منکرین حدیث کی دوسری دلیل کی طرف، خبر واحد کی عدم حجیت کے بارے میں ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جب اصول و عقائد میں خبر واحد پر عمل درست نہیں تو فروعات میں بھی درست نہیں ان کے خیال کے مطابق خبر واحد اگر موجب عمل و قابل استناد ہے تو نہ اصولی و فروع دونوں میں ہونا چاہیے اور اگر اصولیات میں وہ قابل استناد نہیں تو پھر فروعات میں بھی اس کا قابل استناد ہونا جائز نہیں۔

منکرین حدیث کی اس دلیل کا یہ حاسرہ مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ یا تو قطعی دلائل کے بموجب کے مسئلے میں فروع کی بھی اصول و عقائد پر تکیا س کیا جائے یا پھر ظنی دلائل کے موجب عمل ہونے کے لیے اصول و عقائد کو بھی فسُدِ عام پر محمول کیا جائے اور یہ دونوں باتیں محالات کی فہرست میں آتی ہیں نہ فروع کو اصول پر تکیا س کیا جاسکتا ہے اور نہ اصول کو فروع پر۔ یہ اس قدر بدیہی بات ہے کہ اس سے اختلاف و نزاع صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کا مقصود مناظرہ ہاڑی سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ کیا یہ بات بھی کسی دلیل کی محتاج ہے کہ اجماع دین دین کی بنیاد ہوتے ہیں اگر وہ ظنی ہوں گے تو دین کی بنیاد ہی کا ظنی امور پر قائم ہونا لازم آئے گا جبکہ فروع پر دین کی بنیاد قائم نہیں ہوتی وہ اصول دین کے ماتحت ہوتے ہیں اگر فروعات میں ظنیت ہو تو کوئی نقصان لازم نہیں آتا اس لیے

کہ اصول جن کی دراصل وہ مخالفت میں ہیں وہ خود اپنی جگہ قطعیت لیے ہوئے ہیں ان کی مثال بالکل قانونی دفعات کی سمجھنے والوں کے الفاظ اپنے اجمال کے ساتھ قطعی ہوتے ہیں اور اس کی ضمنی دفعات و تشوہات بسا اوقات ظنی ہوتی ہیں۔ فروع کے لیے قطعیت کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ مطالبہ کرنے لگے کہ کسی ملک کے آئین اساسی کو تمام جزئی قوانین کا احاطہ کیے ہوئے ہونا چاہیئے جس طرح اس مطالبے کو ہر کوئی غیر معقول اور ناقابل عمل کہے گا اسی طرح یہ مطالبہ بھی غیر معقول اور ناقابل عمل ہی کہلائے گا کہ فروع کے لیے بھی دلیل قطعی کا ہونا لازمی ہے۔

فروعات میں جن ظنیات کا اعتبار ہے وہ سب وہ ظنیات ہیں جو کسی نہ کسی قطعی اصل کے ماتحت درج ہیں۔ ایسی ظنیات کا دین میں کوئی اعتبار نہیں بن کے لیے کسی قطعی اصل کی شہادت موجود نہ ہو بلکہ امام شاطبی کی تحقیق کے مطابق تو ایسی ظنیات کا دین میں وجود ہی کوئی نہیں امام شاطبی نے المواقعات میں دلائل شرعیہ کی چار قسمیں بیان کی ہیں اول دلیل قطعی دوم وہ دلیل ظنی جو کسی قطعی اصل کے ماتحت ہے سوم وہ دلیل ظنی جو کسی قطعی کے معارض ہے اور دوسری کوئی قطعی دلیل اس کے لیے ثابت بھی نہیں ایسی ظنی دلیل یقیناً قابل قبول نہیں اور چہارم وہ دلیل ظنی کہ نہ اس کی موافقت میں کوئی دلیل قطعی ہاتھ آئے نہ مخالفت میں۔ اس چوتھی قسم کے متعلق امام شاطبی فرماتے ہیں :

والاستقرار يدل على انه غير موجود (المواقعات جلد ۲ ص ۱۱)

بہر حال جب یہ ثابت ہے کہ تمام فروعات کسی نہ کسی قطعی اصل کے ماتحت مندرج و مندرج ہیں تو ان کے ظنیات پر قائم ہونے سے کوئی نقصان لازم نہیں آتا بخلاف اصولیات کے کہ ان کا قیام بھی اگر ظنیت پر ہو تو دین کی بنیاد ہی محل نظر بن کر رہ جائے بنا بریں اصول و فروع کو اپنے اپنے ثبوت میں ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

ذوالیہدین کی بات تسلیم کرنے میں
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تامل
خبر واحد کی عدم حجیت کے سلسلے میں
منکرین حدیث کی تفسیری دلیل ذوالیہدین نامی
صحابی کی بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے تامل سے متعلق ہے۔ ذوالیہدین ایک صحابی کا لقب تھا ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے
اسی لیے ان کا یہ لقب پڑ گیا تھا یہ واقعہ اس طرح پر ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے نماز عصر پڑھائی اور بھول کر بجائے چار فرضوں کے دو رکعت پڑھی سلام
پھیر دیا مقتدیوں میں حضرت ابو بکر و عمرؓ بھی تھے اور کسی کو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
سے اس بارے میں پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی ذوالیہدین نامی صحابی نے سوال کیا یا رسول
اللہ کیا نماز کم ہو گئی یا آپ بھول گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نہیں میں
بھولا اور نہ نماز کم ہوئی“ پھر آپ نے دوسرے صحابہ سے استفسار کیا کہ کیا ذوالیہدین
کی بات صحیح ہے حضرت ابو بکر و عمرؓ اور دوسرے شہکار نماز نے اس کی تائید کی تو آپ
نے نماز کو درست کر لیا۔ یہ واقعہ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت
کیا ہے۔

اس واقعے سے منکرین حدیث کا استدلال یہ ہے کہ اگر خبر واحد حجیت ہوتی تو
آپ صرف ذوالیہدین کے کہنے پر نماز درست فرما لیتے ذوالیہدین کی بات سُن کر دوسروں
سے آپ کا اس بارے میں استفسار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے نزدیک خبر واحد موجب عمل نہ تھی۔

اس سلسلے میں ہمیں منکرین حدیث سے سب سے پہلے تو یہ پوچھنا ہے کہ جس مجموعہ
احادیث سے آپ یہ محولہ بالا حدیث اپنے موقف کی تائید میں لائے ہیں اسی مجموعے
میں وہ احادیث بھی تو ہیں جن سے آپ کے موقف کی کھلی تردید ہوتی ہے۔ اپنی تائید
میں تو آپ کو صرف ایک حدیث ہی مل سکی ہے جبکہ آپ کی تردید کرنے والی احادیث
بے شمار ہیں۔ صرف اس ایک حدیث کو قبول کرنے اور دوسری تمام احادیث کو
رد کر دینے کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ نو دس احادیث تو ہم نے ہی اس

زیر نظر تحریر میں آپ کے موقف کے رد میں پیش کی ہیں اس قسم کی احادیث آخر آپ کی توجہ کا مرکز کیوں نہ بنیں ؟

علامہ انریس اس محولہ بالا حدیث سے بھی منکرین حدیث کا استدلال اس وقت درست ہوتا جبکہ یہ کہا جا رہا ہو تاکہ خبر واحد ہر حالت میں قابل قبول اور معتبر ہے یہ دعویٰ تو کسی کا بھی نہیں کہ خبر واحد کو بغیر کسی چھان بین کے قبول کر لو راوی کی عدالت و تقابہت کی کوئی پرواہ نہ کرو روایت میں وہم و غلطی کی کوئی علامت ہو تو اس بارے بھی کوئی دھیان نہ دو بس خبر واحد سنتے ہی اس کو موجب عمل جان لو۔ خبر واحد کے بارے میں ایسی بات تو کوئی بھی نہیں کہتا۔ قابل قبول معتبر اور موجب عمل تو وہی خبر واحد ہے جو کسی سچے اور ثقہ راوی سے مروی ہو راوی میں مطاعن و روایت میں سے کوئی طعن نہ ہو اور کوئی دلیل قطعی اس کے معارض نہ ہو۔

اب ذوالیہدین والی روایت میں غور کیجئے۔ ذوالیہدین کی بات تسلیم کرنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے تامل نہ ہوا کہ مبادا انہیں وہم ہو گیا ہو ہاتھی شرکاہ نماز کے بارے میں بہ صراحت یہ بات آئی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ پوچھتے ہوئے ڈر رہے تھے جب ہاتھی نمازیوں نے یہ بات نہیں کہی تھی تو آپ کو اکیلے ذوالیہدین کی بات پر وہم کا گمان ہوا اور اس میں کسی کو بھی کلام نہیں کہ خبر واحد میں اگر وہم کی کوئی علامت پائی جاتی ہو تو اس میں توقف واجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی لیے توقف فرمایا کہ وہم کی علامت موجود تھی جب دیگر حاضرین نے تائید کر دی تو ذوالیہدین کی خبر واحد سے وہم کا احتمال جاتا رہا چنانچہ آپ نے اسے قبول کر لیا ۛ

خبر واحد کی عدم حجیت پر منکرین حدیث کی چوتھی دلیل کا تعلق بعض صحابہ کے ایسے طرز عمل سے ہے جو بظاہر خبر واحد کی حجیت کے خلاف نظر آتا ہے۔

بعض صحابہ کے طرز عمل سے غلط استدلال

وہ لوگ مختلف صحابہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے

کہ وہ خبر واحد پر عمل نہیں کرتے تھے مثلاً حضرت ابو بکرؓ نے دادی کی میراث سے متعلق حضرت میسرہ بن شعبہؓ کی روایت کو اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک حضرت محمد بن مسلمہؓ نے اس کی تائید نہ کر دی اسی طرح حضرت عمرؓ نے طلب اذن کے بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت پر شہادت طلب کی اور جب حضرت ابوسعید خدریؓ نے شہادت دی تب آپؐ نے اسے قبول کیا۔ علیؓ ہذا القیاس حضرت علیؓ کا حوالہ دیتے ہوئے منکرین حدیث کہتے ہیں کہ آپؐ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ آپؐ حلف لیے بغیر کسی کی روایت قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ نیز حضرت عائشہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اس روایت کو قبول نہیں کیا تھا کہ گمراہوں کے رونے سے میت کو سزا دی جاتی ہے۔

منکرین حدیث کی یہ دلیل بھی باقی دوسری دلیلوں کی طرح بالکل بے بنیاد ہے یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس میں کسی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ صحابہؓ اخباراً واحد پر عمل کرتے تھے۔ ابھی ہم خبر واحد کی حیثیت اور عمدہ صحابہؓ کے ذیلی عنوان کے تحت متعدد حوالوں سے یہ بات ثابت کر آئے ہیں منکرین حدیث کی جانب سے پیش کردہ ان متذکرہ بالا خاص خاص حوالوں کے بارے میں بھی اس کتاب کے پہلے حصے میں ہم نے حفاظت حدیث اور خلفائے راشدینؓ کے عنوان کے تحت بڑی سیر حاصل بحث کی ہے ناظرین براہ کرم ذرا پھر اس پوری بحث پر نظر ڈال لیں۔

منکرین حدیث نے حضرت ابو بکر صدیقؓ رضی اللہ عنہ کا میراث جِدہ کے متعلق جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے خبر واحد کی عدم حجیت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی حضرت ابو بکرؓ نے حضرت میسرہ بن شعبہؓ کی روایت قبول کرنے سے یہ تو کہا ہی نہیں جاسکتا کہ انکار کیا تھا زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ توقف کیا تھا توقف بھی اس لیے نہیں کیا تھا کہ آپؐ خبر واحد کو قبول نہ کرتے تھے بلکہ صرف اس لیے کیا تھا کہ آپؐ اصولی طور پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کوئی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف محض منسوب کر دینے سے ہی قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ تھان بین از تحقیق و تفتیش کے بعد یہ یقین حاصل

کہنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس بات کو منسوب کرنے میں کسی غلط بیانی یا سہو کا دخل تو نہیں۔ اسلام میں دادی کے لیے ترکہ کا چھٹا حصہ مقرر ہے چونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر قرسمان نے صراحتہً روشنی نہیں ڈالی اس لیے اس کی تعمیل کرنے میں زیادہ حزم و احتیاط کی ضرورت تھی حضرت میخڑہؓ کی روایت پر حضرت ابوبکرؓ کا گواہی مانگنا اعتماد کی شرط کے طور پر نہ تھا بلکہ محض مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی۔ آپ اپنے طرزِ عمل سے یہ سبق سکھانا چاہتے تھے کہ دین کا وہی حصہ کیوں نہ ہو جس کی بنیاد اخبارِ آحاد پر ہے اس کے رد کرنے یا قبول کر لینے میں لاپرواہی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

بالکل یہی بات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت پر شہادت طلب کرنے کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ یہ مطالبہ اس لیے ہرگز نہ تھا کہ تنہا حضرت ابو موسیٰؓ اشعریؓ جیسے حلیل القدر صحابی کی روایت پر حضرت عمرؓ کو اعتماد نہ تھا کیونکہ اسی نوعیت کی تنہا روایوں کی روایت کردہ نہ جانے کتنی حدیثوں پر حضرت عمرؓ سے بار بار اعتماد کرنا ثابت ہے بلکہ تائید کا یہ مطالبہ صرف اس لیے تھا کہ تحقیق حدیث کے لیے جس اصول کی بنیاد حضرت ابو بکرؓ رکھ گئے تھے حضرت عمرؓ اس کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنا چاہتے تھے حضرت عمرؓ یہاں پہنچتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یونی لا پرواہی سے کوئی بات منسوب نہ کی جائے بلکہ اعتماد میں قوت پیدا کرنے کے لیے جو تائید بھی مل سکتی ہو اس کو حاصل کیا جائے چنانچہ اس سلسلے میں حضرت ابی بن کعبؓ کے ایک استفسار پر حضرت عمرؓ نے اس حقیقت کا صراحتاً اظہار بھی فرمایا کہ حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت پر تائید کا یہ مطالبہ محض تحقیق حدیث کے لیے تھا۔ آپؓ فرمایا :

سبحان اللہ سبحان اللہ سبحان اللہ انما سمعت
 مشیاً فاجبت ان اُثبت -
 (جمع الفوائد)

اسی پر حضرت علی کے طرز عمل کو تیس کر لیجئے۔ حلفت لیے بغیر کسی کی روایت کو قبول

نہ کرنے کا جو طریقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اختیار کر لیا تھا اس کا سارا پس منظر ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں ”حفاظت حدیث اور خلعائے راشدین“ کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کرتے ہیں اس پس منظر میں حضرت علی کے طرز عمل کا جو شخص بھی انصاف سے جائزہ لے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ آپ کا یہ طریقہ احادیث نبویہ پر اعتماد میں قوت پیدا کرنے کے لیے تھا۔ فرقہ سبائیہ نے جس انداز سے جھوٹ گھڑا گھر کر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کا دیدہ و دانستہ سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس کی موجودگی میں حضرت علیؑ کے پاس اسکے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ آپ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی بات حلفت لیے بغیر قبول نہ کریں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ کوفہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دولت سے تو سرفراز ہوئے تھے لیکن شرف صحابیت سے محروم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو اپنے کالوں سے سننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت انہیں حاصل نہ تھی۔

دہریہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کو قبول نہ کرنے کی جس کو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے نقل کیا تھا کہ گھر والوں کے رونے سے میت کو مزار دی جاتی ہے تو اس بارے میں منکرین حدیث کی ذرا علمی دیانت ملاحظہ ہو جنہوں نے اپنے مطلب کے لیے یہ تو نقل کر دیا کہ حضرت عائشہؓ نے اس روایت کو قبول نہ کیا تھا مگر اس روایت کو قبول نہ کرنے کی جو وجہ حضرت عائشہؓ نے بیان کی تھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ نے اس روایت کو رد کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ قرآن تو کہتا ہے کہ لا تزروا ذرۃ و ذرۃ و ذرۃ آخری (اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ فاطر ۱۸) اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے خبر واحد کے مقابلے میں ایک دلیل قطعی پیش کی تھی جو حضرت عائشہؓ کی نظر میں اس کے معارض تھی اور ایسی خبر واحد جس کے معارض کوئی دلیل قطعی ہو کسی کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں۔ لہذا حضرت عائشہؓ کا قبول روایت سے انکار اس بنا پر نہ تھا کہ وہ خبر واحد تھی بلکہ صرف اس بنا پر تھا کہ حضرت عائشہؓ کی

نظر میں ایک دلیل قطعی اس خبر واحد کے معارض تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ نے جن کی نظر میں یہاں قطعی اور قطعی کا موازنہ ہے ہی نہیں اس خبر واحد کو قبول کیا ہے ان صحابہ کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی محولہ بالا آیت اور حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ روایت کے درمیان موازنہ اس بنا پر نہیں ہے کہ حدیث بنوی کے مطابق زندوں کے نوحہ کرنے سے میت کو عذاب اس وقت ہوتا ہے جبکہ نوحہ ان کے گھر کا دستور ہو اور میت نے اپنی حیات میں اس سے روکا بھی نہ ہو ظاہر ہے کہ اب یہ فعل میت ہی کا بن جائے گا اور اس لیے جو عذاب اس کو ہو گا وہ اپنے ہی فعل کا نتیجہ کہلائے گا نہ کہ دوسرے کے افعال کا۔

غرض اس قبیل کی جتنی احادیث ہیں جن کے بارے میں بظاہر صحابہ کی طرف عدم قبول کی نسبت کی گئی ہے ان کے متعلق جب بھی تحقیق و تفتیش سے کام لیا جائے گا یہی نتیجہ سامنے آئے گا کہ صحابہ نے جن احادیث کو بھی مسترد کیا یا جن روایات کو بھی قبول کرنے میں توقف سے کام لیا ان میں کوئی نہ کوئی شرط شرائط قبولیت میں سے مفقود تھی جو اس کے عدم قبول کی وجہ بنی یا راوی میں مطاعن روایت میں سے کوئی طعن موجود ہو گا یا کوئی قطعی دلیل ان کے معارض ہوگی اور دوسری کسی قطعی دلیل سے شہادت بھی میسر نہ ہوگی اور یا پھر وہ ہم و سہو کے احتمال سے بچنے کے لیے تحقیق و تفتیش کے مقصود کے پیش نظر توقف سے کام لیا گیا ہو گا جیسا کہ اوپر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ابھی منقول ہوا ہے کہ تاہم و شہادت کے بغیر انہوں نے بعض اخبار آحاد کو قبول کرنے میں توقف سے کام لیا اس قسم کی مثالوں میں تو یوں بھی کسی طرح یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اخبار آحاد سے عدم احتجاج کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اس لیے کہ ایک صحابی کے ساتھ دوسرے صحابی کے منظم ہو جانے سے وہ روایت خبر واحد کے درجے سے ذیل کر خبر متواتر تو نہیں بن جاتی کوئی روایت ایک یا دو یا تین صحابیوں سے مروی ہونے کے باوجود بھی اصطلاحی طور پر رہتی تو خبر واحد ہی ہے۔

ہر کیف حدیث کی تشریحی حیثیت کو مشکوک بنانے کی خاطر خبر واحد کی عدم حجیت

پر معکرین حدیث کی جانب سے جو دلائل دئے گئے تھے تاریکین نے دیکھ لیا کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔ کوئی مستحضریت نہیں تھی کہ بعض بعض جگہ وہ علمی دیانت تک سے تھی دامن میں اس کے مقابلے میں خبر واحد کی حجیت کے ثبوت میں عقلی و نقلی حیثیت سے جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ بھی تاریکین کے سامنے ہے ایک طرف بلا کسی معقول و متوازن دلیل کے یہ دعویٰ ہے کہ خبر واحد حجیت نہیں اور دوسری طرف اس کی حجیت کے ثبوت میں ٹھوس عقلی دلائل کے ساتھ ساتھ قرآنی تائیدات ہیں، عمد رسالت کے نظائر ہیں، عمد صحابہ کے شواہد ہیں اور ائمہ محققین و مجتہدین کی محققانہ آراء ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ حق کس کے ساتھ ہے اور باطل پر کون بلا جواز بے بند ہے ❖

”منصب رسالت اور مرکزیت“ کا تصور

در اصل حدیث کی تشوہی حیثیت سے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ منکرین حدیث منصب رسالت کے سمجھنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ رسول کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اللہ کے بندوں تک پہنچا دے۔ تبلیغ کتاب کے بعد ان کے نزدیک رسول کی حیثیت رسالت ختم ہو جاتی ہے پھر وہ بھی الیہا ہی ایک انسان ہے جیسے اور دوسرے انسان۔ منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ رسالت کا حق صرف یہ ہے کہ جو کتاب رسولوں نے پڑھ کر سنائی ہے اس کو ان کے اعتماد پر اللہ کا کلام سمجھ لیا جائے اس کے بعد رسول اور ہم برابر ہیں جس طرح ان کے پاس عقل ہے ہمارے پاس بھی ہے جس طرح وہ اللہ کی کتاب کو سمجھتے ہیں اسی طرح ہم بھی سمجھ سکتے ہیں چنانچہ ان کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پہنچا دینے کے علاوہ جو کچھ کیا شخصی حیثیت سے کیا۔ قرآن کے مطابق امت کا نظم و نسق، اس کی شیرازہ بندی ان کی تعلیم و تربیت ان کا تزکیہ نفس ان کے باہمی قضایا کے فیصلے تدبیر مہمات اور جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت غرض تبلیغ قرآن کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی کیا وہ منکرین حدیث کے نزدیک اگرچہ آپ نے قرآن ہی کی روشنی میں کیا مگر رسول اور پیغمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت میں مسلمانوں کے ایک امیر ہونے کے لحاظ سے کیا اور اس بنا پر ان تمام امور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس بنا پر نہیں کہ آپ اللہ کے رسول تھے بلکہ اس لیے ہے کہ آپ اپنے زمانے کے صاحب امر تھے اور اسی بنا پر آپ کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک آپ حیات میں اور اولوالامر کے عہدے پر فائز ہیں آپ کے بعد جو بھی اولوالامر بنے گا یہ اطاعت کا حق اس کی طرف منتقل ہوتا جائے گا۔ اس طرح پر منکرین حدیث کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں اطاعت رسول کے جو احکام ہیں وہ آپ کی ذات تک محدود نہیں ہیں

بلکہ اس میں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں کیونکہ اطاعت کے یہ احکام منصب امامت کے لیے ہیں اس لیے آپ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہوگا وہ اس اطاعت کا مستحق ہوگا اور چونکہ امامت کا یہ منصب جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نبی نوع انسان کی صلاح و فلاح کے لیے قائم ہوا ہے قیامت تک مقرر ہے اور آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اس لیے قرآن میں جہاں کہیں بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت کی اطاعت ہے۔ اس امام وقت کو منکرین حدیث نے مرکز ملت کا نام دیا ہے۔ یہ مرکز ملت ان کے نزدیک چونکہ خود اللہ و رسول ہے اس لیے قرآن کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جو معنی وہ پہنائے ان کو درست ماننا اور ان پر عمل کرنا اسی طرح ضروری ہوگا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امامت کے زمانے میں اپنے حالات کے مطابق قرآن کی جو تشریح و تعبیر کی اس کا ماننا اللہ اس پر عمل کرنا ضروری تھا مرکز ملت کے تمام فیصلے منکرین حدیث کی نظر میں واجب الاتباع ہیں مرکز ملت کو اختیار ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلوں میں سے جس کو چاہے باقی رکھے اور جسے چاہے رد کر دے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ احکام و مسائل کا پابند نہیں ہے اس کے لیے ان کی حیثیت صرف نظائر کی ہے اور نظائر بھی ایسے کہ ان سے وہ اپنی صوابدید کے مطابق استفادہ کرنے اور نہ کرنے میں پوری طرح آزاد ہے۔

غرض منصب رسالت کے مفہوم اور مرکز ملت کے تصور سے متعلق منکرین حدیث کی ساری بحث درج ذیل تین مرکزی نقطوں کے گرد گھومتی ہے۔

- (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ وہ اللہ کی کتاب اللہ کے بندوں تک پہنچا دیں اس کے بعد آپ کی حیثیت رسالت ختم ہو جاتی ہے۔
- (۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رسالت اور امامت دو حیثیتوں کے حامل تھے رسالت کی حیثیت سے آپ برصورت ایمان لانا ضروری تھا جہاں تک آپ کی اطاعت کا تعلق

ہے آپ کے امتیوں پر اس کا وجہ آپ کی امامت کی حیثیت سے تھارہ سال کی حیثیت سے نہیں۔

(۳) رسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی مگر امامت کا منصب آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے ہمیشہ باقی رہنے والا ہے چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں اطاعت رسول کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے یہ اطاعت امام وقت ہونے کی وجہ سے آپ کا حق تھی آپ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہوتا رہے گا یہ اطاعت اس کا حق ٹھہرے گی۔

آئیے منکرین حدیث کے ان تینوں دعوؤں کا بہ نظر غور جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس سلسلے میں منکرین حدیث نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔

جہاں تک منکرین حدیث کے پہلے دعویٰ کا تعلق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف اللہ کی کتاب پہنچا

کیا منصب رسالت صرف قرآن پہنچانے تک محدود ہے

دینا تھا اور بس تو یہ دعویٰ منکرین حدیث کے اپنے دماغ کی اختراع ہو تو ہو قرآن کی کسی آیت سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ قرآن کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے قرآن تو کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے امتیوں کے لیے معلم و مربی بھی ہیں اور پیشوا و نمونہ تقلید بھی حاکم و فرمانروا بھی ہیں اور قاضی فوج بھی۔ ان کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ وہ اللہ کی کتاب پر لکھ کر سنا دیں بلکہ یہ بھی ان کی ذمہ داری تھی کہ قرآنی آیات کی صحیح صحیح مرادات نہ صرف زبان کھول کھول کر بیان کر دیں بلکہ ان کا عملی نمونہ بھی مہیا کر دیں۔ قرآن ہمیں بتلاتا ہے کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے کہ وہ مبلغ کتاب ہونے کی حیثیت سے آیات قرآنی کو پڑھ کر سنا دیں وہاں آپ کا کام یہ بھی ہے کہ معلم کی حیثیت سے احکام قرآنی کی تعلیم اور اس کے قوانین کی تشریح و

توضیح بھی کریں نیز مرنے کی حیثیت سے قرآنی تعلیمات و قوانین کے مطابق اپنے امتیوں کی تربیت بھی کریں۔ اسی طرح پیشوا و نمونہ تقلید ہونے کی حیثیت سے آپ کا کام یہ بھی ہے کہ خود قرآنی تعلیم کا عملی مجسمہ بن کر دکھلائیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کما ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے حاکم و فرمانروا بھی ہیں لیکن ایسے حاکم و فرمانروا نہیں جن سے نزاع کی جاسکے بلکہ ایسے حاکم اور ایسے فرمانروا جن کے حکم کو بے چون و چرا ماننا ویسا ہی فرض ہے جیسا قرآن کی آیات کو ماننا فرض ہے یہ حاکم و فرمانروا جس بارے میں جو فیصلہ کر دے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قول ناظر بن جائے گویا ایسا قاضی اور ایسا جج جس سے اوپر کوئی اپیل نہیں۔ اس قاضی اور اس جج کے دئے ہوئے فیصلے پر جو شخص اپنے دل میں ذرا سی بھی تنگی محسوس کرے اس کا ایمان سلب ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمام ذمہ داریاں یہ تمام حیثیتیں قرآنی تصریحات ہیں۔ منکرین حدیث جو چاہے دعویٰ کرتے رہیں منصب رسالت کا اپنی طرف سے جو چاہے مفہوم متعین کرتے پھریں۔ قرآن ان کے ہر دعویٰ سے بری ہے۔ قرآن اٹھا کر دیکھ لیجئے منصب رسالت کی جو تفصیل قرآن نے دی ہے وہ وہی ہے جو اوپر مختصراً بیان ہوئی۔ اس سلسلے میں قرآن کی شہادتیں ملاحظہ کیجئے :

تبلیغ کتاب اور تعلیم و تربیت افراد | قرآن نے متعدد جگہ اس بات کو بار بار بتا کر اللہ علیہ وسلم کو تین بنیادی ذمہ داریوں کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اول یہ کہ آپ آیات قرآنی پڑھ کر سنائیں دوسرے یہ کہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں اور تیسرے یہ کہ آپ اپنی تربیت سے ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں کو دور کریں۔ ارشاد ربانی ہے :

وہی تو ہے جس نے اسی لوگوں میں خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اذان کا تذکرہ کرتا ہے اذان کو کتاب حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا
مِّنْهُمْ يَتْلُو آيَاتِهِ لِيُزَكِّيَهُمْ
وَيُعَلِّمَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
(المجدة-۲)

سورۃ آل عمران میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ذمہ داریوں کا ذکر احسان کے انداز میں کیا گیا ہے شاید یہ بتلانا مقصود ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ذمہ داریاں سونپی جاتیں تو انسانی صلاح و فلاح کا کام نامکمل رہتا۔ ارشاد ہے :

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ - (آل عمران - ۱۶۳)

اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر شانتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ ذمہ داریاں اللہ کے نزدیک اتنی اہم تھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے وقت جب نبی اسماعیل میں سے ایک عظیم نبی کے مبعوث کیے جانے کی دعا کی تو اس دعا کے لیے جو الفاظ اللہ کی طرف سے اتنا کیے گئے ان میں بھی ان ذمہ داریوں کا ذکر بطور خاص شامل رکھا گیا چنانچہ حضرت ابراہیم کی دعا کے الفاظ ہیں :

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ - (بقرہ - ۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر شانتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

سورۃ بقرہ ہی میں ایک اور مقام پر ان ذمہ داریوں کا ذکر اس انداز میں کیا گیا :

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مِمَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ - (البقرہ - ۱۲۹)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر شانتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اب تلائیے قرآن تو بار بار یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف قرآن سناوینا پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ لوگوں کا تزکیہ نفس کرنا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا بھی آپ کے فرائض میں داخل ہے مگر منکر بن حدیث کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام قرآن

بہو نچا دینا تھا اور بس۔ سوچئے کس کی بات مانی جائے اور کس کی رد کی جائے
ان آیات کے بارے میں یہ کہے چلے جانا کہ ان تمام ذمہ داریوں سے مراد قرآن ہی
کا بہو نچا دینا ہے بالکل ہی بلا دلیل ہے جس کو اللہ نے ذرا سی بھی عقل دی ہے وہ خود گواہ
ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم قرآن کے الفاظ سنا دینے سے نائد ہی کوئی چیز ہو سکتی ہے
ورنہ اس کا تلاوت آیات قرآنی کے مستعملہ ذکر کرنا بے معنی تھا اسی طرح افراد اور
معاشرے کی تربیت کے لیے آپ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی لازمی طور
پر قرآن کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نائد ہی کوئی چیز تھی بھی تو اس کا ذرا ایک علیحدہ ذمہ داری کے طور
پر کیا گیا۔ یوں بھی کسی ہدایت نامے میں مندرج احکام و مسائل کی تعلیم اور ان پر عمل پیرا
ہونے کی تربیت محض ان احکام و مسائل کے الفاظ بار بار دہراتے رہنے کا نام نہیں ہے
الفاظ دہراتے رہنے سے تعلیم تربیت کا تصور وہی کر سکتا ہے جو عقل کی نعمت سے محروم ہو۔

توضیح و تشریح کتاب | تعلیم کتاب کی جس ذمہ داری کا ان محمولہ بالا آیات میں
ذکر آیا ہے اس کو اور زیادہ واضح انداز میں توضیح و
تشریح کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بتایا
گیا ہے کہ یہ کتاب ہم نے تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم لوگوں کے سامنے اسے
کھول کھول کر بیان کر دو۔ سورہ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

<p>وَأْمُرْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِنُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ - (نحل - ۴۴)</p>	<p>(اے نبی) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اسی لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دو اس تعلیم کو جو انکی طرف آمارا گئی ہے۔</p>
---	--

ایک موشی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ کسی کتاب کو کھول کھول
کر بیان کرنا محض اس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے پورا نہیں ہو جاتا بلکہ بیان
کرنے والا اس کے الفاظ سے نائد ہی کچھ کتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری
طرح سمجھ جائے۔ اب بتلائیے یہ توضیح و تشریح اور یہ بیان کتاب کی ذمہ داری تبلیغ
کتاب کی ذمہ داری کے علاوہ ہے یا نہیں۔

عملی نمونہ | اس کے علاوہ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ قرآن صرف ایک علمی کتاب نہیں جس کا مقصد صرف علمی طور پر عمل کر لینا ہو۔ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام شاید قرآن پہنچا کر ہی ختم ہو جاتا لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ قرآن افراد و اقوام کا وہ دستور العمل ہے جسے زندگی کے ایک ایک شعبے میں نافذ ہونا ہے اس لیے تبلیغ کتاب کے بعد بلکہ اس کی تعلیم اور اس کی توضیح و تشریح کے بعد بھی ایک اہم ضرورت اور باقی رہتی ہے اور وہ ہے اس کا نقشہ عمل۔

دینی علوم میں بھی بہت سے علوم ایسے ہیں جو عملی مظاہرے کے بغیر اولاً تو سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو اس وقت تک صحیح طور پر رویہ عمل نہیں لائے جاسکتے جب تک ان کا کوئی نقشہ عمل سامنے نہ ہو جب معمولی دینی علوم کی یہ حال ہے تو ربانی علوم کی دقیقیں اور معاملات و عبادات کی نزاکتیں اپنے انواع و اقسام کے اختلاف کے ساتھ کسی ربانی معلم کی جانب سے مہیا شدہ کسی نقشہ عمل کے بغیر کیسے سمجھ میں آ سکتی ہیں چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی کہ قرآنی احکام و ہدایات کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائیں۔ قرآن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ پر ایمان لانے والوں کے لیے ایک نمونہ تقلید کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے کہا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ

أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو

تَمَارَ سَيِّئِ اللَّهِ كَيْ يَرْجُو

اللَّهُ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ (احزاب - ۲۱)

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک نمونہ

تقلید ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم

آخر کا امیدوار ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ اگر اس نمونے کی پیروی نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو۔ اب بتلائیے اگر آپ کا کام صرف قرآن کا پہنچا دینا تھا تو آپ کو نمونہ تقلید قرار دینے کے کیا معنی۔ نمونہ تقلید قرار دینے کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ مگر قرآن کی جو باتیں علمی مسائل سے متعلق ہیں ان کا عملی مظاہرہ کر کے بتایا جائے کہ منشائے خداوندی پر اس طرح عمل کرنا ہے قرآن کے علمی احکام و مسائل کے متعلق سوال کرنے والوں کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنا دینا کسی طفل مکتب کے نزدیک بھی سوال کرنے والوں کی تشفی کا موجب نہیں سمجھا جاسکتا اس

کے لیے تو ایک ایسے ہی نقشہ و عمل کی ضرورت ہے جس کو دیکھ دیکھ کر انسانی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی امور کو درست طریقے پر استوار رکھا جاسکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عجم نقشہ عمل بنا دیا اور حکم دے دیا کہ اس نقشہ عمل کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالتے چلے جاؤ ساتھ ہی صاف صاف فرما دیا کہ جس کسی کو اخروی نجات کی فکر ہے اور جو کوئی مجھ سے کوئی امید لگائے ہوئے ہے اس سے چاہیے کہ وہ اس نقشہ عمل اور اس نمونہ تقلید کی پیروی کرے گویا جو شخص پیروی نہیں کرتا وہ اللہ سے کوئی امید نہ رکھے۔ ایک اور مقام پر تو یہاں تک فرما دیا گیا کہ اس نمونہ تقلید کی پیروی سے منہ موڑنا کفر ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے :

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ
غَفُورٌ رَحِيمٌ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ
(آل عمران - ۳۱ : ۳۲)

اے نبی، آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اللہ بڑا بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ موڑیں تو اللہ کافروں سے ذرا محبت نہیں رکھتا۔

اس آیت کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے سراسر لغو ہے فَاَتَّبِعُونِي (تو میری پیروی کرو) کے لفظ سے کسی طرح قرآن کی پیروی مراد نہیں لی جاسکتی اگر یہ مراد ہوتی تو سیدھا سادا فَاَتَّبِعُوا الْقُرْآنَ فرمایا جاتا۔

حاکم و فرمانروا | قرآن جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا حاکم و فرمانروا مقرر کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو آپ کو اللہ کا رسول جانتا اور مانتا ہے اس پر واجب ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کرے اس لیے کہ رسول بھیجا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے :

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا يَطَاعُ | ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی
بِإِذْنِ اللَّهِ (النار - ۶۳) | اطاعت کی ہلئے اللہ کے اذن سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حاکمیت و فرمانروائی چونکہ آپ کے منصب رسالت ہی
کا ایک حصہ تھی اس لیے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتلادیا گیا کہ آپ کی اطاعت
عین اللہ کی اطاعت ہے :

مَنْ يَطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ | جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی
اللَّهُ (نار - ۸۰) | اطاعت کی۔

اسی طرح آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا دراصل اللہ سے بیعت کرنا ہے :

إِنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا | جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت
يُبَايِعُونَ اللَّهَ - (فتح - ۱۰) | اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

نیز آپ کی اطاعت نہ کرنا ایسا ہے جیسے اللہ کی اطاعت نہ کی جائے اور اس کا نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ آدمی کے تمام اعمال غارت جلتے ہیں کوئی عمل بھی اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہوتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ | اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تَبْغِلُوا | اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال
أَعْمَالَكُمْ (محمد - ۳۳) | کو باطل نہ کرلو۔

رسول کی یہ اطاعت و فرمانبرداری کسی عام دینی حاکم کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرح
نہیں ہے کہ اس سے نزاع بھی کی جاسکتی ہو بلکہ رسول کی اطاعت بالکل غیر مشروط اطاعت
ہے رسول جس بات کا حکم کر دے یا جس بات سے روک دے وہ اٹل ہے اس کے بعد
مومن کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

وَمَا كَانَ لِلْمُؤْمِنِ وَلَا الْمُؤْمِنَةِ | اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں
إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا | ہے کہ جب کسی معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول
أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ | کر دے تو پھر انکے لیے اپنے اس معاملے میں خود کوئی
أَمْرِهِمْ (الاحزاب - ۳۶) | فیصلہ کر لینے کا کوئی اختیار باقی رہ جائے۔

ان تمام آیات میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت کا ذکر صاف یہ بتلا رہا ہے کہ آپ کا کام صرف قرآن کا پوچھا دینا نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو آپ کی اطاعت کو عظیمہ حیثیت دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی صرف قرآن کی اطاعت کا حکم دے دینا کافی ہوتا لیکن یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ رک طرف اطیعوا اللہ کہہ کر قرآن کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے تو دوسری طرف اطیعوا الرسول کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی مستقل حیثیت واضح کی جا رہی ہے اگر آپ کا منصب رسالت صرف قرآن پوچھا دینے تک محدود تھا تو پھر آپ کی اطاعت آخر کس حیثیت سے؟

حکم اور فیصل | اسی طرح قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیکم اور فیصل مقرر کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

<p>اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللَّهُ (النور - ۱۰۵)</p>	<p>(مے بنی)، ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دیکھا ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو۔</p>
---	--

یہ اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں حکیم بن انسان کا کام تبلیغ کتاب کے علاوہ اور اس سے نائد ہے یا نہیں؟ سوچنے کی بات ہے۔ اگر اللہ کی کتاب پوچھا کر آپ کا کام ختم ہوتا تھا تو تنزیل کتاب کا ذکر کرنے کے بعد بطور خاص حکیم بن انسان کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم ہوا تبلیغ کتاب کے ساتھ ساتھ حکیم بن انسان بھی آپ کی ذمہ داری تھی اور ذمہ دار بھی ایسی کہ آپ کے منصب رسالت کا ایک حصہ تھی حکیم کے کام کو اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی کے ساتھ خاص کرنا اس کی مزید دلیل ہے۔ نیز سورہ نور میں کہا گیا ہے کہ اللہ کا رسل جب کوئی فیصلہ کر دے تو مومنین کی شان یہ ہے کہ وہ فوراً تسلیم خم کر دیں اور کہیں نہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ مومنین سے اس انداز کی تسلیم رضا کا مطالبہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حکیم بن انسان کا کام منصب رسالت کا ایک حصہ تھا۔ سورہ نور کی آیت ہے :

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ اِذَا
دُعُوا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ
بَيْنَهُمْ اَنْ يَقْبَلُوْا سَمِيْعًا وَّ
اَطَعًا (النور - ۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ وہ جب اللہ
اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول
ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو وہ کیس ہم نے سنا
اور مان لیا۔

بلکہ صرف زبان سے ہی سمعنا و اطعنا کہنا کافی نہیں بل میں بھی مومن کوئی تنگی تک محسوس
نہ کرے رسول کی تحکیم کو برضا و رغبت قبول کرے۔ قرآن نے ایک مقام پر بالکل بے
لاگ انداز میں کہہ دیا ہے کہ رسول کی تحکیم کو جو شخص اس طرح برضا و رغبت تسلیم نہیں کرتا
وہ مومن ہی نہیں ہے ارشاد ہے :

فَلَا زَرْيَ لَكَ لَا يُوْمِنُوْنَ حَتّٰى
يُحْكَمُوْا فِیْهَا شَیْءٌ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
لَا يَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ مَّرَدًّا
وَمَا قَنِیْتُ وَّیَسْتَمِوْا سَلٰمًا
(النساء - ۶۵)

پس (اے نبی) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن
نہ ہوں گے جب تک وہ اپنے جھگڑاؤں میں تجھے
فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو فیصلہ تو کرے
اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس
نہ کریں بلکہ اسے بسر و چشم قبول کر لیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دینے ہوئے فیصلے پر دل میں تنگی محسوس ہو تو ایمان کا
سبب ہو جائے اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ کی یہ تحکیم بین اناس کی ذمہ داری بھی
منصب رسالت ہی کا ایک حصہ تھی۔

غرض منکرین حدیث کا یہ دعویٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت
صرف قرآن پونچا دینے تک محدود تھا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔
محولہ بالا آیات قرآنی اس بات کا ثبوت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ قرآن کے
ساتھ ساتھ تعلیم احکام قرآنی، توضیح و تشریح مراعات قرآنی اور تربیت افراد
اجتماع کے کام پر بھی مامور تھے نیز آپ مبلغ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے
ماننے والوں کے لیے قرآن کا عملی نمونہ غیر مشروط اطاعت کے حامل حاکم و فرمانروا اور
ہر قسم کی تنقید سے بالاتر حکم اور فیصلہ بھی تھے۔

شخصی اور پیغمبرانہ حیثیت کا فرق | اس موقع پر اپنی طرف سے یہ ضد کیے چلے جانا کہ آپ نے یہ کام اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت

میں کیے اور اس پر کوئی دلیل قائم نہ کرنا کوئی معقول بات نہیں ہے۔ اگر آپ نے یہ تمام کام اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت سے انجام دئے تھے تو آپ کو ان کاموں کو انجام دینے کا اختیار کس نے دیا تھا آپ معلم تھے تو کس کے حکم سے آپ نے افراد و معاشرہ کی تربیت کا کام انجام دیا تو کس کے کہنے پر آپ مسلمانوں کے حاکم و فرمانروا تھے تو کس اختیار کے تحت آپ تحکیم بین الناس کا کام انجام دیتے تھے تو کس قانون کی رو سے ؟

اگر آپ نے یہ تمام کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیے، اگر آپ نے یہ تمام خدمات قرآن کے تحت انجام دیں اور اگر آپ کو یہ تمام ذمہ داریاں بذریعہ وحی سونپی گئی تھیں جیسا کہ محولہ بالا آیات اس پر شاہد ہیں تو پھر ہی تو اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپ کے یہ تمام کام آپ کی یہ تمام خدمات اور آپ کی یہ تمام ذمہ داریاں آپ کے منصب رسالت ہی کا حصہ تھیں آپ نے یہ سب کچھ شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ پیغمبرانہ حیثیت سے کیا تھا۔

اس کے برعکس اگر کوئی کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معلم و مفسر قرآن تو تھے مگر خدا کے مقرر کردہ نہیں بلکہ جیسے دنیا میں اور علوم کے استاد ہوتے ہیں ویسے ہی ایک آپ بھی تھے اسی طرح آپ مربی و مزی کی اور عملی نمونہ تو تھے مگر مامور من اللہ ہونے کی حیثیت سے نہیں نیز اسی طرح آپ حاکم و فرمانروا اور قاضی و فیصل تو تھے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی طرف سے قاضی یا فیصل و حکم مقرر نہیں کیا تھا بلکہ دنیا کے عام قاضیوں اور عام فیصل و حکم کی طرح آپ بھی ایک قاضی یا فیصل تھے اگر کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس قسم کی صورت حال کا دعویٰ کرے تو یہ بار ثبوت اس پر ہے کہ وہ بتلائے کہ پھر یہ تمام مناصب آپ کو کیسے حاصل ہوئے؟ کیا نیکے میں اسلام قبول کرنے والوں نے اپنے اختیار سے آپ کو اپنا معلم و مربی اپنا حاکم و فرمانروا اور اپنا قاضی و فیصل منتخب کیا تھا۔ یا کیا مدینہ پہنچ کر انصار و مہاجرین نے باہمی مشورے سے یہ طے کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آج سے ہمارے رہنما اور ہمارے قائد ہوں گے اور یہ یہ

مناصب آپ کے سپرد ہوں گے؟ کیا کبھی کسی مرحلے پر ایسا کوئی انتخاب عمل میں آیا؟ اگر ایسا نہیں ہوا اور یقیناً نہیں ہوا تو پھر تبلیغ یا جائے آخر یہ تمام مناصب آپ کو کیسے حاصل ہوئے؟ اگر ان تمام مناصب پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مامورین اللہ بھی نہیں تھے اور منتخب شدہ بھی نہیں تھے تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان تمام مناصب پر محاذ اللہ آپ خود ہی فائز ہو بیٹھے تھے؟ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہ خود ہی مسلمانوں کے رہنما، فرمانروا، محاضی اور معلم و مربی بن بیٹھے تھے۔

ہر حال یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ آپ کو یہ مناصب شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ پیغمبرانہ حیثیت سے حاصل تھے آپ کو یہ تمام ذمہ داریاں بذریعہ وحی سونپی گئی تھیں۔ آپ نے یہ تمام کام اللہ کے حکم سے کیے تھے اور آپ نے یہ تمام خدمات قرآن کے تحت انجام دی تھیں۔ اور بنا بریں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف قرآن پہنچا کر ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ اس کے حدودہ تمام کام بھی آپ کی ذمہ داریوں میں شامل تھے جن کا بھی تفصیل سے قرآنی آیات کے حوالے سے ذکر ہوا ہے۔

منکرین حدیث کے موقف کا جائزہ | اس ضمن میں منکرین حدیث اپنے موقف کے ثبوت ہیں جو آیات قرآنی پیش کیا کرتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بھی مختصراً جائزہ لے لیا جائے۔ ان کے موقف کا مدار یہ آیات ہیں :

رسول کے ذمے بجز اسکے کچھ نہیں کہ وہ پیغام پہنچا دے۔
ہمارے ذمے سوائے واضح تبلیغ کے اور کچھ نہیں
آپ کے ذمے صرف تبلیغ ہے۔
اگر تم نے منہ پھریا تو ہمارے رسول پر صرف
واضح تبلیغ ہے اور بس
تیرے ذمے پہنچانا ہے اور ہم پر حساب لینا ہے۔

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ (المائدہ - ۶۶)
وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (البقرہ - ۱۰۵)
إِن عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (شرعاً - ۲۸)
فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا
الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (التغابن - ۱۲)
فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ
(رعد - ۴۰)

یہ آیات پیش کر کے منکرینِ حدیث دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ قرآن کی نظر میں ہول
کافرِ یضنہ بحیثیت منصب رسالت صرف پیغامِ الہی کی تبلیغ ہے اور ان آیات کو پیش کرتے
وقت اپنی عادت کے مطابق چالاکي یہ کرتے ہیں کہ ان آیات کے سیاق و سباق اور فحوائے
کلام کو قطعاً نظر انداز کر جاتے ہیں حالانکہ جو کوئی بھی ان آیات کو ان کے سیاق و سباق
کے ساتھ ملا کر پڑھیں گا وہ فوراً اس حقیقت کو پا لے گا کہ دراصل ان آیات میں جو کچھ کہا گیا
ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں سے نہیں بلکہ آپ کا انکار کرنے والوں
سے متعلق ہے جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کو قبول کرنے پر تیار
نہ ہوتے تھے اور بار بار آپ کو جھٹلاتے تھے ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ رسول کا
کام صرف ان تک ہمارا یہ پیغام پہنچا دیتا تھا سو اس نے پہنچا دیا اب وہ لوگ یہ نہیں
کہہ سکتے کہ ہمارے پاس کوئی رہنما نہیں بھیجا گیا جیسا کہ اللہ نے قرآن میں ان کا یہ قول
نقل بھی کیا ہے :

اَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ
وَلَا نَذِيرٍ ۚ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ
وَنَذِيرٌ (مائدہ - ۱۹)

کیسے تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بھی نہ
بشارت دینے والا آیا نہ تنبیہ کرنے والا (نواب نو)
آگیا تھا اسے پاس بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا۔

دراصل ان محولہ بالا تمام آیات میں اسی مضمون و مفہوم کی اور دیگر آیات میں انکار کرنے والوں کے
انکار کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان کافروں کی روگردانی
سے دل گرفتہ کیوں ہوتے ہو تم ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے تمہارے سپرد جو خدمت
کی گئی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ان کے سامنے سیدھا راستہ پیش کر دو سو وہ تم نے کر
دیا اب اگر وہ تمہاری تعلیم و تبلیغ سے منہ موڑ کر ٹیڑھے راستوں پر چلتے ہیں تو ان کے اس
فعل کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی ذرا غور کیجئے سورہ شورٰی میں اِنْ عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ
کے جن الفاظ کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے ان کا ذکر اس سیاق کے ساتھ ہوا ہے اِنْ عَلَيْنَا
اِلَّا الْبَلَاغُ (یہ لوگ اگر پھر بھی
منہ موڑے رہیں تو ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے آپ کے ذمے صرف پہنچنا

دینا ہے)۔ اسی طرح اگر ایک طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی تو دوسری طرف انکار کرنے والوں سے بھی کہا گیا ہے کہ تمہارے مژہ موڑنے سے اللہ کا یا اس کے رسول کا کوئی نقصان نہیں نقصان تو تمہارا ہے ہم نے رسول کے ذمے صرف اتنا ہی کام لگایا ہے کہ وہ تم تک ہماری بات پہنچا دے تمہیں کھینچ کھینچ کر ہمارے راستے کی طرف لانا یہ اس کا کام ہی نہیں۔ سورۃ تغابن کی محولہ بالا آیت اسی مضمون کی حامل ہے۔

غرض ان تمام آیات کا مدخ کفار کی طرف ہے۔ ان آیات کے وہ لوگ مخاطب ہی نہیں جو ایمان لے آئیں اور اسلام قبول کر لیں۔ ان لوگوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے بلکہ آپ ان کے لیے معلم بھی ہیں۔ مرتی بھی ہیں، مفسر و شارح قرآن بھی ہیں، قرآنی احکام کا عملی نمونہ بھی ہیں، حاکم و فرمانروا بھی ہیں اور حکم و فیصل اور قاضی بھی ہیں جیسا کہ ہم ابھی آیات قرآنی سے آپ کی یہ تمام حیثیات بطور رسول ثابت کر آئے ہیں۔

منکرین حدیث نے بنیادی ٹھوکہ ہی یہی کھائی ہے کہ بعض آیات قرآنی کا مفہوم غلط سمجھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کو صرف تبلیغ قرآن تک محدود کر دیا حالانکہ ان آیات کی رو سے آپ کی مبلغانہ حیثیت صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوئے ہوں اور صرف ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے آپ کی تعلیم کو ابھی قبول نہ کیا ہو رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کر لیں اور امت مسلمہ میں داخل ہو جائیں تو ان کے لیے آپ کی حیثیت صرف مبلغ کی نہیں رہ جاتی۔ ان کے لیے آپ وہ سب کچھ ہیں جس کی تفصیل ابھی گزر چکی ہے۔

رسالت و امامت کی تفریق | پھر اسی پہلی ٹھوکہ کے نتیجے میں منکرین حدیث کو دوسری ٹھوکہ لگی یہی پہلی غلطی ان کی

دوسری غلطی کا موجب بنی جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلم و غیر مسلم سب کے لیے محض مبلغ قرار دے لیا تو ان کو مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے لیے معلم و مرتی اور عملی نمونہ وغیرہ قرار دیا گیا ہے اس کا کیا مفہوم

متعین کیا جائے۔ اس مسئلہ کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ آپؐ کی شخصیت کو دو حیثیتوں میں تقسیم کر دیا ایک حیثیت رسالت کی اور دوسری حیثیت امامت کی۔ آپؐ کی حیثیت رسالت کو صرف تبلیغ قرآن تک محدود کر دیا اور اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ مبلغانہ حیثیت کے ماسوا آپؐ کی جو حیثیت بھی ہے اس کا آپؐ کے منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں تبلیغ قرآن کے سوا آپؐ نے جو کچھ کیا وہ اپنی ذاتی و شخصی حیثیت سے کیا اور مسلمانوں کے امام ہونے کی حیثیت سے کیا پھر ہمیں سے وہ اس غلط نتیجے پر پہنچ گئے کہ رسالت کی حیثیت سے صرف آپؐ پر ایمان لانا ضروری تھا لیکن جہاں تک اطاعت کا تعلق ہے آپؐ کے امتیوں پر اس کا وجوب آپؐ کے امام وقت اور مرکز ملت ہونے کی حیثیت سے تھا رسالت کی حیثیت سے نہیں۔

رسالت و امامت کی اس تقسیم سے نیز اطاعت کو امامت کے ساتھ خاص کرنے سے منکرین حدیث کا مدعا دراصل یہ ہے کہ آپؐ کی ذات بحیثیت رسول اور آپؐ کی ذات بحیثیت انسان کے درمیان فرق کر دیں رسول ہونے کی حیثیت سے آپؐ نے قرآن ہم تک پہنچایا اس کو سمع و طاعت کا مستحق سمجھیں مگر بحیثیت انسان چونکہ آپؐ کے اقوال و افعال ایسے ہی ہیں جیسے کسی دوسرے انسان کے ہوتے ہیں اس لیے ان کا خدا کی طرف سے ہونا اور ضلالت و گمراہی سے پاک ہونا مسلم نہ سمجھا جائے ان کی اطاعت اسی طور پر کی جائے جس طور پر ایک ایک عام انسان کی امام وقت اور مرکز ملت ہونے کے طور پر کی جاتی ہے۔

یوں تو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں ذہنی اعتبار سے دو حیثیتیں کیا بہت سی حیثیتیں قائم کی جاسکتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا آپؐ کی ان دو حیثیتوں کو جن کو منکرین حدیث نے اپنے ذہن سے اختراع کر لیا ہے قرآن نے کہیں بھی جُدا جُدا اعتبار کیا ہے یعنی قرآن نے کہیں بھی کہی یہ حیثیت رسول اور کہی یہ حیثیت امام آپؐ کے دو قسم کے حقوق بتلائے ہیں۔ پھر کیا صحابہ کرام نے ان دو حیثیتوں کے لحاظ سے کبھی آپؐ کے ساتھ دو قسم کے معاملات کیے ہیں پھر امت مسلمہ نے آپؐ کی ذات کو کبھی ان دو حیثیتوں کا حامل سمجھا ہے اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں رسالت اور امامت کی دو حیثیتیں قائم کرنا محض منکرین حدیث کے ذہن کی ایسی اچھ ہے خارج میں جس کا کوئی وجود نہیں۔

رسالت و امامت کی یہ تفریق قرآن کریم سے ہرگز ثابت نہیں ہے قرآن کریم نے ہمیشہ آپ کی صرف ایک ہی حیثیت بیان کی ہے اور وہ رسول ہونے کی حیثیت ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت پر سرفراز فرمایا اس وقت سے لے کر احوال جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسول خدا کی حیثیت سے تھا اسی حیثیت میں آپ مبلغ قرآن بھی تھے اور معلم قرآن بھی مربی افراد بھی تھے اور مزکی معاشرہ بھی حاکم و فرمانروا بھی تھے اور قاضی و امام بھی۔ حیرت کی بات ہے منکرین حدیث کس طرح یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تبلیغ قرآن کے علاوہ باقی تمام کام آپ نے اپنی ذاتی و شخصی حیثیت میں کیے تھے جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن آپ کے ان تمام کاموں کا ذکر کرتے وقت آپ کو رسول کہہ کر پکارتا ہے۔ ابھی قارئین کی نظر سے وہ تمام آیتیں گزر چکی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام کاموں کا ذکر ہوا ہے ان آیتوں پر دوبارہ نظر ڈال لی جائے قرآن آپ کو معلم کہہ کر پکارتا ہے تو رسول کہہ کر ہی آپ کی تعلیم کتاب و حکمت کا ذکر کرتا ہے قرآن آپ کو مربی و مرئی افراد و معاشرہ کہتا ہے تو رسول ہی کی حیثیت سے کہتا ہے۔ توضیح و تشریح کی ذمہ داری کا ذکر آتا ہے تو آپ کو مہبط رحیمی کی حیثیت سے خطاب کیا جاتا ہے قرآن آپ کو امت مسلمہ کے لیے عملی نمونہ قرار دیتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ محمد بن عبد اللہ کی ذات میں تمہارے لیے عملی نمونہ ہے بلکہ واضح طور سے اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے رسول میں تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ حاکم و فرمانروا کی حیثیت سے آپ کی غیر مشروط اطاعت کے مطالبے کی بات آتی ہے تو محمد بن عبد اللہ کی حیثیت سے نہیں محمد رسول اللہ کی حیثیت سے اطاعت کو خاص کرنے پر زور دیا جاتا ہے لیکم بن الناس کا موقع ہے تو قرآن مومنین کو رسول ہی کے لیے سمیع و طاعت کا حکم دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام کاموں اور آپ کی ان تمام ذمہ داریوں کا ذکر کرتے وقت قرآن بالکل اسی طرح رسول کا لفظ استعمال کرتا ہے جس طرح تبلیغ کی ذمہ داری کا

ذکر کرتے وقت آپ کو رسول کہہ کر پکارتا ہے :

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (اے رسول جو کچھ آپ پر آپ کے
 پروردگار کی طرف سے اتارا جاتا ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دیجئے (المائدہ : ۶۷)
 معلوم ہوا جس حیثیت میں آپ مبلغ ہیں بالکل اسی حیثیت میں آپ مسلمان بھی ہیں مرنے والے
 بھی ہیں منقرض قرآن بھی ہیں قرآنی احکام کا عملی نمونہ بھی ہیں اور مسلمانوں
 کے حاکم و فرمانروا اور قاضی و نزع بھی ہیں مگر حیرت ہے قرآن کی
 ان تمام تصریحات کے علی الرغم منکرین حدیث آپ کی ذات کو دو حیثیتوں میں تقسیم کرتے
 ہیں ایک حیثیت میں آپ کو رسول مانتے ہیں اور دوسری حیثیت میں آپ کو ایک عام انسان۔
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی اگرچہ اعتباری
 لحاظ سے دو جداگانہ حیثیتیں شمار کی جا سکتی ہیں مگر وجود میں فی الحقیقت دونوں ایک ہی
 ہیں اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق کرنا ممکن نہیں۔ منکرین حدیث نے منصب
 رسالت کو بھی دنیوی عہدوں کی طرح سمجھ لیا ہے کہ عہدے دار جب تک اپنے عہدے
 کی کرسی پر بیٹھا ہے عہدہ دار ہے اور جب اس سے اترا تو ایک عام انسان ہے۔ اللہ
 کا رسول ہر وقت اللہ کا رسول ہے وہ جس وقت منصب رسالت پر مقرر ہوتا ہے اس
 وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامور من اللہ ہوتا ہے وہ زندگی کے
 کسی لمحے بھی منصب رسالت کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی زندگی کے
 تمام معاملات خواہ وہ ایک امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے قاضی کی
 حیثیت سے ہوں یا معلم اخلاق کی حیثیت سے اور خواہ اس کی ذات کے ساتھ ان معاملات
 کا تعلق ایک شہری اور معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے ہو یا ایک شوہر، باپ
 بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے سب پر اس کی حیثیت رسالت اس
 طرح حاوی ہوتی ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کسی حال میں ایک لمحے کے لیے بھی اس سے
 منفک نہیں ہوتیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی ہدایت کے
 تحت کرتا ہے اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی قائم رہتی ہے جس کے

ماتحت وہ اپنی حدود کے اندر چلنے پر مجبور ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں۔ اللہ کا رسول اپنے ہر قول اور ہر فعل سے بلکہ زندگی کے ہر ہر لمحے کے طرزِ عمل سے دُنیا کے سامنے ان اصولوں کا تعین کرتا ہے جن پر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نظام کا قیام فطری طور پر متقاضی ہے وہ اپنی زندگی کے پورے روئے سے دُنیا کے سامنے ہر حد تک نشان دہی کرتا ہے جن کے دائرے میں حیثیت ایزدی انسان کی انسانی عمل کو محدود دیکھنا چاہتی ہے۔ ان اُمور کی تعمین اور ان حدود کی نشاندہی کا یہ کام اللہ کا رسول اپنی شخصی ذاتی زندگی میں بھی اسی طرح انجام دیتا رہتا ہے جس طرح اپنی سرکاری حیثیت میں اور کسی معاملہ میں بھی اگر اس کے قدم کو ذرا سی لغزش ہو جاتی ہے تو اس کو فوراً اللہ کی طرف سے تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ وہ ایک ایسے منصب پر متمکن ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی خطا صرف اسی کی خطا نہیں رہ جاتی بلکہ ایک پوری امت کی خطا بن جاتی ہے۔ اس کو بھیجے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر کے ان کے سامنے ایک ایسی زندگی کا مکمل نمونہ پیش کر دے جو اللہ کی منشا و رضا کے عین مطابق ہو اور صرف یہی نہیں کہ انفرادی معاملات میں ان کی رہنمائی کر کے ان کو فرداً فرداً مسلمان بنائے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کا تمدنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام بھی ان خطوط پر استوار کر دے جو خالق کائنات نے بنی نوع انسان کی نلاج کے لیے متعین کیے ہیں ظاہر ہے اس کام کے لیے اللہ کے رسول کا ہر قسم کی خطا اور ہر نوع کی غلطی سے معفو نظر ہونا لازم ہے تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جاسکے اور اس کے قول و فعل کو منشا ایہ معلوم کرنے کے لیے بلا خوف و خطر ایک معیار قرار دیا جاسکے۔

ہر حال قرآن کریم میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف بھی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ خیال کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی یا حیثیت امامت میں کوئی فرق کیا گیا ہے اور فرق کیا بھی کیسے جاسکتا ہے جب آپ اللہ کے رسول تھے تو لازم تھا کہ آپ کی پوری زندگی اللہ کی شریعت کے ماتحت ہو اور اس شریعت کی نمائندہ ہو اور آپ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو اللہ کی رضا کے خلاف ہو چنانچہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت جس حالت میں جو

کچھ بھی کرتے تھے رسول اللہ کی حیثیت سے کرتے تھے اور یہ سب کچھ ضلالت و غویت اور ہوائے نفس سے پاک ہوتا تھا کیونکہ یہ سب کچھ وحی الہی کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی بات ہے جس کی طرف سورہ نجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے :

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۚ
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ
إِلَّا وَحْيٌ يُوسَىٰ ۚ عَلَّمَ شَرْيَ
الْقَبَا ۚ

(النجم - ۲: ۵)

تمہارے صاحب (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بھٹکے اور نہ گمراہ ہو گا جو کچھ کہتے ہیں ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتے ان کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو ان پر نازل کی جاتی ہے ان کو ایسے (فرشتے) نے تعلیم دی ہے جس کی توثیق بڑی زبردست ہیں۔

مذہبین حدیث ان آیات کو بھی اپنے مطلب کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان آیات میں محض قرآن کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کفار انکار کرتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی خفیہ سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا اِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوسَىٰ میں هُوَ کی ضمیر نطق رسول کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَمَا يَنْطِقُ عَنْ الْهَوَىٰ میں کیا گیا ہے۔ ان آیات میں کوئی چیز آخر ایسی ہے جس کی بنا پر نطق رسول کو صرف قرآن کی تلاوت کے ساتھ مخصوص کیا جاسکتا ہو۔ جو شخص بھی ذرا انصاف کی نظر سے دیکھے گا بر ملا کہ اُٹھے گا کہ ہر وہ بات جس پر نطق رسول کا اطلاق کیا جاسکتا ہے آیات محمولہ بالا کی بنا پر وحی ہے اور ہوائے نفس سے پاک ہے کفار دراصل اسی چیز کے منکر تھے ان کا کہنا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لغو یا لہ جنون ہے وہ اپنے دل سے باتیں بنا بنا کر کہتا ہے یا کوئی آدمی اس کو پڑھاتا ہے ان آیات میں کفار کے اسی غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور صاف الفاظ میں فرما دیا گیا ہے کہ تمہارا صاحب نہ بدراہ ہے نہ گمراہ اور نہ وہ اپنی خواہش نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے جو خواص ہماری جانب سے ہے اور اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں پڑھاتا بلکہ وہ معلم فرشتہ سبقت دیتا ہے جو شہید القوی ہے۔ یہی بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی ہے کہ

قَوْلَ الَّذِي نَفْسِي بِبَيْدِهِ مَا يَخْرُجُ | اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے
مِنْهُ إِلَّا حَقًّا - (سنن داہمی) | اس (زبان) سے جو کچھ نکلتا ہے حتیٰ ہی نکلتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے اگر اللہ کے رسول کی کسی ایک بات میں بھی یہ شبہ ہو جائے کہ وہ خواہش نفس پر مبنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے تو اس کی رسالت پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ قرآن میں یہ تصریح کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وحی الہی کی بنا پر کہتا ہے کی ہی اسی لیے گئی ہے کہ بن لوگوں کے پاس رسول کو بھیجا گیا ہے ان کو رسول کے بارے میں بد راہی و گمراہی اور ہولنے نفس سے محفوظ ہونے کا کامل اطمینان ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے جو فرائض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد کیے گئے ہیں اور جو خدمات آپ کے سپرد کی گئی ہیں ان کی انجام دہی میں آپ اپنے ذاتی خیالات و خواہشات کے مطابق کام کرتے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دئے گئے بلکہ آپ وحی کی رہنمائی کے پابند ہیں۔ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بار بار کہلاتا ہے :

میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آئی ہے۔

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ

(الانعام - ۵۰)

آپ کہہ دیجئے میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی ہوا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ

رَبِّي - (الاعراف - ۲۰۳)

یوں بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا رسول مقرر کرے دنیا بھر کو اس

پہا میاں لانے کی دعوت دے اس کی بے چوں و چہرا اطاعت اور اس کے اتباع کا بار بار تاکید حکم دے اسے اپنی طرف سے نمونے کا آدمی ٹھہرائے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسے آزاد چھوڑ دے کہ اپنے ذاتی خیالات و رجحانات کے مطابق جس طرح چاہے رسالت کی خدمت انجام دے۔

غرض قرآنی آیات اس باب میں بالکل صریح ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قدم اٹھاتا تھا وحی کی رہنمائی میں اٹھاتا تھا جو قول اور جو فعل آپ کی ذات سے صادر ہوتا تھا وحی

کی رہنمائی میں صادر ہوتا تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپؐ نے اپنی تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں جتنے کام سرانجام دئے اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے انجام دئے ۔

اجتہادِ لغزشوں سے غلط استدلال | اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان اجتہادِ لغزشوں کو

استدلال کے طور پر پیش کرنا جس کا سرانے ذکر کیا ہے اور ان کی بنیاد پر یہ کہنا کہ آپؐ کی ذات سے لغزشوں کا صدور اس بات کی دلیل ہے کہ تبلیغ قرآن کے بعد آپؐ کے جتنے کام تھے ایک عام انسان کی حیثیت سے تھے بالکل ہی بے اصل ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ مان لیا جائے تو اس کا تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے پہلے ایک رسول بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے کے لیے وہ آیات بھی نازل کر دی جو اس کو معاذ اللہ غلط کار ثابت کرتی ہیں تاکہ لوگ کہیں اطمینان کے ساتھ اس کی پیروی نہ کرنے لگیں کتنی مضحکہ خیز بات ہے یہ! قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لغزشوں اور ان پر اللہ کی جہنموں کا جو ذکر آیا ہے اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں سے آپؐ کا اعتماد اٹھ جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ جب اللہ کا رسول بھی نعوذ باللہ ہماری ہی طرح غلطیوں کا ارتکاب کر سکتا ہے تو اس کے احکام کی اطاعت اور اس کی روش کی پیروی کامل اطمینان کے ساتھ کیسے کی جاسکتی ہے بلکہ ان لغزشوں اور تنبیہوں کے ذکر سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو چونکہ اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے مامور کرتا ہے اس لیے ہمیشہ اس پر خاص نظر رکھتا ہے غلطیوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے مگر اہیوں سے اس کو بچاتا ہے حتیٰ کہ اگر بمقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں جسی غلطی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً اس کی اصلاح کر دیتا ہے۔ قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جن پانچ یا چھ لغزشوں کا ذکر ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپؐ نے اپنے فیصلوں میں معاذ اللہ بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ نے بطور نمونہ یہ چند غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار ہو جائیں منکرین حدیث کا موقف تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی مطلب نکلتا ہے حالانکہ دراصل ان لغزشوں کا ذکر اسکے

بالکل ہی برعکس مفہوم کا حامل ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس یہی چند لغزشیں صادر ہوئیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرمادی اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے کیونکہ اس میں اگر کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے صرف پانچ مواقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی کسی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے۔

ایک سورۃ انفال میں بدر کے قیدیوں کو ندیہ کے عوض رہا کر دینے کے موقع پر اس بات پر تنبیہ کی گئی کہ آپ نے اس وقت تک قتل و قتال کیوں جاری نہ رکھا جب تک فساد کی بالکلینہ سبب نہ ہو گئی فرمایا گیا :

<p>ما كَانَ لِنبِيِّ أَنْ يُكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يَتَخَيَّنَ فِي الْأَرْضِ -</p>	<p>نبی کی شان کے لائق نہیں ہے کہ اس کے قیدی (باقی) رہیں جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خون بریزی نہ کر لے۔</p>
---	--

(انفال : ۶۷)

دوسرے جنگ تبوک کے موقع پر جب بعض منافقین نے بہانے بنا کر جنگ میں شریک نہ ہونے اور وطن میں رہ جلنے کی اجازت مانگی اور آپ نے کمال عفو اور مہربانی سے کام لیتے ہوئے ان کو اجازت دے دی تو اس بات پر تنبیہ کی گئی کہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو شریک تو یہ منافقین پھر بھی نہ ہوتے مگر اس وقت بغیر اجازت رہ جانے پر ان کی تلخی کھل جاتی۔ ارشاد فرمایا گیا :

<p>عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ إِذْنَةً لَهُمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَعَلَّكَ الْكَذِبِينَ - (النوبة - ۴۲)</p>	<p>اللہ نے آپ کو معاف کر دیا لیکن آپ نے ان کو اجازت کیوں دے دی تھی جب تک کہ آپ پر سچے لوگ ظاہر نہ ہو جلتے اور آپ جھوٹوں کو جان نہ لیتے۔</p>
--	---

تیرے اس موقع پر آپ کے لیے اللہ کی جانب سے تنبیہ نازل ہوئی جب آپ حضرت زید کی

مطلقہ بیوی حضرت زینب سے نکاح کرنے کے بارے میں صرف اس لیے متردّد تھے کہ قوم عرب جو مُنہ بولے بیٹے کی بہو سے نکاح کو انتہائی میوہ سمجھتی ہے طریح طرح سے بدنام کرے گی۔ آپ کے اپنی فکر و تردد پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اور آپ اپنے دل میں وہ چھپاتے رہے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں کی طرف سے اندیشہ کر رہے تھے حالانکہ اللہ ہی اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

وَرَخِیْ فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ
وَتَخَشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَسْتَأْذِنُ
أَنْ تَخْشَاهُ۔
(الاحزاب : ۲۷)

جو تھا موقعہ وہ ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی زوجہ مطہرہ کی ذل جرتی کے لیے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ آپ کبھی شہر نہ پیئیں گے یہ عمل اگرچہ بجائے خود بالکل جائز تھا لیکن ایک پیغمبر کے شایان شان نہ تھا کہ ایک داعی ضعیف کی بنا پر ایک حلال چیز کو چھوڑ دیں اس لیے اس پر اللہ کی جانب سے آپ کو عتاب کے رنگ میں خطاب فرمایا گیا۔ آپ اگرچہ کسی حلال چیز کو حرام نہیں فرما رہے تھے لیکن آپ کے عہد کے بعد چونکہ صرف وجوب امتناع میں وہ چیز مثل حرام کے ٹھہر رہی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے تنبیہاً تحریم سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا:

اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے اسے آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیوں حرام کر رہے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا آتَاكَ
اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ
أَرْوَاحِكَ (التحریم : ۱)

اور پانچواں موقعہ وہ ہے جس کا ذکر سورہ عبس کی ابتدائی آیات میں ہوا ہے جب آپ کے پاس سردارانِ قریش بیٹھے ہوئے تھے اور تبلیغ و اشاعتِ دین کی دُھن میں آپ ان کی طرف اس قدر متوجہ تھے کہ ایک نابینا صحابی عبد اللہ بن مکتوم کے آنے پر اور کوئی مسئلہ پوچھنے پر ان کی طرف توجہ نہ فرما سکے جس سے کچھ بے اعتنائی کا سا مظاہرہ ہو گیا تو اللہ کی طرف سے تنبیہ ہوئی کہ سائل پہلے سے مشرف باسلام ہونے کی بنا پر آپ کی توجہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اس تنبیہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے:

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۚ أَنْ جَاءَهُ الْأُنْحَىٰ | (پیمبر) چیں بچیں ہرنے اور نہ پھیر لیا اس
..... ۱۰۰۰ (عبس : ۱-۱۰) | مات پر کہ ان سے پاس ناپینا آیا ۔

بس ان پانچ مواقع پر قرآن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ کی جانب سے
تنبیہ نازل ہوئی ہے ۔ البتہ ایک اور مقام جہاں گمان کیا جاسکتا ہے کہ شاید یہاں کسی
غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے وہ سورہ توبہ کی اس آیت میں ہے جس میں منافقین کی نماز
جنازہ پڑھانے سے منع کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے :

وَلَا تَصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ
أَبَدًا ۚ وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ۔
اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس پر کبھی
بھی نماز نہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر
کھڑے ہو جیے ۔
(التوبہ : ۸۴)۔

اگر اس کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل چھ مواقع بن جاتے ہیں ۔ پورے تینیس سال کے
زمانہ نبوت میں ان پانچ یا چھ مواقع کے سوا قرآن کریم میں نہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی کسی غلطی کا ذکر آیا ہے نہ کسی قسم کی اس پر تنبیہ یا اس کی اصلاح کا ۔
اس سے جو بات فی الحقیقت ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پورے زمانے میں
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں فرائض نبوت انجام
دیتے رہے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ بطور خاص اس بات کی حفاظت فرمانا رہا ہے کہ اس
کا نمائندہ مجاہد کہیں اس کی نمائندگی اور لوگوں کی رہنمائی کے کام میں کوئی غلطی نہ
کرے بیٹھے چنانچہ ان پانچ یا چھ مواقع پر جو ذرا سی چوک آپ سے ہوئی جس کو صحیح
معنوں میں غلطی بھی نہیں کہا جاسکتا بلکہ زیادہ سے زیادہ اجتہادی لغزش سے تعبیر
کیا جاسکتا ہے اس کی بھی فوراً اصلاح کر دی اور لغزش اور اصلاح دونوں کا
ذکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قرآن کریم میں ثبت کر دیا تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ کار نبوت
سارا کا سارا ہر قسم کی غلطی کی آمیزش سے پاک ہے اور یہ معلوم ہو جائے کہ ان مواقع
کے سوا اگر کوئی اور غلطی آپ سے ہوئی ہوتی تو اس کی بھی اسی طرح فوراً اصلاح کر دی
جاتی اور قرآن میں اس کا بھی ذکر اسی طرح موجود ہوتا ۔ یہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی رہنمائی پر سے ہمارا اطمینان رخصت کر دینے کے بجائے اس کو اور زیادہ پختہ اور مضبوط بناتے والی ہے۔ ہم اب پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی نیکیوں سے پیغمبرانہ زندگی کا پورا کارنامہ ہر قسم کی خطا اور ہر طرح کی لغزش سے بالکل پاک ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی سند حاصل ہے۔

کاش منکرین حدیث نے کبھی اس بات پر غور کیا ہوتا کہ ان معمولی معمولی لغزشوں کو اللہ کے یہاں اتنی اہمیت کیوں دی گئی کہ فوراً وحی جلی کے ذریعے سے ان کی اصلاح کرنا ضروری سمجھا گیا اگر تبلیغِ قرآن کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک عام انسان کی سی ہوتی اور ایک عام امیر کی طرح آپ مسلمانوں کے امیر ہوتے تو کیا اس وقت بھی ان معمولی معمولی باتوں کی اسی قدر اہمیت ہوتی کیا اس وقت بھی باقاعدہ ایک فرشتہ وحی الہی لے کر ان باتوں کی اصلاح کے لیے آسمان سے اترتا۔ سوچنے کی بات ہے کسی انسان کا شہد کھانا نہ کھانا یا کسی اندھے کی طرف توجہ نہ کرنا یا کسی کے مرنے پر اس کے لیے دعائے مغفرت کروینا کیا ایک عام انسان کی زندگی کے ایسے ہی اہم واقعات ہیں کہ ان کے لیے آسمان سے وحی اترے اسی طرح جنگ کی شرکت سے کسی کو مستثنیٰ کر دینا یا بعض قیدیوں کو فدیہ ملے کہ چھوڑ دینا کیا ایک عام امیر یا حاکم کی زندگی کے ایسے ہی اہم معاملات ہیں کہ ان پر تنبیہ کے لیے آسمان سے فرشتے نازل ہوں۔ کونسا امیر یا حاکم دنیا کا ایسا ہے جس کی زندگی میں بارہا اس طرح کے بلکہ اس سے کہیں زیادہ بڑے اور اہم معاملات پیش نہ آتے ہوں کیا کبھی کسی امیر کے لیے کسی بھی موقع پر آسمان سے فرشتہ اترتا سنا یا دیکھا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی معمولی لغزشیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئیں اور فوراً ان کی اصلاح کے لیے آسمان سے وحی اتر آئی۔ منکرین حدیث نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا ہوتا تو ان کی سمجھ میں آگیا ہوتا کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو ایک عام انسان کا درجہ دے کر کس قدر زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی امیر کوئی حاکم کوئی فرمانروا یا کوئی رہنما یا منکرین حدیث کی اصطلاح میں کوئی مرکز ملت اللہ تعالیٰ کا نمائندہ نہیں ہوتا اس کا مقرر کیا ہوا شارع اور اس

کی طرف سے مامور نمونہ تقلید نہیں ہوتا اس لیے اس کی کسی بڑی سے بڑی غلطی کے بارے میں بھی یہ خدشہ نہیں ہوتا کہ وہ قانون کی حیثیت اختیار کر لیگی یا اس سے خدا کی شریعت کا کوئی اصول اثر انداز ہو گا اس لیے اس پر کسی قسم کی تنبیہ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اس کی اصلاح کا بطور خاص کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے اپنے اعلانات کی رو سے دنیا کے سامنے مرضات الہی کی نمائندگی کرتے تھے آپ کی اطاعت اور آپ کی اتباع کو جزا و میمان بنایا گیا تھا آپ کے بارے میں صاف طور سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ جو کچھ آپ حلال کیں اسے حلال جانو اور جسے آپ حرام قرار دے دیں اسے حرام مان لو آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو اسوۂ حسنہ قرار دے دیا گیا تھا اس لیے آپ کی یہ معمولی لغزشیں بھی بہت بڑی تھیں کیونکہ وہ کسی عام انسان کی لغزشیں نہ تھیں بلکہ اللہ کے اس رسول کی لغزشیں تھیں جس کی ایک ایک حرکت اور سکون سے قانون الہی تشکیل پاتا تھا اس لیے آپ کے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کی بطور خاص حفاظت کی گئی جہاں کہیں ذرا سی چوک ہوئی فوراً وحی جلی کے ذریعے سے اس کی اصلاح کر دی گئی۔ اگر قرآن پہونچا دینے کے بعد آپ کی حیثیت ایک عام انسان کی سی ہوئی تو آپ کے قول و عمل کی اس طرح کی حفاظت کا ہرگز اتنا اہتمام نہ کیا جاتا۔

اس ضمن میں منکرین حدیث کی جانب سے درج ذیل آیت بھی پیش کی جاتی ہے :

فرائض نبوت کی انجام دہی اور غلطیوں کا صدور

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں گمراہ ہو گیا تو میری گمراہی کا وبال مجھ ہی پر رہے گا۔ اور اگر میں ہدایت پر رہوں تو یہ اس وحی کی بدولت ہے جو میرا پروردگار مجھے گمراہ رہتا ہے۔

قُلْ إِنْ خَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَى
نَفْسِي وَإِنْ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحَىٰ
إِلَيَّ رَبِّي (سبا: ۵۰)

اور کہا جاتا ہے کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ آپ سے فرائض نبوت کی انجام دہی میں کبھی کبھی غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی تھیں نیز قرآن کے علاوہ جس کو اس آیت میں فہما یوحیٰ

اَلْحَىٰ مَرَبِّیُّ سے تعبیر کیا گیا ہے آپ کے اقوال و افعال کے بارے میں یہ آیت بتاتی ہے کہ وہ خطا و قصور سے محفوظ نہ تھے اور یہی بات منکرین حدیث کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن پہونچانے کے علاوہ آپ کے جتنے کام تھے ایک عام انسان کی حیثیت سے تھے۔

کتنی عجیب بات ہے منکرین حدیث دعویٰ کرتے وقت شاید عقل کو بالکل ہی کام میں نہیں لاتے اگر اس آیت سے یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے جو ان لوگوں نے سمجھا ہے تو اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات آقدس معاذ اللہ ضلالت و ہدایت کا مجموعہ تھی کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات! کیا یہ تصور کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک رسول بھی بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے اور اسے نعوذ باللہ غلط کار و گمراہ ثابت کرنے کے لیے یہ آیت بھی نازل کر دی اور خود اسی کے منہ سے کہلوادیا کہ میں کبھی گمراہ بھی ہو جاتا ہوں؟ کیا اس لیے کہ کہیں لوگ اطمینان کے ساتھ اس کی پیروی نہ کرنے لگیں؟

منکرین حدیث نے استدلال کرتے وقت آٹا بھی نہ دیکھا کہ یہ آیت کس سیاق و سباق میں آئی ہے دیکھا تو ضرور ہو گا مگر کیا کیا جائے ان کا نونہل ہی یہ ہے کہ آیات قرآنی کو ان کے سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے من مانے معانی ان کو پہناتیں۔ یہ آیت سورہ بآکی ہے اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے پہلے ہی رکوع میں کفار مکہ کا یہ الزام نفل فرمایا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہتان گھڑنے والا یا مجنوں قرار دیتے تھے۔

اُخْرِیْ عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہِ
جَنَہٗ (سبا: ۸)

اس نے یا تو خدا پر جھوٹ بہتان باندھا ہے یا اسے جنون ہے۔

پھر کفار مکہ کے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے اول اللہ تعالیٰ نے نصیحت کے انداز میں فرمایا کہ دیکھو تم انفرادی طور پر اور سب مل کر بھی خدا اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر خلوص دل کے ساتھ ذرا غور تو کرو تمہارا دل خود گواہی دے گا کہ یہ شخص جو تمہیں عذاب الہی سے ڈرا

رہا ہے ہرگز مجنون نہیں ہے :

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ
أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مِثْلِيَ
ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِكُمْ
مِنْ جَنَّةٍ ۚ إِنَّ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ
لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ

آپ یہ کیسے کہ میں تمہیں ایک بات بھاتا ہوں
وہ یہ کہ تم اللہ کے واسطے روداد اور ایک
ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر سوچو۔ تمہارے ان
ساتھی کو جنوں نہیں ہے یہ تو بس عذاب شدید کی
آمد سے پہلے تم کو ڈرانے والے ہیں۔

(سبا - ۴۶)

یہ تو جواب تھا اس بات کا کہ معاذ اللہ آپ کو جنوں ہو گیا ہے اس کے بعد اس الزام کے
جواب میں کہ یہ شخص اللہ پر جان بوجھ کر ہتان گھبراتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا
ہے کہ اے نبی ان سے کہہ دیجئے کہ درحقیقت یہ سب کلام میرا رب اتقا فرما رہے :
قُلْ إِنْ سَأَلْتُمْ عِلْقَافَتِ يَاسَعٍ (آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب سچا دین ڈالتا ہے۔ سبا: ۴۸) اگر
میں گمراہ ہو گیا ہوں جیسا کہ تم الزام لگا رہے ہو تو میری اس گواہی کا وبال مجھ پر ہے
إِنْ ضَلَلْتُ فَمَا نَمَاءُ ضَلُّ عَلَىٰ لَفْظِي اور اگر میں راہ راست پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر
ہوں جو میرا رب مجھ پر نازل کرتا ہے وَإِنْ هَدَيْتُ فَمَا يُوحِي إِلَيَّ سَبِيٌّ وہ سب کچھ
سننے والا اور قریب ہے إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ یعنی اس سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میں
گمراہ ہوں یا ہدایت یافتہ۔

یہ ہے منکرین حدیث کی طرف سے پیش کردہ آیت کا سیاق و سباق۔ تاہم خود
اندانہ لکائیں کہ کس سیاق و سباق میں کہی ہوئی بات کو کہاں لے جا کر چسپاں کیا گیا۔ جو بات
کفار مکہ کے الزامات کا منہ توڑ جواب تھی اس کو ان خوفِ خدا سے عاری لوگوں نے
کفار مکہ کے الزامات کا ثبوت بنا کر رکھ دیا گویا اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے سامنے
اپنے رسول سے یہ اعتراف کروا دیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ درست ہے میں واقعی کبھی کبھی
گمراہ بھی ہو جاتا ہوں اعاذنا اللہ منہ۔

حضور کی بشریت سے غلط استدلال | اپنے اسی فن کا کرشمہ ان لوگوں نے اس آیت میں بھی دکھایا ہے جو اپنے اسی

دعوے کے ثبوت میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تبلیغ قرآن تک محدود تھی اور اس کے بعد آپ ایک عام انسان کی حیثیت میں مسلمانوں کے امام تھے ان کی طرف سے بار بار پیش کی جاتی ہے۔ وہ آیت ہے :

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ | آپ کہہ دیجئے کہ میں تو بس تمہارا ہی جیسا ایک (الکہف - ۱۱۰) بشر ہوں۔

قرآنی آیت کا یہ ٹکڑا پیش کر کے منکرینِ حدیث اپنے زعم میں دلائل کی ایک بہت بلند عمارت تعمیر کرتے ہیں اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فرائض رسالت کی انجام دہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کر کے دکھایا ایک عام بشر کی حیثیت سے کر کے دکھایا۔ ان کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرنا کہ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اس بات کی دلیل ہے کہ خود قرآن کی نظر میں بھی آپ کی حیثیت ایک عام انسان کی تھی۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا اس آیت کو بھی سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے موعومہ معنی پہنائے گئے ہیں بلکہ اس آیت کو پیش کرتے وقت تو کمال یہ کیا گیا ہے کہ پوری آیت بھی پیش نہیں کی گئی قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کے فوراً بعد جو الفاظ ہیں جان بوجھ کر حوالہ دیتے وقت ان کو حذف کر دیا گیا اس لیے کہ ان الفاظ کی موجودگی میں اس آیت کو وہ معنی نہیں پہنائے جاسکتے جو منکرینِ حدیث کا ملحق نظر ہیں۔ پوری آیت اس طرح ہے :

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ | آپ کہہ دیجئے میں تو تمہارا ہی جیسا ایک بشر ہوں یُوسُفٰی رَاحِیَّ۔ (الکہف : ۱۱۰) | (البتہ) محمد پر وحی آتی ہے۔

گویا پوری بات جو قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے بشر ہیں جن پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے ایک اور مقام پر قرآن نے اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں یہ کہا ہے کہ آپ ایک ایسے بشر ہیں جنہیں رسول بنایا گیا ہے سورۃ بنی اسرائیل میں آپ ہی کی زبان سے اعلان کرایا گیا ہے :

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ
إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَ سَوَّلَا (نبی اسرائیل - ۱۳) | آپ کہہ دیجئے ہاں کہ میں آپ پر وہ دیکھ رہا ہوں۔

ظاہر ہے ایک عام بشر میں اور اس بشر میں جس پر وحی آتی ہو اور جس کو منصب رسالت پر مقرر فرمایا گیا ہو نہ بین آسمان کا فرق ہے وہ بشر جو خدا کا رسول ہے وہ لامحالہ خدا کا نمائندہ ہے اور وہ بشر جس کے پاس وحی آتی ہے وہ بلاشبہ خدا کی براہ راست ہدایت کے تحت کام کرتا ہے اس کی حیثیت اور ایک عام بشر کی حیثیت یکساں کیسے ہوسکتی ہے۔

اس قسم کی آیات میں دراصل بتلایا یہ گیا ہے کہ اللہ کا رسول باوجود اس حقیقت کے کہ انہی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی براہ راست رہنمائی میں گزارتا رہے یہاں تک کہ اسکے منہ سے وہی کچھ نکلتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسان ہی ہوتا ہے خدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کی آیات سے فی الحقیقت نصاریٰ کا رد مقصود ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بلکہ خود خدا کا ایک اقنوم قرار دے لیا تھا۔ دیکھا جائے تو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے لغزشوں کا صہبہ اور اس پر اللہ کی طرف سے تنبیہات کا ذکر بھی قرآن میں اسی لیے کیا گیا ہے کہ آپ کی طرف الوہیت کے تصور کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ ہجرت ہوتی ہے منکرین حدیث کی کج فہمی جو آیات اس بات کا ثبوت تھیں کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں انسانی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت دونوں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا انہی آیات کو نوٹ کر لے کر ان لوگوں نے آپ کی دونوں حیثیتوں میں تفریق من کل الوجوہ کے لیے دلیل بنا لیا۔ اس قسم کی تمام آیات سے فی الحقیقت جتلا نا یہ مقصود ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح انسان ہو کر رسول ہیں اسی طرح رسول ہو کر بھی انسان ہی ہیں خدا نہیں۔

فرق دراصل یہی ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن جب بشر کہتا ہے تو رسول ہونے اور مہبط وحی ہونے کی فیدلگا کر یہ واضح کر دیتا ہے کہ آپ ہیں تو بشر مگر ایسے بشر جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی براہ راست حفاظت ہدایت کے تحت گزارتا ہے اس سے برعکس جب منکرین حدیث آپ کی بشریت کو زیر بحث لاتے ہیں تو اس حیثیت سے

کہ آپ ایک عام غیر محصور انسان ہیں۔ جس طرح دوسرے عام انسانوں کے اقوال و افعال خلط و قصور سے متبرائیں اسی طرح آپ سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں اور ہوتی رہی ہیں۔

قیام دین سے متعلق اشکالات
اور ان کا بخسریہ

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کی قرآنی تعبیر کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو منکرین حدیث کی جانب سے پیش کردہ وہ اشکالات بھی خود بخود ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں جو وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر آن اور ہر حال میں رسول اللہ کی صورت پر بیڑے شد و مد سے وارد کیا کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن پہونچانے کے علاوہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے کام بھی کیے رسول کی حیثیت سے کیے تو اس سے لازماً دو نیچے پیدا ہوں گے اولاً یہ کہ آپ کے علاوہ دین پر عمل کرنا عام انسانوں کے لیے ناممکن تصور کیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ جو نظام زندگی اللہ کے رسول نے قائم کر کے چلا دیا اسے آپ کے بعد قائم کرنا اور چلانا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں دوسرے یہ کہ اس نظام کو قائم رکھنے اور چلانے کے لیے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا رکھا جائے تاکہ ہر زمانے میں اللہ کا رسول ہی آکر وہ کام انجام دیتا رہے جو عام انسان نہیں کر سکتے۔ ان دونوں اشکالات کا قرآن نے یہ کہہ کر وجود ہی ختم کر دیا کہ آپ رسول ہو کہ بھی انسان ہی ہیں فرشتے یا خدا نہیں ہیں کہ ان کی ذات سے صادر ہونے والے کاموں کی انجام دہی کو عام انسانوں کی قدرت سے باہر سمجھا جائے۔

بلکہ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو یہ دونوں اشکالات تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب منصب رسالت کے بارے میں منکرین حدیث کا یہ نقطہ نظر درست تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن پہونچانے کے علاوہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے کام تھے انہیں وحی الہی کی مدد حاصل نہ تھی کیونکہ اس صورت میں ہمارے پاس قرآن تو موجود ہو گا مگر قرآنی احکام پر عمل کرنے کا کوئی ایسا نمونہ ہمارے سامنے نہ ہو گا جس کی پیروی ہم اس اطمینان کے ساتھ کر سکیں کہ وہ قرآن کا ایک ایسا نقشہ عمل ہے جو قرآن اتارنے والے کی مشا ورا

کے عین مطابق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ جس دین کو قائم کرنے کے لیے جد و جہد کے پہلے قدم سے لے کر کامیابی کی آخری منزل تک ہر ضرورت اور ہر نازک موقع پر اللہ کی آیات اترتی رہی ہوں اسے اب کیسے قائم کیا جاسکتا ہے۔ قرآن ظاہر ہے پورا کایہ پورا ایک ہی وقت میں بطور ایک مرتب کتاب کے تو نازل نہیں ہو گیا تھا قرآن آخر انہی وحیوں کا تو مجموعہ ہے جو ستریس سال کے عرصہ پر محیط زمانہ نبوت کے دوران مختلف اوقات میں اور دین قائم کرنے کے مختلف مرحلوں میں آسمانی ہدایات لے لے کر نازل ہوتی رہی ہیں قرآن پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ایک برگزیدہ انسان اس کائنات میں اللہ کا بھیجا ہوا دین قائم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور قدم قدم پر اللہ کی وحی قرآنی آیات کی صورت میں اس کی رہنمائی کے لیے آسمان سے اتر رہی ہے۔ مخالفین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور ان اعتراضات کا جواب آسمان سے آتا ہے۔ قیام دین کی جدوجہد میں طرح طرح کی مزاحمتیں مائل ہیں قسم قسم کی مخالفتوں کا سامنا ہے دین پر چلنے والوں کو گونا گوں مشکلات سے واسطہ ہے اور ان سب کے لیے تدابیر قرآنی آیات کی صورت میں جبرئیل علیہ السلام لے کر آ رہے ہیں کہ فلاں مزاحمت اس طرح دوسرے فلاں مخالفت کے مقابلے کے لیے یہ رخ اختیار کرو اور فلاں فلاں مشکلات کا یہ حل ہے۔ جدید معاشرے کی تشکیل کا مسئلہ درپیش ہے اسلامی ریاست کی تعمیر کے مسائل سلجھانے ہیں منافقین یہود اور کفار عرب کے ساتھ کش مکش سے پیدا ہونے والے پیچ در پیچ معاملات نبھانے ہیں ان سب میں قدم قدم پر وحی آسمانی چھوٹی بڑی آیتوں اور سورتوں کی شکل میں اللہ کے اس برگزیدہ بندے کی رہنمائی کر رہی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جدید معاشرے کی تشکیل اور اسلامی ریاست کی تعمیر جیسے اہم مسائل کو سلجھانے کے لیے ہی آسمان سے ہدایات آتی ہیں بلکہ وہاں تو حال یہ ہے کہ کوئی جنگ پیش آگئی ہے تو اس معاشرے کے سمار اور اس ریاست کے فرمانروا کو جو جنگ کے وقت فوجوں کا سپہ سالار بھی ہے جنگ پر لوگوں کو ابھارنے کے لیے خطبہ آسمان سے ملتا ہے۔ تشکیل و تعمیر کے

کام پر مامور کوئی کارکن کہیں کوئی ذرا سی کمزوری دکھاتا ہے تو اس کی فہمائش کے لیے تقریباً آسمان سے اترتی ہے۔ کچھ لوگ ایک موقع پر جنگ پر جانے سے جی چراتے ہیں تو ان کے معاملے کا فیصلہ براہ راست اللہ میاں کر کے بھیجتے ہیں کوئی شخص دشمن کو جاسوسی کا خط لکھ بھیجتا ہے تو اس کا قصہ نمٹانے کے لیے آسمان سے وحی اترتی ہے۔ منافقین مسجد حرام بناتے ہیں تو اس کو توڑنے کا حکم بذریعہ وحی دیا جاتا ہے۔ بنی کی بیوی پر دشمن اتنا طراندی کرتے ہیں تو اس کی صفائی آسمان سے آتی ہے۔

یہ سب قرآنی حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ اگر منکرین حدیث کے نزدیک واقعی یہ بات مایوس کن ہے کہ دین کو قائم کرنے کے لیے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا اس کے بارے میں یہ یقین کر لیا جائے کہ وہ سب کچھ آپ نے وحی الہی کی رہنمائی میں کیا تو یہ مایوسی کا سبب تو خود قرآن فیما بھی موجود ہے۔ اگر وحی غیر قرآنی کا وجود تسلیم کر لینے میں یہ اشکال ہے کہ آپ کے بعد دین کا قائم کرنا اور چلانا عام آدمی کے بس کی بات متصور نہ ہو سکے تو بالکل یہی اشکال وحی قرآنی کا وجود تسلیم کر لینے میں بھی موجود ہے۔ قرآنی وحی بھی تو انہی ہدایات پر مشتمل ہے جو قیام دین کی جدوجہد میں از ابتدا آخر ہر ضرورت ہر مرحلے اور ہر نازک موقع پر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے لیے آسمان سے اترتی رہی ہیں۔ کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ جس دین کے قیام میں قدم قدم پر قرآنی آیات کی رہنمائی میسر رہی ہو اس دین کو وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد کیونکر قائم کیا جاسکتا ہے۔ اگر وحی غیر قرآنی کا وجود تسلیم کر لینے پر منکرین حدیث کو نبوت کا دروازہ کھلا رکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے تو وحی قرآنی کے معاملے میں بھی تو یہی مشکل درپیش ہے۔ جب دین کے قیام کی ساری جدوجہد قرآنی آیت کی رہنمائی ہی کی مرہون منت ہے تو اب بھی دین کا قیام اس وقت تک کیسے ممکن ہوگا جب تک اس کے لیے جدوجہد کرنے والے پر بھی یعنی منکرین حدیث کے ”مرکز ملت“ پر بھی آیات الہی نازل ہونے کا سلسلہ شروع نہ ہو۔

معلوم ہوا منکرین حدیث کا استدلال ہی غلط ہے اگر دین کے قیام میں وحی الہی کی

رہنمائی آئندہ دین کی ترقی کی راہیں مسدود کر دینے کے مترادف ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ راہیں اللہ نے معاذ اللہ خود مسدود کر دی ہیں۔ وحی قرآنی ہو یا غیر قرآنی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رہنمائی تو بہر حال وحی کی ہی رہی اس نقطہ نظر کی صورت میں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ آیات قرآنی کے ذریعے سے عدم قدم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کر کے اللہ تعالیٰ نے معاذ اللہ خود ایسا نامناسب طریقہ اختیار کیا جو مستقبل میں قیام دین کے احکامات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دینے والا تھا۔ اس نقطہ نظر سے نو دراصل ہونا یہ چاہیے تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے پہلے ہی دن ایک مکمل کتاب دے دی جاتی جس میں انسانی زندگی کے مسائل سے متعلق تمام ہدایات مندرج ہوتیں پھر ختم نبوت کا اعلان کر کے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی نبوت بھی ختم کر دی جاتی اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک نبی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے اس کتاب کو لے کر جدوجہد کرتے اور اس کی ہدایات کے مطابق ایک اسلامی معاشرہ اور ایک اسلامی ریاست قائم کرتے۔ صرف اسی صورت میں منکرین حدیث کا اشکال دور ہو سکتا تھا اور دین کے قیام و ترقی کی راہیں ان کو کھلی نظر آ سکتی تھیں بلکہ دیکھا جائے تو اس صورت میں تو ایک نبی کے مبعوث کرنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے لیے تو یہ طریقہ بھی باطل درست ہوتا کہ ایک کتاب لکھی لکھائی اللہ تعالیٰ براہ راست انسانوں کے ہاتھوں میں تھا دیتے اور دیباچے میں یہ لکھ دیتے کہ اس کتاب میں لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو درست کر لو۔

مگر اللہ نے یہ طریقہ پسند نہیں کیا اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ایک انسان کو رسول بنا کر مبعوث کیا اس پر مختلف اوقات میں ضرورت و حالات کے موافق مقوی مقوی کر کے ایک کتاب نازل کی اور پھر اس رسول کو اس کتاب کا عملی نمونہ بنا کر پیش کیا اور اس کے ذریعے سے بالآخر ایک نظام حق قائم فرمادیا۔ نظام حق کے اس نفاذ میں اصل عامل کتاب نہیں تھی بلکہ وہ زندہ انسان تھا جسے اس عظیم کام

کی انجام دہی پر مامور کیا گیا تھا اس انسان کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت نگرانی میں ایک مکمل نظام حیات بنوا کر اور چلا کر دکھلادیا اور ہمیشہ کے لیے دُنیا کے سامنے ایک نمونہ قائم کر دیا تاکہ آئندہ آنے والے اس نمونے کو دیکھ کر اس کے مطابق اپنا نظام حیات درست کرتے چلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے نمونہ کی اس عمارت کو براہِ راست اپنی ہدایات کے تحت بنوایا کیونکہ اس نمونے کا ناقص رہ جانا لازماً ہدایتِ الہیہ کے نقص کو مستلزم ہوتا۔ اس عمارت کے مہار کو لفظ تعمیر بھی خود دیا اور خود ہی اس کا مطلب بھی سمجھایا صرف یہی نہیں بلکہ مہار کو اس عمارت کی تعمیر کی حکمت بھی سکھائی اور عمارت کا ایک ایک گوشہ بناتے وقت اس کی نگرانی بھی کی، کہیں کوئی اینٹ رکھنے میں اس سے ذرا سی بھی اگرچہ چوک ہو گئی تو فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی تاکہ جس عمارت کو قیامت تک کے لیے نمونہ بننا ہے اس میں کوئی ادنیٰ سی خامی بھی نہ رہ جائے تعمیر کے دوران مسلسل کبھی وحی جلی کے ذریعے سے اور کبھی وحی خفی کے ذریعے سے اس مہار کی رہنمائی ہوتی رہی اور پھر جب اس نے اپنے آقا کی ٹھیک ٹھیک مرضی کے مطابق اس عمارت کی تعمیر مکمل کر لی تو دُنیا میں اعلان کر دیا **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ أَوْفِرْ** **أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَآمَنْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا** (آج کے دین میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت اتمام کو بونچا دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا)۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس طریق کار سے امت میلہ حقیقتاً کسی مایوسی کا شکار نہیں ہوئی۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد دین کے قیام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد جب وحی کا دروازہ بند ہو گیا تو خلفائے راشدین نے یکے بعد دیگرے وحی کے بغیر اس نمونے کی عمارت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ آئندہ اسی نمونے پر دینِ حق کی عمارت کو اور وسعت دی۔ خلفائے راشدین کے بعد بھی حضرت عمر بن عبد العزیز اور ان کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف صالح فرمان روا اور دیگر مصلحین امت وحی کے بغیر ہی اسی نمونے کی پیروی کرتے ہوئے دینِ حق کی

عمارت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے رہے۔ ان میں سے کسی کی زبان پر یہ نہیں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوحی کی رہنمائی میں یہ کام کر گئے اب یہ ہمارے جیسے عام انسانوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔

حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہم ہی میں سے ایک انسان کو اپنا رسول بنا کر ہمارے پاس بھیجا اس پر ایک کتاب اتاری اور پھر اس رسول کے ہاتھوں خاص اپنی نگرانی و ہدایت میں ہمارے لیے ایک مکمل نظام فکر و اخلاق، ایک مکمل نظام تہذیب و تمدن، ایک مکمل نظام عدل و قانون اور ایک مکمل نظام معیشت و سیاست مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے سامنے ایک روشن نمونہ قائم کر دیا۔ اب قیامت تک جو انسان بھی اپنی فلاح کے خواہش مند ہوں گے وہ اس نمونے کو دیکھ کر باسانی اپنا نظام حیات صحیح بنیادوں پر استوار کر سکیں گے۔

لیکن یہ احسان صرف اسی وقت تک احسان رہتا ہے جب تک ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی میں کوئی تفریق نہیں کرتے اور یہ مانتے ہیں کہ آپ انسان ہوئے ہوئے بھی ہمہ وقت رسول تھے اس کے برعکس اگر منکرین حدیث کا نقطہ نظر تسلیم کر لیا جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت نبوی کو حیثیت شخصی سے جدا کر کے یہ کہا جائے کہ آپ کی حیثیت نبوی صرف قرآن پہنچانے تک محدود تھی اس کے بعد آپ کی حیثیت ایک عام انسان کی تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن پہنچانے کے علاوہ آپ کے جتنے کام تھے انہیں وحی الہی کی سند حاصل نہ تھی اگر یہ نقطہ نظر درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ احسان مبدل بہ نقصان ہوتا نظر آتا ہے کیونکہ اس صورت میں ہمارے پاس قرآن تو موجود ہو گا مگر اس کے احکام کو رو بہ عمل لانے کا کوئی ایسا نمونہ ہمارے سامنے نہ ہو گا جس کی پیروی ہم اس اطمینان کے ساتھ کر سکیں کہ وہ قرآن کا ایک ایسا نقشہ عمل ہے جو قرآن اتارنے والے کی منشا و مراد کے عین مطابق ہے۔

غرض یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی

رسالت و نبوت کی حقیقت

دونوں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔
 دراصل منکرین حدیث نے منصب رسالت و نبوت کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں ہے۔ رسالت
 و نبوت کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان جو ہر حیثیت سے دوسرے انسانوں جیسا ایک انسان
 ہو ایک عمر کو پہنچنے کے بعد یکایک اللہ کی طرف سے منصب رسالت و نبوت کے لیے چُن لیا
 جاتا ہو اور اس پر وحی اترنا شروع ہو جاتی ہو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے یکایک کسی
 راہ چلتے کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی کتاب پہنچانے کے لیے مامور کر دیا ہو یا کسی شخص کو اس طور
 پر اپنی پیغام بری کے لیے مقرر کیا ہو کہ وہ منجملہ اپنی زندگی کی دوسری مصروفیات کے ایک
 پیغمبری کا کام بھی انجام دے دیا کرے گویا وہ ایک جزوقتی کارکن ہے کہ مقررہ اوقات میں ایک
 مقررہ کام کیا اور اس کام کو ختم کرنے کے بعد وہ آزاد ہے جو چاہے کرے۔ حامل منصب رسالت
 کے بارے میں یہ خیال بھی قطعاً غلط ہے کہ بجز اس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہے اور کسی
 بات میں بھی اس کی رائے اس کے خیالات اس کے کام اس کے احکام اور اس کے
 فیصلے عام انسانوں سے متاثر نہ ہوں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں صرف
 اتنا ہی فرق ہو کہ تنزیل کتاب کے ساتھ ساتھ اس کو احکام کتاب کی علی تفصیلات بھی بتادی
 گئی ہوں اور اس خاص امتیازی حیثیت سے قطع نظر کر کے وہ محض عام اماموں جیسا ایک امام،
 عام امیروں جیسا ایک امیر، عام فرمانرواؤں جیسا ایک فرمانروا اور عام قاضیوں جیسا ایک قاضی
 ہو۔ اسی طرح حامل منصب رسالت کے بارے میں یہ تصور بھی درست نہیں کہ رسول کی ذات
 بشریہ پر رسالت عارض ہوتی ہو اور اس کے عروض کے بعد بھی رسول کی بشریت اور اس
 کی رسالت دونوں علیحدہ علیحدہ رہتی ہوں حتیٰ کہ ہم اس کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم
 کر سکتے ہوں۔

قرآن کریم سے رسالت و نبوت کی حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے وہ ان تمام تصورات
 و خیالات کے بالکل برعکس ہے۔ آئیے ہم قرآن کریم کی روشنی میں رسالت و نبوت کی
 حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نبی کی پیدائش سے پہلے ہی | قرآن کریم ہمیں بتلاتا ہے کہ نبی اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گزرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ وہ کار نبوت ہی کے لیے پیدا کیا جاتا ہے

اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہتا ہے تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی لیے پیدا کرتا ہے کہ وہ نبوت کی خدمت انجام دے۔ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے جو حالات بیان ہوئے ہیں ان میں غور کیجئے۔ انبیاء علیہم السلام پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے نامزد کر دیے جاتے تھے اور ان کو خاص طور پر اسی منصب کے لیے پیدا کیا جاتا تھا۔

مثلاً حضرت اسحق کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی پیدائش اور نبوت کی خوشخبری دے دی جاتی ہے قرآن کہتا ہے :

وَبَشِّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَبَنَيْنَا عَلَيْهِ رَءِیٰۤی
اسْحٰقُ (الصّٰفّٰت - ۱۱۲ : ۱۱۳)

حضرت زکریا بیٹے کے لیے دعا کرتے ہیں تو ان کو حضرت یحییٰ کی خوشخبری ان الفاظ میں دی جاتی ہے :

اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکَ بِیَحٰی مَصَدِّقًا لِّکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَیَدَّ اَرْحٰصًا ۝ وَنَبِیًّا مِّنَ الصَّالِحِیْنَ
آل عمران : ۳۹

حضرت مریم کے پاس خاص طور پر فرشتہ بھیجا جاتا ہے کہ ان کو ایک پاک بھینٹ لڑکے کی خوشخبری دے فرشتہ آکر کہتا ہے :

قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکَ قَالَتْ لَہٗبٌ
فَلِیْ غَلَاظِکَیْہِ (مریم : ۱۶)

فرشتے نے کہا میں تو بس تمہارے پروردگار کا ایک ایلیٰ ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں ۔

پھر پیدا ہوتے ہی اس پاکیزہ لڑکے کے منہ سے اعلان کرایا جاتا ہے کہ
 اَسْتَشْنِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي ذَرِيَّةً۔ | اس نے مجھے کتاب دی اور اس نے مجھے بنی
 بنایا۔

(مریم - ۳۰)

اسی طرح حضرت موسیٰ کی پیدائش جس ماحول میں ہوئی اور ان کی پرورش جس انداز سے ہوئی اس
 میں غور کیجئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خاص طور پر مصری فرعونیت کو تباہ کرنے اور نبی اسرائیل
 کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ فرعون کے ہاتھوں قتل سے بچانے کے لیے ایک
 تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈلوانا خاص اسی فرعون کے گھر میں ہو چنانا جس کو ان کے ہاتھوں تباہ
 کر دانا مقصود تھا ان کو ایسی پیاری صورت دینا کہ فرعون کے گھر والوں کے دل میں دیکھتے ہی
 محبت کے جذبات بیدار ہو جائیں ان کے منہ کو تمام عورتوں کے دودھ سے روک دینا تاکہ وہ
 پھر اپنی ماں کے آغوش میں پوچھ جائیں، حضرت موسیٰ کی پیدائش اور پرورش میں یہ تمام اہتمام
 اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ان کی پیدائش سے بھی پہلے منصبِ سالت
 و نبوت کے لیے منتخب کر لیا تھا۔

غرض حاملین منصب رسالت و نبوت کے بارے میں پہلی بات جو قرآن سے ہمیں معلوم
 ہوئی وہ یہ ہے کہ ان حضرات کو ان کی پیدائش سے پہلے ہی اس منصب کے لیے منتخب کر لیا
 جاتا ہے۔

جہلی اور وہی علوم | دوسری بات جو اس سلسلے میں قرآن ہی سے ہمیں معلوم ہوتی ہے
 یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے
 بلکہ اللہ تعالیٰ ابتداء ہی سے ان کے اندر بلا کسی واسطے کے اعلیٰ درجے کی ذہنی و روحانی قوتیں
 ودیعت کرنا ہے ان کے علوم کسی نہیں ہوتے بلکہ جہلی اور وہی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر
 دیکھئے حضرت نوح علیہ السلام اس ودیعت خداوندی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی قوم سے کہتے ہیں:
 وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَا لَا تَعْلَمُونَ | میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم
 نہیں جانتے۔ (اعراف : ۶۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے

وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی حکومت دکھا دی۔ الانعام : ۷۵) اور جب وہ اس مشاہدے سے علم یقین لے کر پلٹے ہیں تو اپنے باپ سے کہتے ہیں :

<p>اے ابا جان میرے پاس وہ علم آیا ہے جو ترے پاس نہیں ہے لہذا میری پیروی کریں مجھے سیدھا راستہ بتاؤں گا۔</p>	<p>يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (مریم : ۴۳)</p>
---	--

حضرت یعقوب کے متعلق اللہ تعالیٰ خود گواہی دیتے ہوئے فرماتا ہے :

<p>اور وہ یقیناً علم دکھاتا تھا جو ہم نے اس کو تعلیم کیا تھا مگر اکثر لوگ (یہ بات) نہیں جانتے۔</p>	<p>وَاللَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف : ۶۸)</p>
--	---

اسی طرح حضرت یوسف کے حق میں ارشاد فرمایا :

<p>اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکمت اور علم عطا کیا۔</p>	<p>وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (یوسف : ۲۲)</p>
---	---

بالکل یہی بات حضرت موسیٰ کے حق میں بھی فرمائی :

<p>اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور درست ہو گیا تو ہم نے اسے حکمت اور علم عطا کیا۔</p>	<p>وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (القصص : ۱۴)</p>
---	--

یہی حکمت اور ہی علم حضرت نوح کو بھی عطا کیا گیا چنانچہ ارشاد ہوا :

<p>اور نوح کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا۔</p>	<p>وَلُوحًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (الانبیاء : ۷۴)</p>
---	--

اور حکمت و علم کی اسی نعمت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سرفراز فرمایا گیا چنانچہ ارشاد ربانی ہے :

وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ

وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ

لَعَلَّكَ (النار : ۱۱۳)

اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم دیا جو پہلے تو نہ جانتا تھا۔

یہ علم و حکمت ایک روشنی ہے جو انبیاء علیہم السلام کو یہی لمبہ پر ودیعت کی جاتی ہے وہ اس روشنی سے تھا لکن کا عینی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی روشنی کی بدولت انہیں غلط اور صحیح میں امتیاز کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی روشنی معاملات کا فیصلہ کرنے اور ان کے سامنے پیش ہونے والے امور مختلف میں نظر کرنے میں انبیاء کی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ روشنی انبیاء کو ہمہ وقت حاصل رہتی ہے

اور وہ اس سے ہر موقع پر کام لیتے ہیں دوسرے لوگ غور و فکر کے بعد بھی جن باتوں کو نہیں سمجھ سکتے اور حق و صواب معلوم نہیں کر سکتے انبیاء علیہم السلام اللہ کی دی ہوئی اس روشنی کی مدد سے آن و احد میں ان باتوں کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اس روشنی کی بنا پر نبی اور عام انسانوں کے درمیان اتنا عظیم تفاوت واقع ہو جاتا ہے جتنا ایک آنکھوں والے اور ایک نابینا کے درمیان ہوتا ہے اس تفاوت کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اُلوٹا ہے :

إِنْ أَتَّبِعَ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ

وَالْبَصِيرُ (انعام)

میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے (اے محمد) آپ کہہ دیجئے کیا اندھا اور آنکھ والا برابر ہو سکتے ہیں۔

بلند ترین اخلاقی صفات | تفسیری چیز جو عاقلین منصب رسالت و نبوت کے بارے میں قرآن ہمیں بتاتا ہے یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اعلیٰ درجے کے علم اور حکمت سے نوازا ہے اسی طرح ان کو انسانیت کی بلند ترین اخلاقی صفات سے بھی مزین کرتا ہے۔ مثلاً حضرت یحییٰ کے بارے میں قرآن ہمیں بتلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکمت کے ساتھ ساتھ رحم دلی اور پاک طینتی بھی عطا فرمائی تھی ارشاد ربانی ہے :

فَأَنبَتْنَاهُ الْحَكْمَ حَبِيبًا وَحَسَنَانًا
مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكَاةً (مریم : ۱۲، ۱۳)

ہم نے بچپن ہی میں اس کو نفوس فیصلہ اور رحم دلی اور پاک طینتی عطا فرمائی تھی۔

اسی طرح قرآن حضرت عیسیٰ کی زبان سے کھڑا ہوا ہے کہ

وَجَعَلَنِي مَبَارَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَ
اَوْصَانِي بِالْقَلْوَةِ فَلَا تَزْكُوهُ مَا
دُمْتُ حَيًّا وَيَا يَحْيٰى الَّذِي
وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا۔

(مریم : ۳۱-۳۲)

اور اللہ نے مجھے برکت والا بنایا جہاں بھی میں
رہوں اور اس نے مجھ کو وصیت کی کہ جب تک
جیوں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں اور اس نے
مجھ کو اپنی ماں کا خدمتگزار بنایا اور مجھ کو جبار اور
شقی نہیں بنایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند ترین اخلاقی صفات کا حامل قرار دیتے ہوئے فرمایا :

اور آپ اخلاق کے بڑے مرتبے پر
فائز ہیں۔

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خَاقٍ عَظِيْمٍ

(النمل : ۴)

معلوم ہوا کہ انبیاء کی فطرت نہایت پاکیزہ ہوتی ہے وہ فطرتاً صحیح سوچتے ہیں صحیح بولتے ہیں اور
صحیح عمل کرتے ہیں غلط اندیشی اور گمراہی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی اور اس طرح ان کی
نفسی و روحانی قوتیں انتہائی غیر معمولی ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ
غلیظیوں اور لغزشوں سے حفاظت

اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو نہ صرف یہ
کہ علم و حکمت عطا کرتا ہے اور بلند ترین اخلاقی صفات سے نوازتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ
ہمیشہ ان پر خاص نظر رکھتا ہے۔ غلیظیوں اور لغزشوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے ہر قسم کی
گمراہیوں سے ان کو بچاتا ہے حتیٰ کہ اگر بہ مقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں بھی
غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کی زندگیوں میں
اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں غور فرمائیے عین اس وقت
جبکہ عزیز مصر کی بیوی نے آپ کو اپنے جال میں پھنسا لینے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی اللہ تعالیٰ
نے اپنی ”برہان“ دکھلا کر حضرت یوسف علیہ السلام کو بدکاری سے محفوظ کر دیا۔ قرآن اس
واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

اور اس (عورت) کے دل میں تو اس کا خیال جم
ہی رہا تھا اور اسے بھی اس (عورت) کا خیال ہو
چلا تھا اگر اس نے اپنے پروردگار کی دلیل کو نہ
دیکھ لیا ہوتا تو اس طرح (ہم نے اسے بچا دیا) تاکہ ہم
اس سے بلی اور بے حیائی کو دور رکھیں وہ بیشک
ہمارے ان بندوں میں سے تھا جن کو ہم نے اپنے
لیے ماحصل کر لیا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا
لَوْ لَا أَنْ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ
كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ
وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا
الْمُخْلَصِينَ (یوسف : ۲۴)

اسی طرح حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے واقعات پر نظر ڈالئے کس کس
طرح فرعون سے ان کی مخالفت کی گئی۔ جب فرعون کے پاس جانے کا حکم پا کر دونوں خوف زدہ
ہو جاتے ہیں کہ کہیں فرعون ہمارے ساتھ ظلم کا سلوک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں ان
کو اپنی مخالفت کا یقین یاد دلاتا ہے :

تم نہ ڈرو تم دونوں کے ساتھ میں ہوں میں (سب)
سنتا اور دیکھتا ہوں۔

لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمَا أَسْمَعُ
وَأَرَىٰ (طہ - ۴۶)

پھر جب ہمارے دو گمراہوں کے بنائے ہوئے سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ بہ تعاضاً نے
بشری ڈر باتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس بشری کمزوری کو اپنی وحی کے ذریعے سے دور
فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

ڈرو نہیں۔ غالب تو یقیناً تم ہی
رہو گے۔

لَا تَخَفُ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ
(طہ - ۶۸)

حضرت نوح اپنے بیٹے کو ڈوبتے دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں یا اللہ یہ تو میرا بیٹا ہے :
اے میرے رب میرا بیٹا تو میرے گمراہوں
ہی میں سے ہے۔

رَبِّ اِنَّ اَبْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ
(ہود - ۴۵)

اور آپ نے میرے گمراہوں کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیا تھا قُلْنَا اِجْلِيْ فَيَنصَا مِنْ
كُلِّ نَسَاوَجَيْنِ اٰثِمِيْنَ وَاَوْفَلَكَ (ہم نے کہا اس کشتی میں ہر قسم کے جوڑوں میں سے دو دو کو

چڑھا اور اپنے گھر والوں کو بھی۔ (صود: ۴۰) محبت پدری کے جوش میں حضرت نوح کو یہ خیال ہی نہ رہا کہ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ (بجز ان کے جن پر حکم نازل ہو چکا ہے) کی شرط بھی ساتھ ہی لگائی گئی تھی۔ محبت پدری کی بشری کمزوری نے ذرا سی دیر کے لیے نبی کی نظر سے اس حقیقت کو چھپا دیا کہ حق کے معاملے میں باپ، بیٹا اور بھائی کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے اسی وقت اپنے نبی کی آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ آپ کا بیٹا آپ کے لطف سے ضرور ہے مگر چونکہ اس کا عمل غیر صالح ہے اس لیے وہ آپ کے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔

یا نوحُ إِنَّهُ لَكَيْسٌ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود: ۴۶)	اسے نوح یہ تمہارے گھر والوں ہی میں سے نہیں ہے اس کے عمل خراب ہیں۔
---	--

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اس غلط فہمی سے بھی حفاظت فرمائی۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آئے کہ جب کبھی بھی اقتضائے بشریت کی بنا پر آپ سے کوئی اجتہادی لغزش ہوئی اللہ تعالیٰ نے وحی جلی سے فوراً اس کی اصلاح فرمادی قرآن کریم نے اس قسم کی تمام لغزشوں کا اور اللہ کی جانب سے ان کی جو اصلاح کی گئی ان کا بہ تمام و کمال ذکر کر دیا ہے ان آیات کی نشاندہی ہم اوپر کر آئے ہیں۔ یہ تمام آیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غلطیوں سے بچانے اور آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو معیار حق پر قائم رکھنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ نیز ان آیات سے صریح طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ان لغزشوں کے علاوہ جن کا قب آ کریم نے ذکر کر دیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسیس سالہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کا نامہ ہر قسم کی خطا اور ہر طرح کی لغزش سے بالکل پاک ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی سند حاصل ہے کیونکہ ان متذکرہ لغزشوں کے علاوہ دیگر کسی بھی قول و فعل پر اللہ تعالیٰ کا گرفت نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے صادر ہونے

و اے تمام اقوال و افعال اللہ کے معیار مطلوب پر اترتے ہیں گویا ان پر اللہ کی طرف سے مہر تصدیق و توثیق ثبت ہے ۔

منصب رسالت اور حیات طیبہ | غرض عاقلین منصب رسالت و نبوت کے بارے میں قرآنی استشہاد کے ساتھ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اسے پیش نظر رکھیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں غور کیجئے صوریہ حال یہ نہیں ہوتی کہ آپؐ اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گزرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب ہوئے ہوں بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ آپؐ کو ابتداء ہی سے پیدائش سے بھی پہلے کار نبوت کے لیے چن لیا گیا تھا ۔ پھر پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی نگرانی میں آپؐ کی پرورش اور تربیت کرائی نبوت عطا کرنے سے پہلے ہی آپؐ کو ہر طرح کے اخلاقی عیوب اور ہر قسم کی گمراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا اور ایسے حالات میں آپؐ کی پرورش کی جن میں آپؐ کی استعداد نبوت جو پیدائش سے پہلے ہی آپؐ میں ودیعت کر دی گئی تھی رفتہ رفتہ فعلیت کی طرف بڑھتی رہی تا آنکہ جب یہ استعداد اپنے کمال کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو خاص اپنے پاس سے علم قوت فیصلہ اور نور ہدایت عطا کر کے آپؐ کو منصب نبوت پر مامور کر دیا اور پھر آپؐ سے اس طرح کا ایسا کہ اس منصب پر آنے کے بعد سے اس حیات ظاہری کے آخری سانس تک آپؐ کی پوری زندگی اسی کار نبوت کے لیے وقف رہی ۔ تلاوت آیات ، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کے سوا آپؐ کا اور کوئی مشغلہ نہ رہا ۔ رات دن اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے آپؐ کو یہ دھن نہ ہی کہ گمراہوں کو راہ راست پر لائیں اور راہ راست پر آ جانے والوں کو ترقی کی اعلیٰ منزلوں پر پہنچنے کے قابل بنائیں اس تمام کام میں اللہ کی طرف سے ہمہ وقت نگرانی آپؐ کے شامل حال رہی ۔ ہوائے نفس کے اتباع اور شیطانی وسوسوں سے آپؐ کی پوری طرح حفاظت کی گئی معاملات کو بالکل آپؐ کی بشری عقل اور آپؐ کے بشری اجتہاد پر نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ جہاں کہیں بھی آپؐ کی خواہش یا آپؐ کے اجتہاد نے اللہ کے مقرر کیے ہوئے خط مستقیم سے بال برابر بھی جنبش کی وہیں آپؐ کو اس پر متنبہ کر کے آپؐ کا رخ

سیدھا کر دیا گیا۔

نبوت کے منصب پر فائز ہو جانے کے بعد بھی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بشر ہی رہے اور ان تمام حدود سے محدود رہے جو اللہ تعالیٰ نے فطرت بشریہ کے لیے مقرر فرمائی ہیں لیکن ان حدود کے اندر آپ کی بشریت آخری اور اتم درجے کی کامل و اکمل بشریت تھی جس میں وہ تمام فریق بدرجہ اتم موجود تھیں جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان کو حاصل ہونی ممکن ہیں دراصل آپ کے جسمانی، نفسانی اور عقلی و روحانی قوی کو ابتداء ہی سے عدل و تسویہ کے انتہائی مقام پر رکھا گیا۔ آپ کو قلب کی سلامت اور فطرت کی صحت اس درجے کی عطا کی گئی کہ آپ یحییٰ ہی سے خود بخود کسی خارجی انسانی تعلیم و تربیت کے بغیر ان راستوں سے دور رہیں جو رضائے الہی کے خلاف ہیں اور ان راستوں کو اختیار کریں جو مراضات الہی کے عین مطابق ہیں آپ کی یہی کامل و اکمل بشریت تھی جو اپنی پختگی اور اپنے کمال کو پہنچ جانے کے بعد ہدایت عامہ کے منصب پر سرفراز ہوئی، اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم کی مزید روشنی پا کر سراج منیر بنی اور مصلح عامہ بشریہ کے لیے تعلیمات و احکام کا مبسط قرار پا کر نبوت و رسالت سے موسوم ہوئی گویا امر واقعہ یہ نہیں ہے کہ نبوت ایک عرض کی حیثیت رکھتی تھی جو ایک خاص وقت میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوہر انسانیت پر عارض ہوا ہو بلکہ حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ اس کی حیثیت انسانیت کاملہ کے ایک ایسے جوہر کی تھی جو نبوت کی استعداد کے ساتھ پیدا ہوا اور فعلیت کی طرف ترقی کرتے کرتے آخر کار نبوت بنا دیا گیا۔ اس لحاظ سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطر میں نبوت ایک پیدائشی چیز تھی اور آپ کی حیثیت ذاتی ہی دراصل آپ کی حیثیت نبوی کو متضمن تھی فرق مگر تھا تو صرف اتنا کہ بعثت سے قبل آپ کی حیثیت نبوی بالقوہ تھی اور بعثت کے بعد بالفعل۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی ذات میں حیثیت ذاتی اور حیثیت نبوی دونوں اس طور پر جمع تھیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس وضاحت کے بعد کوئی عقل سے عاری ہی ہوگا جو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطر کو رسالت اور امامت دو حیثیتوں میں تقسیم کرے یہ کہے گا کہ رسالت کی

حیثیت سے صرف آپؐ پر ایمان لانا ہی کافی ہے، اطاعت ضروری نہیں، اطاعت کا تعلق صرف آپؐ کی حیثیت، امامت سے ہے۔

اطاعت رسول اور حیثیت امامت | اطاعت رسول کے وجوب کی مستقل حیثیت

روشنی میں گزشتہ مضمون میں ”حدیث کی تشریحی حیثیت“ کے عنوان کے تحت بڑی تفصیل کے ساتھ کر آئے ہیں تاہم اس پر دوبارہ نظر ڈال لیں۔ اس کے بعد مزید کسی گفتگو کی گنجائش نہیں رہتی مگر اس ضمن میں ہم رسالت و امامت کی تقسیم کرنے والوں اور اطاعت کو امامت کے ساتھ خاص کرنے والوں سے تاریخی حیثیت سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ سیرت نبوی میں سے کیا کسی ایک بھی ایسے واقعہ کی نشان دہی کی جاسکتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کا سلوک کبھی بہ حیثیت رسول ہوتا تھا اور کبھی بہ حیثیت امام۔ اگر منبر، مصلیٰ، جلوت و خلوت، سفر و حضر، گھر کے اندر اور گھر کے باہر، میدان جنگ اور دوران امن، محفل اور لیٹر، خواب پر آپؐ کی صرف ایک ہی حیثیت یعنی حیثیت رسالت ہی سمجھی گئی ہے تو امامت کی ایک اور نئی حیثیت از خود کہاں سے پیدا ہو گئی۔ پھر رسالت و امامت کے حقوق بھی متضاد حقوق ہیں۔ تقسیم حیثیات کا دعویٰ کرنے والوں کے نزدیک رسول پر صرف ایمان لانا واجب ہے اور امام پر ایمان نہ لانا ضروری ہے، غور کا مقام ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت لوگوں کو ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے اور اپنی اطاعت کا امر بھی فرماتے تھے مگر کبھی یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ آپؐ نے ان متضاد حقوق کو اپنے دو مختلف منصوبوں سے خود متعلق سمجھا ہو یا دوسروں کو اس پر کبھی تنبیہ کی ہو۔ مزید برآں اُس دور میں اُن امیٰ مخاطبین کے لیے جو منطق کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے یہ تقسیم کرنا کتنا مشکل ہوتا ہو گا کہ وہ ان متضاد حقوق کو ہمیشہ دو مختلف حیثیتوں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ملحوظ رکھیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہ حیثیت رسول ظاہر ہوں تو ان پر فوراً ایمان لے آئیں اور بہ حیثیت امام سامنے آئیں تو ان کا انکار کر دیں اور کہہ دیں کہ یہ انکار بہ حیثیت امامت ہے نہ کہ بہ حیثیت رسالت یا اسی طرح اطاعت کے بارے میں وضاحت کریں کہ یہ اطاعت بہ حیثیت

امامت ہے نہ کہ بد حیثیت رسالت ۔

اس تمام گورکھ دھندے سے نجات کی ایک ہی صورت ہے کہ حق کو تسلیم کر لیا جائے اور حق یہی ہے کہ آپؐ کی ذات میں ذہنی لحاظ سے خواہ کتنی بھی شخصیات پیدا کر دی جائیں مگر اصل یہ ہے کہ آپؐ نبوت سے سرفرازی کے بعد سے یوم وصال تک کسی ایک لمحے بھی حیثیت رسالت سے علیحدہ نہیں ہوئے ۔ ہمیشہ آپؐ پر ایمان آپؐ کی اطاعت اور آپؐ کی عظمت اسی منصب کے ماتحت ہوئی اور آج بھی آپؐ پر ایمان، آپؐ کی اطاعت اور آپؐ کی عظمت اسی منصب رسالت کے اعتبار سے ہے اور تا قیامت اسی منصب کی حیثیت سے یہ سب کچھ کیا جاتا رہے گا اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ سب حق کے خلاف ہے ۔

ایمان کی حقیقت سمجھنے میں غلطی | دراصل رسالت و امامت کی متذکرہ بالا تقسیم اور ایمان و اطاعت کے

درمیان یہ تفریق نتیجہ ہے اس شدید غلطی کا جو ایمان کے معنی سمجھنے میں ان منکرین حدیث کو پیش آگئی ہے ۔ اگر یہ لوگ ایمان کی حقیقت کا صحیح علم حاصل کر لیتے تو اطاعت کو ایمان سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے تھے ۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے تصدیق کر لینے کا نام ہے اس لیے ان کے نزدیک رسول کا حق صرف تصدیق کر کے ادا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اطاعت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی حالانکہ ایمان کی حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے اولاً تو اطاعت کے بغیر ایمان ہی حاصل نہیں ہو سکتا دوم قلبی تصدیق حاصل ہو جانے کے بعد یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اطاعت کا عہد دل میں پیدا نہ ہو جس دل میں رسول کی اطاعت کا عہد نہیں وہ دل یقیناً تصدیق رسول سے بھی خالی ہے ۔ ایمان اور اطاعت باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر قتل شاہِ روم کو مسلمان نہیں کہا گیا حالانکہ اس نے برسرِ دربار عام محفل میں آپؐ کی تصدیق کر لی تھی اگرچہ اپنے درباریوں کی برہمی دیکھ کر بعد میں اس نے بات بنادی اگر ایمان کے لیے صرف تصدیق ہی کافی ہوتی تو ہر قتل

کو مسلمان کہا جانا چاہیے تھا اسی طرح بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب نے بارہا آپ کی تصدیق کی لیکن اس کے باوجود کیونکہ ان کے دل نے معمولی انسانوں کی عار کی خاطر آپ کی اطاعت کرنا قبول نہیں کیا اس لئے جمہور امت نے ان کا ایمان تسلیم نہیں کیا۔

دفعہ نجران کے قصہ میں ایک کاہن بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ابن قیم زاد المعاد میں تحریر فرماتے ہیں:

اس واقعے سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی کتابی کاہن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تصدیق کرے کہ آپ بنی ہیں تو صرف اس اقرار سے وہ اسلام میں داخل نہیں مانا جاسکتا جب تک وہ آپ کی اطاعت اور اتباع کا بھی پورا پورا عہد نہ کرے۔

وَفِيهَا إِنْ أَقْرَأَ الْكَاهِنُ الْكِتَابِي
لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
بِأَنَّهُ نَبِيٌّ لَا يَدْخُلُهُ فِي
الْإِسْلَامِ مَا لَمْ يَلْتَزِمِ طَاعَتَهُ
وَمَتَابِعَتَهُ

(زاد المعاد جلد ۳)

اسی طرح کا ایک واقعہ ان دو یہودی علماء کا ہے جنہوں نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے امتحاناً تین سوالات کیے تھے اور ان کے بالکل ٹھیک ٹھیک اور درست جواب پا کر بے اختیار گواہی دے اُٹھے تھے کہ آپ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں مگر جب بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ پھر اب تمہیں میری اتباع سے کوئی چیز مانع ہے تو وہاں نہ کرنے لگے کہ ہمیں یہ طور ہے کہ کہیں ہماری قوم ہمیں مار نہ ڈالے۔ یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک آپ کی اطاعت کا عہد نہ کیا جائے محض آپ کی نبوت کا اقرار کر لینے سے اسلام کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اسی قسم کے واقعات کا حوالہ دینے کے بعد حافظ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں:

یہ شخص کتب سیرت کا مطالعہ کرے گا اور ان میں بہت سے اہل کتاب اور مشرکین کی تصدیق کے واقعات پڑھے گا تا پھر

وَمَنْ تَامَلَ حِفْ السِّيَرِ وَ
الْأَخْبَارِ الثَّابِتَةِ مِنْ شَهَادَةِ
كَثِيرٍ مِنْ أَهْلِ الْكُتُبِ وَالْمُشْرِكِينَ

یہ بخوبی روشن ہو جائے گا کہ اسلام صرف آپؐ کی رسالت کی تصدیق کا نام نہیں بلکہ اسلام اس سے ماوراء کوئی چیز ہے نہ وہ صرف معرفت ہے اور نہ صرف معرفت و اقرار کا نام ہے بلکہ جب تک آپؐ کی معرفت اور اقرار کے علاوہ ظاہری و باطنی طور پر آپؐ کی فرماں برداری اور آپؐ کی پوری پوری اطاعت کا عہد نہ کرے اس وقت تک کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

لَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالرَّسَالَةِ
وَ اِنَّهُ صَادِقٌ فَلَمْ تَدْخُلْهُمْ هُنَا
الشَّهَادَةِ فِي الْاِسْلَامِ عِلْمُ اَنَّ
الْاِسْلَامَ اَمْرٌ وَرَاءَ ذَلِكَ وَ اِنَّهُ
لَيْسَ هُوَ الْمَعْرِفَةُ فَقَطْ وَلَا الْمَعْرِفَةُ
وَالْاَقْرَارُ فَقَطْ بَلِ الْمَعْرِفَةُ وَالْاَقْرَارُ
وَالْاِتِّقَادُ وَالتَّزَامُ طَاعَتِهِ
وَدِينِهِ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا۔

(زاد المعاد جلد ۳ ص ۵۵)

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا آپؐ کی اطاعت کے بغیر ایمان ہی نہیں ہے کوئی شخص صرف آپؐ کی نبوت کا اقرار کر کے اسلام کے زمرے میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپؐ کی اطاعت کا عہد بھی نہ کرے۔

منکرین حدیث لاکھ کہتے رہیں کہ منصب رسالت کو اطاعت سے کوئی تعلق نہیں حقیقت نفس الامر اس کے بالکل عکس ہے۔ اس موقع پر تارین کو ہم سورہ نسا کی وہ آیت پھر یاد دلاتے ہیں جس کا حوالہ ہم ”حدیث کی تشریحی حیثیت“ کے عنوان کے تحت اطاعت رسول کے وجوب پر گفتگو کرتے ہوئے دے آئے ہیں اور جو اس باب میں فیصلہ ناطق ہے کہ رسول پر ایمان لانا اس کی اطاعت کے بغیر ایمان ہی نہیں ہے ارشاد ربانی ہے :

آپ کے پروردگار کی قسم یہ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک کہ آپ کے اخلاقات میں آپؐ ہی کو حکم نہ ملے۔ پھر ان میں اس کے بعد آپؐ کے فیصلے سے اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کرے اور پوری طرح جب تک اس کے سامنے سر نہ جھکائیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى
يُحْكَمُوا نِيَامًا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا
يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مَّا
قَضَيْتَ وَ يَسْمَعُوا تَسْلِيمًا۔

(النار : ۶۵)

غور کا مقام ہے منکرینِ حدیث کے نزدیک تو منصب رسالت کو اطاعت سے کوئی تعلق ہی نہیں اور قرآن کما ہے کہ اطاعت کے بغیر رسول پر ایمان ہی کامل نہیں ہوتا بلکہ صرف ادھورا اور ناتمام ایمان ہوتا ہے یہ آیت کس قدر صراحت سے اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک مومن کہلانے کا حق دار نہیں جب تک کہ ہر معاملے میں وہ رسول کو اپنا حکم نہ بنائے باہمی جو اختلاف بھی ہو اس میں اسی کا فیصلہ نا طلق نہ سمجھے یہی نہیں بلکہ تکمیلِ ایمان کے لیے یہ بھی بشرط ہے کہ اگر رسول کا فیصلہ اپنے مخالف ہو تو بھی اپنے دل میں اس کے بارے میں کوئی تشکی تک محسوس نہ کرے پھر اس پر بھی یس نہیں آگے ارشاد ہے ولعلو اتسلما یعنی صرف تسک محسوس نہ کرنا ہی کافی نہیں اس منفی پہلو کے ساتھ ساتھ اثباتی پہلو میں انقیاد و تسلیم کا ہوتا بھی ضروری ہے اس کے بغیر بھی ایمان کامل نہیں۔

یہ تو رسول کی اطاعت کا پہلو تھا اس کے خلاف کا پہلو بھی سنئے۔ جو لوگ رسول کی اطاعت کو ضروری نہیں سمجھتے وہ ذرا ساں کھول کر نہیں ان کے لیے دردناک عذاب کی وعید ہے :

تو جو لوگ اس کے حکم کا خلاف کرتے ہیں انہیں
ذرا ڈرتے رہتا چاہیے کہیں کوئی فتنہ یا
دردناک عذاب نہ آپکڑے۔

فليحذر الذين يخالفون عن
أمره أن تصيبهم فتنة
أو يصيبهم عذاب اليم۔

(البقرہ - ۶۳)

بہر حال رسول کے مطاع ہونے کا قانون اللہ تعالیٰ کا مستمرا قانون ہے قرآن کے الفاظ میں رسول بتایا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ
اللہ کے حکم کے ماتحت اس کی اطاعت اور
فرمانبرداری کی جائے۔

وما أرسلنا من رسول إلا ليطاع
بأذن الله (النساء - ۶۴)۔

رسول کا مطاع ہونا گویا قرآن کے نزدیک حق رسالت ہے اور ایک ایسا عام قانون ہے جس سے کبھی کوئی رسول مستثنیٰ نہیں رہا۔

قرآنی صداقتوں کا انکار | مختصر یہ ہے کہ بات رسالت و امامت کی تقسیم کی ہو یا ایمان و اطاعت کے درمیان تفریق کی منکرین

حدیث اپنی طرف سے جو چاہیں کہتے رہیں قرآن ان کے ہر دعوے سے بری الذمہ ہے اصل بات یہ ہے کہ قرآن صداقتوں کا ایک مجموعہ ہے اس کی ایک صداقت کا انکار کیا جائے تو دوسری صداقت کا انکار خود بخود سر پڑ جاتا ہے۔ منکرین حدیث نے اولاً جب قرآن کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت صرف تبلیغ قرآن تک محدود ہے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر انہیں یہ بھی ماننا پڑا کہ مبلغانہ حیثیت کے علاوہ آپ کی جو حیثیت بھی قرآن نے ذکر کی ہے اس کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پہنچ کر انہیں یہ مشکل پیش آئی کہ پھر آخر ان حیثیات کا تعلق ہے کس سے؟ اس کے لیے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو دو حیثیتوں میں تقسیم کرنا پڑا ایک حیثیت رسالت کی اور ایک حیثیت امامت کی اور یہ دعویٰ کرنا پڑا کہ تبلیغ قرآن کے سوا آپ کی جو حیثیت بھی قرآن نے بیان کی اس کا تعلق امامت سے ہے رسالت سے نہیں۔ پھر اس رسالت و امامت کی تفریق کو نبھانے کے لیے انہیں ایک اور خلاف قرآن دعویٰ کرنا پڑا کہ منصب رسالت کے لیے اطاعت ضروری نہیں قرآن میں جہاں کہیں اطاعت رسول کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا تعلق منصب امامت سے ہے منصب رسالت سے نہیں اسی طرح قرآن کی ایک صداقت کا انکار منکرین حدیث کو دوسری صداقت کے انکار پر مجبور کرتا رہا اور وہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کے مرتکب ہوتے چلے گئے:

اطاعت رسول کا قرآنی حکم اور امام وقت یا مرکز ملت | منکرین حدیث نے جب یہ دعویٰ کیا کہ اطاعت کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے تو انہیں پھر ایک مشکل پیش آئی وہ یہ کہ قرآن

نے تو جگہ جگہ اطاعت رسول کا حکم دیا ہے بلکہ قرآن کے نزدیک تو رسول بنایا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے تو اب ایسی کونسی توجیہ اختیار کی جائے کہ منصب رسالت کے لیے اطاعت بھی ضروری نہ رہے اور منکرین حدیث پر خلاف قرآن کوئی دعویٰ کرنے کا

الزام بھی سر نہ آئے۔ اس کے لیے انہیں پھر مزید ایک غلطی کا مرتکب ہونا پڑا انہوں نے کہا کہ قرآن میں جہاں کہیں اطاعتِ رسول کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت کی اطاعت ہے جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حیات تھے یہ اطاعت امام وقت ہونے کی وجہ سے آپ کا حق تھا آپ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہوگا۔ یہ اطاعت اس کا حق ٹھہرے گی۔ امام وقت کے لیے منکرینِ حدیث نے ایک نئی اصطلاح ایجاد کی اور اسے مرکزِ ملت کا نام دیا۔ یہ مرکزِ ملت کا منصب جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی زیرِ نظر تحریر میں کہیں واضح کر آئے ہیں منکرینِ حدیث کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے شروع ہو کر آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے چونکہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اس لیے عاملِ وحی ہونیکے علاوہ باقی جتنی حیثیات بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں وہ سب کی سب آپ کے بعد آنے والے خلیفہ یعنی مرکزِ ملت کو منتقل ہو گئیں حتیٰ کہ قرآنی آیات کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جو معنی بھی آپ کے بعد آنے والا امام وقت یعنی مرکزِ ملت پہنائے گا وہ درست ماننا اور ان پر عمل کرنا منکرینِ حدیث کے نزدیک اسی طرح ضروری ہوگا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امامت کے زمانے میں اپنے حالات کے مطابق قرآنی آیات کی جو تشریح و تفسیر کی اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔

حیرت کی بات ہے ایک طرف منکرینِ حدیث رسالت کے لیے اطاعت کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں وہ رسالت جس کا حامل صاحبِ وحی ہوتا ہے اس پر ایمان نہ لانے والا کافر کہلاتا ہے اس کی ذات ہر قسم کی خطا و لغزش سے معصوم ہوتی ہے دوسری طرف امامت کے لیے اطاعت کو لازمی قرار دیتے ہیں وہ امامت جس کا حامل نہ صاحبِ وحی ہوتا ہے نہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور نہ وہ خطا و قصور سے مبرا ہے۔ آئیے منکرینِ حدیث کے اس دعوے کا بھی پوری حقیقت پسندی سے جائزہ لیں :

اطاعت کے لیے حیاتِ جسمانی کی قید | جہاں تک اطاعت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ جسمانی تک محدود کرنے کا تعلق ہے تو منکرینِ حدیث کا یہ دعویٰ خلافِ عقل بھی ہے اور خلافِ نقل بھی۔

خلافتِ عقل اس طرح پر کہ ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں کہ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے منصبِ رسالت پر سرفراز فرمایا اس وقت سے لے کر اپنی حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے اسی حیثیت میں آپ مبلغِ قرآن بھی تھے اور معلمِ قرآن بھی مرنے والے بھی تھے اور منکر کی معاشرہ بھی حاکم و فرماں روا بھی تھے اور ماضی و امامِ وقت بھی۔ آپ کی ذاتِ اعلیٰ کو رسالت و امامت کی حیثیتوں میں تقسیم کرنا سراسر لغو ہے آپ کی ذات میں حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شفعی و انسانی دونوں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات پوری طرح ثابت ہو جانے کے بعد ذرا غور کیجئے کہ منکرینِ حدیث کا یہ دعویٰ کس قدر خلافتِ عقل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت اور آپ کے ارشادات کی پیروی صرف آپ کی حیاتِ جسمانی تک محدود تھی۔ اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ صرف اسی عہد کے لیے تھی جس میں آپ اپنے جسمِ اعلیٰ کے ساتھ زندہ تھے۔ آپ کے وصال فرماتے ہی گویا آپ کی رسالت کا تعلق عملاً دینا سے منقطع ہو گیا اس لیے کہ آپ کی اطاعت کا مطلب ہے آپ کے اسوۂ حسنہ کی اطاعت اور آپ کے ان اقوال و افعال کی اطاعت جو اپنی ذات میں قرآن کا مجسمِ عملی نمونہ ہیں لہذا قرآن کا جو عملی نمونہ آپ نے پیش کیا تھا وہ تو منکرینِ حدیث کے نزدیک آپ کی حیات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اب تو آئندہ قرآن کا وہ عملی نمونہ نافذ العمل اور قابلِ تسلیم سمجھا جائے گا جو آپ کے بعد آنے والا امامِ وقت اپنا احکام سے ادا اپنے اعمال سے قائم کرے گا اس صورت میں تو رسالت کا منصب ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے سوچنے کی بات ہے جب قرآن کا عملی نمونہ قائم کرنے کا ہر شخص اہل ہو خواہ وہ نبی ہو یا نہ ہو خواہ اس پر وحی اترتی ہو یا نہ اترتی ہو تو پھر سرے سے کسی رسول کے مبعوث کرنے ہی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ قرآن بغیر کسی رسول کے آثارِ دیلجاتا اور ملنے والوں سے کہا جاتا کہ اپنے جس سے کسی شخص کو امامِ وقت منتخب کر لو جو تمہارے لیے اس قرآن کا ایک عملی نمونہ قائم کر دے پھر یہ نمونہ جو وحی الہی کی رہنمائی سے محروم ہوتا کیسا کچھ مختلف فیہ اور متنازع ہوتا ہر صاحبِ عقل خود تصور کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں

بنی نوع انسان کی ہدایت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ اگر اللہ نے یہ طریقہ پسند نہیں کیا اور قرآن کے ساتھ ایک رسول مبعوث کر کے قسّرآن کا ایک عملی نمونہ وحی ہی کی رہنمائی میں تیار کرنا ضروری سمجھا تو کیسے مان لیا جائے کہ یہ سب کچھ صرف تیسیس چوبیس سال کے لیے کیا گیا۔ وہ چیز جس کے لیے اللہ تعالیٰ بطور خاص ایک رسول مبعوث کرتا ہے اور رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرتا ہے وہ چیز جس کو قرآن انتہائی شد و مد کے ساتھ ذریعہ ہدایت قرار دیتا ہے اس کے بارے میں کیونکر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ رسول اللہ کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہوتے ہی دنیا کے لیے غیر ضروری قرار دی جاسکتی ہے۔ عقل کسی طرح اس صورت حال کو تسلیم نہیں کرتی۔ اسی لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اطاعت رسول کو محض حمایت نبوی تک محدود کرنے کا دعویٰ سراسر لغو اور خلاف عقل ہے۔

ربا اس دعوے کا خلاف نقل ہوتا تو اس میں تو کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں اگر قسّرآن آپ کو خاتم النبیین کہتا ہے اگر قرآن کے نزدیک آپ کی رسالت قیامت تک قائم رہنے والی ہے اگر قسّرآن کے الفاظ میں آپ تمام عالمیں کے لیے رحمت ہیں اور اگر قسّرآن آپ کی بعثت کو پوری کائنات انسانی کی طرف بعثت عامہ قرار دیتا ہے تو پھر آپ کی اطاعت بھی قرآن کے نزدیک قیامت تک تمام عالم انسانی کے لیے باقی رہنے والی ہے کیونکہ یہ بات ہم بدلائل قطعہ ثابِت کہ چکے ہیں کہ رسالت کے لیے اطاعت ایک جزو لا ینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس بات سے تو منکرین حدیث کو بھی اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطرہ نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ اعلان کیا۔

ماکان محمدؐ أباً أحد من	محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ
رجالکم ولكن رسول اللہ	نہیں ہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور سب
وخاتم النبیین (احزاب : ۴۰)	نبیوں کے ختم پر ہیں۔

جب آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا ہی نہیں تو لازم ہے کہ آپؐ کی نبوت و رسالت تا قیامت قائم رہے اور جب تک نبوت و رسالت قائم و دائم ہے اس کا لازمی جزو اطاعت بھی قائم و دائم ہے۔

قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالمین کے لیے رحمت کہہ کر پکارتا ہے :

اور ہم نے آپ کو تمام عالمین پر رحمت ہی کے لیے بھیجا ہے۔	وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء - ۱۰۷)
---	--

آپ کا رحمتہ للعالمین ہونا مستلزم ہے اس بات کو کہ آپ کا فیضان رسالت صرف آپ کے اپنے زمانے تک محدود نہ ہو قیامت تک جاری و ساری رہنے والا ہو۔ اگر کہا جائے کہ آپ قرآن لائے جو ہمیشہ رہنے والا ہے اور اسی نسبت سے آپ رحمتہ للعالمین ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ رحمت نہ تھے بلکہ رحمت تو قرآن تھا آپ کو رحمت خواہ مخواہ کہہ دیا گیا۔ معاذ اللہ! حالانکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے الگ رحمت فرمایا ہے اور اس کے لانے والے کو الگ۔

اسی طرح قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو پوری نوع انسانی کے لیے بعثت عامہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے :

ہم نے تو آپ کو سارے ہی انسانوں کے لیے (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے بطور خوش خبری سنانے والے اور ڈرائیو والے کے۔	وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (النبأ : ۲۸)
---	---

قرآن کا ارشاد اپنے مفہوم میں کس قدر واضح ہے۔ الناس کا لفظ اپنے معنی میں عام ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لیکر قیامت تک جس قدر بھی انسان ہیں سب کے لیے آپ اللہ کے رسول ہیں گویا آپ کی رسالت کسی خاص زمانے تک محدود نہیں بلکہ جب تک بھی زمین پر انسان رہتے ہیں اس وقت تک آپ کی رسالت قائم ہے۔ اور جب تک آپ کی رسالت قائم ہے آپ کی اطاعت بھی باقی ہے۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں منکرین حدیث کی جانب سے کبھی کبھی سورہ انفال کی ایک آیت پیش کی جایا کرتی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے ان کے استدلال کی اصل حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔ سورہ انفال کی آیت ہے :

اے ایمان والو اطاعت کرتے رہو اللہ اور
اس کے رسول کی اور اس سے روگردانی نہ کرو
وہ آں حالیکہ تم سُن رہے ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ
رَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عُنْدَهُ وَانْتُمْ
تَسْمَعُونَ (انفال : ۲۰)

منکرین حدیث اس آیت کے الفاظ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اطاعت
رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت اس حکم کو سُن رہے تھے بعد کے آنے
والے لوگوں کے لیے نہ تھا یہ استدلال سراسر بدینتی اور فریب پر مبنی ہے کیونکہ اس
آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹ کر اپنی خواہش کے مطابق اس کا مفہوم نکالنے
کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سورہ انفال کو ابتدا سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو
جاتا ہے کہ اس آیت میں وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ کہنے سے مقصود ہی کچھ اور ہے۔ اس
سورت کی ابتدا میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وَأَطِيعُوا اللَّهَ
وَرَسُولَهُ إِنَّ كُنْتُمْ مَوْمِنِينَ (اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
کرو۔ انفال - ۱) پھر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے
دی گئی دعوت بھاد پر دل تنگ ہوتے تھے وَإِنْ فَرَّقَاهُمْ إِلَى ثَلَاثِينَ أَهْوَاجٍ لِّكُلِّ هِزْبٍ
مُّؤْمِنُونَ كَأَنَّهُمْ وَفْدٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ (انفال - ۵) پھر آگے چل کر فرمایا گیا ہے
وَمَنْ يَشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنِ اللَّهُ شَهِدَ عَلَيْكَ الْعُقَابَ (اور جو کوئی اللہ اور اس
کے رسول کی مخالفت کرتا ہے سو اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔ انفال - ۱۳) اس کے بعد اس
محولہ بالا آیت کا مضمون وارد ہوا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے اس محولہ بالا آیت میں اور اس
سے کچھلی تمام آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جس سے
یہ جہلانا مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے پھر ہر جگہ لفظ رسول آیا
ہے امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا کہ یہ کہا جاسکے کہ اس اطاعت کا تعلق آپ
کے منصب امامت سے ہے۔ ایسا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں جو یہ ظاہر کرتا ہو کہ ان آیات
میں رسول سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو منصب رسالت سے مختلف ہو

پھر اطاعت کے اثباتی پہلو کے بعد اس کا منفی پہلو بیان کرتے ہوئے رسول کے حکم سے مُنہ موڑنے سے منع کیا گیا ہے اور اس پر سخت عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس سب کے بعد وَاَنْتُمْ تَسْمَعُونَ کہا گیا ہے جس کا منشاء صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدِ احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی مُنہ نہ موڑو۔ اس وَاَنْتُمْ تَسْمَعُونَ کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے جس وقت یہ ریت نازل ہو رہی تھی یا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک زندہ تھے بلکہ ان الفاظ کے مخاطب وہ سب لوگ ہیں جو قیامت تک ایمان کے ساتھ قرآن کو سننے والے ہیں۔ یہ آیت ان سب پر لازم قرار دے رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم بھی ان تک پہنچے اس کے آگے وہ بلا چون و چرا تسلیم کر دیں۔

غرض اطاعت رسول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات جسمانی تک محدود کرتے کا دعویٰ نہ عقل ہی کی میزان پر پورا اترتا ہے اور نہ قرآن ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے اس لیے منکرینِ حدیث کا یہ دعویٰ قطعاً بلا دلیل ہے۔

مرکزِ ملت کی طرفِ حق
اطاعت کی منتقلی

اسی طرح اس ضمن میں منکرینِ حدیث کا یہ دعویٰ بھی دلیل کی حمایت سے قطعاً محروم ہے کہ حاملِ وحی ہونے کے علاوہ باقی جتنی حیثیات بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں وہ سب آپ کے بعد آپ کے جانشین یا مرکزِ ملت کو منتقل ہو گئیں اور اس طرح اطاعت کا وہ حق جو امام وقت ہونے کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا وہ آپ کے بعد آئندہ آنے والے امام وقت یا مرکزِ ملت کو منتقل ہو گیا اپنی طرف سے کوئی دعویٰ کر لینا بہت آسان ہے ثابت ہو جائے تو بات ہے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں منکرینِ حدیث کے پاس کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ وہ قرآن کی کوئی آیت ایسی پیش نہیں کر سکتے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان حیثیات کی منتقلی اور حقِ اطاعت کے انتقال کا ذکر ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا ارشاد اپنے اسی دعوے کے ثبوت میں وہ نہیں دکھا سکتے جس میں اس انتقالِ حیثیات و حقِ اطاعت

کے بارے میں کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ اشارہ نک کیا گیا ہو آثار صحابہ میں سے کوئی ایسی روایت نہیں اپنی نائید میں نہیں مل سکتی جس میں خلفائے راشدین میں سے کسی نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں فلاں حیثیات ہماری طرف منتقل ہو گئی ہیں اور مطاع ہونے کے لحاظ سے ہم اب اسی مقام پر فائز ہیں جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات تک فائز تھے۔ خلافت راشدہ کے بعد بھی آج تک کے ادوار میں سے کسی دور میں بھی ایسی نظیر موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ علمائے امت میں سے کسی تباہی ذکر آدمی کا کبھی یہ مسلک رہا ہو۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کی جانب سے
کیا اللہ و رسول کی اطاعت سے
امام وقت کی اطاعت مراد ہے
 کسی جاتی ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں اللہ

و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت کی اطاعت ہے مگر اول تو یہی بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ مراد آخر متعین ہوئی کس طرح؟ اس مراد کا تعین ہی اول تو محتاج دلیل ہے دوسرے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ منکرین حدیث ان متحدر آیاتِ قرآنی کا کیا کریں گے جن میں اللہ و رسول کی اطاعت کا ذکر کسی طرح بھی امام وقت کی اطاعت مراد نہیں لیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر وہی آیت لے لیجئے جو اس باب میں بنیادی آیت تصور کی جاتی ہے یعنی

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولوالا ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو جائے تو اس کو پھر دو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف۔	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَ اطِيعُوا الرَّسُولَ وَ اطِيعُوا الْأَمْرَ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (النساء - ۵۹)
---	---

اس آیت میں اگر اللہ و رسول کی اطاعت سے امام وقت کی اطاعت مراد لی جائے تو اولوالامر یعنی امام کی اطاعت کا دوبارہ حکم دینا بے معنی

تکرار بن کر رہ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں تناسل عتہ میں مزاج نزاع اللہ و رسول کو ٹھہرایا گیا ہے جو بقول منکرین حدیث خود امام وقت ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس سے کسی معاملے میں اختلاف ہو اسی کو رفع اختلاف کے لیے ثالث تسلیم کر لیا جائے۔ کس قدر غیر معقول ہے یہ بات۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہاں تناسل عتہ میں آپس کا اختلاف مراد ہے اور مزاج نزاع امام وقت ہے تو پھر فرد وہ الی اللہ والرسول کے الفاظ بالکل بے محل نظر آتے ہیں کیونکہ اوپر اولی الامر منکم کا ذکر آ جانے کے بعد فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ فرد وہ الی اللہ والرسول کے بجائے فرد وہ الیہم یا صاف فرد وہ الی اولی الامر کہا جائے۔ غرض اس آیت میں کسی طرح بھی اللہ و رسول کو امام وقت کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا اسی طرح اور بھی متعدد نظیریں قرآن سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ اللہ رسول اور امام یہ تینوں عربی زبان کے الفاظ ہیں کیا منکرین حدیث بتا سکتے ہیں کہ اللہ و رسول کے الفاظ سے امام وقت یا مرکز ملت کے معانی مراد لینا کونسا محاورہ اور کونسی لغت ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے مقصود امام رتت کی اطاعت کو اللہ رسول کی اطاعت کے مترادف قرار دینا ہے کیونکہ اس خیال کی ہی اگر کوئی حقیقت ہوتی تو قرآن میں کہیں تو اس معنوں کی بھی کوئی ایک آیت ضرور آتی کہ من یطیع الامام فقد اطاع اللہ والرسول (جس نے امام کی اطاعت کی اس نے اللہ و رسول کی اطاعت کی) جیسا کہ یہ واضح کرنے کے لیے کہ رسول کی اطاعت بعینہ اللہ کی اطاعت کے مترادف ہے قرآن نے بڑے ہی صریح الفاظ میں اعلان کیا من یطیع الرسول فقد اطاع اللہ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی) - (نساء - ۸۰) -

رسول کی اطاعت اور امام کی اطاعت میں بنیادی فرق

رسول کی اطاعت کو تو بعینہ اللہ کی اطاعت کہا جاسکتا ہے مگر امام کی اطاعت کو بعینہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں کہا جاسکتا کیونکہ

رسول کی اطاعت اور امام کی اطاعت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کے بیان اس کی راۓ اور اس کی وحی کے ماتحت ہونے کی بنا پر فی الحقیقت اللہ ہی کی اطاعت

ہوتی ہے مگر امام پر نہ وحی آتی ہے نہ اللہ کی طرف سے اس کی صواب رسی کی کوئی ضمانت دی گئی ہے نہ جو حکم دے گا اپنی صواب دید، اپنی فہم اور اپنے علم کے مطابق دے گا ظاہر ہے اس صورت میں اس کی اطاعت کو کسی طرح بھی اللہ و رسول کی اطاعت نہیں کہا جاسکے گا۔ اس حقیقت کو ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے برسہا برس بڑے واضح الفاظ میں واضح کرتے ہوئے فرمایا :

لوگو! جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے (دین کے بارے میں) اس لیے صواب ہوتی تھی کہ وہ اللہ کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ یہی ہماری رائے تو وہ تو بعض ایک شکل ہوتی ہے۔

إِنَّهَا النَّاسُ إِنْ رَأَوْا إِنْمَا كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَصِيبًا إِنْ اللَّهَ، كَانَ يُؤَيِّدُهُمْ وَرَأَيْتُمْ هُوَ مِنَ الظُّنِّ وَالتَّكَلُّفِ (اعلام المرتعین ج ۱ ص ۲۵)

اسی طرح ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کاتب نے حضرت عمرؓ کے فیصلے پر یہ الفاظ لکھ دئے فَهَذَا أَمْرُ رَسُولِ اللَّهِ أَهْلُ الْمُؤْمِنِينَ عُمَرُ (یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین عمرؓ کے خیال میں ڈالا ہے) حضرت عمرؓ نے دیکھا تو سختی سے منع فرمایا اور کہا کہ یو، مت لکھو بلکہ یوں لکھو کہ فَهَذَا أَمْرُ رَسُولِ اللَّهِ عُمَرُ (یہ وہ فیصلہ ہے جو امیر المؤمنین عمرؓ نے خود اپنے خیال کے مطابق صادر فرمایا) جتنا نا پس مقصود تھا کہ ہم پورے وحی آتی ہے نہ ہم موصوم عن الخط ہیں اور نہ ہماری رائے کو حفاظت ربانی کی ضمانت حاصل ہے اس لیے ہماری رائے کو صواب رسی میں رسول کی رائے کا مقام نصیب نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے جس کی رائے کا صواب اور درست ہونا یقینی نہ ہو اس کی اطاعت کو اس بستی کی اطاعت کے ہم پارہ کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے جس کی اصابت رائے پر وحی الہی ضامن ہو۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ امام وقت یا مرکز ملت کی اطاعت کو اطاعت رسول کے قائم مقام قرار دینے کا لازمی طور پر یہ مطلب ہو گا کہ وہ خصوصیات جو اطاعت رسول کے لیے قرآن سے ثابت ہیں وہ سب کی سب امام وقت یا مرکز ملت کے لیے بھی مختص تصور کی جائیں حالانکہ ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی امام وقت یا مرکز ملت پر صادق نہیں آتی۔

اطاعتِ رسول کے خصائص مرکزِ ملت | اطاعتِ رسول کے جو خصائص قرآن سے ثابت ہیں وہ ہم ایک ایک کر کے کی اطاعت پر صادق نہیں آتے | گنا تے ہیں منکرینِ حدیث ان میں غور کر کے بتائیں ان میں سے کسی ایک کو بھی امامِ وقت یا مرکزِ ملت کے حق میں مختص قرار دینا کسی طرح بھی معقول نظر آتا ہے؟ قرآن کا ارشاد ہے :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى
يَحْكُمُوا بِمَا فِي شَجَرِ بَيْنِهِمْ ثُمَّ
لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا
(النساء : ۶۵)

سو آپ کے پروردگار کی قسم کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ لوگ آپ کے حکم سے میں آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کرے اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کر لیں۔

اس آیت سے اطاعتِ رسول کی دو خصوصیتیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) اول یہ کہ رسول کے فیصلے پر رضامندی شرط ایمان ہے جو شخص کسی معاملے میں رسول کے کیے ہوئے فیصلے سے اتفاق نہیں کرتا وہ مومن نہیں رہتا۔

(۲) دوسرے یہ کہ رسول کی اطاعت کا حق تب ادا ہوتا ہے جب اپنے ہر معاملے کو رسول کے سپرد کر دیا جائے پھر جو فیصلہ وہ کر دے اس کو ہر طرح حق اور درست مانا جائے نیز اس فیصلے پر اس طرح بخوشی راضی رہا جائے کہ اپنے خلاف ہونے کی صورت میں دل کے اندر بھی کوئی تنگی تک محسوس نہ ہو۔

اب امامِ وقت یا مرکزِ ملت کی اطاعت کو بعینہ رسول کی اطاعت قرار دینے والے ذرا سوچیں کیا مرکزِ ملت کی اطاعت بھی اسی درجے کی ہوگی کہ اس سے اتفاق نہ رکھنے والا ایمان کے دائرے سے خارج سمجھا جائے گا؟ کیا مرکزِ ملت کی ایسی اطاعت ممکن بھی ہے کہ اس کے ہر فیصلے کو حق اور درست مانا جائے اور اپنے خلاف دئے گئے کسی فیصلے پر دل میں ناگواری تک کا احساس نہ ہو؟

(۳) اطاعتِ رسول کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ رسول کا کیا ہوا ہر فیصلہ ناطق

ہوتا ہے اس کے فیصلے کے سامنے کسی مومن کو کوئی اختیار ہوتا نہیں رہتا اس کے فیصلے سے انکار کرنے والا کھلی گمراہی کا مرد قرار پاتا ہے اطاعتِ رسول کی اس خصوصیت کے لیے سورہ احزاب کی چھتیسویں آیت ملاحظہ کیجئے :

<p>اور کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کریں تو پھر ان کو اپنے (اس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔</p>	<p>وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ أَنَّا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا (الاحزاب : ۳۶)</p>
--	--

ظاہر ہے مرکزِ ملت کے فیصلے کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی کہ اس کے بعد کسی کو کوئی اختیار ہی باقی نہ رہے۔ نہ مرکزِ ملت کے فیصلے سے انکار کرنے والے کو گمراہ کہا جاسکتا ہے اس لیے کہ گمراہی یا ہدایت کا دار و مدار وحی الہی کے رد و قبول پر ہے اور مرکزِ ملت وحی الہی کی رہنمائی سے محروم ہے۔

(۴) اطاعتِ رسول کی ایک خصوصیت قرآن کریم ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ رسول کے کیے ہوئے فیصلے کی کہیں کوئی اپیل نہیں رسول جو حکم بھی دے دے اس کو سنتے ہی سربلیم خم کر دینا ضروری ہے۔ ارشادِ ربانی ہے :

<p>ایمان والوں کا قول تو یہ ہے جب وہ بلائے جلتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف کہ (رسول) ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا تو ایسے ہی لوگ تو فلاح یاب ہیں۔</p>	<p>إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ - (النور : ۵)</p>
---	---

اس آیت میں تو سمع و طاعت کا اثباتی پہلو بیان کیا گیا ہے کہ حکمِ رسول کے معاملے میں جو لوگ سمع و طاعت کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ فلاح یاب ہیں اس کے منہج پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ اطاعتِ رسول کا اقرار کر کے اس سے سربلیم خم جاتے ہیں

وہ مومن ہی نہیں ہیں۔ سورہ نور ہی کی آیت ہے :

وَلَيَقُولُنَّ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ
وَإِطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فِئْتًا مِنْهُمْ
مَنْ بَعْدَ ذَلِكَ دَعَاؤُكَ
بِالْمُؤْمِنِينَ (النور : ۷۴)

اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر
ایمان لے آئے اور ان کا حکم مانا پھر
ان میں کا ایک گروہ اس کے بعد مرتد بن کر
جاتا ہے اور یہ لوگ ہرگز ایمان والے نہیں

جمع و طاعت کے اثباتی اور منفی دونوں پہلوؤں کو یکجا کر کے دیکھئے معلوم ہوتا ہے حکم
رسول پر اطلاع پانے کے بعد مومن کے لیے اور کوئی راستہ نہیں سوائے اس کے کہ
سیرا طاعت جھکا دے رسول سے اوپر کوئی ہستی ہی نہیں کہ اس کے سامنے لے مل کا سوال
پیدا ہو خود رسول کے سامنے بھی چون و چرا کی گنجائش نہیں بس حکم رسو نے رد و رداً
بجائائے ایمان کا تقاضا ہی ہے۔

اطاعت رسول کی یہ خصوصیت بھی کسی طرح مرکز ملت پر صادق نہیں آتی تاہم
اسلام گواہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے کسی جانشین یعنی منکرین حدیث
کی اصطلاح میں کسی مرکز ملت کی اطاعت کو اس کا مستحق نہیں سمجھا گیا کہ اس کے حکم کو
ہر قسم کی تنقید سے بالاتر تصور کیا جائے حضرت عمر فاروقؓ جیسے رعب و دبہ کے حامل
خلیفہ کے احکام کو ایک عام آدمی تنقید کا نشانہ بنالیتا تھا اور جبت مک قرآن و حدیث کی سند
کے ساتھ اس کو مطمئن نہ کر دیا جاتا وہ تعمیل حکم سے صاف انکار کر دیتا تھا کوئی ایک نظیر
بھی ایسی نہیں دی جاسکتی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ کسی بھی جانشین رسول نے یا دوسرے
لفظوں میں کسی بھی مرکز ملت نے یہ کہا ہو کہ ہمارے احکام کے سامنے سمج و طاعت کا لایا
ہی مظاہرہ کرو جیسا رسول اللہ کے سامنے لازم تھا کیونکہ مرکز ملت کی اطاعت اطاعت
رسول کے قائم مقام ہے۔

۵، اطاعت رسول کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک رسول کی

اطاعت بعینہ اللہ کی اطاعت ہے :

من يطع الرسول فقد اطاع الله (النساء - ۸۰) | جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

گویا اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت دو جدا جدا حیثیتوں کی حامل نہیں ہیں بلکہ فی الحقیقت ایک ہی ہیں رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی اطاعت دراصل اللہ ہی کی ہوتی ہے اس لیے کہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہی کچھ کہتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے۔

اس کے بالعکس مرکز ملت صاحب وحی نہیں ہوتا اس پر اللہ کی وحی نازل نہیں ہوتی وہ جو کچھ کہتا ہے اور جو فیصلہ دیتا ہے اپنی سمجھ بوجھ کے بھروسے پر دیتا ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے منکرین حدیث کو بھی انکار نہیں تو پھر ذرا بتلائیے اس خصوصیت کی موجودگی میں مرکز ملت کی اطاعت کو کس طرح اطاعت رسول کے قائم مقام قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۶) اطاعت رسول کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں فیضی طور پر اللہ کی محبت حاصل ہوتی ہے نیز وہ گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بنتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (آل عمران ۳۱)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

کیا مرکز ملت کی اطاعت کے بارے میں بھی یہ ضمانت دی جاسکتی ہے کہ وہ اللہ کی محبت حاصل کرنے کا ایک سبب اور گناہوں کی مغفرت کا ایک ذریعہ ہے ظاہر ہے ایسی کوئی ضمانت قطعاً نہیں دی جاسکتی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرکز ملت کی اطاعت کو اللہ کے رسول کی اطاعت کے مرادف قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(۷) اطاعت رسول کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ہدایت منحصر ہے جو شخص اللہ کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ ہدایت پالیتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَرَانِ تَطِيعُوا قَهْتَدُوا۔ | اگر تم اس (رسول) کی اطاعت کرو گے تو
(النور : ۵۴) | ہدایت پاؤ گے۔

کیا منکر بن حدیث کے مرکز ملت کو بھی یہ مقام دیا جاسکتا ہے کہ جو اس کی
اطاعت کرے بس وہی ہدایت یافتہ سمجھا جائے اور اس کی اطاعت سے انکار کرنے والا
گمراہ ٹھہرے۔ یہی نہیں بلکہ جو عمل اس نے اس انکار سے پہلے کیے ہوں وہ بھی ضائع ہو
جائیں کیونکہ

(۸) قرآن ہی میں اطاعت رسول کی ایک یہ خصوصیت بھی بتائی گئی ہے کہ اس
سے انکار کرنے کا نتیجہ ضبط اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے چنانچہ ارشاد رہانی ہے :
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ
وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تَبْطُلُوا
أَعْمَالَكُمْ۔ (محمد : ۳۳) | اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور
اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو
راہِ کمال مت کرو۔

(۹) تعین حکم سے انکار کی صہدہ ہی میں ضبط اعمال نہیں ہوتا اطاعت رسول کو تو
قرآن نے وہ مقام دیا ہے کہ رسول کے سامنے اپنی آواز سے بولنے والا تک اپنے اعمال
گنوا بیٹھا ہے۔ سورہ حجرات کی یہ آیت اس پر شاہد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا
أصواتكم فوق صوتِ النَّبِيِّ وَلَا
تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ
لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ
لَا تَشْعُرُونَ (حجرات : ۲) | اے ایمان والو اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز
سے بلند نہ کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر
بولو کہ جیسے آپس میں کھل کر بولا کرتے ہو کہ
کیسے تمہارے اعمال پر باد نہ ہو جائیں اور
تمہیں خبر تک نہ ہو۔

غور کرنے کی بات ہے کسی مرکز ملت کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا
کہ اس کے سامنے محض اپنی آواز سے بولن یا کھل کر حفظ مراتب کا خیال کیے بغیر لا پرواہی
سے کلام کرنا ضبط اعمال کا موجب بن سکتا ہے۔

(۱۰) اسی طرح اطاعت رسول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اندر

معمولی معمولی اطاعت کو بھی سمجھو ہوئے ہے حتیٰ کہ کسی خاص مجلس سے باہر نکلنا ہو تو اس کے لیے بھی رسول کی اجازت لینا ضروری ہے اس اجازت کو قرآن کمال ایمان کا معیار قرار دیتا ہے۔ سورہ نور میں ہے :

<p>ان الذین یستأذنونک اولمک الذین یؤمنون باللہ ورسولہ (النور : ۶۲)</p>	<p>جو لوگ آپ سے اجازت لے کر جلتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔</p>
--	---

یہ دس خصوصیات ہم نے گنائی ہیں جو قرآن کریم سے صرف اطاعت رسول کے لیے ثابت ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی ایسی نہیں جو امام وقت یا مرکز ملت پر صادق آسکے اسی صورت میں ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ اللہ و رسول کی اطاعت سے امام کی اطاعت مراد لینا کسان تک درست ہے۔

ان خصوصیات میں ایک ایک کی اطاعت رسول سے امام وقت یا مرکز ملت کی اطاعت مراد لینے کے لازمی نتائج

کو بھی اگر امام کے لیے درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کے نتیجے میں ہمیں لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ امام اپنی اطاعت کے لحاظ سے نبی کے مقام پر فائز ہے البتہ اللہ کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دے کر منکرین حدیث کی بنوت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہتے ہیں؟

اس کے علاوہ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی بہت اہم ہے۔ منکرین حدیث نے

اللہ و رسول سے امام وقت یا مرکز ملت تو مراد لے لیا مگر یہ نہیں بتلایا کہ اس سے

امام صالح مراد ہے یا امام فاسق اگر اس سے مطلق امام مراد ہے خواہ وہ صالح ہو یا فاسق تو براہ کرم یہ بھی بتلایا جائے کہ کیا امام فاسق کی اطاعت کو بھی ٹھیک ٹھیک اللہ و رسول کی اطاعت سمجھا جائے گا اور اگر اس سے مراد خاص امام صالح ہے تو پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ

خلافت راشدہ کے بعد تیرہ سو سال تک اللہ و رسول کی اطاعت کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہی اور اتنے طویل عرصے تک اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا نظام بالیکہ معطل پورا رہا کیونکہ خلفائے راشدین کے بعد کو کوئی شاذ و نادر ہی امام صالح ہوا ہے۔ ”اللہ و رسول“ سے مرکز ملت مراد لے لینے کے بعد اس مشکل کا پیش آنا لازمی ہے اس کا منکرین حدیث کے پاس کیا حل ہے۔ سوچنے کی بات ہے قرآن نے بے شمار مقامات پر بصراحت اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہدایت اور نجات کا راستہ صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں منحصر ہے۔ اب اگر ہر جگہ اللہ و رسول کی اطاعت سے مراد امام وقت یا مرکز ملت کی اطاعت ہو تو یقیناً گزشتہ تیرہ سو سالوں میں اماموں کی اکثریت ایسی ہی ہے جن کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت نہیں کیا جاسکتا تو کیا یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس پورے عرصے میں مسلمانوں کے لیے راہ نجات و ہدایت مسدود رہی کیا یہ مان لیا جائے کہ اس تمام دور میں مسلمانوں کے پاس اپنے باہمی نزاعات رفع کرنے کی کوئی معصومت ہی موجود نہیں رہی کیا یہ تصور کر لیا جائے کہ دین اسلام ایک ایسا آئین ہے جس پر عمل کرنا دنیا کی طاقت سے باہر ہے اگر آپ اللہ و رسولؐ کی اطاعت سے مرکز ملت کی اطاعت مراد لیتے ہیں تو آپ کو یہ سب کچھ جو قطعاً خلافت عقل نقل اور سراسر خلافت واقعہ ہے ماننا پڑے گا۔

کبھی منکرین حدیث نے اس پر بھی غور کیا کہ وہ تمام خصائص جو قرآن سے اطاعت رسول کے لیے ثابت ہوتے ہیں اگر وہ امام وقت یا مرکز ملت کی ذات میں مجتمع ہو گئے تو عملی طور پر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا وہ تمام آیات جو اس ضمن میں ہم نے ابھی پیش کی ہیں ذرا ان میں غور کیجئے مرکز ملت کی ذات میں یہ تمام خصائص مجتمع ہو جانے کی صورت میں ایسی بدترین آمریت قائم ہوگی کہ فرعون کی فرعونیت اور ہٹلر و موسولینی کی بدنام زمانہ ڈکٹیٹر شپ بھی اس کے سامنے ماند پڑ جائے گی ذرا خیال تو کیجئے جب حال یہ ہو کہ مرکز ملت مسلمانوں کا دین و ایمان قرار پائے اس کے ہر حکم پر سر تسلیم کرنے والا تو مسلمان رہے مگر جو بھی کسی محلے میں اس سے اتفاق نہ کرے وہ ایمان کے دائرے سے خارج سمجھا جائے اس کو راضی کرنا ہر مسلمان کے لیے شرط ایمان قرار پائے اور جو شخص بھی اس کی اطاعت سے ذرا منہ موڑے اس کی نماز، اس کا روزہ، اس کی زکوٰۃ غرض اس کی ساری نیکیاں برباد ہو جائیں، اس کے سامنے آواز بلند

کرنے والا حتیٰ کہ اس کی مرضی کے بغیر اپنی جگہ سے ادھر ادھر ہو جانے والا تک اللہ کا مجرم گردانا جائے تو ایسا مرکز ملت کسی قدر زبردست آمر اور ڈکٹیٹر ثابت ہوگا اس کی آمریت کو تاریخ انسانی کی کسی آمریت سے بھلا کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

پھر کبھی منکرین حدیث نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ نبوا میہ کے بعد سے آج تک سارا عالم اسلام کبھی ایک دن کے یہ بھی ایک مرکز ملت کے تحت جمع نہیں ہوا اس زمانے میں بھی مسلمانوں کی حکومتیں متعدد ہیں جو مختلف سربراہوں کے تحت اپنا نظام حکومت چلا رہی ہیں تو اب کیا اندونیشیا، ملایا، ایران، ترکی، پاکستان، عرب، مصر، لیبیا، اردن، شام، عراق، تونس اور مراکش وغیرہ میں سے ہر ایک کے ”اللہ و رسول“ الگ الگ ہوں گے؟ یا کسی ایک ”مک“ کے ”اللہ و رسول“ کیا زبردستی اپنی آمریت دوسرے ملکوں کے ”اللہ و رسول“ پر مسلط کریں گے؟ یا کیا اسلام کا سارا نظام اس وقت تک پورا کا پورا موحل رہے گا جب تک پورا عالم اسلام متفق ہو کر ایک ”اللہ و رسول“ کا انتخاب نہ کرے؟ کاش منکرین حدیث نے ان عواقب پر غور کیا ہوتا جو ”اللہ و رسول“ سے امام وقت یا مرکز ملت مراد لینے کی صورت میں لازمی طور پر پیش آتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر انہوں نے صرف ان عواقب ہی پر غور کر لیا ہوتا تو منصب رسالت اور مرکز ملت کے تصور کو یوں گڈ گڈ کر کے دین اسلام کا اس طرح حلیہ نہ بگاڑتے :

پہلے بنیاد اعتراضات اور ان کا تجزیہ

اب تک ہماری گفتگو کا محور زیادہ تر وہ اعتراضات رہے ہیں جن کو منکرین حدیث اپنی دانست میں علمی مسائل کا رنگ دے کر پیش کرتے ہیں اور جن سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ احادیث نبوی کی عدم حجیت اگر ثابت نہ ہو سکے تو کم از کم ان کی حجیت مشکوک ضرور ہو جائے۔ لیکن جب علمی بساط پر ان کی یہ کوششیں کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تو پھر وہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں پھر وہ سارا زور اس پر صرف کرتا شروع کر دیتے ہیں کہ کسی طرح عام سادہ لوح مسلمانوں کی نظریں احادیث کے موجودہ ذخیرے کو بسوخت اور ناقابل اعتقاد ثابت کر دیا جائے۔ اسی ضمن میں جتنے اعتراضات ان کی طرف سے کیے جاتے ہیں وہ اگرچہ اس قابل تو نہیں کہ انہیں نونی وزن دیا جائے لیکن چونکہ زیر نظر تحریر سے ہمارا مقصد ہی منکرین حدیث کی ان شاطرانہ چالوں کو آشکارا کرنا ہے جو وہ ناواقف حال عام مسلمانوں کے اذہان کو مسموم کرنے کے لیے چلتے ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کی بھی اصل حقیقت واضح کر دی جائے تاکہ وہ لوگ جو بے چارے دین سے بوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر منکرین حدیث کی چالوں کو سمجھ نہیں پاتے ان کے فریب کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔

بے بنیاد اعتراضات | اس سلسلے میں ہم اپنی گفتگو صرف ان اعتراضات کے تجزیے تک محدود رکھیں گے جن کو منکرین حدیث کے یہاں نمایاں

حیثیت حاصل ہے۔ ایسے اعتراضات مختصراً حسب ذیل ہیں :

- (۱) احادیث نبوی کا موجودہ ذخیرہ ناقابل اعتبار ہے اس لیے کہ اس ذخیرے میں موضوع احادیث بہت کثرت سے شامل ہیں اور صحیح و غیر صحیح اس طرح مخلوط ہیں کہ ان میں امتیاز دشوار ہے۔
- جھوٹی احادیث کا سلسلہ عہد رسالت ہی میں شروع ہو گیا تھا پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا جعلی اور جھوٹی حدیثوں کا انبار لگتا چلا گیا۔ موضوع احادیث کی کثرت کا اندازہ اس

ہات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام بخاری کے زمانے میں جو چھ لاکھ حدیثیں رائج تھیں جن میں سے امام صاحب نے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔
(۲) بعض احادیث خلاف عقل و درایت میں لیکن اس کے باوجود محدثین کے یہاں انہیں صحت کا درجہ حاصل ہے۔

(۳) بعض صحیح احادیث عربی یا مضامین پر مشتمل ہیں۔
(۴) بعض صحیح احادیث علم اور تجربے کے حیا پر پوری نہیں اترتیں۔
(۵) اکثر احادیث باہم متعارض ہیں اور متعارض اشیاء ساقط الا اعتبار ہوتی ہیں لہذا احادیث بھی تعارض کی وجہ سے ساقط الا اعتبار ہوتیں۔
(۶) اکثر احادیث کی روایت بالمعنی ہے یعنی راوی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی محفوظ نہیں تو مفہوم کے بارے میں کیسے یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ محفوظ ہے۔

(۷) سب زیادہ احادیث حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہیں اور ابو ہریرہ کا حال یہ ہے کہ خود صحابہ کے درمیان ان کو ناقابل اعتماد تصور کیا جاتا تھا۔

(۸) امام ابو حنیفہ نے مسائل فقہی کے استنباط کے لیے صرف ۷۰ یا ۸۰ حدیثوں پر اعتماد کیا ہے ورنہ جتنے احکام و مسائل کا بھی انہوں نے استنباط کیا ہے ان سب کی بنیاد قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی ہے اگر امام ابو حنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تعبیر اس وقت کے حالات کی روشنی میں کریں تو بعد میں آنے والوں کو یہ حق کیوں نہیں کہ وہ قرآن کی تعبیر اپنے وقت کے حالات کو مدنظر رکھ کر حدیث کی مدد کے بغیر کر سکیں۔

یہ ہے خلاصہ ان اعتراضات کا جو حدیث کی وقعت کو کم کرنے اور حدیث پر عام مسلمانوں کا اعتماد مجرد کرنے کی خاطر منکرین حدیث کی جانب سے بار بار مختلف انداز بدل بدلی کر بڑے شد و مد سے اُجھالے جاتے ہیں۔ اب ہم ایک ایک کر کے ان تمام اعتراضات کا بے بنیاد ہونا واضح کرتے ہیں۔

۱۔ موضوع احادیث کی موجودگی سے غلط استدلال

منکرین حدیث کا پہلا اعتراض وضع حدیث سے متعلق ہے ان کا کہنا ہے کہ چونکہ موضوع احادیث بہت کثرت سے ہیں اس لیے

احادیث کا سارا ذخیرہ ناقابل اعتماد ہو گیا ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ موضوع احادیث کثیر تعداد میں موجود ہیں مگر منکرین حدیث کی یہ منطق کسی طرح سمجھ میں آنے والی نہیں کہ ان کی موجودگی احادیث کے تمام ذخیرے کو ساقط الاعتبار بنا دیتی ہے یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ دنیا میں جھوٹ کی موجودگی پسح کو ناقابل اعتبار بنادینے کی موجب ہے۔ کیا کسی معاشرے میں جھوٹوں کا وجود اس معاشرے کے سچے لوگوں کو بھی جھوٹا بنا دیتا ہے۔ دنیا میں کونسا ملک یا کونسا شہر ایسا ہے جہاں جھوٹے افراد نہیں ملتے تو کیا ان جھوٹوں کی وجہ سے یہ حکم لگا دینا صحیح ہے کہ اس ملک یا اس شہر کے تمام باشندے جھوٹے ہیں۔ ہر زمانے میں پسح کے ساتھ ساتھ جھوٹ کا سلسلہ برابر لگا چلا آ رہا ہے مگر آج تک جھوٹ کی وجہ سے پسح کو کسی نے نہیں چھوڑا۔ منکرین حدیث کی یہ نرالی منطق ہے کہ چونکہ جھوٹی احادیث کا وجود پایا جاتا ہے اس لیے سچی اور صحیح احادیث پر بھی اعتماد نہ کیا جائے۔ بعض احادیث کے موضوع اور مبنی بر کذب ہوتے سے یہ کہاں لازم آیا کہ کل ذخیرہ حدیث موضوع اور ناقابل اعتبار بن گیا۔ یہ بعض کا حکم کل پر لگانا کونسا اصول ہے؟

در اصل منکرین حدیث کی اس منطق کی بنیاد اس غلط مفروضے پر ہے کہ احادیث کے فیخروں میں صحیح و غیر صحیح احادیث باہم اس طرح خلط ملط ہیں کہ ان میں امتیاز دشوار ہے۔ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے حقیقت یہ ہے کہ جس وقت سے جعلی اور موضوع احادیث کا سلسلہ شروع ہوا اسی وقت سے محدثین اور ائمہ مجتہدین نے اپنی تمام کوششیں اس بات پر مرکوز رکھیں کہ موضوعات کا یہ ذخیرہ کس راہ سے بھی احادیث کے معتبر اور قابل اعتماد ذخیروں میں نہوذ نہ کر پائے۔ حضرات محدثین نے صحیح اور غیر صحیح کو ایک دوسرے سے ہمیز کرنے کے لیے باقاعدہ قواعد و ضوابط بنائے، جھوٹے اور سچے راویوں کی پہچان کے لیے علم اسماء الرجال ایجاد کیا، کھرے کھوٹے میں تمیز کے لیے علم جرح و تعدیل مدون کیا

پھر ایک ایک حدیث کو جانچا اور ایک ایک راوی کو پرکھا موضوعات کو الگ کر دیا اور معتبرات کو علیحدہ نکال لیا۔ ہر روایت کی سند متین کی اور ہر راوی کا نام پتہ اور حال سب کچھ منضبط کر دیا۔

حضرات محدثین نے حدیث کی صحت اور تنقید کا مجاہد بھی بتلایا اور موضوعات پر باقاعدہ کتابیں بھی لکھیں انہوں نے ایک ایک واضح حدیث کا پتہ لگا کر اس کا نام رجال کی کتابوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیا ایک ایک جھوٹی اور موضوع حدیث کا کھوج لگا کر احادیث موضوعہ کے مجموعے مرتب کر دئے جن میں خوب واضح طور پر یہ بتلایا کہ یہ حدیثیں جعلی ہیں ان کو کوئی اصل حدیث نہ سمجھے جس حدیث پر بھی کلام کیا اولاً اس کی سند بتلائی پھر اس کے راویوں کے صدق و کذب اور ان کے ثقہ و غیر ثقہ ہونے نیز ان کے حافظے کی قوت و ضعف پر بحث کر کے نتائج مرتب کیے پھر کسی حدیث پر کوئی حکم لگایا بے دلیل کوئی حکم نہیں لگایا اگر کسی حدیث کے موضوع اور غیر موضوع ہونے میں علمائے حدیث کا اختلاف ہوا تو وہ تمام اختلاف بھی من و عن بیان کر دیا تاکہ ہر کوئی بخود دیکھ لے پرکھ لے اور کھرا کھوٹا الگ کر لے۔ اس قدر تنقیحات کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صحیح و غیر صحیح احادیث آپس میں غلط ملط ہیں تو اس پر اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ روزِ روشن میں سورج کے وجود سے انکاری ہے۔

منکرین حدیث نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو بھی عام مصلحین عالم کے اقوال کی طرح سمجھ لیا ہے کہ جس نے چاہا ان کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہہ دی اور لوگوں نے محض ان کے نام کی نسبت کے رعب میں آکر اسے قبول کر لیا کسی نے ان کی صحت و عدم صحت کی تحقیق کی ضرورت ہی نہ سمجھی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عام مصلحین عالم کے اقوال کی طرح نہ تھے کہ ان کا تعلق محض چند مبنی براخلاق نصائح سے ہو یا وہ فلسفہ حیات انسانی کے چند علمی نکات تک محدود ہوں جن کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ ان کے قائل کی طرف نسبت اگر درست نہ بھی ہو تو نفسِ مضمون پر اور اس سے مستنبط نتائج میں کئی فرق نہیں پڑتا اور

اسی لیے ان کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی زحمت بھی کوئی نہیں اٹھاتا۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا معاملہ بالکل جدا ہے وہاں تو آپ کے ایک ایک ارشاد پر ایک ایک اسلامی قانون کی بنیاد رکھی جا رہی تھی آپ کے ایک ایک فعل کو نظیر بنا کر شریعت اسلامی کی عمارت کی تعمیر میں ایک ایک اینٹ نسب کی جا رہی تھی۔ آپ کی سنت کو دین اسلام کے بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کی طرف کسی معمول سے معمولی بات کی غلط نسبت اسلامی قوانین کے پورے ڈھلچنے پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ بھلا ایسی صورت میں یہ خیال کرنا کسی طرح بھی درست مانا جا سکتا ہے کہ واضعین حدیث جھوٹی احادیث وضع کرتے رہے اور محدثین بغیر کسی تحقیق کے انہیں اپنے معمول میں شامل کرتے چلے گئے۔

محدثین نے قبول حدیث کے لیے جو اصول ابتدا ہی سے بالاجماع مقرر کر دیے تھے ان کی موجودگی میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی جھوٹ نے مجموعہ ہائے احادیث میں اس طرح راہ ہالی ہو کہ محدثین اس کی نشان دہی کرنے سے تاصر رہ گئے ہوں۔

روایان حدیث پر نقد و حرج فن حدیث کا ایک عظیم باب ہے

نقد رواۃ حدیث

اس کے ذریعے علمائے حدیث نے احادیث صحیحہ و سقیمہ کو

باہم ممیز و ممتاز کرنے کا ایسا عظیم الشان کام انجام دیا کہ تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے تاصر ہے محدثین نے اس سلسلے میں ہمد و سعی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا انہوں نے تمام راویان حدیث کو جانچا پرکھا ان کی حیات ان کی سیرت حتیٰ کہ انکی عادات تک کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے ان کے تمام ظاہری و باطنی امور کا بخوبی جائزہ لیا اس راہ میں انہیں نہ کسی کی ملامت کا خوف دامنیگر ہوا نہ کسی لالچ نے ان کا راستہ روکا۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیے جانے والے جھوٹ کے قبول کرنے کا تو خیر سوال ہی کیا محدثین نے تو یہاں تک کیا کہ جس راوی کو کسی ایک حدیث میں انہوں نے دروغ گوئی کا مرکب پایا اس راوی کی باقی احادیث کو بھی انہوں نے مردود قرار دے دیا۔ یہی نہیں محدثین نے اس شخص کی حدیث بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کا حدیث

رسول کی روایت میں تو جھوٹ ثابت نہ ہو لیکن دیگر باتوں میں وہ جھوٹ بولنے کا عادی ہو بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر محدثین نے تو احتیاط کی انتہا کر دی اس سے زیادہ احتیاط عقل تصور کرنے سے قاصر ہے انہوں نے ایک اصول کی حیثیت سے یہ طے کر دیا کہ جس شخص نے اپنی پوری زندگی میں ایک مرتبہ بھی دروغ گوئی کا ارتکاب کیا ہو اس کی حدیث قبول نہ کی جائے بھلا کوئی حد ہے احتیاط کی! فلسفہ تاریخ کا ایک مسئلہ مسئلہ ہے کہ جھوٹے کی ہر بات کا جھوٹا ہونا ضروری نہیں عربی میں بھی ایک مقولہ ہے الکذب قلد یصدق (جھوٹا بھی کبھی سچ بول دیتا ہے) مگر محدثین کی احتیاط کا عالم ملاحظہ کیجئے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ تاقعدہ مقرر کر دیا کہ جس شخص کا مدت العمر میں ایک مرتبہ بھی جھوٹ ثابت ہو جائے اس کی کوئی روایت معتبر نہیں۔

اس بات سے بچنے کے لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی غلط بات کہیں حدیث کا درجہ حاصل نہ کر لے محدثین نے یہاں تک اہتمام کیا کہ اس روای کی روایت بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کے بارے میں یہ گمان ہی پیدا ہو گیا کہ شاید بھوٹے سے یا کسی غلطی کی بنا پر یا کم نہی و بد فہمی کے نتیجے میں وہ روایت کی صحت کو برقرار نہ رکھ سکا ہو۔ چنانچہ بالا جماع سلسلہ سند کے ہر راوی کے لیے انہوں نے یہ اصول قرار دے دیا کہ حدیث اس راوی کی قبول کی جائیگی جو :-

(۱) صحیح الفہم ہو، غبی بد عقل اور بد فہم نہ ہو یعنی جو حدیث کے سمجھنے میں غلطی نہ کرتا ہو۔

(۲) صحیح الحافظ ہو یعنی جس پر نسیان اور دم کا غلبہ نہ ہو۔

(۳) محتاط ہو روایت میں سہل انکاری سے کام نہ لیتا ہو۔

اور تو اور محدثین نے اس راوی کی روایت کو بھی قابل قبول نہیں سمجھا جو فاسق و فاجر اور بدکار ہو حالانکہ ہر بدکردار شخص کا جھوٹا ہونا ضروری نہیں لیکن چونکہ بدکردار شخص کے بارے میں احتمال موجود ہے کہ فسق و فجور کی بنا پر اس کی نگاہ میں حدیث رسول کی روایت میں احتیاط کی اہمیت جس قدر کہ لازم ہے نہ رہی ہو اس لیے اس کی روایت کو بھی معتبر نہیں جانا اور یہ شرط لگادی کہ روایت اس راوی کی قبول کی جائے جو ثقہ اور متقی

ہو نیز معروفت ہو مجہول نہ ہو یعنی اہل علم اور اہل تقویٰ اس کے نام، نسب، کردار اور اس کے علم، حفظ اور ثقاہت سے واقف ہوں اور ان کی نظر میں اس کی رفتار و گفتار اس کے حال احوال اور اس کا عام کردار قابل اعتراض نہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی محدثین نے روافض کی مرویات کو بھی مردود قرار دے دیا اس لیے کہ روافض وضع حدیث میں پیش پیش تھے بلکہ پسچ یہ ہے کہ اولین واضح ہی یہ لوگ تھے انہوں نے حضرت علی اور اہل بیت کے فضائل و مناقب پر مشتمل بکثرت حدیثیں وضع کی تھیں چنانچہ محدثین نے یہ اصول بنا دیا کہ روافض کی روایت قبول نہ کی جائے اگرچہ علمائے حدیث نے بعض ایسے شیعہ راویوں کی روایات قبول کی ہیں جو صدق و امانت میں معروفت تھے اور ثقیہ کے تائل نہ تھے لیکن محدثین کسی شیعہ راوی کی روایت اس صورت میں بالکل قبول نہیں کرتے جب وہ اپنے مخصوص مسلک کی تائید و حمایت میں کوئی حدیث روایت کر رہا ہو یا اس کا تعلق کسی ایسے گروہ سے ہو جو جھوٹ کو حلال سمجھتا ہے۔ یہی طرز عمل محدثین کا دیگر مبتدعین کے بارے میں بھی ہے کسی ایسے بدعتی کی روایت جو اپنے مسلک کا داعی ہو ان کے نزدیک قابل قبول نہیں۔

وضع حدیث کے اسباب و جوہ میں سے ایک سبب چونکہ زندہ بھی تھا، زندہ سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو ایک دین و مذہب کے اعتبار سے بہ نظر گراہت و حقارت دیکھا جائے۔ گروہ زندہ نے دین حنیف میں بگاڑ پیدا کرنے، عقلا اور مذہب طبقے کی نگاہ میں اس کی وقعت کو کم کرتے اور عوام کے عقائد کو انتہائی پست اور مضحکہ خیز سطح پر لانے کے لیے چونکہ بہت سی حدیثیں وضع کر ڈالی تھیں اس لیے محدثین کو اگر کسی راوی کے بارے میں یہ تحقیق ہو گیا کہ اس کا تعلق گروہ زندہ سے ہے تو اس کی تمام مرویات کو انہوں نے مردود قرار دے دیا۔

غرض ایک طرف اگر واضعین حدیث تھے تو دوسری طرف محدثین کی مقرر کردہ نقد و رداۃ و رجال کی کسوٹی تھی جس نے کھرے اور کھوٹے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں ایسا محیر العقول کارنامہ انجام دیا کہ علم سیر و سوانح کی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔

تلفیح متن حدیث | پھر اسی پر اکتفا نہیں راویوں کی جانچ پڑتال کے ساتھ ساتھ محدثین نے متن حدیث میں بھی ایسے علامات کی نشان دہی کر دی

جن سے صاف معلوم ہو جائے کہ کونسی حدیث موضوع ہے اور کونسی نہیں۔ بتانچہ اور زایل میں سے کوئی امر اگر کسی حدیث میں پایا جائے تو علمائے حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ موضوع ہے۔

(۱) جو حدیث قرآن کی عبارت النص کے خلاف ہو اور تاویل تاویل نہ ہو۔

(۲) جو حدیث کسی سنت منواترہ کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو۔

(۳) جو حدیث قرآن و سنت سے ماخوذ قوا عد عامہ کے صریحاً خلاف ہو

(۴) جو حدیث اجماع قطعی یعنی اجماع صحابہ و تابعین کے خلاف ہو اور کسی طرح اس کی

توجیہ و تاویل نہ کی جاسکتی ہو۔

(۵) جو حدیث عہد رسالت کے معروف تاریخ حقیقی کے خلاف ہو۔

(۶) جو حدیث کسی معمولی کام کے صلے میں مبالغہ آمیز اجر و ثواب کا پتہ دیتی ہو یا اس میں

معمولی کام کے ترکب ہونے پر شدید عذاب کی وعید کا ذکر ہو۔

(۷) جو حدیث کسی ایسے واقعے پر مشتمل ہو جو بہت سے لوگوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہو

اور اس بنا پر اس کا متقاضی ہو کہ بکثرت لوگ اس کو روایت کریں مگر باہیں ہم صرف

ایک ہی راوی اسے روایت کرے۔ یا اس واقعہ میں شریک ہونے والے اس

کے خلاف اس قدر کثرت سے روایت کریں کہ عقلاً ان کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا ممکن ہو۔

(۸) جو حدیث کسی ایسے مضمون پر مشتمل ہو جس کو عقل بدایتاً رد کرتی ہے لیکن اس میں ہر کہ

وہ کی عقل معیار نہیں بلکہ علماء و ماہرین فن حدیث اس کو خلاف عقل قرار دیں۔ محاذرا

عرب سے نادانف اور حدیث کے علوم سے بے بہرہ افراد کی رلے امی باب ہیں

قطعا کوئی وزن نہیں رکھتی۔

(۹) جو حدیث ایسے علوم متعارفہ کے مخالف ہو کہ جن کے اصول

مشاہدوں اور بے شمار تجربوں کے بعد قائم کیے گئے ہوں اور ان سے ہمیشہ ایک

ہی جیسے ایسے نتیجے برآمد ہوتے ہوں جن میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔

(۱۰) جو حدیث ایسے مضمون کی حامل ہو جس کا جاننا تمام مکلفین پر فرض ہو اور نہ جاننے کے لیے کوئی عذر بھی نہ ہو مگر بایں ہمہ اس کا زوایت کرنے والا سوائے اس کے اور کوئی نہ ہو۔

(۱۱) جو حدیث ایسے رکیک اور گھٹیا الفاظ پر مشتمل ہو جن کا صدور کسی عام فصیح و بلیغ شخص کی ذات سے متوقع نہ ہو چہ جائیکہ سید الفصحی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے ان کا صدور ہو البتہ یہ وہاں ہوتا ہے جہاں اس امر کی صراحت کی گئی ہو کہ یہ الفاظ آپؐ نے فرمائے ہیں۔

(۱۲) جو حدیث فساد معنی کی حامل ہو یعنی جس میں ایسا مضمون بیان کیا گیا ہو جو عقلی بدیہیات کیخلاف ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو مثلاً ایسی حدیث جو حکم و اخلاق کے قواعد عامہ کے منافی ہو یا ایسی حدیث جو شہرت و فساد کی موجب ہو۔

(۱۳) جو حدیث خود اپنے راوی کے اقرار کے بموجب موضوع ہو۔

اب منکرین حدیث بتلائیں کہ ان اساسی و اصولی قواعد و ضوابط کے بعد جو محدثین نے متن حدیث کی چھان پھٹک اور جانچ پڑتال کے لیے وضع کیے کیا کوئی امکان اس بات کا رہ جاتا ہے کہ صحیح و غیر صحیح احادیث باہم اس طرح خلط ملط ہو گئی ہوں کہ ان میں باہم امتیاز کرنا دشوار ہو۔ حق یہ ہے کہ نقد رواۃ و رجال کی ان کڑی شرائط کی موجودگی میں جن کا محقر سا خاکہ ہم ابھی اُوپر پیش کر آئے ہیں اور متن حدیث سے متعلق ان تذکرہ بالا تصریحات و تنقیحات کے ہوتے ہوئے موضوع احادیث کی کثرت جتنی موجود ہے اس سے دو گنی اور چار گنی بھی ہوتی تو کسی اندیشے اور خطرے کی بات نہ ہوتی۔

علاوہ ازیں اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ **خدا داد صلاحت** اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے محدثین کو ایک خاص

توفیق و فراست عطا فرمایا تھا جس کے ذریعے ان کو حدیث صحیح اور حدیث موضوع کا فرق بدیہی طور پر نظر آ جاتا تھا۔ حضرات محدثین حدیث کو سنتے ہی بغیر سند کے دیکھے ہوئے کچھ جلتے تھے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں چنانچہ انہوں نے اپنی اس خدا داد صلاحت سے

بھی تحقیق و تنقیح حدیث میں خوب خوب کام لیا بسا اوقات ایسا ہوتا کہ محدثین کسی حدیث کو سنتے ہی اس لیے رد کر دیتے کہ ان کی فنی مہارت و بصیرت اس کو قبول کرنے سے انکار ہی ہے۔ محدثین کے یہاں ہمیں اس قسم کے کلمات کی جو ہمتا ملتی ہے کہ ”اس حدیث پر تائید کی چھائی ہوئی ہے“ یا ”اس حدیث کو دل تسلیم نہیں کرتا“ یا ”اس حدیث کا متن تاریک ہے“ یا ”اس حدیث سے جی مطمئن نہیں“ وغیرہ کلام تو اس کا سبب ہی ہے کہ کلمات نبویہ کی دن رات مذاکرہ و مزاہلت کی وجہ سے کلام نبوی میں غیر نبی کے کلام کی آمیزش کو پہچان لینا ان حضرات کا مزاج بن کر رہ گیا تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں عام زندگی میں ہمیں اس کی مثالیں بہت مل جاتی ہیں۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھئے وہ شعر سنتے ہی بتا دیں گے کہ یہ کس استاد شاعر کا شعر ہے اگرچہ انہوں نے وہ شعر اس سے پہلے کبھی سنا بھی نہ ہو، اس پہچان کی آپ وجہ پوچھیں گے تو وہ یہی بتائیں گے کہ اس شعر پر فلاں استاد کا رنگ غالب ہے۔ کسی استاد شاعر کے کلام میں دوسرے کسی کلام کی آمیزش کر کے ذرا کسی ایک شخص کو سنا کر دیکھئے جو کم از کم سخن دانوں کی فہرست میں آتا ہو اور صاحب ذوق ہو وہ اس آمیزش کو فوراً پہچان لے گا۔ سبب اس کا بھی وہی ہے کہ اساتذہ کا کلام لگاتار پڑھتے پڑھتے ان کے کلام کا رنگ اس کے مزاج میں رچ بس گیا ہے۔ اسی قسم کا معاملہ فقہاء اور فتویٰ کا کام کرنے والوں کے ساتھ ہے کیونکہ دن رات ان کا واسطہ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے ہی رہتا ہے اس لیے وہ طرز کلام ہی سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے یا امام شافعی کا یا امام مالک سے کسی اور امام کا۔ یہ تو علمی جواہر پاروں کی بات ہے جو اپنے مُنہ سے خود بولتے محسوس ہوتے ہیں لوگ پتھر کے بے زبان جواہرات کو ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ کھرا اور اصلی کو سناؤ اور کھوٹا اور نقلی کو سنا! لہذا محدثین کے بارے میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ حدیث کو سنتے ہی بغیر سند دیکھے ہوئے پکار اُٹھتے تھے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ جس طرح شعرا کا کلام پہچاننے کے لیے سخن دان ہونا شرط ہے اور ائمہ کے اقوال میں باہم تمیز کے لیے فقیہ ہونا ضروری ہے یا جس طرح

جو ابرار کی پہچان صرف جوہری ہی کر سکتا ہے اسی طرح احادیث میں کھرا کھوٹا الگ کرنے کے لیے محدث ہونا شرط لازم ہے۔ ہر کس و ناکس اپنے اوپر قیاس کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس طرح ہمیں حدیث صحیح اور حدیث موضوع میں باہم کوئی فرق نظر نہیں آتا اسی طرح محدثین کے لیے بھی یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ موضوع حدیث کو سنتے ہی پہچان لیتے تھے۔ محدثین کرام کا تو معاملہ ہی جُدا ہے، ارشادات نبوی کی دن رات مذاکرت و مزاولت کے علاوہ نصرت الیہ بھی ان کے شامل حال تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کی حفاظت کا کام لینا تھا اس لیے ان کو اپنی موہبت خاصہ سے ایسا خاص فہم عطا فرمادیا تھا کہ وہ اس سے حق اور باطل، ہدایت و ضلالت اور جھوٹ اور سچ میں باسانی تمیز کر لیتے تھے۔ ان کے قلوب حدیث کے لیے آئینہ کام دیتے تھے جس میں ارشادات نبوی کے نور کا خود بخود انعکاس ہو جاتا تھا۔ حضرت ربیع بن خیثمہ تابعی فرمایا کرتے تھے :

<p>صحیح حدیث میں دن کی روشنی کی طرح ایک خاص قسم کی روشنی ہوتی ہے جو پہچانی جاتی ہے اور (موضوع حدیث میں) رات کی تاریکی کی طرح ایک خاص قسم کی تاریکی ہوتی ہے جو ناگہم غور ہو جاتی ہے۔</p>	<p>إِنَّ لِلْحَدِيثِ ضَوْءً كَضَوْءِ النَّهَارِ لَيُحَرِّفُ وَظِلْمَةً كَظِلْمَةِ اللَّيْلِ تَسْكُرُ (معرفة علوم الحديث، للحاكم وقواعد التحديث للشيخ ابو الحسن حنبل دمشقي ص ۱۳۸ مطبوع دمشق)۔</p>
---	--

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک خاص عظمت اور جلال ہوتا ہے جو کسی دوسرے کے کلام میں نہیں ہوتا یہ عظمت و جلال محدثین کے گوشت پوست میں بچ بس جاتا ہے جس کی بنا پر حدیث صحیح کے الفاظ بلا واسطہ ان کے دل پر جا کر لگتے ہیں۔ قواعد التحديث ہی میں شیخ ابوالحسن حنبلی دمشقی نے خود اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے فرماتے ہیں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب کوئی حدیث سنتے تو سنتے ہی بتلا دیتے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا موضوع بعد میں تحقیق کرتے تو پتہ لگتا کہ محدثین نے بھی ایسا ہی لکھا ہے ان بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں موضوع تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک خاص عظمت اور جلال ہوتا ہے جو دوسرے کے کلام میں نہیں ہوتا اور اسی طرح صحابہ کرام کا کلام دوسروں

کے کلام سے ممتاز ہوتا ہے۔ حافظ ابن قیم سے کسی نے سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ سند دیکھے بغیر حدیث موضوع کا علم ہو جائے انہوں نے جواب دیا سند کو دیکھے بغیر ہی شخص حدیث کو پہچان سکتا ہے کہ جس کے گوشت پوست میں حدیث سرایت کر چکی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات اور اوامر و نواہی اور آپ کے محبوبات و مرضیات ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے ہوں صرف ایسا ہی شخص حدیث کو سنتے ہی بغیر سند کے دیکھے ہوئے سمجھ جاتا ہے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں۔

فردن اولیٰ کے محدثین کی تو خیر بات ہی جُدا ہے ان کے تو گوشت پوست تک میں واقعی علم حدیث رچ بس گیا تھا آج بھی جو شخص بشرطیکہ عربی زبان پر اسے پورا عبور حاصل تھا حدیث کی اکثر کتابوں کا یا کم از کم صحیحین کا گہری نظر سے مطالعہ کرے گا وہ اس قابل ہو جائے گا کہ نبی کے کلام کو غیر نبی کے کلام سے الگ پہچان لے گا دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ایک خاص زبان اور اپنا ایک مخصوص طرز بیان ہے جو آپ کی تمام صحیح احادیث میں بالکل یکسانیت اور یک رنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ آپ کے کلام میں آپ کی شخصیت بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اس میں آپ کا بلند منصب مقام جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آپ کا اندازِ تکلم فقروں کی بناوٹ الفاظ کا انتخاب اور طرزِ بیان سب کچھ ایسی انفرادیت کا حامل ہے کہ کوئی دوسرا اس کی نقل کر ہی نہیں سکتا چنانچہ آپ کی احادیث سے گہرا شغف رکھنے والا صحیح حدیث کو سنتے ہی کہہ اُٹھے گا کہ یہ بات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوا کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا اسی طرح غیر صحیح حدیث کے بارے میں سند کو دیکھے بغیر فیصلہ دے دیگا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان نہیں ہے حتیٰ کہ صحیح احادیث میں روایت باللفظ اور روایت بالمعنی کا فرق اسے صاف محسوس ہو جائے گا کیونکہ جہاں راوی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے وہاں آپ کے مخصوص طرزِ بیان سے واقفیت رکھنے والا فوراً پہچان لے گا کہ یہ خیال اور بیان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہے لیکن زبان آپ کی نہیں ہے۔

ہر حال اول تو حدیث کی سندا و اس کے متن کی جانچ پرکھ کے لیے محدثین کے

مرتب کردہ قواعد و ضوابط اس پر مستزاد محدثین کا خدا واد نور فہم و فراست ان دونوں نے مل کر اس کا امکان ہی سرے سے باقی نہ رہنے دیا کہ احادیث میں کسی بھی طور سے صحیح و غیر صحیح اور معتبر و غیر معتبر کے درمیان کوئی اشتباہ التباس باقی رہ جائے۔

محدثین کی مساعی کے ثمرات | اللہ تعالیٰ محدثین کرام کی ارواح طیبہ کو ہزار ہا ہزار رحمتوں سے نوازے، یہ انہی کی بدولت ہے کہ ایک ایک واضح حدیث کا نام آج ہمیں معلوم ہے، کوئی حدیث ایسی نہیں جو موضوع ہو اور ہمارے علم میں آتے سے رہ گئی ہو ہم جانتے ہیں کہ سلیمان بن عمرو الغنی، وہیب العاص، حسین بن علوان، ابوالنخری، اسحق بن یحییٰ، ابوداؤد نخعی، ابولیسیر احمد بن محمد الفقیہ الموزنی، وہیب بن حفص، محمد بن سعید البوسجید مدائنی اور محمد بن قاسم الطالقانی یہ سب مشہور و اضعین حدیث تھے، ہم احمد جرباری، ابن عکاشہ کرمانی اور ابن تیم فریابی جیسے وضاعین حدیث کے ناموں سے بھی بخوبی واقف ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عباسی دور کے زنادقہ میں سے عبدالکریم بن ابی العوام، بیان بن سحمان ہمدانی اور محمد بن سعید مصلوب مشہور وضاع تھے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابن یحییٰ مدنی، واقدی، مقاتل بن سلیمان خراسانی، محمد بن مجہد شامی، ترمذی و تریب کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے اور اضعین حدیث کے بارے میں ہمارا یہ سارا علم رہیں منت ہے محدثین کرام کی اس سعی و جہد کا جو انہوں نے صحیح و غیر صحیح احادیث کو باہم ملنس ہونے سے بچانے کے لیے انجام دیں۔ محدثین کرام نے صرف وضاعین و مدلسین کے ناموں کا ہی انکشاف کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ہمیں ان تمام موضوعات کی بھی اطلاع دے گئے جو ان لوگوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ تھیں چنانچہ حدیث کا کوئی طالب علم ایسا نہ ہوگا جو موضوع احادیث کے مشہور مجموعوں الموضوعات لابن جوزی،

۱۔ تجدید السلیق - ۲۔ ابن خلکان -

۳۔ السنۃ و مکاتبتانی التشریح الاسلامی از ڈاکٹر مطلقہ باعی -

۴۔ فتح المغیث -

موضوعات ابن عبد البر، موضوعات علی تلمیسی اور موضوعات شوکانی کے ناموں پر واقف نہ ہو۔ محدثین کرام نے اس کے علاوہ ان کتابوں کی نشان دہی بھی کر دی۔ نو موضوعات سے پُر ہیں مثلاً 'مندانس بصری'، 'لجون ودعائیم'، 'کتاب القف'، 'علومیات' اور 'کتاب الحروف' وغیرہ۔ ان تمام معلومات کی موجودگی میں کوئی عتہ سے عاری ہی ہوگا جو یہ کہے گا کہ صحیح و غیر صحیح احادیث باہم اس طرح خلط ملط ہیں ان میں امتیاز دشوار ہے۔

غرض موضوع احادیث کی موجودگی کی بنیاد پر منکرین حدیث کا احادیث بنوہا پورے ذخیرے کو ناقابل اعتبار ٹھہرانا ایک ایسی نرالی منطق ہے جو عقل کے کسی بھی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ منکرین حدیث کا منشا تو یہ ہے کہ وضع حدیث کے ہمارے حدیث حجت کو مشکوک بنا دیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وضع حدیث خود بڑی زبردست دلیل حجت حدیث کی اس لیے کہ اگر حدیث حجت نہ ہوتی تو وضع حدیث کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ وضّاعین و کذابین اپنے دل سے گھڑی ہوئی باتوں کو حدیث کا نام اسی لیے دیتے تھے کہ وہ حدیث کے نام پر قبول کر لی جائیں یوں تو ان کی بات کوئی بھی قبول نہ کرتا مگر لوگوں کے درمیان حدیث کی حجت چونکہ مسلم تھی اس لیے وضّاعین خیال کرتے تھے کہ ہم حدیث کا نام لیں گے تو ہماری بات بھی حجت کے طور پر تسلیم کر لی جائے گی نقل اسی سکے کی گھڑی جاتی ہے جو بازار میں چلتا ہو جس سکے کو بازار میں کوئی قبول ہی کرتا ہو بھلا اس کی نقل بنانے سے کسی کو کیا نائدہ۔ حدیث کا سکہ بازارِ علم میں چلتا تھا تو موضوع احادیث کے نقلی سکے گھڑے جا رہے تھے مگر جہاں نقلی سکے گھڑنے والے موبہ تھے وہاں ایسے ماہر صراف بھی موجود تھے جو جعلی اور اصلی سکوں کی خوب پہچان رکھتے تھے انہوں نے نہ صرف جعلی سکے بنانے والوں کے نام کشت ازبام کر دئے بلکہ ان کے بنائے ہوئے تمام جعلی سکے بھی الگ کر کے رکھ دئے اور آئندہ آنے والوں کے لیے

اس سلسلے میں تمام ضروری معلومات مہیا کر گئے تاکہ کسی بھی مرحلے پر یہ جعلی اور نقلی سکے دوبارہ رواج نہ پاسکیں۔ غرض موضوع احادیث کی موجودگی ذخیرہ احادیث کو مشکوک بنانے کے بجائے اس کے اور زیادہ محفوظ ہونے کا ثبوت مہیا کرتی ہے نیز اس کو ویتع تر بنانے کا موجب ہے۔

وضع حدیث اور عہد رسالت | اس سلسلے میں یہ کہنا بھی قطعاً خلاف واقعہ ہے کہ جھوٹی احادیث کا سلسلہ عہد رسالت ہی میں شروع ہو گیا تھا اس کا نام مطلب یہ ہوا کہ صحابہ کرام کی وہ جماعت جس نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں، اپنے احوال بے دریغ منشاء کیے، اپنے اعزہ و آماں کو چھوڑا اور اپنے وطن تک کو خیر باد کہہ دیا وہی جماعت اللہ اور اس کے رسول سے بے وفائی کے کام میں اس قدر آگے نکلی گئی تھی کہ جھوٹ گھڑ گھڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرنے لگی تھی؟ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کی نسبت کرنا دراصل اللہ ہی پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے اور صحابہ کرام سے زیادہ اس حقیقت سے اور کون واقف ہوگا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے ارباب ممکن نہیں کہ صحابہ کرام دینی احکام کے بید حرلیں، شریعت کی حفاظت میں انتہائی مستعد اور تبلیغ اسلام کے حد درجہ شائق تھے انہیں ہر تکلیف اور ہر مصیبت گوارا تھی مگر یہ گوارا نہ تھا کہ دین اسلام کو معمولی سا بھی کوئی نقصان پہنچے ان کے بارے میں یہ تصور تک نہیں کیا جاسکتا کہ وہ از خود دین کو اس حد تک نقصان پہنچانے پر تل گئے تھے کہ سنت نبوی میں جسے وہ خود دین کی بنیاد تصور کرتے تھے جھوٹ کی آمیزش کر کر کے اسے مشکوک اور کمزور بنانے کا کام انجام دے رہے تھے۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ صحابہ کے لیے حکم خداوندی کا درجہ رکھتا تھا جس قسم کے ایمان و یقین کی دولت سے صحابہ مالا مال تھے اس کے ہوتے ہوئے بھلا یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب کر سکتے تھے خصوصاً جبکہ وہ بکثرت بار بار زبان نبوی سے

ایسے شخص کے لیے جہنم کی وعید سن چکے تھے، میرا اشارہ اس مشہور حدیث کی طرف ہے جس کے الفاظ ہیں :

من کذب علی متعمداً فلیتبعوا مقعده من النار | جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا ہے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کر لے۔

یہ روایت جملہ کتب حدیث میں موجود ہے جتنے صحابہ سے یہ حدیث مروی ہے مشکل ہی سے چند احادیث اس قدر کثیر التعداد صحابہ سے مروی ہوں گی بعض علمائے حدیث نے اس حدیث کو تواتر قرار دیا ہے تقریباً ستر صحابہ نے اس کو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے بعض نے اس سے زیادہ راویوں کا دعویٰ کیا ہے۔ بہر حال راویوں کی یہ کثرت اس بات کی دلیل ہے کہ خود بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو صحابہ کے اذہان میں راسخ کر دینا چاہتے تھے کہ میری طرف غلط بات کی نسبت اللہ کی ناراضگی کو دعوت دینے کے مترادف ہے جس کا لازمی نتیجہ جہنم ہے۔ جہنم کی وعید شاید آج کے مسلمان کے لیے اتنی اہمیت کی حامل نہ ہو لیکن صحابہ کے لیے جہنم کی وعید کوئی معمولی بات نہ تھی یہی وجہ تھی کہ صحابہ کا عالم یہ تھا کہ حدیث سنانے وقت کانپ کانپ اٹھتے اور اس خوف سے کہ کہیں کوئی غلط بات بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے حدیث کے الفاظ دوہرا کر فوراً کہتے اس سے کم یا اس سے زیادہ یا اسکے مشابہ غرض بغیر طوطی پر یہ نہ کہتے کہ آپ کی کہی ہوئی حدیث کے الفاظ بعینہ ہی ہیں کبھی حدیث سنا کر کہتے ادا کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یا جیسا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو) بعض صحابہ کا یہ دستور تھا کہ کوئی حدیث سنانے سے قبل متذکرہ بالا مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ والی حدیث ایک بالضرورہ دوہراتے تاکہ متعلقہ وعید ذہن میں ایک بار پھر تازہ ہو جائے اور لا پرواہی سے بھی کسی غلط بات کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ ہو جائے۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں راوی ہیں کہ ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی حضرت ابو ہریرہ کا تو یہ دوامی قاعدہ بن گیا تھا کہ

يَبْدَأُ بِحَدِيثِهِ بَانَ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ
اللَّهِ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ ابُ الْقَاسِمِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ كَذِبٍ عَلَى مَتَعَمَلًا
فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ -

جس وقت اپنی حدیث سنائی شروع کرتے تو کہتے
فرمایا رسول اللہ صادق و مصدوق ابوالقاسم صلی
اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر تصداً جھوٹ باندھا
اسے چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنالے -

حضرت علی فرمایا کرتے تھے مجھے یہ گوارا ہے کہ مجھ پر آسمان پھٹ پرٹے یہ نسبت اس کے
کہ میں آپ کی طرف اس بات کا انتساب کروں جو آپ نے نہیں کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ
سے خاصی تعداد میں احادیث مروی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو پھر بھی آپ سے کسی
روایت کی شکایت تھی کیونکہ آپ فرمایا کرتے تھے :

إِنِّي لَيَمْنَعُنِي أَنْ أُحَدِّثَ حَدِيثًا
كَثِيرًا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا لَمْ
(طبرانی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو جس کثرت
سے جو بیان نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ
مَنْ تَعَمَّدَ دال روایت مجھ کو اس سے روکتی ہے -

ظاہر ہے روایت کی کثرت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اسی بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے اسی طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ
کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے پیچھے حضرت عبد اللہ نے ان سے پوچھا کہ جس
طرح فلاں فلاں صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کثرت سے روایت کرتے ہیں آپ
کو میں نے اس طرح کبھی روایت کرتے نہیں سنا حضرت زبیر نے جواب میں فرمایا :

أَمَّا إِنِّي لَمْ أَفَارِقْهُ وَلَكِنْ
مَعَهُ يَقُولُ مِنْ كَذِبٍ عَلَيَّ
فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ
(بخاری کتاب العلم)

آگاہ رہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
جدا نہیں ہوا لیکن (بات یہ کہہ کر) میں نے آپ
کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے
اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کر لے -

گویا وہی نوح جو ابھی حضرت انس سے روایت ہوا حضرت زبیر کو بھی کثرتِ روایت سے روکے ہوئے تھا بعض صحابہ نے اپنی کبریا کے زمانے میں صرف اس لیے روایت کرنا ترک کر دیا تھا کہ کہیں بڑھاپے کی وجہ سے کوئی سہو نہ ہو جائے لوگ ان سے روایت کی درخواست کرتے تو فرماتے :

<p>ہم بڑھے ہو گئے اور تھوٹے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیث بیان کرنا بڑا سخت معاملہ ہے۔</p>	<p>كَبُرْنَا وَلَيْسَنَا وَالْحَدِيثُ عَنْهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَشَدِيدٌ (ابن ماجہ)</p>
---	---

غرض جن حضرات کا روایت حدیث میں احتیاط کا یہ عالم ہوا ان کے بارے میں کوئی کیسے یقین کرے کہ وہ اپنی طرف سے جھوٹ گھڑ گھڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے قبیح ترین کام میں مشغول تھے کوئی عقل سے عاری ہی ہو گا جو صحابہ کے بارے میں اس قسم کا گمان کرے گا۔

عجیب استدلال | حیرت ہوتی ہے منکرین حدیث کے طرزِ استدلال پر انہوں نے اپنے حق میں اسی مَن کَذِبَ عَلٰی مَتَّحِدًا والی حدیث سے دلیل پکڑی ہے یعنی جو حدیث اس بات کی دلیل تھی کہ صحابہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کے انتساب کی جزا ت ہی نہیں کر سکتے تھے اسی صاپٹ کو انہوں نے اپنے اس دعوے کی دلیل بنایا کہ صحابہ معاذ اللہ جھوٹی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ متذکرہ بالا حدیث بار بار آتی ہی اسی لیے تھی کہ آپ کی طرف غلط باتوں کا انتساب ہونے لگا تھا۔ اگر آپ کی طرف منسوب کر کے غلط باتیں بیان نہ کی جا رہی ہوتیں تو آپ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔ آپ کو بار بار یہ وعید سنانے کی ضرورت پیش آنا منکرین حدیث کے نزدیک دلیل ہے اس بات کی کہ آپ کی طرف جھوٹ کا انتساب ہونے لگا تھا۔ اپنی اس دلیل کی تائید میں وہ عہدِ رسالت کا ایک واقعہ بھی نقل کرتے ہیں ہم اس واقعے کی اصیلت تو بعد میں واضح کریں گے، ہمیں اس سے

پہلے دراصل یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ من کذب علیٰ والی حدیث بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس کس سیاق و سباق کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ اگر منکرین حدیث کا استدلال درست ہے تو اس حدیث کو لازماً ایسے ہی بیاق و سباق کی طرح روایت ہونا چاہیے جس سے معلوم ہو کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی ایسا جھوٹ آیا جو آپ کی طرف نسبت کر دیا گیا تھا اس کی تردید کرنے ہوئے آپ نے ایسے دروغ باتوں کے لیے جہنم کی وعید سنائی اور اگر بیاق و سباق اس سے مختلف ہو تو پھر منکرین حدیث کا استدلال یقیناً بے بنیاد ٹھہرے گا۔

مختلف مرویات کا جائزہ

جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا یوں تو یہ جھوٹ کی نسبت دلی حدیث کے مشہور راویوں میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص حضرت ابو ہریرہ حضرت ابوسعید خدری حضرت علی بن ابی طالب حضرت انس بن مالک حضرت میسر بن شعبہ حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت جابر بن عبداللہ حضرت ابو قتادہ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہم اجمعین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

آئیے ان سب حضرات کی مرویات کا جائزہ لیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

<p>بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری بات دوسروں تک پہنچا دو خواہ وہ ایک ہی آیت ہو اور بنی اسرائیل کے واقعات (اگر تم چاہو تو) بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر تصدّٰی جھوٹ بولا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔</p>	<p>أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً وَحَدَّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَدًّا فَلْيَتَّبِعْ مُقْعِدَهُ مِنَ النَّارِ۔ (بخاری کتاب الانبیاء باب ما ذکر عن بنی اسرائیل)۔</p>
--	--

اس روایت کا سباق صاف بتلا رہا ہے کہ زیر بحث دروغ بانی سے متعلق حدیث بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمائی جب آپ لوگوں کو اپنی احادیث دوسروں تک پہنچانے کی تلقین فرما رہے تھے گویا آپ تبلیغ احادیث کی تلقین کرتے وقت مخاطب کو یہ

ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ دیکھنا یہ کام بڑی ذمہ داری کا ہے اس میں اگر ذرا سی بے احتیاطی سے کسی غلط بات کی نسبت میری طرف ہو گئی تو بجائے ثواب کے اللہ عذاب نہ کما بیٹھتا۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت کو امام بخاری کتاب العلم میں لاتے ہیں اس کے الفاظ

اس طرح ہیں :

میرے نام پر نام رکھ لو مگر میری کینت (پرکینت) نہ رکھو جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے یقیناً مجھے دیکھ لیا اس لیے کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ باندھے تو اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنالے۔

تَسْمُوا بِاسْمِي وَلَا تَكْتُمُوا بَكْنِيَّتِي
وَمَنْ رَأَى فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَأَى فِي
قَالَ الشَّيْطَانُ لَا يَتَمَثَّلُ فِي
صُورَتِي وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعِدًّا فَلْيَتَوَّأ
مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ (بخاری کتاب العلم باب
اَلَمْ مِنْ كَذَبِ عَلَيَّ النَّبِيِّ)۔

اس روایت میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جس سے یہ گمان کیا جاسکے کہ آپ کی جانب کسی دروغ کی نسبت کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا جس سے متاثر ہو کر آپ کو جہنم کی یہ حنڈ کرہ و عید سنانی پڑے تھی بلکہ اس حدیث کے الفاظ صحت بتلا رہے ہیں کہ اس سے مقصود جھوٹ کی نسبت سے استراز کو ٹوک دینا ہے یعنی کوئی شخص بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر اگر جھوٹی خراب بات تک بھی بیان کرے گا تو وہ بھی گویا اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا۔

اس دروغ کی نسبت والی حدیث کے تیسرے مشہور راوی حضرت ابوسعید خدری

رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی روایت کو ہم امام مسلم سے نقل کرتے ہیں، امام مسلم نے اسے کتاب الزہد والرفاق میں بیان کیا ہے یہ پوری روایت اس طرح پر ہے :

میرا کلام مت لکھو اور جس نے مجھ سے سن کر قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے وہ اسے مٹا دے البتہ میری احادیث (حافظے سے) بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو مجھ پر جھوٹ باندھے صام (درمیان کے

لَا تَكْتُبُوا عَلَيَّ وَمَنْ كَتَبَ عَلَيَّ
غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهِ وَحَدِّثُوا عَلَيَّ
وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ قَالَ هَامُ
أَحْسِبُهُ قَالَ مُتَعِدًّا فَلْيَتَوَّأ مَقْعَدَهُ

من النار (مسلم کتاب الزہد باب | ایک راوی کا کہنا ہے میرا خیال ہے آپؐ نے فرمایا
تثبت فی الحدیث)۔ | قصداً دھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم ہی بنا۔

اس روایت کے بارے میں اس تصریح کی تو ضرورت نہیں کہ یہ کتاب حدیث سے مماثلت کا حکم ابتدا میں تھا بعد میں کتابت کی اجازت دے دی گئی تھی اس پر تفصیلی بحث اس کتاب کے پہلے حصے میں کتابت حدیث اور صحابہ کے عزائم کے تحت دے دی گئی ہے وہاں مراجعت کی جاسکتی ہے بہر حال اس وقت تو ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت میں جھوٹ کی نسبت کا ذکر جس حوالے سے آیا ہے اس کا منشاء حفظ حدیث پر زور دینا ہے اس تاکید کے ساتھ کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور یاد کی ہوئی حدیث روایت کرتے وقت اس بات کا خیال رہے کہ کوئی غلط بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے۔ اس روایت میں بھی جھوٹ کی نسبت سے متعلق کسی واقعے کے وقوع میں آنے کا کوئی اشارہ ناک موجد نہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب کی روایت ہم ترمذی سے لیتے ہیں۔ اس روایت کے

الفاظ یہ ہیں :

لَا تَلْذِبُوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ | محمدؐ پر جھوٹ نہ باندھو اس لیے کہ میں نے محمدؐ پر
يَلْجُ النَّارَ (ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم | جھوٹ باندھا وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔
الکذب علی رسول اللہ)۔

ظاہر ہے اس روایت میں بھی کوئی ایسا اشارہ موجود نہیں جس سے منکرین حدیث کے موقف کی تائید ہو سکے۔ اسی طرح حضرت انس بن مالکؓ حضرت میسرہ بن شعبہؓ حضرت عمرہ بن عبد منافؓ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت بابر بن عبد اللہؓ کی روایات کا بھی یہی حال ہے ان حضرات کی روایات کے الفاظ بھی بالکل واضح ہیں اور ہر ایسے حوالے سے خالی ہیں جو کسی طبعی منکرین حدیث کے موقف کے حق میں جتنا ہو۔ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت یہ ہے :

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ حَسِبْتُ أَنَّهُ قَالَ | جو شخص محمدؐ پر جھوٹ باندھے میرا گمان ہے آپؐ
نَاصِدًا (الفاظ بھی) فرمایا

متعداً فليتبوا مقعدها من النار | وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنا لے۔
(ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم الکذب)۔

حضرت میسر بن شعبہ اور حضرت سمرہ بن جندب اس حدیث کی روایت میں متحد اللفظ ہیں ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

من حدث عني حديثاً وهو يري | جو شخص مجھ سے کوئی حدیث روایت کرے یہ
انه كذب فهو احد الكاذبين | جانتے ہو جھٹے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹوں
(ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم الکذب)۔ | میں کا ایک جھوٹا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت جابر بن عبداللہ بھی اس حدیث کی روایت میں متحد اللفظ ہیں ان دونوں نے اسے حسب ذیل الفاظ میں روایت کیا ہے :

من كذب عني متعداً فليتبوا | جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ
مقعدها من النار (ترمذی کتاب العلم | اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔
باب فی تعظیم الکذب)۔

ان پانچوں حضرات کی روایتوں میں بھی قارئین نے دیکھ لیا کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ایسے موقع پر ارشاد فرمائی جب آپ ﷺ نے علم میں کوئی ایسا واقعہ لیا گیا جس میں کسی نے کسی غلط بات کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کر دی تھی اور آپ ﷺ اس کی روک تھام کے لیے یہ جہنم کی وعید لوگوں کو سنا رہے تھے۔ اب اس حدیث کے قایل ذکر راویوں میں صرف حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت رہ گئی ہے وہ بھی ملا خطہ ہو۔ حضرت ابو قتادہ کی روایت ہے :

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول على هذا المنبر إياكم وكثرة الحديث عني فمن قال علي فليقتل حقاً | میں نے اسی منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم مجھ سے بہت زیادہ حدیث روایت کرنے سے پرہیز کرو مجھ سے جو شخص بھی روایت کرے اسے چاہیے کہ حق اور

اَوْ صَدَقًا وَمَنْ تَقَرَّرَ عَلَيَّ مَا لَمْ
اَقُلْ فَلْيَتَّبِعُوا مَتَّعِدَةً مِنَ النَّارِ
(ابن ماجہ - باب التغلیظ فی تعدد الکذب
علی رسول اللہ)۔

سچ کے اور جو شخص مجھ پر وہ بات باندھے
جو میں نے نہیں کہی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم
میں بنائے۔

یہ روایت تو اپنے مفہوم میں بالکل ہی واضح ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کثرت روایت سے پرہیز
کرنے کی تاکید فرما رہے ہیں اور اس ممانعت کی توجیہ کے طور پر مخاطب کو یہ ذہن نشین کرانا
چاہتے ہیں کہ کثرت روایت کی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی غلط بات میری طرف منسوب ہو
جائے اور راوی کے لیے جہنم کی آگ کا سبب بن جائے۔

اس سلسلے کی ایک اور قابل ذکر روایت وہ ہے جس کو امام ابو جعفر طحاوی نے مشکل الآثار
میں اپنی متصل سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس روایت کا ما حاصل یہ ہے کہ کسی مجلس میں ایک
صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث بیان کی، حضرت
مالک بن عبادہ رضی اللہ عنہ بھی اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے سن کر فرمایا کہ حجۃ الوداع کے
موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں سے یہ عہد لیا تھا کہ

عَلَيْكُمْ بِالْقُرْآنِ وَإِنْ كُنْتُمْ سَتَرْتُمْ عَنْ
إِلَٰهِ قَوْمٍ لِيَسْتَمِيعُوا الْحَدِيثَ عَنِّي فَمَنْ
عَقِلَ شَيْئًا فَلْيَحْذَرِ بِهِ وَمَنْ افْتَرَى
عَلَيَّ فَلْيَتَّبِعُوا بَيِّنَاتٍ أَوْ مَقْعِدًا فِي
جَهَنَّمَ۔ (مشکل الآثار جلد ۱ ص ۱۱۱)۔

تم پر لازم ہے کہ تم قرآن کو چھوڑ کر غریب
ایسے لوگوں کے پاس واپس کیے جاؤ گے جو چاہیں گے
کہ میری حدیث ان سے بیان کی جائے لہذا جس کی
نے میری بات کو سمجھ لیا ہے اور یاد کر لیا ہے اسے چاہیے
کہ حدیث بیان کرے اور (یاد رکھو) جو شخص تصداً
میری طرف جھوٹ منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ یا
(فرمایا) اپنا گھر جہنم میں بنائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ غریب اسلام اطراف و اکناف عالم
میں پھیلے گا اور مختلف اقوام کے لوگ جو قدر جو حق اسلام میں داخل ہوں گے اور آپ کی صحبت کے
شرف سے محروم ہونے کی بنا پر آپ کے ارشادات سننے کے بہت زیادہ شائق ہوں گے ایسی صورت

میں ممکن ہے کثرت روایت کی بنا پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اس لیے صحابہ کو آپؐ نے متنبہ کر دیا کہ دیکھنا روایت حدیث میں احتیاط سے کام لینا اگر میری حدیث خوب یاد ہو تو ضرور روایت کرنا اگر کوئی شک ہو تو روایت سے استراذہ ہی کرنا یہاں نہ ہو کوئی غلط بات میری طرف منسوب ہو جائے۔ اس روایت کے بارے میں بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ حدیث آپؐ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب کسی نے آپؐ پر جھوٹ باندھا تھا۔

غرض اس من کذب علیؑ والی حدیث سے متعلق جتنی بھی قابل ذکر روایتیں ہیں ان میں سے کسی ایک روایت میں بھی کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس کی بنیاد پر منکرین حدیث کا یہ استدلال درست سمجھا جاسکے کہ یہ جھوٹ کی نسبت والی حدیث ارشاد فرمانے کی ضرورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش ہی اس لیے آئی تھی کہ آپؐ کی طرف آپؐ کے عہد ہی میں جھوٹ کی نسبت ہونے لگی تھی اس کے بالمقابل تمام قابل ذکر روایتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ مذکورہ زیر بحث حدیث یا تو آپؐ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب اپنی احادیث دوسروں تک پہنچانے کا آپؐ نے صحابہ کو حکم دیا یا اس وقت ارشاد فرمائی جب کثرت روایت کی صورت میں احتیاط کا پہلو مد نظر رکھنے کی آپؐ نے تلقین فرمائی۔

کذب علیؑ البنی سے متعلق ایک واقعہ | منکرین حدیث اپنے استدلال کی تائید میں عہد رسالت کا جو واقعہ پیش کیا کرتے ہیں مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی اصل حقیقت تاریخین کے سامنے لے آئی جائے تاکہ اصل صورت حال کو سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ یہ واقعہ امام طحاوی نے شکل الآثار میں حضرت بریدہؓ سے اور طبرانی نے الاوسط میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے اس واقعے کا لب لباب یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ایک شخص مضافات مدینہ کے ایک قبیلہ کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر لڑکی والوں نے انکار کر دیا تھا ہجرت کے بعد ابتدائی زمانے میں ہی وہ شخص ایک حملہ پہنچے ہوئے اس قبیلے میں پہنچا اور جا کر اس نے لڑکی والوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ فلاں معاملے میں اپنا فیصلہ صادر کروں یہاں طبرانی کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جس گھر میں جا ہوں چلا

جاؤں) گھر والوں نے اسے بٹھایا اور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقت حال دریافت کی آپ نے فرمایا ”دشمن خدا نے جھوٹ بولا پھر آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا (طبرانی نے یہاں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے نام لیے ہیں) کہ ہاؤ اگر اسے زندہ پاؤ تو قتل کر دو اور اگر مردہ پاؤ تو اس کی لاش جلا ڈالو وہ آدمی وہاں پہونچا تو پستہ چلا کہ مجرم سانپ کے ڈسنے سے مرچکا ہے چنانچہ حکم نبوی کے مطابق اس کی لاش جلا ڈالی گئی وہ آدمی واپس خدمت نبوی میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا ”جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنائے۔“

اس واقعے کے بارے میں ہیں جنکرین حدیث سے سب سے پہلے یہ پوچھنا ہے کہ پوسے ذخیرہ حدیث سے تمام صحیح احادیث کو چھوڑ کر ان کی نظر انہی دو روایتوں پر کیوں پڑی جن کی سند بھی ضعیف ہے اور متن بھی منکر ہے کہاں تو منکرین حدیث کا یہ موقف کہ موضوع احادیث کی موجودگی کی بنا پر صحیح احادیث بھی مشکوک ہو گئیں اور قابل حجت نہیں رہیں اور کہاں یہ حال کہ ان روایات کو حجت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جن میں موضوع ہونے کی علامات بہت نمایاں ہیں آخر اس دورنگی کی کیا وجہ ہے۔ ایک طرف منکرین حدیث محدثین پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ روایت کی چھان بھٹک ہی میں لگے رہے درایت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور دوسری طرف اپنی مطلب برآری کے لیے ایسی روایت سے دلیل پکڑتے ہیں جس کا متن ایک عامی آدمی بھی دیکھتے ہی کہہ اُٹھے گا کہ منکر ہے بھلا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آپ مردوں کو جلانے کا حکم صادر کریں؟

متن کے منکر ہونے کے علاوہ ان دونوں روایتوں کی تو سند بھی ضعیف ہے ان کے راویوں میں سے بعض راوی ابے ہیں جن کی روایت قبول نہیں کی جاتی یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس قصہ کو موضوع اور خود ساختہ کہا ہے۔ نیز مشہور محدث عبداللہ بن عدی نے اس واقعہ کو اپنی کتاب ”الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتروکین“ میں لیا ہے جو خود دلیل ہے اس واقعے کے راویوں کے ضعیف اور متروک الروایت ہونے کی۔

علامہ ازہب ان دونوں روایتوں کو اگر صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو ان سے زیادہ سے زیادہ ہر کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ایک دینیوی کام کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک ایسے جھوٹ کی لبت کی گئی تھی جو صرف دروغ گو کی ذات تک محدود تھا۔ ان روایتوں سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ دین کے کسی معاملے سے متعلق کوئی حدیث گھڑ کر عام مسلمانوں کے سامنے اسے حدیث رسول کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو۔ کہاں ایک خالصتاً دینیوی معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جھوٹا حوالہ دے کر کسی شخص کا صرف اپنی ذات کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرنا اور کہاں دینی معاملات میں وضع حدیث کا ارتکاب کر کے پورے دین میں رخنہ اندازی کا موجب بننا ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے پر قیاس کر کے یہ حکم ہرگز نہیں لگایا جاسکتا کہ عہد رسالت ہی میں وضع حدیث کا آغاز ہو گیا تھا۔ مزید برآں ان دونوں روایتوں میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے دوسرا کوئی واقعہ منکرین حدیث بھی اس ضمن میں پیش نہیں کر سکے صرف اس ایک واقعے کی بنیاد پر یہ کلیہ قائم کر لینا کہاں کا انصاف ہے کہ عہد رسالت ہی میں موضوع احادیث گھڑی جانے لگی تھیں۔

منکرین حدیث نے اتنا بھی نہ سوچا کہ دونوں روایتوں میں اس شخص کا نام نہیں بتایا گیا جس نے یہ جھوٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جھوٹ بولنے والا کوئی مجہول اور غیر معروف شخص تھا۔ ایک مجہول اور غیر معروف شخص کے ایک جھوٹ کی بنا پر صحابہ کی پوری جماعت کی صداقت کو آخر کس دلیل سے مشکوک ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ عہد رسالت میں وضع حدیث کے آغاز کا دعویٰ کرنا صحابہ کرام کی صداقت کو مشکوک ٹھہرانا ہے جو بلاشبہ آسمان پر خاک ڈالنے کے مترادف ہے اس لیے کہ صحابہ کرام کی عدالت علی الاطلاق سے صرف وہی انکار کر سکتا ہے جو عقل کی نعمت سے محروم ہو یا جس نے انکار حق پر کمر باندھ رکھی ہو۔ غرض منکرین حدیث کے پاس اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں کہ وضع حدیث کا آغاز عہد رسالت ہی میں ہو گیا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر وضع حدیث کا

آغاز ہوا کب؟ تو اس کی اصل حقیقت بھی سن لیجئے :

وضع حدیث کا اصل نقطہ آغاز | وضع حدیث کی داغ بیل دراصل اس وقت پڑی جب حضرت عثمان کی شہادت کے بعد

حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلافات نے سراٹھایا اور سبائیوں کی سازش کے نتیجے میں ان کے باہمی اختلافات کو حرب و پیکار کی صورت دے دی گئی۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ اہل اسلام چھوٹے چھوٹے فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ اس تفرقہ بازی کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ سیاسی اختلافات کو دینی رنگ دے دیا گیا اور سنت نبوی کو سیاسی اغراض اور داخلی انقسامات کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ بعض فرقے اپنے افکار و آراء کی تائید میں حدیثیں گھڑنے لگے اولین عنوان جس کو وضع حدیث کی آماجگاہ قرار دیا گیا فضائل اشخاص و رجال تھا لوگوں نے اپنے ائمہ اور قائدین کے فضائل و مناقب پر مشتمل حدیثیں وضع کرنا شروع کیں مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغۃ میں لکھتے ہیں :

”نوب جان لیجئے کہ فضائل و مناقب پر مشتمل احادیث میں

اصل جھوٹ شیعہ کی جانب سے آیا ہے“ (شرح نہج البلاغۃ جلد ۲ ص ۱۳۲)

معلوم ہوا کہ وضع حدیث کی ابتدا کرنے والے شیعہ تھے۔ ان لوگوں نے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے فضائل و مناقب کے بارے میں حدیثیں وضع کی تھیں اسی طرح صحابہ خصوصاً صحابہ کبار اور شیخین جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بے بنیاد معائب و مثالب پر مشتمل حدیثیں بھی وضع کر ڈالی تھیں اس قسم کی موضوعات کے بارے میں ابن ابی الحدید ہی رقم طراز ہے :

شیعہ بن ناپسندہ امد گھناؤنے اور کھڑکڑاتے ہیں ہمارے

اصحاب (شیعہ) کے نزدیک ان کی کوئی اصل و اساس نہیں

محمد بن نے نہ اس کو روایت کیا ہے اور نہ اس کو پہچانتے ہیں یہ

ایک ایسی بات ہے کہ شیعہ اس کی نقل و روایت میں منفر د ہیں۔

(شرح نہج البلاغۃ جلد ۱ ص ۱۳۵)

شیعہ نے فی الحقیقت اپنے جذبات و احساسات کی تسکین کی خاطر اس کی کوئی پرواہ نہ کی کہ وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کر کے سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ شیعہ کی اس جسارت کو دراصل اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ یہ لوگ فارسی الاصل تھے بلکہ ہر تو یہ اسلام کے دائرے میں آگئے تھے مگر اپنے وطنی و آبائی مذاہب کے اثرات کو قلب ذہن سے نکال باہر کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ یہ لوگ بدستور بت پرستانہ لہجہ میں گرفتار تھے بنا بریں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہ تھی اس سے ان کے دلوں میں پوشیدہ جذبات کو تسکین ملتی تھی۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ لوگ مشہور یہودی عبد اللہ بن سبا کی جیسے کامیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ عبد اللہ بن سبا نے اسلام کے شیرازے کو درہم برہم کرنے کے لیے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق تشیع کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اس کے پیروکاروں میں اکثریت تو ان لوگوں کی تھی جو اس کے مخصوص مشن سے پوری طرح واقف تھے اور وہ خود بھی اسلام کو پھلتے پھولتے دیکھنا پسند نہ کرتے تھے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لاعلمی میں اس کے دام فریب میں پھنس گئے تھے۔ سبائیوں کا صرف ایک ہی مقصود تھا اللہ وہ یہ کہ صحابیت کی قوت کو جس قدر بھی کمزور کیا جا سکے کیا جائے کیونکہ وہ جاننے لگتے تھے کہ عرب کے دس لاکھ مربع میل پر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں جس اقتدار کے حاصل کرنے میں اسلام کامیاب ہوا تھا یا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد چند ہی سالوں میں اسلام نے جو روئے زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کی حیثیت اختیار کر لی تھی تو یہ سب کچھ اسی صحابیت کی قوت کے بل بوتے پر ہوا تھا۔ اپنے اس مقصود کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے ان سبائیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشوں کا حال پھانے اور صحابہ کرام کو باہم رڑانے میں جو کردار ادا کیا وہ تو اپنی جگہ ایک الگ داستان ہے ہی اس کے ساتھ ہی انہوں نے صحابہ کو بدنام کرنے کی بھی ایک منظم تحریک چلائی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چند گنے چنے صحابیوں کو چھوڑ کر صحابہ کی پوری جماعت نہ اسلام ہی کی دوست تھی اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ

علیہ وسلم ہی سے اس جماعت کو اخلاص و عقیدت کا کوئی تعلق تھا لیکن ظاہر ہے یہ بالکل خلاف واقعہ بات ثابت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا یہ تو ایسا ہی تھا جیسے دن کی پوری روشنی میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ سورج غروب ہو چکا ہے اور رات آگئی ہے اس کے لیے سبائیوں نے یہی ایک تدبیر کارگر دیکھی کہ جھوٹے کا ایسا دھواں اٹھایا جائے اور اس کے ذریعے سے ایسی تاریکی پھیلا دی جائے کہ بینائی رکھتے ہوئے بھی دیکھنے والوں کو دن کی روشنی، رات کی تاریکی کی طرح دکھائی دینے لگے چنانچہ صحابہ کبار کے بارے میں عموماً اور شیخین حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق خصوصاً مختلف قسم کے معائب و مثالب گھر گھر کربنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کیے جانے لگے دوسری طرف اپنے آپ کو مسلمان اور اسلام دوست ثابت کرنے کے لیے ان معدودے چند صحابہ کے فضائل و مناقب اپنی طرف سے وضع کر کے حدیث نبوی کے طور پر پیش کیے جانے لگے جن کو ان سازشی ذہن رکھنے والے سبائیوں نے پہلے ہی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت صحابہ کی پوری جماعت سے علیحدہ کر لیا تھا۔

حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں اس بے بنیاد الزام کا ذکر کرتے ہوئے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی منشا کے خلاف مسند خلافت سنبھال لی تھی اور صحابہ کی عمومیت ان دونوں کے ساتھ ہو گئی تھی، اس امر کی بطور خاص تصریح کی ہے کہ یہ بے بنیاد الزام سب سے پہلے عبداللہ بن سبا کی زبان پر آیا تھا حافظ ابن حجر کے الفاظ ہیں :

كَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ سَبَا أَوَّلَ مَنْ أَظْهَرَ ذَلِكَ (لسان المیزان جلد ۳ ص ۱۹۱) | عبداللہ بن سبا ہی سب سے پہلا آدمی ہے جس نے اس کے ساتھ ہی عامر شعبی کے حوالے سے حافظ ابن حجر نے اس بات کی بھی تصریح کی کہ سب سے پہلا آدمی جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ کی نسبت کی وہ بھی یہی عبداللہ بن سبا ہی تھا۔ عامر شعبی کے اس دعوے کو حافظ ابن حجر نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

اَوَّلَ مَنْ كَذَبَ عِبْدَ اللَّهِ ﷺ | سب سے پہلے جس نے جھوٹ بولا (جھوٹی حدیث سب) (لسان المیزان جلد ۳ ص ۲۸۹) | بنائی (وہ عبداللہ بن سبا ہی تھا۔

عامر شیبی کے اس قول کو مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید کے اس قول کے ساتھ ملا کر پڑھیں جس کا ابھی ہم اوپر حوالہ دے آئے ہیں اور جس میں انہوں نے کہا ہے کہ فضائل و مناقب پر مشتمل اصل جھوٹ شیعہ کی جانب سے آیا ہے آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ شیعہ ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے عبداللہ بن سبا کی دسیہ کاریوں کے زیر اثر نیز اپنے مخصوص روایتی جذبات و احساسات کی تسکین کی خاطر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کی ابتدا کی۔

اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وضع حدیث کی ابتدا خلافت راشدہ کے آخری دو تین سالوں میں ہوئی یعنی تقریباً ۳۰ سنہ سے ۳۳ سنہ تک کے درمیان زمانے میں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے تقریباً تیس سال بعد اس فتنہ کا ظہور ہوا۔

اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ وہ زمانہ ہے جب پہلے پہل احادیث نبوی کے راویوں کے بارے میں پھانسیں مین کی جانے لگی اور

وضع حدیث کے مستطاب میں صحابہ کی احتیاطی تدابیر

اسناد حدیث کے سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ اس سے پہلے صحابہ ایک دوسرے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنتے سنا تے اور قطعاً اس تصدیق کی ضرورت محسوس نہ کرتے کہ یہ حدیث سنانے والے نے از خود زبان نبوی سے سنی ہے یا کسی دوسرے صحابی سے سن کر روایت کی ہے مگر جب وضع حدیث کا ظہور و شیوع ہوا تو ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اس وقت تک کوئی حدیث قبول نہ کی جائے جب تک اس کے راوی کی ثقاہت و عدالت کا یقین نہ ہو جائے قبل ازیں صحابہ کے باہم اعتماد کا یہ عالم تھا کہ جب کسی دوسرے صحابی سے کوئی حدیث سنتے تو بلا جھجک اس کو نہ صرف قبول کر لیتے بلکہ آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے اس طرح روایت کرتے جیسے بذات خود انہوں نے وہ حدیث زبان نبوی سے

سُنی ہو۔ ذخیرہ احادیث میں مراسیل صحابہ کا وجود اس کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا وہ قول بھی اس پر شاہد ہے جس کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں نقل کیا ہے، ایک مرتبہ حضرت انسؓ ایک حدیث بیان کر رہے تھے کہ سننے والوں میں سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حدیث خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی ہے حضرت انسؓ نے جواب میں فرمایا :

<p>ہم تم سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے ہیں وہ سب ہم نے خود ہی آپؐ سے نہیں سنی بلکہ ہم میں سے بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے۔</p>	<p>مَا كُنَّا مَا نَحْدُثُكُمْ بِهِ سَمِعْنَا لَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَكِنْ كَانَ يَحْدُثُ بَعْضُنَا بَعْضًا (مستدرک للحاکم)</p>
---	--

<p>ہم لوگ باہم ایک دوسرے کو (جھوٹ سے) متہم نہیں کیا کرتے تھے۔</p>	<p>كَثَرًا لَانْتِهَم بَعْضُنَا بَعْضًا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۱، ص ۱۳)</p>
---	--

غرض جب تک وضع حدیث کا آغاز نہ ہوا تھا صحابہ نے کبھی اس بات کی پرواہ نہ کی تھی کہ راوی کے حالات کی چھان بین کی جائے مگر جوہنی اس فتنے نے سراٹھایا صحابہ نے بھی اس بات کا اہتمام کرنا شروع کر دیا کہ کوئی حدیث صرف اس لیے قبول نہ کر لی جائے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے بلکہ قبول کرنے سے پہلے اس بات کا پورا اطمینان کر لیا جائے کہ جو کچھ روایت کیا جا رہا ہے اس کا انتساب آپؐ کی طرف صحیح اور درست طوعہ پر ہوا ہے یا نہیں۔ امام ابن سیرین نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے :

<p>(پہلے لوگ) اسناد حدیث دریافت نہیں کیا کرتے تھے لیکن فتنہ بپا ہو جانے کے بعد لوگ یہ کہنے لگے کہ ہمیں راویوں کے نام بتاؤ پھر غور و غوض کے بعد اہل سنت کی روایت قبول کر لی جاتی اور اہل بدعت سے منع کیا جاتا ہے۔</p>	<p>لَمْ يَكُونُوا يَسْتَلُونِ عَنِ الْاِسْنَادِ فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ قَالُوا اسْمُوْنَا رِجَالَكُمْ فَيَنْظُرُ اِلَى اَهْلِ السُّنَّةِ فَيُوْخَذُ مَعْدِيْثُهُمْ وَيُنْظَرُ اِلَى</p>
--	--

أَهْلُ الْبِدْعِ فَلَا يُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ | بدعت کی حدیث رد کردی جلتی تھی۔
(مقدمہ صحیح مسلم باب ۴)

وضع حدیث کا فتنہ ظہور میں آنے کے بعد قبول حدیث میں صحابہ کی احتیاط کا کیا عالم ہو گیا تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس کو امام مسلم نے مقدمہ مسلم میں مجاہد سے نقل لیا ہے کہ ایک بار بشیر عدوی حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثیں بیان کرنے لگے ان کا خیال تھا کہ وہ ان حدیثوں کو خاص توجہ سے سنیں گے مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے نہ ان کی باتوں کی طرف کوئی دھیان دیا نہ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا آخر متعجبانہ کہنے لگے کہ اے ابن عباس میں تو آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سنارہا ہوں اور آپ توجہ تک نہیں دے رہے یہ کیا معاملہ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے جواب میں فرمایا:

ایک وہ وقت تھا کہ جب ہم کسی کو یہ کہتے سننے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فوراً ہماری نظریں بے ساختہ اس کی طرف اٹھ جایا کرتیں اور ہم اپنے کانوں کو اس کی (باتوں کی) طرف لگا دیتے مگر جب لوگ ہر سرکشی وغیرہ سرکش (اڈنٹ) پر سوار ہونے لگے (یعنی جھوٹ پسج کی تیز جاتی رہی) تو ہم نے بھی مرنے ان حدیثوں کو لینا اختیار کر لیا جن کو ہم پہچانتے ہیں۔

إِنَّا كُنَّا مَرَّةً إِذَا سَمِعْنَا رَجُلًا
يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْتَدَرْتَهُ أَبْصَارُنَا
وَأَصْغَيْنَا إِلَيْهِ بِأَذَانِنَا فَلَمَّا
لَكِبَ النَّاسُ الصَّعْبَةَ وَالذَّلُولُ
لَمْ نَأْخُذْ مِنَ النَّاسِ إِلَّا مَا نَعُفُ
(مقدمہ صحیح مسلم باب ۳)

بشیر بن کعب عدوی جیسا کہ معلوم ہے بصرے کے رہنے والے تھے حضرت عبداللہ ابن عباس سے یہ مکالمہ الیا لگتا ہے کہ اس زمانے میں ہوا ہے جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جانب سے حضرت عبداللہ ابن عباس بصرہ کے حاکم تھے اور یہ وہی زمانہ ہے جب وضع حدیث کا فتنہ جنم لے چکا تھا۔ قبول حدیث میں صحابہ کرام کی اس احتیاط کا حال بیان کرنے سے ہمارا مقصود یہی واضح کرنا ہے کہ وضع حدیث کے ظہور و شیوع کے ساتھ ہی صحابہ کی طرف سے اس بات کا

اہتمام شروع ہو گیا تھا کہ صحیح و غیر صحیح احادیث آپس میں غلط ملط نہ ہو جائیں۔ "سرکش" وغیرہ سرکش آدمیوں پر سواری یہ عرب کا ایک محاورہ ہے مراد اس سے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی یہی تھی کہ روایت حدیث میں جھوٹ اور سیح کی تمیز ہی جاتی رہی تو ہم بھی قبول حدیث میں سخت احتیاط برتنے لگے امام مسلم کی ایک اور روایت میں جس کو انہوں نے طائیس سے لیا ہے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے یہی بات زیادہ صریح انداز میں کہی ہے۔ آپؓ فرمایا:

ہم لوگ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے تھے جب آپؐ پر کوئی جھوٹ نہیں باندھا تھا مگر جب لوگ ہر سرکش و غیر سرکش (آڈٹ) پر سوار ہونے لگے (یعنی جب جھوٹ سیح کی تمیز جاتی رہی) ہم آپؐ کی طرف منسوب کر کے حدیثیں بیان کرنا ہی چھوڑ دیا۔

إِنَّا كُنَّا نَحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ لَمْ يَكُنْ يَكْذِبُ عَلَيْهِ فَلَمَّا مَكَبَتِ النَّاسُ الصَّعْبَ وَالذَّلُولَ تَرَكَنَا الْحَدِيثَ عِنْدَهُ (مقدمہ صحیح مسلم باب النسخ من الروایۃ من الضعفا)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ کی نہایت سے بچنے کے لیے اور وضع حدیث کے فتنے کو بے اثر بنانے کے لیے یہ احتیاط کی انتہائی حد تھی کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے حدیث روایت کرنا ہی ترک کر دیا تھا اور صرف حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ہی نہیں معلوم آیا ہوتا ہے دیگر صحابہ نے بھی یہی طریقہ اپنا لیا تھا کیونکہ حضرت ابن عباسؓ نے بملے صیغہ واحد کے جمع کا صیغہ ترک استعمال فرمایا ہے۔

غرض وضع حدیث کا فتنہ عہد رسالت کے بہت عرصے بعد خلافت راشدہ کے بالکل آخری سالوں میں رونما ہوا مگر اس کے ظہور کے ساتھ ہی صحابہ پوری طرح مستعد ہو گئے اور اس بات کا پلہ پورا خیال رکھا کہ کسی راستے سے بھی کوئی غلط بات اس طوع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے کہ اسے صحیح احادیث سے ممتاز نہ کیا جاسکے خود حضرت علیؓ کو کم اللہ وجہ بھی جن کے فضائل و مناقب پر بکثرت حدیثیں گھڑی جا رہی تھیں اس باب میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لانے میں انتہائی مستعد تھے۔ سبانی جس قسم کی بے سرو پا باتیں خود آپؐ کی طرف منسوب کر کے پھیلا رہے تھے جب کبھی بھی ان میں سے کوئی بات آپؐ تک

بہو بختی آپ منبر پر پہنچ کر فوراً اس کی تردید برسر عام فرماتے اور ایسے لوگوں علی الاعلان اپنی برادرت کا اعلان فرماتے حافظ ابن حجر لسان المیزان میں نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ جہنہ آدمی جن میں عبد اللہ بن سبا بھی شامل تھا کسی مقام پر یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضرت علی کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت علیؑ ایک خاص کیفیت کے انداز میں عبد اللہ بن سبا کے بارے میں فرمانے لگے :

میرا اس کاٹے گندے سے کیا واسطہ اللہ کی پناہ
جو میں ان دونوں (ابو بکر و عمر) کے بارے میں بجز
اچھی بات کچھ اور کہوں۔

مَا لِي وَلِهَذَا الْخَبِيثِ الْأَسْوَدِ مَعَاذَ
اللَّهِ أَنْ أَقُولَ لَهَذَا إِلَّا الْحَقَّ
الْجَمِيلُ (لسان المیزان جلد ۳)

ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خود عبد اللہ بن سبا کو اپنے پاس بلا کر پیسے تو بہت کچھ سمجھایا بچھایا کہ وہ اپنی دروغ گوئیوں سے توبہ کرے مگر جب اس پر کوئی اثر نہ دیکھا تو اس کے منہ پر فرمایا کہ قیامت سے پہلے جن تیس دجالوں کے پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے ان میں سے ایک تو بھی ہے۔

سہاں جب اپنی دروغ بانیوں سے کسی طرح باز نہ آئے اور ہر طرح کی تادیب کا ردیائوں کے باوجود جھوٹی حدیثیں گھر دگھر پھیلانے میں مصروف رہے تو بالآخر حضرت علی نے مجبور ہو کر ان لوگوں کو آگ میں جھونک دینے کا حکم صادر کر دیا اور حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ
قَدْ أَحَقُّهُمْ عَلَى خِلَافَتِهِ | (حضرت علی نے ان لوگوں کو اپنی خلافت
(لسان المیزان ص ۲۹)۔ | میں جلادیا۔

اس احتیاطی تدبیر کے علاوہ حضرت علی نے وضع حدیث کے نفع کی سرکوبی کے لیے ایک بڑا کام یہ کیا کہ تفصیل روایت یعنی حدیثیں بہت کم روایت کرنے کا طریقہ جو اب تک

آپ نے اپنے پیشرو خلفائے راشدین کے طرز پر اختیار کیا ہوا تھا ایک بحث ترک کر دیا اور روایتوں کی اشاعت میں تکثیر کا طریقہ اپنایا۔ ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق معلومات کے اس قیمتی ذخیرے کے مقابلے میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے چشم دید مشاہدات و سموعات پر مشتمل تھا ان بے سرو پا باتوں کی بھلا کیا وقعت باقی رہ سکتی تھی جو سبائی مختلف ذرائع سے پھیلاتے پھرتے تھے۔ سبائی موضوعات سے عام لوگوں کی توجہ ہٹانے اور اسے بے وقعت بنانے کی اس تدبیر سے ہمترا اور کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی تھی جو حضرت علی نے اختیار کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے متعلق جو معلومات بھی آپ کے پاس تھیں ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت شروع کر دی۔

اس کے علاوہ خود قبول حدیث میں اس قدر احتیاط سے کام لینے لگے کہ جب بھی کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث آپ کے سامنے بیان کرتا تو اس وقت تک اسے قبول نہ کرتے جب تک راوی سے اس پر قسم نہ لے لیتے۔

قبول حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے قسم کی اس شرط کے بارے میں اور روایتوں کی اشاعت میں تکثیر کا طریقہ اپنانے سے متعلق تفصیلی بحث ہم نے اسی کتاب کے پہلے حصے میں ”حفاظت حدیث اور خلفائے راشدین“ کے عنوان کے تحت بیان کی ہے قارئین مراجعت فرمائیں۔

بہر حال ہمیں بتلانا یہ تھا کہ وضع حدیث کا فتنہ تقریباً ۳۳۰ھ ہجری اور ۳۳۰ھ ہجری کے درمیانی عرصے میں رونما ہوا اولین واضح حدیث سبائی اور شیخہ تھے مگر وضع حدیث کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہی صحیح و غیر صحیح احادیث کے درمیان امتیاز قائم رکھنے کی کوششوں کی ابتدا بھی ہو گئی جو بعد میں چل کر مستقل ایک فن کی شکل اختیار کر گئی۔

امام بخاری کی چھ لاکھ حدیثوں کی اصل حقیقت | اب ہمیں وضع حدیث سے متعلق منکرین حدیث کے اعتراض کے

سلسلے میں ان کی صرف اس آخری بات کا جواب دینا ہے کہ امام بخاری کے زمانے میں چھ لاکھ حدیثیں رائج تھیں جن میں سے امام صاحب نے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔

ہم یہ تو نہیں سمجھتے کہ منکرین حدیث علم حدیث سے اس قدر بے برہ ہوں گے کہ اتنا بھی نہ جانتے ہوں کہ حدیثوں کی یہ چھ لاکھ کی تعداد طرق و اسانید کے لحاظ سے کتنی یا اپنے متون کے اعتبار سے اور نہ ہی ہم تاریخ حدیث سے انہیں اتنا تابلہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہوں کہ جو حدیثیں امام بخاری نے منتخب کی ہیں بس وہی صحیح ہیں اور باقی تمام روایات غیر صحیح ہیں البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ منکرین حدیث چونکہ علمی و باریک کٹھن کوئی پاس نہیں کرتے اس لیے وہ حقیقت حال سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود عام سادہ لوح ناواقف مسلمانوں کو یہی تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اول تو چھ لاکھ جتنی کثیر تعداد میں احادیث کا موجود ہونا محال و عجیب ہے چھ لاکھ میں سے نو ہزار کے انتخاب کا مطلب یہ ہوا کہ چھ لاکھ احادیث میں سے بس وہ نو ہزار تو امام بخاری کی نظر میں صحیح تھیں جو انہوں نے اپنی تصحیح میں لیں اور باقی پانچ لاکھ انہیں تو ہزار احادیث کو امام بخاری جعلی اور جھوٹی تصور کرتے تھے اسی لیے انہوں نے ان سب کو اپنی تصحیح میں نہیں لیا۔

در اصل یہ دونوں باتیں ہی خلاف واقعہ ہیں نہ اپنے الگ الگ مفہوم اور علیحدہ علیحدہ موضوع کے اعتبار سے احادیث کی تعداد چھ لاکھ ہے اور نہ یہ دعویٰ درست ہے کہ جو حدیثیں امام بخاری نے اپنی تصحیح میں لی ہیں ان کی نظر میں بس وہی صحیح تھیں باقی تمام احادیث کہ وہ جعلی اور جھوٹی خیال کرتے تھے۔

حقیقت اصل یہ ہے کہ محدثین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو متون کے اعتبار سے نہیں بلکہ ان کے طریق قول اور ان کی سندوں کے اعتبار سے کہتے تھے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل یا آپ سے متعلق کوئی واقعہ اگر ایک سند سے روایت ہوا ہے تو محدثین کے نزدیک وہ ایک حدیث ہے لیکن وہی قول یا فعل یا آپ

متعلق وہی واقعہ ایک سند کے بجائے متعدد سندوں سے روایت ہوا ہے تو محدثین اس کو ایک حدیث کے بجائے متعدد احادیث شمار کریں گے دراصل صحابہ سے احادیث اخذ کرنے والوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک ہی روایت کو جن صحابیوں سے ممکن ہو سب سنا جائے چہرکہ راویوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ روایت اپنی قطعیت میں بلند ہوتی جاتی تھی اس لیے ہر راوی اپنی روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ راویوں کی تلاش میں رہتا تھا شروع شروع میں تو یہ سلسلہ مختصر ہی رہا مگر مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ راویوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تا آنکہ امام بخاری کے زمانہ تک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک قول ایک ایک فعل اور آپ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ بکثرت بہت سی سندوں سے روایت ہونے لگا اور اس طرح احادیث کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور جیسا کہ اسی کتاب کے پہلے حصے میں ہم کہیں لکھ آئے ہیں کہ منون کے اعتبار سے صحیح احادیث کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ ہے اور اگر صحیح کے ساتھ دیگر تمام قسم کی احادیث بھی جمع کر لی جائیں تب بھی تمام حدیثوں کی تعداد بشمول موضوع احادیث پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ہے تو یہ چند ہزار احادیث کی تعداد بکثرت مختلف راویوں سے روایت ہونے کی بنا پر لاکھوں تک پہنچ گئی۔

اس اعتبار سے یہ بات تو بالکل صحیح ہے کہ امام بخاری کے زمانہ میں چھ لاکھ حدیثیں رائج تھیں بلکہ چھ لاکھ ہی نہیں اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تھیں مگر یہ شمار تعدد طرق کی بنا پر تھا یعنی بکثرت راویوں سے مروی ہونے کی بنا پر تھا احادیث کے مفہوم و معنوں کے اعتبار سے نہ تھا۔ ذرا اندازہ کیجئے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد انما الاعمال بالنیات اپنے مضمون کے اعتبار سے تو صرف ایک ہی حدیث ہے مگر چونکہ اس کے راویوں کی تعداد سات سو سے بھی متجاوز ہے اس لیے محدثین اس کو ایک حدیث نہیں بلکہ سات سو حدیثیں شمار کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ حدیثوں کی تعداد کا تعین کرتے وقت اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ امام بخاری کے دور تک حدیث کے لفظ کے اطلاق میں اس قدر

توسیع اور کشادگی آگئی تھی کہ صحابہ کرام کے اقوال و فتاویٰ نیز تابعین و تبع تابعین تک کے ملفوظات کو اصطلاحاً حدیث میں شامل سمجھا جانے لگا تھا احادیث کے شمار کا لاکھوں کے عدد تک پہنچنا کچھ اس بنا پر بھی تھا۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بات کو سمجھئے کہ احادیث کے انتخاب میں امام بخاری کا طریقہ کیا تھا۔ امام بخاری کا طریقہ یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول کوئی فعل یا آپ سے متعلق کوئی واقعہ جتنی سندوں کے ذریعے ان تک پہنچتا تھا ان میں سے جو جو سندان کی شدہ لطافت پر پوری اترتی تھیں ان تمام

سندوں سے امام بخاری اس روایت کو لے لیتے تھے اور جو سندیں ان کے معیار پر پوری نہ اترتیں ان کو چھوڑ دیتے لیکن اس کے ساتھ ہی امام بخاری نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو حدیثیں انہوں نے منتخب کی ہیں بس وہی صحیح ہیں باقی تمام روایات غیر صحیح ہیں بلکہ وہ تو اس کے بالکل عکس بالتصریح یہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سی صحیح احادیث خوف طوالت کی وجہ سے چھوڑ دی ہیں۔ تہذیب المنوی میں امام بخاری کا یہ قول موجود ہے کہ ”میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث داخل نہیں کی ہے جو صحیح نہ ہو مگر بہت سی صحیح حدیثیں صرف اس لیے چھوڑ دی ہیں کہ کہیں کتاب طویل نہ ہو جائے“ جب مولف خود یہ کہہ رہا ہے کہ میری کتاب نے تمام صحیح احادیث کا احاطہ نہیں کیا تو بھلا کسی دوسرے کو یہ کہنے کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ مولف کی کتاب نے تمام صحیح احادیث کا احاطہ کر لیا ہے باقی جو کچھ ہے وہ غیر صحیح ہے بلکہ امام بخاری نے تو اپنے ایک اور قول میں جس کو محدث حازمی نے اپنی تصنیف ”شروط الائمة الخمسة“ میں نقل کیا ہے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ جو صحیح حدیثیں میں نے چھوڑ دی ہیں وہ ان صحیح حدیثوں سے تعداد میں زیادہ ہیں جو میں نے اپنی کتاب میں لی ہیں۔ اب بتلائیے ایک طرف منکرین حدیث کا یہ دعویٰ ہے کہ صحیح بخاری کے علاوہ جتنی احادیث ہیں وہ امام

بخاری کی نظر میں غیر صحیح ہیں دوسری طرف صحیح بخاری کے خود مؤلف کا کہنا ہے کہ میری تالیف میں ساری صحیح احادیث جمع نہیں ہو سکیں جتنی صحیح احادیث میں نے اپنی تالیف میں جمع کی ہیں اس سے زیادہ صحیح احادیث میں نے طوالت کے خوف سے چھوڑ بھی دی ہیں ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کس کی بات ماننے کے قابل ہے اور کس کی رد کر دینے کے قابل۔ صحیح بخاری کے مؤلف امام بخاری کی یا نرم گدوں پر بیٹھ کر حدیث کا انکار کرنے والوں کی؟ اس حقیقت کا ثبوت کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں تمام صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام نہیں کیا امام بخاری کے اس قول سے بھی ملتا ہے جس کو محمد ابن حمدویہ نے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد بن اسماعیل بخاری کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں۔“ اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ ایک لاکھ صحیح احادیث میں سے آپ نے صرف نو ہزار کو اپنی صحیح میں لیا ہے باقی ایک نوے ہزار صحیح احادیث ایسی ہیں جن کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس لیے نہیں لیا کہ کہیں کتاب طویل نہ ہو جائے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے منکرین حدیث ناواقف حال لوگوں کو ایک اور مغالطہ بھی دیا کرتے ہیں وہ اپنے موقف کے حق میں دلائل بیان کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ علم حدیث میں صحیح کا لفظ سچی حدیث کے معنی میں مستعمل ہے گویا صحیح کے ماسوا جتنی حدیثیں ہیں وہ سب جھوٹی شمار ہوتی ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، علم حدیث کی اصطلاح میں ”صحیح“ سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحت کی مخصوص قسم کی شرائط پائی جاتی ہوں اس سے کم تر درجے کی سندوں کے لیے یعنی ان سندوں کے لیے جو ثقہ اور تاویل اعتماد تو ہوتی ہیں مگر اتنی اعلیٰ درجے کی نہیں ہوتیں محدثین ”صحیح“ کے لفظ کے بجائے دوسرے مختلف الفاظ مثلاً ”صحیح غیرہ“ ”حسن لذاتہ“ اور ”حسن لغیرہ“ استعمال کرتے ہیں اس لیے علم حدیث میں جہاں کہیں ”حدیث صحیح“ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس سے یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ ”حدیث صحیح“

کے سوا باقی جتنی حدیثیں ہیں وہ سب جھوٹی ہیں۔

بہر حال اب تک کی گفتگو سے تاریک پر واضح ہو گیا ہو گا کہ وضع حدیث سے متعلق جتنی بھی باتیں منکرین حدیث کی جانب سے کہی گئی ہیں سب بے بنیاد ہیں۔ ابتدائیں منکرین حدیث کے جن چند اعتراضات کا ہم نے حوالہ دیا تھا ان میں ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلا نمبر وضع حدیث سے متعلق اعتراض ہی کا تھا جس پر اب تک ہم گفتگو کرتے رہے۔ اب ہم ان کے دوسرے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۲۔ **خلافت عقل و درایت**
روایات کی اصل حقیقت

دوسرے نمبر پر جس اعتراض کا ہم نے اوپر ابتداء ذکر کیا ہے وہ خلافت عقل و درایت روایات سے متعلق ہے منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ بعض احادیث خلافت عقل و درایت ہیں اس کے باوجود محدثین کے یہاں انہیں صحت کا درجہ حاصل ہے حالانکہ یہ ناممکن ہے کہ اللہ کا رسول کوئی ایسی بات کہے جو عقل اور درایت کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ چند ایسی احادیث بھی پیش کرتے ہیں جو انہیں خلافت عقل نظر آتی ہیں۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ احادیث بنوہ کو اسی ترازو میں تولتے ہیں جس میں عام غیر بنی انسانوں کے اقوال و اخبار کو تول جاتا ہے دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب و مقام ان لوگوں کی نظر میں ہے ہی ایک عام انسان کا ان کے نزدیک اللہ کے رسول کے کلام میں نہ تو روحی کی کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے اور نہ قرآن کے علاوہ کسی اور صورت میں اس پر غیبی امور منکشف ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے رسول میں سوائے اس کے کہ اس پر قرآن کا نزول ہوا ہے کوئی اور ایسی غیر معمولی بات سرے سے پائی ہی نہیں جاتی جو اسے عام بنی نوع انسان سے ممتاز و ممتاز کر دے۔ اس بنیادی غلطی کے نتیجے میں منکرین حدیث بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو پرکھنے کے لیے وہی مقیاس و معیار مقرر کرتے ہیں جو عوام الناس کی باتوں کو پرکھنے کے لیے عام طور پر معروف خیال کیا جاتا ہے۔ منکرین حدیث کی ساری غلط

فہمیاں دُور ہو سکتی ہیں اگر وہ اُصولی طوعہ پر اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے فرستادہ اور جوامح الکلم کے حامل تھے، آپ کی روحانی بلندی ملا، اعلیٰ کے ساتھ ملی ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ کے ہر قول اور ہر فعل سے نور و حکمت اور علم و معرفت کے سوتے پھوٹتے تھے اور آپ ان غیبی اسرار سے آگاہ تھے جن سے کوئی دوسرا بشر آگاہ نہیں ہے۔

اس اُصولی حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بھی حدیث کسی بھی صورت میں خلافتِ عقل و درایت نظر نہ آئے گی اس لیے کہ عقلاً یہ عین ممکن ہے کہ آپ ملا، اعلیٰ سے براہِ راست رابطہ رکھنے کی بنا پر کوئی ایسی بات ارشاد فرمائیں جو ایک مخصوص زمانے کے لوگوں کے لیے بالائے فہم و ادراک ہو مگر وہی ارشاد آنے والے اس دور کے عین مطابق ہو جب انسانی فہم و ادراک تے ترقی کی نئی منازل طے کر لی ہوں۔ اسی طرح عقلاً اس بات کا بھی امکان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رحی الہی کی بنیاد پر کسی ایسے علمی معجزے کی خبر دی ہو جو ابھی ظہور میں نہیں آیا اور اس لیے ہماری محدود عقل اس کو سمجھنے سے قاصر ہو نیز اس میں بھی کوئی عقلی استحالہ درپیش نہیں کہ غیبی اسرار پر مطلع ہونے کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمادیں جو آج کے معلوم و معروف حقائق سے ہم آہنگ نہ ہو لیکن آگے چل کر اس حقیقت پر سے پردہ اٹھ جائے اور کھلی آنکھوں سب کچھ مشاہدہ ہو جائے۔

یہ تو ایک اُصولی بات تھی لیکن جہاں تک امر واقعہ کا تعلق ہے کوئی بھی صحیح حدیث منقطع ہے ہی نہیں اتنی بات تو معترضین بھی مانیں گے کہ غلامِ عقل وہ چیز ہو کر رہی ہے جس سے کوئی محال لازم آئے تو پورے ذخیرہ حدیث میں پوری تحقیق و جستجو کے بعد بھی کوئی ایک صحیح حدیث بھی خواہ وہ صحت کے نچلے درجے ہی کی کیوں نہ ہو ایسی نہیں ملے گی جس سے کوئی محال لازم آتا ہو البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حدیث کی جانچ پرکھ کے لیے عقل کی سلامتی ایک شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے وہ عقل جو رلیص اور بیمار نہ ہو جو انسانی ظلمتوں اور غاصبانہ نہماستوں سے آلودہ نہ ہو اور وہ عقل جو حق کی تلاشی ہو کسی تعصب کا شکار

نہ ہو حدیث کی جاچ پر رکھ کے لیے ایسی ہی عقل کی ضرورت ہے۔ مریض اور بیمار عقل یا وہ عقل جو کسی تعصب کے زیر اثر ہو حدیث کی جاچ پر رکھ کی صلاحیتوں سے محروم ہوتی ہے اس لیے کہ وہ مخصوص جذبات و احساسات سے مغلوب ہوتی ہے نتیجتاً اپنے نظریات و افکار کی بنیاد ایسے شکوک و شبہات پر رکھتی ہے جو کوتاہی فکر و نظر اور غفلت پر مبنی ہوتے ہیں ایسی عقل شتر بے ہمار کی طرح ہوتی ہے ایسی عقل کو نقد حدیث کی اجازت دے دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے خود اس بات کا سامان مہیا کر دیا کہ سنت صحیحہ کے لیے سرے سے کوئی مضبوط اساس ہی باقی نہ رہے۔

علاوہ ازیں ہر کہ و مہ کی عقل کو نقد حدیث کے لیے حکم ٹھہرانا یوں بھی خود خلاف عقل ہے کون نہیں جانتا کہ مختلف اشخاص کے اعتبار سے عقل کے درجات بھی مختلف و متعدد ہوتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز کو ایک شخص درست اور صحیح سمجھتا ہے جبکہ اسی چیز کو دوسرا شخص غلط اور غیر صحیح خیال کرتا ہے عین ممکن ہے کہ ایک چیز ایک شخص کی سمجھ سے بالاتر ہو مگر دوسرے شخص کے لیے وہی چیز اس کے فہم و ادراک کے بہت قریب نظر آتی ہو یہی وجہ ہے کہ تمام امور میں رائے وہی وقع خیال کی جاتی ہے جو منطقہ امور کے ماہرین کی جانب سے دی گئی ہو اس لیے کہ وہ ان امور کے مالہ اور ماعیلہ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ نقد حدیث کا بھی بالکل یہی معاملہ ہے اس کے لیے بھی اگر یہ ماہرین حدیث ہی کی رائے کو وقعت حاصل ہے تاہم معترضین اگر ماہرانہ صلاحیتوں سے محروم ہوں تو کم از کم ان سے ہمارا اتنا مطالعہ تو کسی طرح بھی بے جا نہیں کہ وہ اپنے اذہان کو نفسانی ظلمتوں اور نجاستوں سے پاک کر کے نیز انہی آنکھوں پر سے تعصب کی عینک اتار کر احادیث نبوی میں غور کریں انشاء اللہ ان کو کوئی ایک حدیث بھی خلاف عقل و درایت نظر نہ آئے گی۔

نقد حدیث کے لیے عقل کے اصل معیار پر اس اصول گفتگو کے بعد اب ہم

نمونے کے طور پر چند ایسی روایات کا جائزہ لیں گے جو عقل کے عین مطابق ہونے کے باوجود منکرینِ حدیث کو خلاف عقل و درایت نظر آتی ہیں تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ معتصرِ ضیق کا ذہن کس انداز سے سوچتا ہے اور اصل حقیقت کیا ہے تاہم انشاء اللہ خود دیکھ لیں گے کہ خلاف عقل احادیث نبوی نہیں بلکہ وہ منفی سوچ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی احادیث کے بارے میں منکرینِ حدیث نے اپنائی ہوئی ہے۔

سُورج کی سجدہ ریزی | مثال کے طور پر پہلی حدیث وہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب بدو الخلق میں باب صفت الشمس القمر میں حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے اور جس میں سُورج کا عرش کے نیچے سجدہ کرنا اور دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگنا مذکور ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج غروب ہوا تو حضرت ابوذر سے فرمایا جانتے ہو سورج کہاں جاتا ہے میں نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں آپ نے فرمایا وہ جاتا ہے اور عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے پھر (طلوع ہونے کی) اجازت مانگتا ہے اور اسے اجازت دے دی جاتی ہے اور عنقریب وہ وقت آئے گا کہ وہ سجدہ کرے گا مگر قبول نہ ہوگا اور اجازت مانگے گا مگر اسے اجازت نہ ملے گی اسے حکم ہوگا کہ پلٹ جائے جہاں سے آیا ہے اور پھر وہ مغرب سے طلوع ہوگا اور یہی مطلب ہے اللہ کے اس قول کا کہ آفتاب اپنے مستقر پر چلتا رہتا ہے یہ اندازہ باندھا ہوا ہے نہ بروہت اور علم والے کا۔

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا بِي ذَرِّحِينَ غَرِبَتِ الشَّمْسُ تَدْرِي أَيْنَ تَذْهَبُ قُلْتُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّهَا تَذْهَبُ حَتَّى تَسْجُدَ تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَسْأَلُ فَيُؤْذَنُ لَهَا وَتُؤْمِنُ أَنْ تَسْجُدَ فَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا وَتَسْأَلُ فَلَا يُؤْذَنُ لَهَا يَقَالُ لَهَا ارْجِعِي مِنْ حَيْثُ جِئْتِ فَيُطْلَعُ مِنْ مَغْرِبِهَا فَذَلِكَ قَوْلُهُ تَعَالَى وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (بخاری کتاب بدو الخلق باب صفت الشمس والقمر)

اس حدیث میں منکرین حدیث کو جو باتیں خلاف عقل نظر آتی ہیں وہ مختصراً کچھ اس طرح ہیں کہ
(۱) سورج بھلا سجدہ کس طرح کر سکتا ہے سورج کا سجدہ میں گر پڑنا کسی طرح عقل میں آنے
والی بات نہیں۔

(۲) اس حدیث میں طلوع و غروب کو سورج کی گردش کا نتیجہ بتلایا گیا ہے حالانکہ آج ایک
سکول کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ طلوع و غروب سورج کی گردش کا نہیں زمین کی گردش
کا نتیجہ ہے۔

(۳) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا بھی سراسر خلاف عقل ہے۔

اب ہم ایک ایک کر کے ان تینوں شبہات کا جواب دیتے ہیں جہاں تک سورج کے
سجدے میں گر پڑنے کا تعلق ہے تو حیرت ہے منکرین حدیث کی بیمار عقل اتنی سی بات نہ
سمجھ سکی کہ سورج کا سجدہ وہ سجدہ نہیں ہے جو زمین پر سڑنیک کر کیا جاتا ہے بلکہ وہ سجدہ
ہے جو اظہار عبودیت کے لیے اس کائنات کا ذرہ ذرہ ہمہ وقت اپنے رب کے سامنے کرتے
رہنے پر مجبور ہے قرآن زمین و آسمان کی ہر چیز کو اللہ کے آگے سجدہ ریز قرار دیتا
ہے مثلاً قرآن کہتا ہے **وَلِلّٰهِ لِسْجُدٍ مِّنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا**
وَضَلٰلًا لَهُمْ يٰۤاَعْدُوْا وَالْاَصْحٰلِ (جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں چاروں اچا اللہ ہی کو سجدہ
کرتے ہیں اور صبح و شام ان کے سامنے) (بھی اسکا کو سجدہ کرتے ہیں) (الرعد - ۱۵) یا اسی طرح ایک
مقام پر قرآن کریم ستاروں اور درختوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے
سر بسجود ہیں چنانچہ سورہ رحمن میں ہے **وَالْبُحْمِ وَالشَّجَرِ لِسْجُدٍ اِنْ (بنجم و شجر اس کے سامنے**
سجدہ ریز ہیں - الرحمن - ۶) تو اب کیا قرآنی آیات کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ
چونکہ فلاں فلاں آیت میں خلاف عقل مضمون بیان ہوا ہے جس کا صدور اللہ سے ممکن
نہیں اس لیے اس قسم کی تمام آیات معاذ اللہ موضوع اور ناقابل اعتبار ہیں۔ منکرین
حدیث جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں ذرا بتلائیں کہ متذکرہ بالا قسم کی آیات
قرآنی میں سجدے سے کونسا سجدہ مراد ہے۔ جو مراد وہ ان آیات کی بیان کریں گے
وہی مراد ہماری جانب سے محولہ بالا حدیث نبوی کے بارے میں سمجھ لیجئے ظاہر ہے اس

قسم کی آیات قرآنی میں سجدے سے مراد سجدہ تسخیری ہے یعنی کلیتہً امر رب کا تابع ہونا، بس یہی سجدہ تسخیری بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تسبیح تحت العرش سے بھی مراد ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخاطب کو بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ سورج ہر آن اللہ تعالیٰ کے حکم کا تابع ہے اس کا طلوع بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے اور اس کا غروب بھی یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ چونکہ سورج کا مغرب ایک نہیں ہے بلکہ قرآن کی رو سے بہت سے مغرب ہیں جیسے قرآن کہتا ہے **بوت المشرق والمغرب** (مشرق اور مغربوں کے مالک کی قسم۔ الماعز۔ ۹۰) اور سورج ہر آن ایک خطہ زمین میں غروب اور ہر آن دوسرے خطے میں طلوع ہوتا رہتا ہے تو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں سجدہ ریزہ ہو کر طلوع و غروب کی اجازت مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ سورج ہر آن اور ہر لمحہ امر الہی کا تابع ہے۔

رہا منکرین حدیث کا دوسرا شبہ کہ اس حدیث میں طلوع و غروب کو سورج کی گردش کا نتیجہ سمجھا گیا ہے جبکہ سائنسی تحقیق بتلاتی ہے کہ طلوع و غروب زمین کی گردش کا نتیجہ ہے تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ سائنسی تحقیقات کو جن کا ہمیشہ بدلتے رہنا تجربے سے ثابت ہو چکا ہے قرآنی آیات یا احادیث نبوی کے لیے معیار ٹھہرانا خود خلاف عقل ہے عین ممکن ہے کہ جو سائنس آج سورج کو ساکن اور زمین کو متحرک قرار دیتی ہے کل اس کی تحقیق بدل جائے اور وہ زمین کو ساکن اور سورج کو متحرک قرار دینا شروع کر دے چنانچہ اس رخ پر سائنس نے سوچنا شروع کر بھی دیا ہے تو اول تو یہ معیار ہی غلط ہے۔ دوسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ اتنی بات تو معتبر نہیں کہ بھی تسلیم ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبیعیات یا کیمیا کے مسائل نبی نزل انسان کو سکھانے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ عرفان حقیقت بخشنے اور فکر و عمل کی اصلاح کرنے کے لیے تشریف لائے تھے آپؐ نے زمین یا سورج کا ذکر کیا ہے تو یہ بتلانے کے لیے نہیں کیا کہ ان میں سے کون متحرک ہے اور کون ساکن بلکہ یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ زمین اور سورج دونوں کا مالک و خالق صرف ایک ذات ہے جس کا نام اللہ ہے

اب اس حقیقت کی تعلیم دینے کے لیے عقل کیا کہتی ہے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس علم اشیاء سے مدد دینی چاہیے تھی جو آپ کے زمانے میں موجود تھا یا اس کو چھوڑ کر ہزار ڈیڑھ ہزار سال بعد کے علم اشیاء کو اس حقیقت کی تعلیم کا ذریعہ بنانا چاہیے تھا ظاہر ہے عقل کا فیصلہ ہی ہوگا کہ اپنے ہی زمانے کے علم اشیاء سے کام لینا حکمت تبلیغ کے عین مطابق ہے اگر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان حقائق کو ذریعہ تعلیم بناتے جو صدیوں بعد انسان کے علم میں آنے والے تھے تو آپ کی تعلیم آپ کے عہد کے لوگوں میں مقبول تو کیا ہوتی سمجھ ہی میں نہ آتی لوگ اصل تعلیم کو چھوڑ کر اس بحث میں پڑ جاتے کہ آخر وہ کونسی دُنیا ہے جس کی ایسی عجیب و غریب باتیں آپ سنا رہے ہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی اگر زیر بحث حدیث کا مضمون اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اس انداز سے بیان کیا جاتا کہ صنفِ داللا طلوع و غروب کا سبب سورج کے بجائے زمین کی حرکت کو سمجھا تو آج کی دُنیا کی نظر میں تو بے شک وہ ایک علمی معجزہ ہوتا مگر خود آپ کے زمانے کے لوگوں کے بارے میں معترضین کا کیا خیال ہے۔ وہ اس علمی معجزے کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے؟ اور پھر اس علمی معجزے کے معنی کی بھول بھلیوں میں پھنس جانے کی بنا پر وہ مضمون ان کے دل و دماغ میں کہاں تک اترتا جو فی الحقیقت سمجھنا مقصود تھا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کوئی ایک شخص بھی شاید بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے متاثر ہو کر نہ دیتا اور جب آپ کے زمانے کے لوگ ہی ایسے علمی معجزوں کی بدولت ایمان لانے سے محروم رہ جائے تو یہ علمی معجزے بعد کی نسوں تک پہنچتے ہی کیا کہ ان سے داد و سول کرتے۔ غرض حکمتِ تبلیغ اسی طرزِ عمل کی متقاضی تھی جو آپ نے اختیار فرمایا کہ اپنے زمانے کے لوگوں کے علم و فہم کے مطابق ان سے کلام کیا اور جن حقائق کو آپ لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے ان کی تفہیم کے لیے ان معلومات سے کام نہیں لیا جو صدیوں بعد ظہور میں آئیں۔

یہی سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی بات تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے جو ذات اس سورج کی خالق ہے اس کو تھامے ہوئے ہے اور جو ذات زمین کو ایک منضبط گردش میں رکھے ہوئے ہے وہی ذات اس پر بھی قادر ہے کہ اس سارے نظام کو الٹا

چلاد سے اور سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکلتا ہوا نظر آئے سائبسی نقطہ نظر سے بھی اس امر کا امکان موجود ہے کہ دُنیا کا تاون جذب و کشش یکایک ایک پلٹ کھائے اور تمام سیارے موجودہ رفتار کے مقابلے میں بالکل الٹ رفتار سے چلتا شروع کر دیں طبیعیات اور ہیئت کے موجودہ قوانین کو کوئی بھی اٹل نہیں مانتا ان قوانین میں تغیر واقع ہونے یا بالکل اس کے درہم برہم ہو جانے کے امکانات کی موجودگی کا ہر کوئی قائل ہے لہذا عین ممکن ہے کہ سورج کے طلوع و غروب کا موجودہ تاون یکایک بدل جائے اور سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو۔

سردی و گرمی اور
دونخ کی دو پھونکیں
دوسری ایسی ہی ایک اور حدیث جو منکرین حدیث کو خلاف عقل نظر آتی ہے وہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب مواقیت الصلوٰۃ میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اس کا متن ملاحظہ فرمائیے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا جب گرمی کا زور ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے (یعنی ٹھنڈے وقت میں) پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی اور کہا اے رب میرے ایک جھٹے نے دوسرے جھٹے کو کھالیا ہے۔ اللہ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دیدی ایک سانس کی جارے میں اور ایک سانس کی گرمی کے موسم میں اور وہ (گرمی کا سانس) اس سخت گرمی جیسا ہے جو تم محسوس کرتے ہو اور وہ (سردی کا سانس) اس سخت سردی جیسا ہوتا ہے جو تم محسوس کرتے ہو۔

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّہٗ قَالَ رَاۡذَا اَشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرَدُوا بِالصَّلٰۃِ لِاَنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فِیْہِمْ جَہَنَّمَ فَاَشْتَدَّتْ النَّارُ اِلٰی رِبِّہَا فَقَالَتْ یَا رَبِّ اَکُلْ بَعْضِیْ بَعْضًا فَاِذْ نَ لَهَا بِنَفْسِیْ نَفْسٍ فِی السَّتَارِ وَنَفْسٍ فِی الصِّیْفِ وَہُوَ اَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْحَرِّ وَہُوَ اَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ النَّارِ مِمَّنْ یُرِی
(بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب ابرؤ بالنہر)

منکرین حدیث کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک کی

وجہ سے ہوتی ہے نیز سردی اور گرمی کے موسم جہنم کی دو پھونکوں کے سبب سے آتے ہیں حالانکہ یہ سراسر غلط ہے مومموں کا تغیر زمین کی مداری گردش اور سوڈج کے قریب بعد کی بنا پر ہے۔

اس حدیث کے بارے میں بھی بنیادی بات یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ایک عالم طبیعیات کی حیثیت سے موسمی تغیرات کی وجہ بیان فرمانا نہیں ہے بلکہ آپ ایک نبی کی حیثیت سے گرمی کی تکلیف محسوس کرنے والوں کو جہنم کا تصور دلانا چاہتے ہیں۔ دوپہر کے وقت صحرائی عرب کی گرمی کا جو حال ہوتا ہوگا باسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے ایسی گرمی میں ظہر کی نماز کے لیے نکلنا واقعی بڑا شاق گذرتا ہوگا جنانچہ مسند امام احمد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے منقول بھی ہے کہ لم یکن یصلوا شدا علی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منھا (اس ظہر کی نماز سے بڑھ کر کوئی نماز اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق نہ تھی) اس پس منظر میں آپ دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس سے آپ کا مقصود دوزخ سے ڈرانا اور ان کاموں سے روکنا تھا جو انسان کو دوزخ کی طرف لے جانے والے ہیں۔ آپ کا یہ ارشاد قرآن کریم کے اس ارشاد سے ملتا جلتا ہے جو غزوہ تبوک کے موقع پر ان لوگوں کے لیے جو گرمی سے گھبرا کر جہاد پر نکلنے سے جی چڑا رہے تھے فرمایا گیا تھا کہ **وَقَالُوا لَا تَنْصُرُوا فِی الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدَّ حَرًّا** (انہوں نے کہا کہ اس گرمی میں جہاد کے لیے نہ نکلو (اے نبی) ان سے کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ اس گرمی سے زیادہ گرم ہے۔ توبہ - ۸۱) جس طرح قرآن دنیا کی گرمی کا جہنم کی گرمی سے مقابلہ اس لیے کر رہا ہے کہ پس منظر میں وہ لوگ ہیں جو گرمی سے گھبرا کر جہاد پر جانے سے ہچکچا رہے ہیں اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا کی شدید گرمی اور شدید سردی کو دوزخ کی محض دو پھونکوں کے برابر اس لیے بتا رہے ہیں کہ پس منظر میں وہ لوگ موجود ہیں جو جاڑے میں صبح کی اور گرمی میں ظہر کی نماز کے لیے گھروں سے نکلنا شاق سمجھ رہے ہیں۔

فَإِنْ شَدَّ الْحَرُّ مِنْ فِیْجِ جَهَنَّمَ كُنْ مِنْ نَبِیِّ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد لازماً یہی نہیں ہے کہ دنیا میں گرمی جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہوتی ہے بلکہ اس سے آپ کی مراد

یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ جہنم کی پھونک کی قسم یا جنس سے ہے اس لیے کہ عربی زبان میں لفظ جنس بیان جنس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح گرمی اور سردی کے موسموں کے بارے میں آپ کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ یہ دونوں موسم جہنم کی درپھونکوں کے سبب سے آتے ہیں بلکہ آپ کا کہنا ہے کہ اللہ نے دوزخ کو دو سالنوں کی اجازت دی ایک سال سردی کے موسم میں اور ایک سال گرمی کے موسم میں اور یہ جو تم گرمی سردی محسوس کرتے ہو اس کو دوزخ کے انہی دو سالنوں پر قیاس کر لو۔ غرض جس شخص نے بھی قرآن اور سیرت نبوی میں کچھ بھی غور کیا ہو گا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متذکرہ حدیث سن کر بلا تامل کہ اُسے گٹھ کا کہ اس میں آپ نے طبعیات کے کسی مسئلہ کو نہیں بلکہ جہنم کی شدت گرمی کو ذہن نشین کرانا چاہا ہے۔

گر گٹ کی پھونکیں | ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیے جس کا مضمون منکرین حدیث کو خلاف عقل نظر آتا ہے حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا

سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گر گٹ کو مارنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت ابراہیم پر آگ پھونکتا تھا۔

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
أَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزْغِ وَقَالَ كَانَ يَنْفُخُهُ
عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ
(بخاری کتاب الانبیاء باب قل اللہ تعالیٰ۔
وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا۔)

اس حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کو عقلی استحالہ یہ درپیش ہے کہ آخر ایک گر گٹ کی پھونکوں میں آگ بھڑکاتے کی طاقت کہاں سے آگئی اور پھر ایک گر گٹ کے بدلے میں گر گٹوں کی ساری نسل کو سزا دینا کہاں کا انصاف ہے؟

منکرین حدیث اس حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے اگر ان احادیث پر بھی نظر ڈال لیتے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وناغ یعنی گر گٹ کو

قَوْلِ سَقِّ لَعْنِ مَوْذِي جَانُودٍ مِّنْ سَعْدِ قَرَارِ دِيَا هُوَ تَوَانُ كُوْمُوْلُهُ بِالْأَحْدِيثِ مِّنْ كُوْنِيْ
عَقْلِيْ اسْتَحَالَهُ بِمِشْزَنِ آتَاوَرَاتِ بَخُوْبِيْ سَمَجْهِ مِّنْ آجَاتِيْ - دِرَاصِلِ بَنِيْ كَرِيْمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
نَے چنڊ جانوروں کو فواسق (موزی) قرار دے کر یہ فرمایا تھا کہ انہیں حرم میں اور حالت
احرام میں مار دینے کی بھی اجازت ہے ان میں پھو باؤ لاکت اور چوہا وغیرہ شامل ہیں اور
بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے گرگٹ کو بھی موزی قرار دیا تھا
اب اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے محولہ بالا حدیث کے مفہوم میں غور کیجئے اس حدیث کا
یہ مطلب نہیں ہے کہ گرگٹ کی پوری نسل کو اس لیے مار ڈالا جائے کہ اس کے ایک فرد نے
حضرت ابراہیم پر آگ بھڑکانی تھی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک موزی جانور ہے اور
اس کو دوسرے موزی جانوروں کی طرح انسان سے دشمنی ہے چنانچہ اس کی انسان دشمنی کا
اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سارے جانوروں میں سے یہی ایک جانور تھا کہ جب حضرت
ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اس نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی۔
یہی یہ بات کہ گرگٹ کی پھونک میں آگ بھڑکانے کی طاقت کہاں سے آگئی تو
حدیث میں یہ کہا ہی کب گیا ہے کہ وہ آگ گرگٹ کی پھونکوں سے بھڑک اٹھی تھی حدیث
میں تو صرف گرگٹ کی انسان دشمنی کی مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس کی یہ دشمنی اس
حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ یہ حضرت ابراہیم پر آگ بھڑکانے کی کوشش کرتا رہا اگرچہ
اس کو شمش کا کوئی فائدہ نہ تھا لیکن اس جانور نے اپنی انسان دشمنی کے اظہار میں کوئی
کسر اٹھانہ رکھی۔

۱۔ ہر حال منکرین حدیث کی طرف سے پیش کی جانی والی اس قسم کی تمام احادیث کا
احاطہ کرنا ہمارا مقصود نہیں ہے ہم صرف یہ دکھلانا چاہتے تھے کہ اصل خرابی اس انداز
فکر میں ہے جو احادیث نبوی کے بارے میں منکرین حدیث نے اختیار کر رکھا ہے ورنہ
کوئی ایک صحیح حدیث بھی ایسی نہیں ہے جو عقل کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔

۳۔ احادیث نبوی اور عریاں مضامین

منکرین حدیث کا تیسرا اعتراض ان احادیث کے ہلے میں ہے جو بقول ان کے عریاں مضامین پر مشتمل ہیں ان کا کہنا ہے کہ بعض احادیث تو ایسے مضامین پر مشتمل ہیں

جو اخلاقی لحاظ سے معیوب خیال کیے جاتے ہیں جبکہ بعض احادیث ایسی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات کے درمیان خالصتاً ازدواجی تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی اکثر و بیشتر خود ازواج مطہرات کی زبانی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ازواج مطہرات آپ کی زندگی کے ایسے معاملات بھی لوگوں کو بتلا دیں اور بتلانے میں کوئی شرم محسوس نہ کریں جن کو عام طور پر میان بیوی کے سوا دوسرا کوئی نہیں جانتا اور نہ کسی دوسرے کو اس پر مطلع کرنا کوئی گوارا کرتا ہے۔

احادیث نبوی پر اس قسم کے تمام اعتراضات دراصل نتیجہ ہیں اس ضمن میں چند بنیادی باتوں کو نظر انداز کر دینے کا۔ اس قسم کے شبہات کو دل میں جگہ دینے سے پہلے اگر درج ذیل چند امور کو ذہن نشین کر لیا جائے تو احادیث کے بارے میں کوئی غلیظ بات نہ رہے اور اچھی طرح یہ بات سمجھ میں آجائے کہ یہ مضامین جو بظاہر عریاں اور معیوب نظر آتے ہیں انسانی زندگی کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے ان کا بیان کیا جانا کس قدر ضروری تھا۔

چند بنیادی باتیں

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو ذہن نشین کیے جانے کے لائق ہے یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک

ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جو تہذیب و تمدن کے بالکل ابتدائی درجے میں تھی آپ کے ذمے صرف یہی کام نہیں تھا کہ ان کے عقائد درست کریں بلکہ آپ کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ انہیں انسان بنائیں ان کی زندگی کو سنواریں انہیں شائستہ اخلاق سکھائیں اور انہیں پاکیزہ معاشرت، مہذب تمدن اور نیک معاملات کی تعلیم دیں۔ یہ مقصد ظاہر ہے محض وعظ و تلقین اور چند زبانی ہدایات کے ذریعے پورا نہیں ہو سکتا تھا اس کے لیے ضرورت تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی کو ان کے سامنے

انسانیت کا ایک مکمل نمونہ بنا کر پیش کریں اور ان کو پورا موقع دیں کہ وہ اس نمونے کا ایک ایک پہلو خوب اچھی طرح دیکھیں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالیں۔

دوسری بنیادی بات جو اس سلسلے میں ذہن میں رکھنی ضروری ہے یہ ہے کہ انسان کی داخلی زندگی کے چند گوشے ایسے ہیں کہ انسان کی جسمانی طہارت و نظافت کا بیشتر مدار انہی گوشوں کے درست ہونے پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود دوسری قوموں کے درمیان ان گوشوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں کوئی ہدایات صرف اس لیے نہیں ملتی کہ ان کے بارے میں شرم کا ایک بے جا احساس ہمیشہ ان کے اذہان میں موجود رہا ہے اسلام کا ہم پر یہ احسان ہے کہ اس نے ان گوشوں کے بارے میں بھی ہمیں ہدایات دیں اور ان کے متعلق قواعد و ضوابط بتا کر ہمیں غلطیوں سے بچایا۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاص شعبہ زندگی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھانے رکھی آپ جس قوم میں مبعوث ہوئے تھے اس خاص شعبہ زندگی میں اُس قوم کے لوگ ابتدائی ضابطوں تک سے ناواقف تھے بالخصوص تعلقات مرد و زن سے منسلک معاملات میں ان لوگوں کی ناشائستگی، ناپاکی اور بے حیائی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ذکر سے بھی کھن آتی ہے اس قوم کے لوگوں کا آپ نے نہ صرف تزکیہ نفوس کیا بلکہ ان کو طہارت جسم و لباس کے طریقے بھی سکھائے ان میں پاکیزگی کا نفیس ذوق پیدا کیا ان کو نجاست اور طہارت کی تمیز عطا کی زندگی بسر کرنے کے گندے کھناؤنے اور ناشائستہ طریقوں کو موقوف کر کے اپنے قول اور عمل سے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کو صفائی، نفاست اور نظافت کے آداب کا ثمر بنایا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت، استنجا اور غسل وغیرہ کے مسائل نیز ایسے ہی دوسرے مسائل ان لوگوں کو نہ صرف زبان سے سمجھائے بلکہ خود اپنی خالصتاً نجی زندگی کو ایک حد تک ان کے سامنے بے پردہ کر دیا تاکہ جو کچھ لوگ نہ پوچھیں یا نہ پوچھ سکیں یا جو باتیں آپ کو زبان سے بتاتے کا موقع نہ ملے وہ لوگوں کو آپ کا طریقہ زندگی دیکھنے سے معلوم ہو جائیں۔

اس سلسلے کی تیسری بنیادی بات یہ ہے کہ صحابہ کرام بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو

ایک مثالی انسان سمجھتے تھے اس لیے وہ ہمہ وقت، اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ زندگی کے ہر کام کے بارے میں انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کیا تھا وہ چیزیں جو محض گمان کی بنیاد پر یا مود و نصاریٰ کے زیر اثر حرام، مکروہ اور ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھیں ان کے متعلق صرف یہ سن کر صحابہ کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ شریعت میں وہ جائز ہیں، حکم جواز کے باوجود ان کے دلوں میں یہ شک باقی رہ جاتا تھا کہ شاید ان میں کوئی کراہت کا عنصر موجود ہو جو جب تک وہ یہ نہ جان لیتے تھے کہ فلاں فلاں کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کیا تھا اس وقت تک ان کے دلوں سے کراہت کا خیال نہیں نکلتا تھا یہ بھی ایک اہم وجہ تھی جس کے پیش نظر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خالصتاً خانگی زندگی کو ایک حد تک بے نقاب کرنا ضروری خیال فرمایا۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زبردست اثبات | ان تین بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھئے اور احادیث

بنوی کے مضامین پر عربیاں اور غیر اخلاقی ہونے کا الزام لگانے سے پہلے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ انہی تین وجوہ کے پیش نظر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کیسا زبردست اثبات تھا کہ آپ نے اپنی زندگی کے ہر شعبے کو قوم کی تعلیم کے لیے پبلک بنا دیا اپنی کسی چیز کو بھی پرائیویٹ نہ رکھا حتیٰ کہ ان معاملات کو بھی نہ چھپایا جنہیں دُنیا میں کوئی شخص دوسروں کے سامنے ظاہر کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا آپ نے لوگوں کو اذن عام دے دیا کہ آؤ ہر حال میں میری زندگی کے ایک ایک پہلو کو دیکھو اور زندگی کے ہر معاملے میں مجھ پر نظر رکھو کہ میں کیا طرز عمل اختیار کرتا ہوں آپ نے امت کے ایک ایک فرد کو اس بات کی کھلی اجازت دیدی کہ رفتار میں گھٹا رہیں، نشست و برخاست میں سونے اور باگنے میں عبادات و معاملات میں حتیٰ کہ اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے ساتھ تڑاؤ میں غرض ہر چیز میں ہر وقت اور ہر حال میں ہر کوئی آپ کے ایک ایک عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، دیکھنے والوں سے سنے اور جاننے والوں سے پوچھے یا خود آپ سے دریافت کرے اور اپنی زندگی کو اسی طرز پر ڈھالنے کی کوشش کرے۔ آپ نے اپنی ازواج مطہرات

کو بھی عام اجازت دے دی کہ خلوت میں آپ کا جو طرز عمل دیکھیں اس سے
 مردوں اور مردوں کی سب کو آگاہ کر دیں تاکہ لوگوں کی صرف ظاہری زندگی ہی نہیں
 باطنی اور مخفی زندگی بھی تہذیب و شائستگی اور طہارت و نفاہت کے نیر سے آراستہ
 ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا علم چونکہ ازواج
 مطہرات کے علاوہ اند کسی ذریعے سے ممکن نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اس ذریعہ
 تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لیے آپ کی ازواج مطہرات کو تمام مسلمانوں کے لیے حقیقی
 ماؤں کی سی حیثیت دے دی تھی اور ان کو افراد امت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام کر دیا
 تھا تاکہ مائیں اپنے بیٹوں سے کھل کر بات کریں اور ان کے روحانی باپ کی حرکات و
 سکنات میں سے ہر ہر چیز کو ان کے سامنے تقلید و پیروی کی خاطر حدود حلال و حرام
 سے واقفیت کے پیش نظر اور پاک و ناپاک میں تمیز کے لیے بیان کرتی رہیں اور اسی
 طرح بیٹے بھی تاکہ اپنی ماؤں کی خدمت میں حاضر ہو کر بلا جھجک زندگی کے مخفی سے مخفی
 تر گوشوں کے متعلق رہنمائی حاصل کر سکیں اور جانین میں ان مسائل پر گفتگو کرتے
 ہوئے کسی قسم کے ناپاک جذبے کی دخل اندازی کا خطرہ ہی باقی نہ رہے۔

وہ تمام احادیث جو منکرین حدیث کو عریاں مضامین پر مشتمل نظر آتی ہیں وہ سب
 کی سب وہ احادیث ہیں جن میں جنابت، جنس و نفاس، یا کی و ناپاکی، تعلقات مرد و زن
 سے منسلک مسائل اور ایسے ہی دیگر امور کی نسبت انسان کے طرز عمل کی تفصیلات
 بیان کی گئی ہیں ان احادیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور دیگر
 صحابہ و صحابیات کی زبان سے سن کر منکرین حدیث کا بیمار ذہن اس طرف تو گویا کہ
 ان احادیث کے مضامین عریاں، خلاف حیا اور غیر اخلاقی ہیں لیکن یہ نہ سوچا کہ اگر یہ
 احادیث نہ ہوتیں تو انسانی زندگی کے کیسے کیسے اہم معاملات سے متعلق مسائل سے ہم
 لاعلم رہ جاتے۔ یہ انہی احادیث کی بدولت تو ہے کہ نہ صرف اہل عرب بلکہ دنیائے
 کروڑوں ماکر و مفسدانوں کی نجی مخفی زندگی صفائی جسم، طہارت لباس اور پاکیزگی اطوار نیز
 صفی معاملات میں شائستگی و نفاہت کے ایک عام ضابطہ کی پابند ہو گئی۔ ان حالات

کو اگر محض شخصی ذوق اور انفرادی تمیز پر چھوڑ دیا جاتا تو ہم میں اکثر افراد کا حال اپنی زندگی کے محض شعبوں میں جانوروں سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتا۔ آج کی دنیا کی بزمِ خود متمدن غیر مسلم قوموں کا حال کس کو نہیں معلوم کھانے کے بعد منہ کی صفائی سے ناواقف رفع حاجت کے بعد جسم کی طہارت سے نابلد، بخت و طہارت کے تصور سے بے نیاز اور صنفی جذبات کی تسکین میں گھناؤنے اور گندے طریقوں کے عادی، ان میں اور جانوروں میں کوئی بھی تو فرق نہیں بلکہ قرآن کے الفاظ میں اولئک کالانعام بل هم اضل۔ یہ امادیت نہ ہونیں تو بلاشبہ ہمارا بھی یہی حال ہوتا۔

حق یہ ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت بڑا ایثار تھا کہ طبعاً انتہا درجے کے شریعے اور جہاد ہونے کے باوجود افراد امت کی تعلیم کے لیے حیا کے پردے کو اٹھادیا اور ہر قسم کے معاملات میں اپنی روحانی اولاد کو جن میں بیٹے اور بیٹیاں سب شامل تھے خود ہدایات دیں، ان کو اجازت دی کہ جو چاہیں بوجھیں اور ان کو اس کا موقع دیا کہ جہاں تک آپ کے اندرونی حالات سے وہ واقف ہو سکتے ہوں واقف ہوں خود بھی معلوم کریں اور دوسروں کو بھی بتائیں کہ ایک پاکیزہ مہذب اور شائستہ زندگی کیسی ہوتی ہے فی الحقیقت کیا زبردست ایثار ہے جس ذات پاک کی حیا کا یہ عالم تھا کہ اس کی شریک زندگی تک کو عمر بھر کبھی اسے برہنہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا حتیٰ کہ جس نے کبھی تنہائی میں بھی برہنہ ہونے کو پسند نہ کیا اس نے محض اپنی امت کو صفائی اور شائستگی کی تعلیم دینے کے لیے اپنی بیویوں کو کھلی اجازت دے دی کہ اس کی نجی زندگی کے محض سے محض واقعات تک کو لوگوں کے سامنے بیان کر دیں۔

متذکرہ بالا امور کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اگرچہ

چند روایات کا جائزہ

منکرہ بن حدیث کے زیر بحث اعتراض میں کوئی وزن نہیں رہتا تاہم اتمام حجت کے طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ احادیث جو اس ضمن میں محترفین کا تختہ مشق بنی ہیں ان میں سے چند احادیث کا نمونے کے طور پر تجزیہ کر کے یہ دکھا دیا جائے کہ اس قسم کی تمام احادیث دراصل ان مسائل پر مشتمل ہیں جو انسانی

زندگی کے مخفی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا انسان کے علم میں آنا اس کی اپنی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے از بس ضروری ہے۔

اس سلسلے کی جتنی احادیث منکرین حدیث کی جانب سے اپنے موقف کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں ان کو راویوں کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ احادیث جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے مروی ہیں دوسرے وہ احادیث جو ازواج مطہرات کے علاوہ دیگر صحابہ و صحابیات سے مروی ہیں ہم ان دونوں قسموں میں سے ہر ایک قسم کی چار پانچ احادیث کا نمونے کے طور پر تجزیہ کریں گے صرف یہ دکھانے کے لیے کہ منکرین حدیث کی سوچ کس قدر منفی اخراجات کی حامل ہے۔

اولاً ہم ازواج مطہرات کی روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔ چنانچہ درج ذیل چند احادیث ملاحظہ فرمائیے:

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بیوی کا بوسہ لیا پھر نماز کے لیے نکلے اور وضو نہیں کیا۔

(۱) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبَّلَ بَعْضَ نِسَائِهِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ (ترمذی المہذبۃ باب ترک الوضوء من القبلة)۔

ابو بکر بن حفص نے بیان کیا کہ میں نے ابو سلمہ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں اور حضرت عائشہ کے بھائی حضرت عائشہ کے پاس آئے اور ان سے ان کے بھائی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا حال پوچھا تو انہوں نے تقریباً ایک صاع پانی منگایا پھر انہوں نے غسل کیا اور اپنے سر پر پانی بہا یا اس حال میں کہ ہمارے اور ان کے درمیان پردہ عائل تھا۔

(۲) حَدَّثَنِي أَبُو بَكْرِ بْنُ حَفْصٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا سَلَمَةَ يَقُولُ دَخَلْتُ أَنَا وَأَخُو عَائِشَةَ عَلَى عَائِشَةَ فَسَالَهَا أَخُوهُ عَنْ غُسْلِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَتْ بَارِنًا نَحْوًا مِنْ صَاعٍ فَأَغْتَسَلَتْ وَأَنَا ضُتُّ عَلَى رَأْسِهَا وَبَيْنَنَا وَبَيْنَهَا حِجَابٌ۔ (بخاری - الفضل باب بالصاع ونحوه)

(۳) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ جَاءَتْ
أُمَّ سَلِيمٍ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ
اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَسْتَحْيِي
مَنْ الْعَقَّ فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ
غَسَلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ فَقَالَ رَسُولُ
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
نَعَمْ إِذَا لَأَتِ الْمَاءَ فَقَالَتْ أُمُّ
سَلَمَةَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَتَحْتَلِمُ
الْمَرْأَةُ فَقَالَ تَرَبَّيْتُ بِدَالٍ فِيمَ
يُشَبِّهُهَا وَلِدَهَا -

(المراة باب رجب الغسل على المرأة)

(۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ أَرْتَحِلُ
أَنَا وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
مِنْ رَأْنَاءٍ وَاحِدٍ كِلَانَا جُنُبٌ
وَكَانَ يَأْمُرُنِي فَأَتُرِفِيَا شِرْطِي
وَأَنَا حَالِضٌ وَكَانَ يُخْرِجُ
رَأْسَهُ إِلَيَّ وَهُوَ مَعْتَكِفٌ
فَأَغْسِلُهُ وَأَنَا حَالِضٌ
(بخاری کتاب الحیض باب مباشرة الحائض)

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ام سلمہؓ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر
ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ
حق بات سے نہیں شرماتا کیا عورت پر غسل واجب
ہے جب اسے اختلام ہو اور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ہاں جبکہ وہ پانی (مٹی)
دیکھے حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا کہ اللہ
کے رسول کیا عورت کو بھی اختلام ہوتا ہے
آپؐ نے فرمایا تیرے لائقوں کو مٹی لگے اختلام
نہیں ہوتا تو پھر حج عورت کے مشابہ کیونکر
ہوتا ہے -

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں اور
بنی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے نہاتے
تھے اور ہم دونوں جنبی ہوتے تھے اور آپؐ
مجھے حیض کی حالت میں ازراہ نڈھنے کا حکم
دیتے تھے پھر مجھ سے اعتکاف کرتے تھے
اور آپؐ اعتکاف کی حالت میں اپنا سر
(مسجد سے باہر) میری طرف نکال دیتے تھے
اور میں بحالت حیض اسے دھرتی تھی -

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ میں زہرتن سے (بانی بیٹی تھی اور پھر اسے بنی علی اللہ علیہ وسلم کی جانب بڑھا دیتی آپ اسی جگہ منہ رکھتے جہاں میں نے رکھ کر پیا تھا حالانکہ میں حیض سے ہوتی تھی اور اسی طرح میں حیض کی حالت میں ہڈی پر سے گوشت کھاتی تھی اور پھر اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کودے دیتی تھی اسلئے اس جگہ منہ رکھتے جہاں میں نے رکھا تھا۔

(۵) من عَالَشَهَ قَالَتْ كُنْتُ اشْرَبُ
وَأَنَا حَالِضٌ ثُمَّ أَنَا وَلَهُ النَّبِيُّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَضَعُ
نَازًا عَلَى مَوْضِعٍ فِي فَيْشَنَ ب
وَالْعَرَقِ الْعَرَقِ وَأَنَا حَالِضٌ
ثُمَّ أَنَا وَلَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فَيَضَعُ نَازًا عَلَى مَوْضِعٍ فِي
(مسلم کتاب اللہ باب جواز غسل الحائض
بِاس زوجھا)۔

یہ پانچوں احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ بیان ہوا ہے جو یا تو انسانی زندگی کے معنی شعبوں سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا تعلق جسمانی طہارت و نفاست سے ہے۔ یہ مسائل محترضین کے لیے کوئی اہمیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں مگر جن لوگوں کو اپنی زندگی احکام خداوندی کے مطابق گزارنی ہے ان کو تو بہر حال یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ زندگی کے ان معنی گوشوں کو رضائے الہی کے مطابق کیسے درست رکھا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی کے بعض معنی گوشوں کا ذکر میں کر مگر میں حدیث کا ذہن ان مخصوص گوشوں کی کیفیت و ماہیت کی طرف توجہ دلا گیا اور اسی لیے ان کے الفاظ میں سے انہیں عریانی جھانکتی نظر آنے لگی مگر ان کا ذہن اس طرف متوجہ نہ ہو سکا کہ اگر یہ ذکر نہ ہوتا تو انسانی زندگی کے یہ معنی گوشے اصلاح سے محسوس نہ جلتے۔ ان کی زبان پر یہ اعتراض تو فوراً آگیا کہ ایسی خالصتاً نجی نوعیت کی باتوں پر ازواج مطہرات کی یوں بے جا کادہ گفتگو توقع کے خلاف ہے مگر ان کے دماغ میں اتنی بات نہ آئی کہ یہ گفتگو ماؤں اور بیٹیوں کے درمیان ہے اور اس کا تعلق ایسے مسائل سے ہے جن کا علم بیٹیوں کو اپنی ماؤں کے ذریعے کے علاوہ اور کسی ذریعے سے ہو ہی

نہیں سکتا تھا۔

چلے جانے دیجئے معمر بن حدیث کو ان کے حال پر چھوڑنے آئے ہم فرداً فرداً ان پانچوں احادیث کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان میں کیسے ایسے مسائل کا حل بیان ہوا ہے۔

بوسہ ناقض وضو نہیں | پہلی حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل کی خبر دی ہے اور بتلایا ہے کہ آپ نے اپنی کسی زوجہ مطہرہ کا بحالت وضو بوسہ لیا اور اس کے بعد بغیر وضو کیے نماز پڑھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کی اطلاع دینے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصود یہ بتلانا ہے کہ بوسہ بجائے خود وضو توڑنے والی چیز نہیں ہے۔ دراصل بعض لوگ محض بوسہ لینے کو ناقض وضو سمجھنے لگے تھے ان کا خیال تھا کہ اس سے اگر وضو ٹوٹتا نہیں ہے تو کم از کم طہارت میں فرق ضرور آجاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا شک دور کرنے کے لیے متذکرہ بالا عمل نبوی کی خبر دینا پڑی تاکہ ثابت ہو جائے کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بوسہ لینے کے بعد بغیر وضو کیے نماز پڑھی ہے اس لیے بوسہ ناقض وضو نہیں ہے۔

غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہے | دوسری حدیث بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعلق ہے اس میں ذکر ہے کہ غسل کے

متعلق استفسار پر حضرت عائشہ نے پانی منگو کر اور پردہ لٹکا کر حضرت ابوسلمہ اور اپنے بھائی کی موجودگی میں غسل فرمایا۔ اس حدیث کے بارے میں سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی بھانجے تھے جنہیں حضرت ام کلثوم بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا نے دودھ پلایا تھا اس لحاظ سے اس حدیث میں مذکور وہ دونوں شخص جیسے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پردہ لٹکا کر غسل فرمایا آپ کے محرم ہی تھے ان میں سے غیر محرم

کوئی نہ تھا۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ منکرین حدیث حقیقت حال سے ناواقف لوگوں کے سامنے اس حدیث پر تبصرہ کچھ ایسے انداز سے کرتے ہیں جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوسلمہؒ کوئی غیر شخص تھے اس کے علاوہ پھر ایک زیادتی یہ کرتے ہیں کہ روایت میں تو صرف ”حجاب“ یعنی پردے کا ذکر ہے مگر ان لوگوں کے تبصرے سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ گویا پردہ ہائیک تھا چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر پردہ ہائیک نہ ہوتا تو حضرت عائشہؓ نہاتی ہوئی غطرتا سکتیں اور اس طرح غسل کے عمل کا جو مظاہرہ کرنا مقصود تھا وہ پورا نہ ہوتا حالانکہ اگر انہیں اس مسئلے کا علم ہوتا جو اس وقت ہمیشہ تھا اور جس کی تحقیق کے لیے یہ دونوں اصحاب اپنی خالہ اور من کے پاس گئے تھے تو انہیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ پردہ ہائیک ہونا چاہیے تھا۔

در اصل صحابہ کے درمیان بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہو سکتا ہے۔ بعض صحابہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ روایت پہنچی تھی کہ آپ ایک صاع بھر پانی سے غسل کر بیٹے تھے جبکہ اتنے پانی کو لوگ غسل کے لیے کافی سمجھتے تھے غلط فہم کی بنیاد فی الحقیقت یہ تھی کہ وہ غسل جنابت اور غسل نہضت صفائی بدن کا فرق نہیں سمجھ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے متفسرین کو مسئلے کی نزاحت سمجھانے کے لیے اپنے اور ان کے درمیان ایک پردہ ڈالا جس سے صرف ان کا سر اور چہرہ ان دونوں مسنرات کو نظر آتا تھا پھر ایک صاع بھر پانی ملکا کر اپنے اوپر بہایا۔ اس طریقے سے حضرت عائشہؓ متفسرین کو دو باتیں سمجھانا چاہتی تھیں ایک یہ کہ غسل جنابت کے لیے صرف جسم پر پانی بہانا کافی ہے دوسری یہ کہ اس مقصد کے لیے صاع بھر پانی کفایت کرتا ہے۔

عورتوں سے مخصوص ایک شرعی حکم | تیسری حدیث حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے یہ صریح عورتوں کو ایک

اہم شرعی حکم سے واقفیت مہیا کرتی ہے مسئلہ جس سے ایک عرب خاتون کو سابقہ ہمیشہ آگیا تھا یہ تھا کہ اگر ایک عورت اسی طرح کا خواب دیکھے صیام طویل یا بالغ مرد

دیکھا کرتے ہیں تو وہ کیا کرے اسے پاک ہونے کے لیے مردوں کی طرح غسل کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ چونکہ یہ صورت عورتوں کو بہت کم پیش آتی ہے اس لیے عورتیں اس کے شرعی حکم سے ناواقف تھیں۔ چنانچہ وہ خاتون مسئلہ پوچھنے آئیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ بتا کر کہ عورت کو بھی مرد ہی کی طرح غسل کرنا چاہیے نہ صرف ان کو بلکہ تمام عورتوں کو ایک ضروری تعلیم دے دی اب بتلایا جائے کہ اس میں کونسی بات اخلاقی لحاظ سے محبوب تھی کیا ان عرب خاتون کا مسئلہ پوچھنا کوئی عیب کی بات تھی؟ کیا انہیں مسئلہ پوچھنے کے بجائے شرم کا لحاظ کرتے ہوئے جو کچھ ان کی اپنی سمجھ میں آتا وہی کر لینا چاہیے تھا۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ معترضین کو اس میں کونسی بات غیر اخلاقی نظر آتی ہے۔

جنابت اور حیض کے بارے | چوتھی اور با پنجویں احادیث میں جو مضمون حضرت عائشہؓ کی زبانی بیان ہوا ہے اس کی اصل میں قدیم تعصبات کا اثر الہ | اختیقت سمجھنے کے لیے اس پس منظر کا جاننا

ضروری ہے جو ان احادیث کو روایت کرتے وقت حضرت عائشہؓ کے پیش نظر تھا۔ دراصل جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے ناپاک ہونے کا تصور شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی طرح قدیم شریعتوں میں بھی تھا لیکن قدیم شریعتوں میں یہودی اجار اور عیسائی راہبوں کی مبالغہ آرائیوں نے اس تصور کو حد اعتدال سے اس قدر بڑھا دیا تھا کہ وہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے وجود ہی کو ناپاک خیال کرنے لگے تھے۔ ان کے زیر اثر اہل جہاں و مدینہ میں بھی یہ تصور راجد مبالغہ کو پورے گیا تھا خصوصاً حائضہ عورت کے ساتھ تو رہنا سمنا بھی گناہ خیال کیا جانے لگا تھا چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب عورت کو حیض آتا تھا تو یہودی اس کے ساتھ کھانا پینا اور اس کے ساتھ رہنا سمنا چھوڑ دیتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف

لائے تو آپؐ نے بتایا کہ اس حالت میں صرف فعل مباشرت ناجائز ہے اس کے علاوہ میل جول رہن سہن کھانا پینا غرض ہر قسم کی معاشرت عائضہ عودت کے ساتھ اسی طرح رہتی ہے جیسی اس کے پاک ہونے کی حالت میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگرچہ اس سلسلے میں بنیادی غلط فہمی رفع ہو گئی تھی تاہم قدیم تعصبات کے زیر اثر ایک مدت تک لوگ یہ سمجھتے رہے کہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کا وجود کچھ نہ کچھ تو گنہگار رہتا ہی ہے اس لیے اس حالت میں اس کا ہاتھ جس چیز کو لگ جائے وہ بھی کم از کم مکروہ تو ضرور ہو جاتی ہوگی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں زیر بحث دونوں حدیث اور اسی قسم کی دوسری احادیث روایت ہوئی ہیں۔ مذکورہ بالا مبالغہ آمیز تصورات کو اعتدال پر لانے کے لیے ازواج مطہرات کو یہ بتانا پڑا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اس حالت میں کوئی اجتناب نہیں فرماتے تھے آپؐ کے نزدیک عائضہ یا جنبی عورت کے ہاتھ لگانے سے جب پانی جیسی سیال اور تر چیز گندی نہیں ہوتی تھی تو کسی برتن یا کپڑے وغیرہ کے گندے ہو جانے کا تو سوال ہی کیا۔ بلکہ پانچویں حدیث میں تو یہ بتلایا گیا کہ عائضہ عورت کا ہاتھ تو ہاتھ ہے منہ بھی لگ جائے تو کوئی چیز گندی نہیں ہوتی۔ نیز اس قسم کی احادیث میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ عائضہ بیوی کے ساتھ اس کا شوہر صرف مباشرت کا مخصوص فعل نہیں کر سکتا باقی ہر قسم کا اختلاط جائز ہے۔ اب در اسوچئے اگر ازواج مطہرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان افعال پر ہمیں مطلع نہ کیا ہوتا تو قدیم تعصبات کے زیر اثر ہمیں اپنی خانگی زندگی میں کیسی کیسی مشکلات سے سابقہ پیش آتا۔

ازواج مطہرات کی مرویات کے بعد اب ہم چند ایسی احادیث کا جائزہ لیتے ہیں جو دوسرے راویوں سے روایت ہوئی ہیں۔ مثلاً

(راوی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہ کو کہتے سنا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے ہمراہ ایک

(۱) قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ يَقُولُ كُنَّا نَسْتَمِعُ

مٹھی چھوڑا روں یا ایک مٹھی اٹے کے عوض چند روز کے لیے متوکر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے ہمیں منع کیا۔

(حضرت سُبْرَةُ الْجُحَنِّي) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع کرنے کی اجازت دی تو میں اور ایک اور شخص بنی عامر کی ایک عورت کے پاس گئے عورت نوجوان اور دراز گردن تھی سو ہم نے اپنے آپکو اس پر پیش کیا وہ بولی کیا دو گئے میں نے کہا میری چادر حاضر ہے میرا ساتھی بولا میری بھی چادر حاضر ہے اور میرے ساتھی کی چادر میری چادر سے اچھی تھی مگر میں اس سے جوان زیادہ تھا عورت جب میرے ساتھی کی چادر دیکھتی تو وہ اسے پسند آتی اور جب مجھے دیکھتی تو میں اسے پسند آنا پھر وہ بولی کہ تو اور تیری چادر مجھے کافی ہے پھر میں اسکے پاس تین دن رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ملان فرما دیا کہ اگر کسی کے پاس یہ میعاد نکاح والی عورتیں ہوں تو وہ انہیں آزاد کر دے۔

بالقبضة من التمر والدقيق
الایام علی عهد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم وأبی
بکر حتی نفی عنه عمر
(مسلم کتاب النکاح باب نکاح المتعة)
(۲) قال اذن لنا رسول الله صلی
الله علیه وسلم بالمتعة فالتفت
انا ورجل الى امرأة من
بنی عامر كانها بكرة حبيطة
فعرضنا عليها أنفسنا فقالت
ما اعطني فقلت ردائي وقال
صاحبی ردائي ركان ودار صاحبی
اجود من ردائي وكنت اشت
منه فاذا نظرت الى ردار
صاحبی اعجبها واذ انظرت
الى اعجبها ثم قالت انت
وردارك يكفيني فمكثت
معها ثلاثا ثم ان رسول
الله صلی الله علیه وسلم قال
من كان عنده شيء من
هذه النساء التي يتمتع بخليل
سبيلا۔
(مسلم کتاب النکاح باب نکاح المتعة)

(۳) أَخْبَرَنِي عَطَاءٌ قَالَ سَمِعْتُ
جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ
عَنْهُمَا فِي نَاسٍ مَعِيَ قَالَ أَهْلَلْنَا
أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
بِالْحَجِّ خَالِصًا وَحَدَّةً قَالَ عَطَاءُ
قَالَ جَابِرٌ فَقَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صُبْحَ رَابِعَةٍ مَضَتْ
مِنْ ذِي الْحِجَّةِ فَأَمَرْنَا أَنْ نَحْلَلَ
قَالَ عَطَاءُ قَالَ أَهْلُوا وَاصْبُوا النِّسَاءَ
قَالَ عَطَاءُ وَلَمْ يَعِزْمَ عَلَيْهِمْ
وَلَكِنْ أَهْلَلْنَاهُمْ فَقُلْنَا لِمَا لَمْ
يَكُنْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ عُرْفَةِ الْآخِسِ
أَمَرْنَا أَنْ نَقْضِيَ إِلَى نِسَائِنَا نَاتَا
عُرْفَةَ تَقَطَّرَ مَذْأَكُنَا الْمَنَى.. الْمَدَى
(مسلم کتاب الحج باب بیان وجوب الاقتراف)

عطاء روایت کرتے ہیں کہ میں نے چند اشخاص
کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ سے سنا فرمایا
ہم سب اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف
حج کا احرام باندھا عطا بیان کرتے ہیں کہ حضرت
جابر نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو تھیں ذی الحج
کی صبح کو آئے اور ہمیں حکم دیا کہ احرام کھول دیں
عطا کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا احرام کھول دو
اللہ (اپنی) بیویوں کے پاس جاؤ عطا بیان کرتے
ہیں کہ یہ حکم ان پر وجوب کے طور پر نہ تھا بلکہ
جواز کی حدود میں تھا پس ہم کہہ رہے تھے کہ صرف
پانچ دن تو عزت پہنچنے میں رہ گئے ہیں اسآپ
نے ہمیں اپنی بیویوں کے پاس جانے کیلئے کہہ دیا
(گویا) ہم عزت اس طرح پہنچیں کہ ہمارے
اعضائے رئیسہ سے تقاطر منی ہو رہا ہو.....
الی آخر الحدیث -

حقیقت حال کی وضاحت کے لیے یہ تین احادیث ہی کافی ہیں۔ پہلی دو حدیثیں متعہ
کے ذکر پر مشتمل ہیں جبکہ تیسری حدیث حج کے بعض احکام سے متعلق ہے۔ جو کوئی بھی تعصب سے
بالا تیر ہو کر ان احادیث کے معنائیں میں غور کرے گا اس کا ذہن "نستمتع یا نیتمتع" یا
"اصیبوا النساء" جیسے الفاظ سے جماع کے مخصوص عمل کی کیفیت کی طرف منتقل ہونے کے
بجائے ان مسائل کے جو انہ و عدم جو انہ پر غور کرنے میں مصروف ہو جائے گا جو ان الفاظ
کے ذکر کا اصل مقصد ہیں مگر کیا کیا جائے منکرین حدیث کی عقل سقیم کا کہ وہ اس قسم کی
احادیث میں اصل مقصود تلاش کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہے۔

متعہ کے مختلف پہلو | پہلی دو حدیثوں پر اعتراض کرنے سے پہلے اگر منکرین حدیث یہ ہانسنے کی کوشش کرتے کہ متعہ کی حقیقت کیا ہے اور اس کے بارے میں صحابہ کے تسلسلے کو کونسی بات تحقیق طلب تھی جس کی وضاحت کے لیے صحابہ کو یہ روایات نقل کرنا پڑیں تو شاید ان کا ذہن عربانیت کی طرف منتقل نہ ہوتا اور وہ حقیقت سال کو پالیتے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں نکاح کے جو طریقے رائج تھے ان میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ کسی عورت کو کچھ معاوضہ دے کر ایک خاص مدت کے لیے اس سے نکاح کر لیا جاتا تھا ایسے نکاح کو نکاح متعہ کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کی نفی کا حکم نہیں مل جاتا تھا اس چیز کے بارے میں پہلے سے رائج شدہ طریقے کو آپ منسوخ نہ فرماتے تھے بلکہ یا تو اس پر سکوت فرماتے یا بوقت ضرورت اس کی اجازت بھی دے دیتے تھے چنانچہ اپنی اسی عادت کے مطابق متعہ کے بارے میں بھی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً اس کے رواج پر سکوت فرمایا مگر بعد میں کسی جنگ یا سفر کے موقع پر اگر لوگوں نے شدت سے اس کی ضرورت ظاہر کی تو اس کی اجازت بھی دے دی کیونکہ اس وقت تک اس کی نفی کا حکم نازل نہ ہوا تھا پھر جب حکم نہی نازل ہو گیا تو آپؐ نے اس کو قطعاً ممنوع قرار دے دیا لیکن متعہ کی ممانعت کا یہ حکم تمام لوگوں تک نہ پہنچ سکا جس کی بنا پر بعد میں بھی کچھ لوگ نادانیت کی بنا پر متعہ کرتے رہے آخر کار حسرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اس حکم کی عام اشاعت کی اور پوری قوت کے ساتھ اس رواج کو بند کیا جب تک یہ رواج پوری طرح بند نہ ہو گیا صحابہ کے سامنے متعدد سوالات تحقیق طلب رہے مثلاً یہ کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی متعہ کی اجازت صراحتاً بھی دی تھی یا محض سکوت کے طریقے پر ہی آپؐ عمل پیرا رہے؟ اور اگر اجازت دی تھی تو کس کس موقع پر؟ نیز یہ کہ آپؐ نے اسے بعد میں ممنوع قرار دیا ہے یا نہیں؟ اگر دیا ہے تو اس کی عام ممانعت آپؐ نے کب فرمائی؟ اور کن الفاظ میں اس کام سے روکا؟

یہ اور اسی طرح کے متعدد سوالات تھے جن کی تحقیق مقصود تھی چنانچہ صحابہ میں سے جس جس کے پاس اس مسئلے سے متعلق کوئی علم تھا اس نے دوسروں کے سامنے بیان کیا یہی وجہ ہے کہ یہ محمولہ بالا دو حدیثیں ہی نہیں اور بھی متعدد احادیث اسی قسم کے مضامین کی حامل مختلف کتب حدیث میں آپ کو ملیں گی جن سے اس متعہ کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اب انہی زیر بحث دونوں حدیثوں کو لے لیجئے پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر کے عہد تک متعہ کے جواز کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں لوگوں کے ذہنوں میں موجود تھیں تا آنکہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا اور متعہ کے عدم جواز سے متعلق حکم بنوی کہ عام رواج دیا۔ اسی طرح دوسری حدیث سے متعہ کے ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بعض مواقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی صریح اجازت بھی دی تھی تاہم بعد میں اس کی قطعی ممانعت بھی فرمادی تھی۔ یہی حال اس قسم کے مضامین پر مشتمل دیگر تمام احادیث کا ہے کہ ان سے اس مسئلے سے متعلق کسی نہ کسی پہلو کی وضاحت ہوتی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر صحابہ یہ احادیث روایت نہ کرتے تو متعہ کے بارے میں متذکرہ بالا تحقیق طلب مسائل کیسے حل ہوتے نیز بعد میں آنے والے فقہاء اور اسلامی قانون کی تدوین کرنے والے آخر کس بنیاد پر متعہ کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرتے۔

تیسری حدیث حضرت جابر کی روایت کردہ ان متعدد احادیث میں سے ایک ہے جن میں انہوں نے احرام سے تعلق رکھنے والے چند قواعد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس

حج و عمرہ سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ

حدیث میں جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کا پس منظر دراصل یہ تھا کہ گذشتہ ترسوم مالوفہ کی بنا پر بعض لوگوں کے دلوں میں یہ غلط خیال بیٹھا ہوا تھا کہ ایام حج میں عمرہ نہیں ادا کیا جاسکتا اس غلط خیال کو دود کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ہم رزی الحجۃ کو طواف و سعی سے فارغ ہو کر لوگوں کو حکم دیا کہ جو لوگ اپنے

ساتھ قربانی کا جانور نہیں لائے وہ احرام کھول دیں چونکہ آپ ایام جاہلیت کے اثرات کو بین دین سے اکھاڑ بھینکنا چاہتے تھے اس لیے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ احرام کھول کر تم اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اس سے مقصود صرف اتنا تھا کہ احرام کی تمام پابندیوں کا رنج ہو جانا متحقق ہو جائے اور لوگوں کے ذہن میں کوئی شک باقی نہ رہے مگر اس کے باوجود بھی بعض لوگ احرام کھولتے ہوئے جھجکے اور آپس میں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ کیا ہم اس حالت میں عرفہ کی طرف روانہ ہوں گے کہ ہم بہ احرام کی کوئی پابندی نہ ہو سکتی کہ ہمیں اپنی بیویوں سے متمتع ہونے کی بھی کھلی چھٹی ہو اسی استعجاب کو انہوں نے تقطرمذاکیرونا المنی کے الفاظ سے تعبیر کیا بعض لوگوں کے اسی مذہب پر نبی کریم صلی علیہ وسلم نے وہ فقرہ ارشاد فرمایا تھا جو اسی روایت میں آگے چل کر آتا ہے کہ میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اگر میرے ساتھ قربانی کے جانور نہ ہوتے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی احرام کھول دیتا۔

یہ واقعہ بعد میں حضرت جابرؓ کو اس لیے سنا پڑا کہ بعد میں بھی بعض لوگوں کو یہ شک باقی رہ گیا تھا کہ جو شخص احرام باندھ کر حج سے پہلے مکہ پہنچا ہو وہ آیا طوات وسیعی کرنے کے بعد حلال ہو سکتا ہے یا نہیں اور آیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حج کا زمانہ آنے پر حرم ہی سے احرام کا آغاز کرے اس شک کو دور کرنے کے لیے حضرت جابرؓ نے یہ حدیث سنائی تھی۔

اب تک کی گفتگو سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ تمام احادیث جن کا ہم نے ابھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے وہ سب کی سب انسانی زندگی کے بعض انتہائی اہم مسائل سے متعلق ضروری علم مہیا کرتی ہیں اگر کوئی اس علم سے آنکھیں بند کر کے ان احادیث کو صرف اپنے اعتراضات کا تختہ مشق بناتا ہے تو اپنی عقل کے ستقیم و بیمار ہونے کا خود ثبوت مہیا کرتا ہے احادیث کے مرتبہ و مقام میں کوئی فرق نہیں آتا یہ چند احادیث ہم نے نمونے کے طور پر پیش کر دی ہیں انہی پر ان تمام احادیث کو قیاس کر لیا جائے جو ان احادیث کے علاوہ منکرین حدیث کی جانب سے اس ضمن میں پیش کی

جاتی ہیں۔

۴۔ **خلاف علم و تجربہ روایات** | اب اس کے بعد ہم منکرین حدیث کے پوچھتے اعتراض کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ صحیح احادیث کے ذخیرے میں بعض روایات ایسے دعاوی پر مشتمل ہیں جو تجربے کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور ظاہر ہے نبی کے دعاوی بھی غلط نہیں ہوتے بنا بریں یہی سمجھا جائے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان تمام دعاوی کی نسبت غلط ہے۔

اس اعتراض کے پیچھے بھی منکرین حدیث کی وہی منفی سوچ کلام کو رہی ہے جب تک وہ اس حقیقت کو اصولی طور پر تسلیم نہیں کر لیتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے فرستادہ ہونے کی بنا پر ان غیبی اسرار سے آگاہ تھے جن سے کوئی دوسرا بشر آگاہ نہیں ہے اور جب تک وہ یہ نہیں مان لیتے کہ ملائکہ اعلیٰ سے ہمہ وقت رابطہ حاصل ہونے کی بنا پر آپ کا ہر قول اور ہر فعل نور و حکمت اور علم و معرفت سے معمور ہوتا تھا اس وقت تک ان کو قدم قدم پر اسی طرح مشکوک بن لگتی رہیں گی۔

اول تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی صحیح حدیث ایسی ہے ہی نہیں جو علم و تجربے کے معیار پر پوری نہ اترتی ہوتا ہم بالعرض اگر کوئی ایسی حدیث ہو بھی جو اب تک کے معروضات علم اور آج تک کے معلوم تجربے کے خلاف ہو تو کیا یہ ممکن نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسی بات کی خبر دی ہو جو موجودہ زمانے میں رائج علوم و معارف سے تو ہم آہنگ نہ ہو لیکن آئندہ زمانوں میں انسانی دسترس کی حدود میں آنے والے علم و آگاہی کے ذرائع اس کی تصدیق کرتے ہوں۔ مثلاً یہ عین ممکن ہے کہ آپ نے فلسفہ حیات انسانی سے متعلق کوئی ایسی بات ارشاد فرمائی ہو جو آج کے دور میں لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو مگر وہی فلسفیانہ ارشاد اس دور کے عین مطابق ہو جب فلسفیانہ نقطہ کمال پر پہنچ جائے گا۔ غرض اگر کسی زمانے میں لوگوں پر کسی ارشاد رسول کی حکمت و مصلحت واضح نہ ہو سکے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ وہ حدیث ہی موضوع ہے۔

سوسال بعد دنیا کا خاتمہ | بہر حال منکرین حدیث اگر اپنی سوچ کا رخ درست کر لیں تو خود اس بات کا اقرار کرتے نظر آئیں گے کہ

کوئی ایک بھی صحیح حدیث ایسی نہیں جو انسانی علم و تجربے کے خلاف ہو۔ ان کی جانب سے جتنی بھی روایات اس سلسلے میں پیش کی جاتی ہیں اگر ذرا بھی بہ نظر غور ان کا جائزہ لیا جائے تو کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں رہتی جس پر خلاف علم و تجربہ ہونے کا اعتراض صادق آسکے۔ مثال کے طور پر ان کی طرف سے پیش کی جانے والی اسی روایت کو لے لیجئے جس میں ذکر ہے کہ سوسال کے بعد زمین پر کوئی جاندار زندہ نہیں رہے گا۔ یہ روایت دراصل اس حدیث کا ایک جزو ہے جس کو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کتاب العلم میں نقل کیا ہے۔ پوری حدیث اس طرح ہے :

(حضرت عبداللہ بن عمر نے) بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اخیر عمر میں ہم کو نماز کی نماند پڑھائی جب سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور فرمایا کیا تم نے اس رات کو دیکھا (اسے یاد رکھنا) اب سو برس کے بعد جتنے لوگ اس وقت زمین پر ہیں ان میں سے کوئی (زندہ) نہیں رہے گا۔

قَالَ صَلَّى بِنَا الْبَقِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ فِي آخِرِ حَيَاتِهِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ فَقَالَ أَرَأَيْتُمْ لَيْلَتَكُمْ هَذَا فَإِنْ رَأَسَ مَا مَدَّةَ سِنَةٍ مِنْهَا لَا مَبْقَى مِنْهُ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ

(بخاری - العلم باب السر في العلم)

منکرین حدیث نے اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ دنیا سوسال کے بعد ختم ہو جائے گی اور پھر اسی بنیاد پر اسے موضوع ٹھہرایا ہے کہ یہ تاریخی حقائق اور جس و مشاہدے کے خلاف ہے۔

اس حدیث پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہمیں منکرین حدیث سے یہ پوچھنا ہے کہ امام بخاری نے اس روایت کو کتاب الصلوٰۃ میں بھی لیا ہے کیا وجہ ہے اس کو اختیار کرنے کے بجائے منکرین حدیث کی نظر انتخاب اس کتاب العلم والی روایت پر کیوں پڑی کیا یہ حقیقت نہیں کہ کتاب الصلوٰۃ والی روایت انہوں نے صرف اسی لیے نہیں لی کہ اس میں

ان کے اعتراض کا جواب موجود تھا۔ اس روایت میں چونکہ ”الیوم“ کا لفظ اس ارشاد نبوی کا صحیح مفہوم متعین کر دیتا تھا جس کے بعد متذکرہ بالا اعتراض کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی اس لیے منکرین حدیث کا فائدہ اسی میں تھا کہ اس روایت سے صرف نظر کر لیا جائے۔

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت جبکہ میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں دنیا میں جتنے لوگ ہیں سو سال کے اندر اندر سب مر جائیں گے یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ سو سال کے بعد دنیا ہی ختم ہو جائے گی۔ اگرچہ کتاب العلم والی روایت میں بھی ”یلتکم هذا“ کے الفاظ اسی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں تاہم کتاب الصلوٰۃ والی روایت تو اس مفہوم کی تیسرین میں بالکل ہی صریح ہے۔ اس حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہا تم نے اس رات کو دیکھا اب سے سو برس کے بعد جتنے لوگ آج پشت زمین پر ہیں ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔

فَقَالَ اَرَأَيْتُمْ لِيَلْتَكُمْ هَذِهِ فَاِنْ
رَأَيْتُمْ مِائَةَ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى
مِنْ هَٰؤُلَاءِ يَوْمَ عَلَى ظَهْرٍ اِلَّا رَجُلًا

(بخاری - الصلوٰۃ باب ذکر العشاء والعتمۃ)

اس ارشاد سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تمہاری عمریں پہلی امتوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں لہذا عبادت کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ نیز اس کے ساتھ ہی ان الفاظ میں مجزا نہ طور پر ایک پیش گوئی بھی موجود تھی کہ پوری ایک صدی گزرنے پر موجودہ لوگوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا چنانچہ یہ پیش گوئی پوری بھی ہوئی صحابہ میں سے جس کی موت سب کے بعد واقع ہوئی وہ حضرت ابو طفیل عامر بن دائلہؓ تھے جنہوں نے سالانہ ہجری میں وفات پائی جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سالانہ ہجری کا واقعہ ہے اس طرح اس ارشاد کے دن سے لیکر آخری صحابی حضرت ابو طفیل کی وفات تک پورے سو سال بنتے ہیں۔

یہی بات کہ یہ کیسے پتہ لگا کہ آپؐ نے یہ سنائے مگر میں ارشاد فرمایا تھا تو اول تو کتاب العلم والی روایت میں فی آخر حیاتہ کے الفاظ خود اس پر مال ہیں دوسرے وہ حدیث جو امام مسلم نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ ارشاد بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ایک مہینہ پہلے کا واقعہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ماہ ربیع الاول سنۃ ہجری میں ہوا ہے۔

منکرین حدیث کی علمی دیانت ملاحظہ ہوا انہوں نے اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وضاحت کو بھی درخورد اعتناء سمجھا۔ دراصل خود صحابہ کے زمانے میں بھی بعض لوگوں کو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا صحیح مطلب سمجھنے میں دھوکہ لگ گیا تھا ان کے ذہن میں صرف صدی کا مفہوم باقی رہ گیا انہوں نے آپؐ کے الفاظ آج جو زمین کی پشت پر زندہ ہے کی طرت تو جبرزدی اور اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ ساری دنیا ہی سو سال بعد ختم ہو جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک موقع پر ایسے لوگوں کو سمجھایا اور تذکرہ الفاظ کی طرت تو بہ دلاتے ہوئے آپؐ کے اس ارشاد کا اصل مقصود واضح کیا۔ حضرت ابن عمرؓ کی یہ وضاحت امام مسلم نے کتاب فضائل الصحابہ میں نقل کی ہے۔ اس وضاحت کے الفاظ ہیں :

لوگوں کو سو سال والی احادیث کے بارے میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ کہا تھا کہ جو انسان زمین کی پشت پر آج کے دن موجود ہیں ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا اور مراد یہ تھی کہ اس صدی کے آخر تک (یہ موجودہ نسل) ختم ہو جائے گی۔

فَوَلَّ النَّاسَ فِي مَقَالَةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَلَاةً فِيهَا يَتَحَدَّثُونَ مِنْ هَذِهِ الْأَمَارِثِ عَنْ مِائَةِ سَنَةٍ رِائِعًا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبْقَى مِنْ هَذَا الْيَوْمِ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ يَرِيدُ بَدَلَكَ أَنْ يَنْخَرِمَ ذَلِكَ الْقَرْنُ رِسْمَ كِتَابِ نَفَائِ الْأَصْحَابِ بِإِذْنِ اللَّهِ عَلَى رَأْسِ مِائَةٍ.

لے کلم کتاب نفائ الصحابہ باب بیان معنی قولہ علی رأس مائۃ

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس وضاحت سے آنکھیں بند کر لینا اندبہ رٹے جانا کہ زیر بحث حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہے منکرین حدیث کی علیحدہ دیا نئی توجہ ہے ہی خوفِ خدا سے ان لوگوں کے عاری ہونے کی دلیل بھی ہے۔

غرض کتنی عجیب بات ہے جو حدیث بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم معجزے پر مشتمل تھی منکرین حدیث کا تختہ مشق بن کر وہ موضوع اور تاریخی حقائق کے خلاف قرار پائی۔
علا بری عقل و دانش بیادہ گریست۔

عجودہ کھجور کی تاثیر | اسی طرح ایک اور حدیث جو منکرین حدیث کا تختہ مشق بنی ہے وہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب الطب میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس کو بھی دیکھ لیجئے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

جس نے ہر روز صبح علی الصبح عجودہ نامی کھجور کی کھٹی
اس پر اس رات تک نہ برا نہ ہاؤفا نہ غماز نہ
ہر گاہ ایک دوسری روایت میں سات کھجوریں
(کے الفاظ) ہیں۔

من اصطبغ کلَّ یوم تمراً
عجوداً ثم یضرب ستم ولا یجرح
ذلک الیوم الی اللیل قال غیرہ

صبح تمرات۔
(بخاری۔ الطب باب الدار بالبحوۃ)

منکرین حدیث کہ عجودہ نامی کھجور کی اس تاثیر سے انکار ہے۔ ان کا منہ ہے کہ طب جدید نے اس مخصوص کھجور میں کوئی ایسی تاثیر یا خاصیت نہیں پائی جو زہر یا جانوروں کے مٹلے میں مفید ہوتی ہو اس لیے معلوم ہوتا ہے یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

عجودہ نامی کھجور کے بارے میں طب جدید کیا رائے رکھتا ہے کیا نہیں اس سے تو ہم بعد میں بحث کریں گے پہلے ہمیں یہ بتایا جائے کہ کیا طب جدید نے دُنیا کے تمام ماکولات مشروبات نہات امتدادِ مہدات کی خاصیات کا احاطہ کر لیا ہے یا دوسری صورت میں طب جدید نے کہیں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے عجودہ کی تمام تاثیرات اور تمام خاصیات معلوم کر لی ہیں اگر ایسا کوئی دعویٰ طب کی دُنیا میں موجود نہیں تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ عجودہ میں نفلان تاثیر

سرسے سے موجود ہی نہیں ہے اگر عجوہ میں ابھی تک جادو اور نہ ہر کے لیے مفید خواص کا سراغ نہیں لگایا جاسکا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ مستقبل میں جب اس کھجور پر باقاعدہ طبی تحقیق کی جائے تو بہت سے ایسے نئے خواص کا پتہ چلے جو مفید نہ ہر یا مفید سحر ہوں۔ علاوہ ازیں تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجئے کہ طب جدید نے عجوہ نامی کھجور پر بوستانی طبی تحقیق کے بعد یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ اس میں متذکرہ تاثیرات میں سے کوئی تاثیر موجود نہیں ہے تو اس کے بعد بھی یہ امکان پھر بھی باقی رہے گا کہ آئندہ طب کا علم مزید ترقی کرے اور تحلیل و تجزیہ کا کوئی ایسا نیا طریقہ دریافت ہو جائے جس کی مدد سے عجوہ کی کچھ مزید تاثیرات و خاصیات کا انکشاف ہو کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ طب کا علم اپنی آخری حد کو پہنچ گیا ہے اور اب اس پر مزید کسی اضافے کا کوئی امکان نہیں۔

یہ تو تھی ایک اصولی بات رہا عجوہ کے بارے میں طب جدید کی رائے کا معاملہ تو یہ کہنا سرے سے ہے ہی غلط کہ طب جدید نے اس مخصوص کھجور میں کوئی ایسی تاثیر یا خاصیت نہیں پائی جو نہ ہر یا جادو کے علاج میں مفید ہوتی ہو اس لیے کہ طب جدید میں یہ امر ایک طے شدہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ عجوہ غذا بخش اور بیلین مدہ ہوتی ہے یہ کھجور جسم میں حرارت کے ساتھ ساتھ فرحت اور نشاط پیدا کرتی ہے نتیجتاً اس کو اگر نہار منہ کھانا معمول بنالیا جائے تو جس مادے سے معدہ میں کیرے بنتے ہیں وہ کمزور پڑ جاتا ہے اور کیرے مرجاتے ہیں اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اندرونی امراض کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ انٹریکٹوں میں بدبو اور کیروں کا پیدا ہو جانا ہی ہے جب یہ معاملہ بڑھ جاتا ہے تو جسم میں زہر پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوتا ہے بنا بریں صرہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ عجوہ زہریلے اثرات کو ختم کر دیتی ہے معلوم ہوا کہ بالکل درست ہے۔

اسی طرح عجوہ سے جادو کے اثرات کا زائل ہو جانا بھی کوئی ایسی بات نہیں جو بعید از عقل و قیاس ہو۔ اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ جادو ایک نفسیاتی مرض ہے طب جدید نے بھی اس کو تسلیم کر لیا ہے کہ تخیلات و توہمات بعض امراض میں بڑا اہم پارٹ

ادا کرتے ہیں تو نھیاتی مرض ہونے کی بنا پر ظاہر ہے ہادو کا علاج بھی نھیاتی ہی ہونا چاہیے۔ اب ذرا تجزیہ کیجئے جب ایک سرزدہ شخص عجبہ کے ان پہلوؤں پر غور کرے گا کہ یہ جسم انسانی کو حرارت بخشتی ہے فرحت و نشاط بہم پہنچاتی ہے بدن کو تقویت دیتی ہے کیرڈوں کو مارتی اور فضلات کے تعفن کو دودھ کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب وہ اس حقیقت میں غور کرے گا کہ عجبہ کھجور کو اللہ کے رسول نے جس کی بات ہمیشہ قطعی اور حتمی ہوتی ہے جادو کے مرض کے لیے مفید بتایا ہے تو نھیاتی طور پر اس کے اندر قوتِ مدافعت بڑھ چکی ہو جادو کے اثر سے مرعوب ہو کر مرے گا۔

کھمب کی خاصیت | طب ہی کی بنیاد پر منکرینِ حدیث نے اس حدیث کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جس میں ذکر ہے کہ کھمب (جس

کو سانپ کی چھتری بھی کہا جاتا ہے اور جو برسات کے زمانے میں عموماً کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر اتار دیا گاتا ہے) کا پانی آنکھ کے لیے باعثِ شفا ہے۔ اس حدیث کا متن یہ ہے:

الْكَمْبُ مِنَ الْمِنْ وَمَا رَها شِفَا
للعین۔

(بخاری کتاب الطب باب المنّ شفا للعین)۔

اس حدیث پر بھی منکرینِ حدیث کو یہی اعتراض ہے کہ یہ طبی تحقیق کے خلاف ہے اس لیے صحیح نہیں ہے۔

اس حدیث کے بارے میں بھی اوّل تو اصولی بات وہی ہے کہ آج اگر انسان کی تحقیق میں کھمب کی یہ تاثیر نہیں آتی جو محولہ بالا حدیث میں بیان ہوئی ہے تو اس کا امکان ختم تو نہیں ہوا کہ کل انسانی تحقیق میں اس تاثیر کا وجود ثابت ہو جائے دوسرے ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ منکرینِ حدیث ایک طرف تو اخبارِ احاد کے بعدے کے پورے ذخیرے کو صرف اس بنیاد پر بے کار اور ناقابلِ اعتماد ٹھہراتے ہیں کہ ان سے علمِ طبی حاصل ہوتا ہے جو کہ فی الحقیقت یقین ہی کی ایک قسم ہے دوسری طرف محض اندازوں اور تخمینوں پر اس قدر اعتماد کرتے ہیں کہ ان کو احادیثِ نبوی کے صحیح و غیر صحیح ہونے کا معیار

قرار دیتے ہیں۔ کسی چیز کی کوئی خاصیت جو اطباء بیان کرتے ہیں وہ سب ان کے اندازے اور تخمینے ہی تو ہوتے ہیں۔ ان اندازوں اور تخمینوں کی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جو وحی و برہان پر مبنی ہونے کی وجہ سے یقیناً قطعی اور حتمی ہیں مشکوک اور غلط قرار دینا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آج اگر ایک حدیث اس لیے قابل قبول نہیں کہ وہ طب کی تحقیق کے خلاف ہے تو کل اگر طب کی تحقیق اس کے حق میں ہو گئی تو یقیناً وہ قابل قبول بن جائے گی اس کا مطلب یہ ہوا کہ طبیب کی بات تو قابل قبول ہے جو ایک عام انسان سے زیادہ کچھ نہیں مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات قابل قبول نہیں جو معترضین کے نزدیک بھی اللہ کے رسول ہیں اس چہ بوا الجہی است

علاوہ ازیں یہ کہنا ہی غلط ہے کہ کھمب میں وہ تاثیر نہیں پائی جاتی جو حدیث میں بیان ہوئی ہے اس لیے کہ البوسہل مسیحی اور لوط علی سینا جیسے مسلم و مشہور اطباء کی تحقیق تو یہ ہے کہ کھمب کا پانی بصارت کو نیز کرتا ہے نیز اگر اس کو سُرمرہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے ظلمت بصر دور ہوتی ہے اور دکھتی آنکھ ٹھیک ہو جاتی ہے۔ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں ان دونوں اطباء کی اس تحقیق کو زیر بحث حدیث کی صداقت پر گفتگو کرتے ہوئے دلیل کے طور پر بیان کیا ہے۔ انہوں نے مشہور طبیب غافقی کا بھی حوالہ دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس طبیب کی مفردات میں لکھا ہے اگر کھمب کے پانی کو مشہور دوا اشمہ کے پانی میں گوندھ کر سُرمرہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے آنکھ کی پلکوں کو تقویت پہنچتی ہے اور قوت بصارت میں اضافہ ہوتا ہے۔

کیا یہ تمام مشاہیر اطباء منکرین حدیث کے نزدیک ناقابل اعتماد ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو براہ کرم ہمیں بتایا جائے وہ کونسے اطباء ہیں جن کو منکرین حدیث کے یہاں اعتماد کا درجہ حاصل ہے پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ کیا ان کے معتمد اطباء نے روئے زمین پر پیدا ہونے والی ہر کھمب کا تجربہ و تجزیہ کر لیا ہے اور

اس کی سب زمیں پر تحقیق مکمل کر لی ہے خصوصاً اسی طرز و انداز کی کھمب پر جو عہد رسالت میں سرزمین حجاز میں پائی جاتی تھی کیا انہوں نے کوئی تجربہ کیا؟ اور سب سے بڑھ کر اور بنیادی بات یہ کہ کیا ان اطباء کی رائے میں طب اپنے نقطہ کمال کو پہنچ گیا ہے کہ اب جو چیز بھی اس کی تحقیق میں نہیں آئی یا اس کے خلاف ثابت ہوئی وہ مردود قرار دے دی جائے۔

بات کچھ بھی نہیں منکرین حدیث کے پیش نظر صرف اعتراض کرنا ہے اسی مقصد کو ذہن میں رکھ کر وہ کتب حدیث کو کنگھالنا شروع کرتے ہیں اور جہاں جہاں کوئی بات انہیں اپنے مطلب کی نظر آتی ہے بلا تحقیق و تنقیح اور بغیر کچھ سوچے سمجھے اس کی بنیاد پر احادیث بنوی پر اعتراضات وارد کرتے چلے جاتے ہیں خواہ بعد ان میں سے کوئی بھی اعتراض ثابت نہ ہو سکے وقتی طور پر نادانانہ حال لوگوں کو دھوکہ دینے میں تو وہ کچھ نہ کچھ کامیاب ہو ہی جاتے ہیں اور یہی ان کا مسلح نظر ہے۔

۵۔ باہم متعارض روایات | اب آئیے منکرین حدیث کے اس اعتراض کی طرف

گنا ہے کہ اکثر صحیح احادیث باہم متعارض ہیں اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ متعارض اشیاء ساقط الاعتبار ہوتی ہیں لہذا احادیث بھی باہم متعارض ہونے کی بنا پر ساقط الاعتبار قرار پائیں۔

یہ اعتراض بھی دراصل معترضین کی کم علمی کا غماز ہے۔ منکرین حدیث کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ کتب حدیث کا متقابل مطالعہ انہیں حاصل نہیں وہ احادیث کے بارے میں جو فیصلہ کرتے ہیں اپنے محدود مطالعے کی بنیاد پر کرتے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ یہ کبھی نہ کہتے کہ اکثر احادیث باہم متعارض ہیں۔ جن لوگوں کی احادیث کے پورے ذخیرے پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ احادیث کے درمیان اتفاق بہت زیادہ اور اختلاف بہت کم ہے مثلاً احادیث صفات و فضائل میں کوئی تعارض نہیں احادیث اختلاف و رفاق میں بھی کہیں تعارض نظر نہیں آتا اسی طرح احادیث معجزات تعارض سے

پاک ہیں نیز احوال جہنت و جہنم کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان پر بھی شانوں
فی صد احادیث ایسی ہیں جن میں کوئی تعارض نہیں پایا جاتا۔ لے دے کے وہ احادیث
رد جاتی ہیں جو یا تو بعض واقعات پر مشتمل ہیں اور یا پھر ان کا تعلق احکام سے ہے۔

جہاں تک احادیث واقعات کا تعلق ہے تو ان میں اگرچہ ایک بہت ہی تلیل تعداد
ایسی حدیثوں کی ضرورت ملتی ہے جو باہم متعارض تو نہیں البتہ باہم مختلف دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کا
یا بھی تعارض و اختلاف بھی صرف ظاہر نظر میں ہی عکس ہوتا ہے غور و فکر کے بعد اور احادیث
نبوی کے تقابلی مطالعے کے بعد اکثر و بیشتر وہ رفع ہو جاتا ہے دراصل ہوتا یہ ہے کہ یا تو
مختلف راویوں نے ایک ہی بات یا واقعے کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہوتا ہے
جو بظاہر باہم متعارض و مختلف نظر آنے لگتا ہے حالانکہ معانی کے لحاظ سے ان کے دریاں
کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہوتا یا پھر مختلف راویوں نے ایک ہی واقعے یا تقریر کے
مختلف اجزاء بیان کیے ہوتے ہیں ناواقف سمجھتا ہے ان کے بیانوں میں اختلاف
ہے جبکہ احادیث کے ذخیرے سے واقف اس واقعے کے تمام اجزاء کو یکجا کر کے
ان کے باہمی تطابقی کو پالیتا ہے۔

.. یہی حال احادیث احکام کا ہے جو احادیث باہم متعارض نظر آتی ہیں وہ اس قدر
کم ہیں کہ غیر متعارض احادیث کی نسبت وہ شاید ایک فی صد بھی نہیں۔ ان میں سے
بھی اکثر کا حال یہ ہے کہ ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے اور تحقیق و جستجو کی جائے تو
تعارض رفع ہو جاتا ہے ان احادیث کے ساتھ بھی صورت حال یہ ہے کہ یا تو یہ
ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے عمل
فرمایا ہوتا ہے اور جس راوی نے جو طریقہ مشاہدہ کیا اسے روایت کر دیا یا پھر یہ ہوتا
ہے کہ احادیث میں باہم تقدم و تاخر زمانی موجود ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو علوم حدیث پر
عبور حاصل ہے وہ اس تقدم و تاخر زمانی کو معلوم کر لیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر
پہلی حدیث کو منسوخ اور بعد والی حدیث کو ناسخ قرار دیتے ہیں۔

احادیث احکام کا مطالعہ کرتے وقت یہ تحقیق بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ بہت

سے اعمال و افعال کی تشریح و تفصیل نہیں ہوئی بلکہ بتدریج ہوئی ہے مثلاً نماز ابتدا میں دو رکعت فرض ہوئی بعد میں رکعات کی تعداد چار ہو گئی یا مثلاً ابتداء اسلام میں صرف دو ہی وقت صبح اور عصر کی نماز فرض تھی بعد میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں تو احکام پر مشتمل احادیث کے معاملے میں اس تدریج کے عمل کا لحاظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس تدریج کے عمل سے پیدا ہونے والے اختلاف کو تعارض یا تناقض کا درجہ دینا غلط ہوگا۔

غرض ایسی احادیث جن کا باہمی تعارض و اختلاف رفع کرنا مشکل ہو تعداد میں اتنی قلیل ہیں کہ ان کو غیر متعارض و غیر مختلف احادیث سے وہ نسبت بھی نہیں جو ایک کے عدد کو ہزار کے عدد سے ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تدریج قلیل احادیث متعارضہ کی بنیاد پر پورے ذخیرہ حدیث کو غیر معتبر قرار دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ احادیث نبویہ کسی ایک ناقابل تقسیم کل کا نام تو ہے نہیں کہ اس کا ایک جز و ساقط ہو تو کل کے کل کا ساقط ہونا لازم آگیا ہر حدیث اپنے اپنے مقام پر اپنی ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے اور ہر ایک اپنی جداگانہ سند کے ساتھ روایت ہوئی ہے بنا بریں دو چار روایات کیا دو چار سو روایات بھی ساقط ہو جائیں تو بقیہ ہزاروں روایات کا سقوط لازم نہیں آسکتا۔ اول تو ایسی روایات کے بارے میں جن کا باہمی تعارض و اختلاف رفع کرنا مشکل ہو درست اور صحیح طریقہ عمل یہ ہے کہ راجح اور احوط پر عمل کیا جائے لیکن اگر ترک ہی کرنا منظور ہے تو ظاہر ہے صرف انہی روایات کو ترک کیا جائے گا جو یا ہم متعارض ہوں گی ان کی وجہ سے غیر متعارض روایات کو ترک کرنے والا پاگل اور احمق ہی کہلائے گا۔

۶۔ روایت بالمعنی | اس کے بعد نمبر ہے منکرین حدیث کے اس اعتراض کا کہ اکثر احادیث کی روایت بالمعنی ہے یعنی بنی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر ارشادات کے مفہوم و مضامین کو راوی نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے چنانچہ ان کے خیال میں جب آپ کے الفاظ ہی محفوظ نہیں تو مفہوم و

مضامین کے بارے میں کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ وہ بہ تمام دیکال ہم تک پہنچ گئے ہیں۔

اس اعتراض کا انداز یہ بتلا رہا ہے جیسے معتز ضیق کے نزدیک احادیث نبوی کا جس قدر ذخیرہ ہے وہ سب کا سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر مشتمل ہے حالانکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ حدیث فقط اقوال نبوی ہی کا نام نہیں بلکہ آپ کے افعال اور آپ کے سامنے پیش آنے والے حالات و واقعات کو بھی حدیث ہی کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات منکرین حدیث بھی بخوبی جانتے ہیں لیکن حقائق کو چھپا کر اپنے مطلب کی بات نکالنا ان کی عادت ہو گئی ہے۔ ہر حال اتنی بات واضح ہے کہ منکرہ بالا اعتراض صرف ان احادیث تک محدود ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر مشتمل ہیں اس لیے کہ صرف اقوال ہی کے بارے میں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ان کی روایت بالمعنی کیوں ہے باللفظ کیوں نہیں جہاں تک آپ کے افعال اور آپ کے سامنے پیش آنے والے حالات اور واقعات کا تعلق ہے تو ظاہر ہے ان کے باللفظ روایت ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی کے منہ سے نکلنے والے کلمات تو باللفظ نقل کیے جاسکتے ہیں لیکن کسی کی ذات سے صادر ہونے والے افعال یا کسی کی ذات سے تعلق رکھنے والے احوال الفاظ یا کلمات تو نہیں ہیں کہ انہیں باللفظ نقل کیا جاسکے ان کو تو نقل کرنے والا ہر راوی اپنے ہی الفاظ میں نقل کرے گا اگرچہ بنیادی مفہوم ہر ایک کا یکساں رہے گا۔

اب روایت بالمعنی کا اعتراض چونکہ اقوال نبوی تک ہی محدود رہ گیا ہے اس لیے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ منکرین حدیث کو وہ تمام احادیث تسلیم کر لینی چاہئیں جن کا تعلق افعال و احوال نبوی سے ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ ذخیرہ احادیث کا اکثر حصہ افعال و احوال نبوی پر ہی مشتمل ہے اقوال نبوی پر مشتمل حصہ اس کے مقابل میں بہت قلیل ہے اس طرح حدیث کا ایک بہت ہی قلیل حصہ ایسا ہے جو اب محل نظر رہ گیا ہے۔ اس قلیل حصے میں سے بھی بہت سے اقوال نبوی ایسے ہوں گے جو افعال و احوال نبوی سے

مطابقت رکھتے ہوں۔ گے ان کو تسلیم کر لینے میں بھی منکرین حدیث کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ تسلیم شدہ حصے سے ان کا مطابقت رکھنا ثبوت ہے اس بات کا کہ روایت بالمعنی کے طریقے سے جو نقصان انہیں پہنچنے کا احتمال تھا وہ اس سے محفوظ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو بہت ہی قلیل حصہ اقوال بنوی کا بچے گا اس میں سے ان احادیث کو بھی علیحدہ کر لیجئے جو وارد و اذکار اور ادعیۃ منونہ پر مشتمل ہیں ایسی احادیث کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب کی سب روایت باللفظ ہیں اس لیے کہ امت مسلمہ کے درمیان ایسی احادیث نسل در نسل ایک ہی جیسے الفاظ کے ساتھ نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اسی طرح اذان، تشہد، اقامت اور احادیث اخلاق نیز احادیث قدسیہ اور احادیث جوامع الکلم یہ سب کی سب احادیث بھی تقریباً باللفظ روایت ہوئی ہیں اس قسم کی تمام احادیث پر بھی منکرین حدیث کا اعتراض صادق نہیں آتا اس لیے ان کو بھی قبول کر لینے میں انہیں کوئی تاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اقوال بنوی کا بقیہ حصہ وہ ہی کتنا جتنا ہے جس پر روایت بالمعنی کا اعتراض وارد ہوتا ہو۔

بہر حال منکرین حدیث کے نزدیک اگر حفاظت حدیث میں شبہ روایت بالمعنی ہی کی بنا پر تھا تو یہ شبہ صرف اس اتنے ہی حصہ تک محدود رہنا چاہیے جتنا حصہ روایت بالمعنی کے طریقے سے غیر محفوظ ثابت ہے اور وہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ انتہائی قلیل ہے مگر تاریہ بین کو یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ اس اقل قلیل حصہ حدیث کے مشتبہ و مشکوک ہونے کی بنیاد ہم منکرین حدیث پورے کے پورے ذخیرہ حدیث کو مشتبہ و مشکوک قرار دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ حصہ بھی جو روایت باللفظ کے طریقے سے ثابت ہے۔ کتنی عجیب بات ہے ہم اب تک تو یہ سنتے آئے تھے کہ اکثر کی بنیاد پر کل کا حکم ثابت ہوتا ہے منکرین حدیث نے اس کلیہ کو اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر الٹ دیا۔ ہے ان کے یہاں اب اقل قلیل کی بنیاد پر کل کا حکم ثابت ہونے لگا ہے۔ ہم تو جب جانیں جب منکرین حدیث اپنے دنیاوی کاروبار بھی اسی کلیہ کے مطابق انجام دینے لگیں اور آج ہی سے سب پہلا کام یہ کریں کہ

کھانا کھانا بالکل چھوڑ دیں کیونکہ کھانا کھانے سے کبھی کبھی بد معنی بھی ہو جاتی ہے اور قلیل کی بنیاد پر کل کے حکم کا اثبات ایک اصول کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ روایت بالمعنی کے طریقے پر منقول یہ اقل قلیل حصہ حدیث بھی فی الحقیقت مشتبہ نہ رہتا اس لیے کہ محدثین کے یہاں روایت بالمعنی وہی مقبول ہے جس کا راوی الفاظ کے مدلول و مفہوم اور معانی و مقاصد کو خوب سمجھتا ہو اور یہ بھی خوب جانتا ہو کہ اگر اس لفظ کے بجائے دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو مفہوم میں کتنا تغیر ہو جائے گا جو راوی ان صلاحیتوں سے بہرہ ور نہیں اس کی روایت بالمعنی محدثین کے نزدیک بالاتفاق مقبول نہیں۔

روایت بالمعنی کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ احادیث نبوی کے اولین راوی صحابہ کرام اعلیٰ درجے کے قوی الحافظ ہونے کے علاوہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس بھی تھے نیز آپ کی مراد میں کسی تغیر و تبدل اور آپس کے کلام میں ادنیٰ تحریف کو اپنے لیے اشتقاق و تبدیلی خیال کرتے تھے ایسے راویوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے مقصود کو اگر اپنے الفاظ میں بیان کیا بھی ہے تو کیسے یہ تصور کر لیا جائے کہ ان سے کوتاہی ہو گئی اور مقصود و مراد نبوی میں تغیر و تبدل آ گیا ہو گا۔

روایت بالمعنی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ روایت باللفظ کے مقابلے میں روایت بالمعنی وثاقت اور طمانیت کے لحاظ سے کم درجہ رکھتی ہے اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں تھا۔ اُسے اسلام بالاتفاق اس کے قائل ہیں۔

اب تک ہم منکرین حدیث کے چھ اعتراضات کا جواب دے چکے ہیں۔ اوپر ساتویں نمبر پر جس اعتراض کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس کا تعلق

۷۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور صحابہ کی تنقید

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ذات سے ہے۔ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو خود صحابہ کے درمیان قابل اعتماد تصور نہیں کیا جاتا تھا چنانچہ بعض صحابہ نے

ان پر تنقید کی ہے اور ان کی صداقت بیانی پر شک و شبہ کا اظہار کیا ہے پھر اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ احادیث نبوی کا ایک کثیر حصہ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے اس لیے وہ سارا کا سارا ناقابل اعتماد ہے۔

اس اعتراض کی اصل حقیقت پر کلام کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ صحابہ کے درمیان جو بھی علمی نزاع و اختلافات ہیں مختلف کتابوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے اس کی حقیقت تبادلاً انکار و نظریات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ فہم و ادراک اور قوت استنباط کے اعتبار سے سب صحابہ یکساں نہ تھے بعض اوقات ایسا ہوتا کہ خاص حالات کے پیش نظر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی سے کوئی معاملہ کرتے اور وہ اسے عام حکم سمجھ کر لوگوں کے سامنے بیان کر دیتا اس سے صحابہ کے مابین علمی بحث کا آغاز ہو جاتا اور نزدیک ذنا بید کا سلسلہ شروع ہو جاتا تا آنکہ حق واضح ہو جاتا اور حق واضح ہوتے ہی یکایک وہ علمی بحث اپنے انجام کو پہنچ جاتی اور ہر فریق حق کے سامنے تسلیم خم کر دیتا۔ حق واضح ہونے سے پہلے جس قدر بھی تردیدات ایک دوسرے کے لیے رد رکھی جاتیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کی صداقت بیانی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں بلکہ ہوتا یہ تھا کہ مثلاً ایک صحابی کوئی حدیث روایت کرتا اور دوسرا صحابی اس روایت کو منسوخ یا مخصوص یا مقید تصور کرتا یا ایک صحابی روایت کرتا اور دوسرا سمجھتا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کسی خاص شخص سے متعلق ہے اور مخصوص حالات کے نتیجے میں صادر ہوا ہے۔ یا مثلاً ایک صحابی کسی حدیث کو ایک طریقے سے بیان کرتا اور دوسرا اسے اس سے مختلف انداز میں نقل کرتا۔ اس قسم کی تمام صورتوں میں حق واضح ہونے تک ایک صحابی دوسرے صحابی کے بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کرتا مثلاً یہ کہ اسے وہم ہوا ہے یا یہ کہ وہ بھول گیا ہے یا اس سے کوئی فرد گذاشت ہوئی ہے۔ اب اس قسم کے یا اسی سے ملتے جلتے جس قدر بھی اقوال و آثار منقول ہیں واقف حال یا تعصب مغلوب حضرات ان کے بارے میں جو چاہیں رائے زنی کرتے رہیں ان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ صحابہ فہم حدیث کی خاطر ایک دوسرے سے تبادلاً انکار کرتے

تھے تاکہ حق کھل کر سامنے آجائے۔

بس اسی پر حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر صحابہ کے مولے کو قیاس کر لیجئے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر صحابہ کے مابین جو علمی تنازعات کا ذکر ہمیں مختلف کتب میں ملتا ہے اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ وہ محض ایک علمی تبادلہٴ افکار تھا جو فہم و ادراکِ حدیث کی خاطر صحابہ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے درمیان وقتاً فوقتاً بپا ہوا اس کو حضرت ابو ہریرہؓ کی تردید و کمزیر بہرِ محمول کرنا سراسر کم علمی اور ہمالیت ہے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی سوچنے کی بات یہ ہے کہ صحابہ اگر حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوتے تو وہ ان کو اس بات کی اجازت کیونکر دے سکتے تھے کہ وہ کھلم کھلا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و روایت کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ذرا خیال تو کیجئے حضرت ناردقی اعظم رضی اللہ عنہ جیسا جری اور بے باک حق پرست کیا کسی ایسے شخص کو جس کی روایات صحابہ کے درمیان شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہوں روایتِ حدیث کی اجازت دے سکتا تھا یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی فقیہہ و عالمہ المؤمنین کیا اس صورتِ حال کو خاموشی سے برداشت کر سکتی تھیں کہ ایک آدمی جو احادیثِ نبوی کے بارے میں تاویلِ اعتماد متصور نہیں ہوتا دن رات کثیر احادیثِ روایت کرتا رہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے زمانے میں بہت سے صحابہ بعقیدہ حیات تھے اور صحابہ کی دینی غیرت سے کون واقف نہیں حدیث میں غلطی کرنے والے کے بارے میں وہ چشم پوشی سے کام لیں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ان سب کے سامنے اگر حضرت ابو ہریرہؓ روایتِ حدیث کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس انداز سے رکھے ہوئے ہیں کہ صحابہ میں سب سے زیادہ روایت کرنے والے شمار کیے جاتے ہیں تو یہ بٹنِ ثبوت ہے اس بات کا کہ صحابہ کے درمیان حضرت ابو ہریرہؓ کو روایتِ حدیث میں معتد خیال کیا جاتا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ صحابی کی نظر میں | علاوہ انہی صحابہ کے درمیان اگر حضرت ابو ہریرہؓ کو اعتماد کا درجہ حاصل نہ تھا جیسا کہ منکر بن حدیث کا دعویٰ ہے تو صحابہ کے ان اقوال و آثار کے بارے میں وہ کیا

کیس گے جو حضرت ابو ہریرہؓ کی مدح و ستائش میں وارد ہوئے ہیں مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک موقع پر حضرت ابو ہریرہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

<p>یا ابا ہریرۃ اَنْتَ كُنْتَ اَلْزَمْنَا لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَحْفَظْنَا لِحَدِيثِهِ - (ترمذی - المناقب) -</p>	<p>اس کا ابو ہریرہ آپ ہم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہنے والے اور ہم سے زیادہ احادیث کو یاد رکھنے والے ہو۔</p>
---	--

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے سامنے حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت پر تعجب کا اظہار کیا تو حضرت طلحہ بن عبید اللہ نے فرمایا:

<p>أَمَّا أَنْ يَكُونَ سَمِعَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَمْ نَسْمَعْ عَنْهُ (ترمذی - المناقب) -</p>	<p>اس میں شک نہیں کہ (ابو ہریرہؓ نے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ سنا ہے جو ہم نے نہیں سنا۔</p>
---	---

اسی قسم کا ایک قول حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کسی نے ان کو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت بیان کرتے سنا تو تعجب سے پوچھا کہ آپ تو خود صحابی ہیں اس کے باوجود حضرت ابو ہریرہؓ کی روایتیں نقل کرتے ہیں آپ نے جواب میں فرمایا:

<p>أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَدْ سَمِعَ مَا لَمْ نَسْمَعْ وَإِنِّي إِنْ أَحَدْتُ عَنْهُ أُحِبُّ الْحَقَّ مِنْ أَنْ أَحَدْتُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنِي مَالِمَ أَسْمَعُهُ مِنْهُ - (البدایۃ والنہایۃ ج ۸)</p>	<p>ابو ہریرہؓ نے وہ کچھ سنا ہے جو ہم نے نہیں سنا اور مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں ابو ہریرہؓ سے روایت کروں بر نسبت اس کے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (بلا واسطہ) روایت کروں یعنی وہ کچھ جو میں نے آپ سے خود نہیں سنا۔</p>
---	--

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کسی نے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو آپؓ نے فرمایا

وعلیک ابا حشریرۃ یعنی تمہیں چاہیئے کہ تم یہ سوال ابو ہریرہ سے کرو پھر ان کی نفیلت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی اس دُعا کا ذکر کیا جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کہا تھا اور جو کبھی نرا موش نہ ہونے والے علم سے متعلق تھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں یہ سارا واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی واقعے میں یہ بھی ذکر ہے کہ جب حضرت ابو ہریرۃ کی تقلید کرتے ہوئے بعض دیگر صحابہ نے بھی ایسی ہی دُعا درخواست کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَسَبَقْتُكُمْ بِهَا الْفُضْلَامُ الدُّوْعَى	دوہی لڑکا تم پر سبقت لے گیا۔
(تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صفحہ ۲۶۶)	

غرض حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مدح دستائش میں صحابہ کرام کی تمام اقوال اس بات کا ثبوت ہیں کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے جس کا منکرین حدیث کو دعوئے ہے۔ اور یہ تو ہم نے صرف چند اقوال نقل کیے ہیں ورنہ اسی قسم کے مضامین کے حامل اند بھی بہت سے اقوال اس ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرۃ صحابہ کرام کے نزدیک نہ صرف قابلِ اعتماد بلکہ دوسروں سے زیادہ قابلِ اعتماد دوسروں سے زیادہ احادیث نبوی کو یاد رکھنے والے اور دوسروں سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہ کر کسب علوم و برکات میں سبقت لے جاتے والے خیال کیے جلتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ابو ہریرۃ کو ہم سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل تھا اور وہ ہم سے بڑے حافظ حدیث تھے اسی طرح حضرت ابی بن کعبؓ حضرت ابو ہریرہ کے ہارے میں فرمایا کرتے کہ ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں بھی پوچھنے کی جرات کر لیتے جو ہم نہیں کر سکتے تھے۔

لَا الْفَتْهَ وَمَكَانَهَا فِي التَّشْرِيعِ الْقَامُوسِ ۲۷۵ الْيُضَا

منکرین حدیث کا استدلال

ہی کے ایک قول سے دلیل پکڑتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول پر تفصیلی گفتگو کی جائے تاکہ اصل حقیقت سامنے آجائے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا یہ قول وہ ہے جس کو امام مسلم نے حضرت اعرج سے روایت کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں:

سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ إِنَّكُمْ تَزْعُمُونَ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ يَكْثُرُ الْحَدِيثَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللَّهُ الْمَوْعِدُ كُنْتُ رَجُلًا مُسْكِنًا أَخْدُمُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مِلَّةٍ بَطْنِي وَكَانَتْ أَلْهَاجِرِينَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفَقُ بِالْأَسْوَاقِ وَكَانَتْ الْأَنْصَارُ يَشْغَلُهُمُ الْقِيَامُ عَلَى أَمْوَالِهِمْ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَبْسُطُ ثَوْبَهُ فَلَنْ يَنْسِيَ شَيْئًا سَمِعَهُ مَتَى فَبَسَطْتُ ثَوْبِي حَتَّى تَضَى حَدِيثَهُ ثُمَّ ضَمَمْتُهُ الْفَ فَإِنْسَيْتُ شَيْئًا سَمِعْتُهُ مِنْهُ - (مسلم - فضائل المعابر)

میں نے ابوہریرہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم سمجھتے ہو کہ ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت احادیث بیان کرتا ہے بخدا میں تو ایک مسکین شخص تھا اور صرت اپنا پیٹ بھر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے کے سوا میرا کوئی کام نہ تھا اور مہاجرین کو بازار کے کاروبار سے فرصت نہ تھی جبکہ انصار اپنے اموال کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنا کپڑا بچھا دے وہ مجھ سے جو بات سنے گا وہ بھولے گا نہیں سو میں نے اپنا کپڑا بچھا دیا یہاں تک کہ آپؐ حدیث بیان کر چکے پھر میں نے اس کپڑے کو اپنے سینے سے لگا لیا چنانچہ (پھر) میں نے جو بات بھی آپؐ سے سنی کبھی نہیں بھولا۔

منکرین حدیث اس حدیث سے دلیل پکڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں حضرت ابوہریرہؓ کا

خود اپنا اعتراف موجود ہے کہ صحابہ کثرت مرویات کی بنا پر ان کی روایت کردہ احادیث کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان پر تنقید کیا کرتے تھے۔

بدگمانی نہیں اظہار تعجب | ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس حدیث میں کونسی بات ایسی ہے جس سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہو کہ حضرت ابوہریرہ

کی مرویات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ متذکرہ بالا حدیث میں حضرت ابوہریرہ کی کثرت روایت پر اظہار تعجب ضرور کیا گیا ہے مگر اظہار تعجب سے شک و شبہ کا اظہار کیسے لازم آیا۔ بعض اوقات ایک شخص جس کی صداقت بیانی پر پورا اعتماد ہوتا ہے کوئی عجیب واقعہ بیان کرتا ہے یا اس کی ذات سے کسی عجیب عمل کا صدور ہوتا ہے اور آپ اس پر حیرت و تعجب کا اظہار کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ اس کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں یا اس کو جھٹلا رہے ہیں بخلاف اس کے اظہار حیرت سے آپ کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ امر واقعہ کی اصل حقیقت بیان کر کے آپ کے تعجب کا ازالہ کرے۔ بالکل یہی معاملہ حضرت ابوہریرہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوہریرہ متاخر الاسلام ہونے کے باوجود دیگر صحابہ کے مقابلے میں زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے تھے صحابہ کے درمیان سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ وہ سمندر کی سی روانی کے ساتھ جب حدیثوں پر حدیثیں بیان کیے چلے جاتے تو اس سے بعض ان تابعین کے دلوں میں جو حضرت ابوہریرہ کے ذاتی حالات سے واقف نہ تھے یا بعض ان صحابہ کے ذہنوں میں جو مدینہ سے دور بود و باش رکھتے تھے اس تعجب کا پیدا ہونا فطری امر تھا کہ آخر آپ دوسرے صحابہ کے مقابلے میں اس قدر احادیث کے محفوظ کرنے والے کیسے بن گئے۔ یہی تعجب ایک سوال بن کر کبھی کبھی ان کی زبانوں پر بھی آجاتا مگر جب حضرت ابوہریرہ حقیقت حال واضح فرماتے تو سب کے دل مطمئن ہو جاتے۔

حضرت ابوہریرہ کو دوسرے صحابہ کے مقابلے میں اس قدر کثیر احادیث کیسے محفوظ ہو گئی تھیں اس کی وجہ حضرت ابوہریرہؓ نے اسی متذکرہ بالا حدیث میں خود بیان کر دی ہیں اس کی وجہ دو تھیں ایک یہ کہ حضرت ابوہریرہ ہمہ وقت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں حاضر رہتے تھے دو سکر یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے جو کچھ ایک مرتبہ آپ یاد کر لیتے کبھی نہ بھولتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سنہ ہجری میں ایمان لائے اور پہلے دن سے لے کر آپ کے وصال تک ایک دن کے لیے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے سے جدا نہ ہوئے ہر وقت آپ کے ساتھ رہے۔ جہاں بھی آپ تشریف لے جاتے ابو ہریرہ ساتھ ہوتے، کئی کئی دن کھانے کو نہ ملتا مگر ابو ہریرہ کو یہ گوارا نہ ہوتا کہ حفظ حدیث کا مشغلہ چھوڑ کر دنیا کے کسی کاروبار میں لگ جائیں ان کے مقابلے میں دو سکر صحابہ کو خدمت نبوی میں حاضری کے ساتھ ساتھ دینی مشاغل کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا تھا جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ نے خود بتایا مہاجرین بے چارے باندہ اردن میں کاروبار تجارت میں مصروف رہتے اور انصار کو اپنے باغات اور اپنے اموال کی دیکھ بھال کی طرف توجہ دینی پڑتی۔ اس طرح حضرت ابو ہریرہ نے چار سال کے عرصے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ حاصل کر لیا جو دو سکر نہ کر سکے۔ پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احادیث کے حفظ میں ان کا شغف دیکھ کر معجزانہ انداز میں ان کی قوتِ حافظہ کی تقویت کا ایسا سامان کر دیا کہ جو یاد کیا کبھی نہیں سے محو نہ ہوا۔ بہادر کا قصہ اوپر کی حدیث میں بھی بیان ہوا ہے دیگر کئی روایات میں بھی آیا ہے، جن میں سے بعض میں ذکر ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے خود ضعفِ حافظہ کی شکایت کی تھی جس پر اس چادر والے طریقے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فیضیاب فرمایا۔

غرض خدمت نبوی میں ہر وقت حاضری اور دعائے نبوی کی برکت سے غیر معمولی قوتِ حافظہ ان دونوں ہاتھوں نے مل کر حضرت ابو ہریرہ کو حفظ حدیث اور کثرتِ روایت کے معانی میں دوسرے لوگوں سے ممتاز بنا دیا۔

کثرتِ روایت کا ایک اور سبب | حضرت ابو ہریرہ کی کثرتِ روایت کا ایک اور سبب بھی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

وصال کے بعد خلافتِ راشدہ کے عرصہ میں جب صحابہ کی کثیر تعدادِ ادرادھر ادرادھر مختلف بلاد و امصار میں پھیل گئی تو حضرت ابو ہریرہ نے عکس کیا کہ احادیث کا جو ذخیرہ ان کے

پاس امانت ہے اسے ہر حال میں امت مسلمہ کے جتنے افراد تک وہ پہنچا سکیں پہنچا دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آخری گھڑی آگھڑی ہو اور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہوا یہ کثیر علم ان کے سینے میں مخفی ان کے ساتھ ہی چلا جائے اور کتمانِ علم کا الزام ان کے سر رہ جائے چنانچہ بعض مواقع پر اپنے اس فکر و احساس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی تو میں کبھی کوئی حدیث بیان نہ کرتا پھر سورۃ بقرہ کی وہ آیت تلاوت فرماتے جس میں کتمانِ علم پر اللہ کی لعنت کا ذکر ہے۔

غرض جن لوگوں کو حضرت ابو ہریرہ کے شغف حدیث کا حال معلوم نہ ہوتا تھا وہ ان کی کثرتِ روایت کو دیکھ کر تعجب میں پڑ جاتے تھے اور اپنی حیرت و استعجاب کو دور کرنے کے لیے حضرت ابو ہریرہؓ سے مختلف سوالات کرنے لگتے تھے اسی حیرت و استعجاب کو دور کرنے کے لیے حضرت ابو ہریرہؓ اس حقیقت کا اظہار فرماتے جس کا ذکر زیر بحث حدیث یا اسی قسم کی دوسری احادیث میں ہمیں ملتا ہے۔

ایک اور حقیقت | زیر بحث حدیث سے ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرتِ روایت پر حیرت و استعجاب کا اظہار بھی مشاہیر صحابہ میں سے کسی کی جانب سے نہ تھا بلکہ اس کا اظہار کرنے والے وہ لوگ تھے جو نہ تو چیدہ و برگزیدہ صحابہ کی صف میں شامل تھے اور نہ ان کو اسلام میں سبقت کرنے اور عرصۂ مدینہ تک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے قریب ترین صحابیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرتِ روایت پر حیرت و تعجب کا اظہار کرنے والوں میں مرے سے کوئی صحابی تھا ہی نہیں حضرت ابو ہریرہؓ کے الفاظ پر غور کیجئے وہ معترضین کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں ”اور مہاجرین کو بازار کے کاروبار سے فرصت نہ تھی جبکہ انصار اپنے احوال کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے“ معلوم ہوا حضرت ابو ہریرہؓ کے مخاطبین میں مہاجرین

انصار میں سے کوئی شامل نہ تھا اگر کوئی شامل ہوتا تو حضرت ابو ہریرہؓ کا خطاب ان الفاظ میں ہوتا تم لوگ تجارت و زراعت کے کاموں میں مصروف رہتے تھے یہ غائب کے صیغے سے مہاجرین و انصار کا ذکر دلیل ہے اس بات کی کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت پر تعجب کا اظہار کرنے والے مہاجرین و انصار کے علاوہ کچھ لوگ تھے۔

ہمارے اس خیال کی تائید میں وہ روایت اور بھی زیادہ صریح ہے جس کو امام مسلم نے ہی حضرت سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں معترضین کا قول ان الفاظ میں نقل ہوا ہے :

لوگ کہتے ہیں کہ مہاجرین و انصار کو کیا ہوا
وہ ابو ہریرہ کی طرح حدیثیں بیان نہیں
کرتے۔

وَقَوْلُهُمْ مَا بَالُ الْمُهَاجِرِينَ وَ
الْأَنْصَارِ لَا يَتَحَدَّثُونَ مِثْلَ
أَحَادِيثِهِ
(مسلم فضائل الصحابة)

غور کرنے کی بات ہے اگر اعتراض کرنے والے مہاجرین و انصار میں سے کوئی ہوتے تو ان کا قول لازماً ان الفاظ میں نقل ہوتا ما بالان لا نتحدث مثل احادیثہ (ہمیں کیا ہوا ہم ابو ہریرہ کی طرح حدیثیں روایت نہیں کرتے) اسی طرح جواب میں حضرت ابو ہریرہؓ یہ نہ کہتے کہ ”میرے انصاری بھائی اپنی زمینوں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے اور میرے مہاجر بھائی بازار کے معاملات میں مصروف ہوتے“ بلکہ سیدھے سادے طریقے سے کہتے کہ تم زمینوں کی دیکھ بھال میں یا تم بازار کے معاملات میں مصروف رہتے تھے۔

غرض اس قسم کی جتنی روایات بھی مسلم یا بخاری میں ہیں ان کے الفاظ اسی حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرنے والے صحابہ کے علاوہ کوئی ایسے لوگ تھے جو حضرت ابو ہریرہؓ کے شغف حدیث اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے خصوصی تعلق سے کما حقہ واقف نہ تھے۔ ہم نے حضرت ابو ہریرہؓ کے سیر و سوانح کو خوب خوب لکھا لکھنا کتب آثار و حدیث میں بڑی تلاش و جستجو سے کام لیا کہ کسی ایک ہی ایسے صحابی کا نام مل جائے جس نے

حضرت ابو ہریرہؓ کو کثرت روایت کی بنا پر مطعون کیا ہو لیکن کوئی ایک روایت بھی ہمیں ایسی نہیں مل سکی۔ حضرت ابو ہریرہؓ پر تنقید کرنے والوں میں مشاہیر صحابہ میں سے اگر کوئی ہوتا تو تاریخ کے اوراق میں یہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتی۔ جس طرح صحابہ کی دوسری رد و قدح کا ذکر ہمیں کتب تاریخ میں ملتا ہے اس کا ذکر بھی ضرور ملتا۔

ہم منکرین حدیث کے ممنون ہوں گے اگر وہ کوئی ایک ہی ایسی صحیح تاریخی شہادت پیش کر دیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی معروف صحابی نے حضرت ابو ہریرہؓ کو انکی کثرت روایت پر مطعون کیا ہو یا کسی صحابی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف کذب بیانی کی نسبت کی ہو اور ان کو حدیثیں روایت کرنے یا دوسروں کو ان کی مرویات سننے سے روکا ہو۔ ہمیں یقین ہے وہ کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کر سکیں گے۔

اس ضمن میں کوئی تاریخی ثبوت تو خیر منکرین حدیث قیامت تک پیش نہیں کر سکیں گے البتہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت کے بعض الفاظ کو توڑنے مروڑنے کی کوشش کی ہے اور اس سے اپنے مطلب کی بات نکالنی چاہی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ امام مسلم نے اسے کتاب المساقات والمزارعۃ میں روایت کیا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

<p>حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کے مار دالنے کا حکم فرمایا مگر شکار کا کتا یا بکریوں کا کتا اور جانوروں کی حفاظت کا کتا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ حضرت ابو ہریرہؓ تو</p>	<p>عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ إِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ أَوْ كَلْبَ غَنَمٍ أَوْ مَا شَبَّهَ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ يَقُولُ أَوْ كَلْبَ</p>
--	--

زرع فقال ابن عمر رضي الله
تعالى عنهما إن لا جـ
هريرة زرعا۔
مسلم کتاب المساقات والمزارعة باب الامر
بقول الكتاب۔

کھیت کا کتا بھی (متشعہ) کہتے ہیں حضرت
ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت ابو ہریرہ
کے پاس کھیت بھی ہے۔

اس حدیث کے الفاظ "إِنَّ لَا بِي هَرِيرَةٍ نَسْرَعًا" کے مفہوم کو منکرین حدیث اس معنی
میں لیتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی جانب سے یہ ایک لطیف لہنز ہے حضرت
ابو ہریرہؓ پر یعنی دراصل حضرت ابن عمرؓ کا یہ چاہتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ
کے پاس کھیتی بھی ہے اس لیے یہ کھیتی کے کتے کا استثنا انہوں نے معاذ اللہ اپنی طرف
سے بڑھایا ہے۔

اگرچہ اکثر شارحین حدیث نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے اس قول پر روشنی
ڈال ہے اور بتایا ہے کہ ان الفاظ سے حضرت ابن عمرؓ کا مقصود کیا تھا ہم اس پر بھی
ابھی گفتگو کریں گے مگر اس سے پہلے ہم منکرین حدیث سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ کھیتی
کا کتا کے الفاظ روایت کرنے میں کیا حضرت ابو ہریرہؓ منفرد ہیں اگر وہ منفرد ہوں
اور دیگر کسی صحابی سے یہ الفاظ مروی نہ ہوں تو پھر منکرین حدیث کا یہ قول کسی درجے
میں قابل غور ہو سکتا ہے کہ اس سے حضرت ابن عمرؓ کی مراد حضرت ابو ہریرہؓ کو کذب بیانی
سے متم کرنا تھا لیکن اگر صورت حال اس سے مختلف ہو اور یہ الفاظ دوسرے صحابہ
نے بھی روایت کیے ہوں تو پھر منکرین حدیث کا یہ قول کسی درجے میں بھی قابل قبول نہ
ہوگا۔ اب سنئے وہ روایت جس میں کھیتی کے لیے کتا پالنے کی اجازت کا ذکر ہے کس کس صحابی
سے مروی و منقول ہے امام بخاری نے اسے حضرت سفیان بن ابی زہیرؓ سے روایت کیا ہے
مسلم میں یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت شعبہؓ اور حضرت سفیان بن ابی زہیرؓ سے

روایت ہوئی ہے ترمذی کتاب الصيد میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت کے ساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن مغفل کی روایات میں بھی کھیتی کے لیے کٹا پالنے کی یہ اجازت صریحاً مذکور ہے۔ اب بتلائیے جب اس روایت میں حضرت ابو ہریرہ منفرد نہیں بلکہ دیگر متعدد صحابہ نے بھی اسے روایت کیا ہے تو پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہ کے پاس کھیتی بھی تھی اس لیے انہوں نے اپنی طرف سے حدیث کے الفاظ میں کھیتی کے کٹے کی اجازت کا اضافہ کر لیا تھا اور حضرت ابو ہریرہؓ کے اسی فعل پر طنز کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ کہا تھا کہ ”ابو ہریرہ کے پاس کھیتی بھی ہے۔“

اب دیکھنا یہ ہے کہ پھر آخر ان الفاظ سے حضرت ابن عمر کا مقصود کیا تھا۔

شراحین حدیث نے اس سلسلہ میں جو وضاحت کی ہے ہمیں افسوس ہے کہ منکرین حدیث نے اس کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ہم اگر یہ کہیں تو بالکل درست ہوگا کہ عامۃ الناس کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے انہوں نے جان بوجھ کر اس وضاحت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ حافظ بن حجر نے فتح الباری میں حضرت ابن عمر کے ان الفاظ پر تبصرہ کرتے ہوئے پہلے یہ بیان کیا ہے کہ ان الفاظ سے مقصود حضرت ابو ہریرہ کی تصدیق ہے پھر لکھا ہے کہ رواۃ حدیث میں سے سفیان بن ابی زہیر اور عبداللہ بن مغفل نے حضرت ابو ہریرہ کی تائید کی ہے۔ اسی طرح امام نووی شارح صحیح مسلم ان الفاظ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے حضرت عبداللہ ابن عمر کا مقصود نہ ابو ہریرہ کی روایت کی تحقیر ہے اور نہ اس کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار۔ بخلاف اس کے ان کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہ زمین اور کھیتوں کے مالک بھی تھے اس لیے انہوں نے اس کھیتی کے کٹے کی اجازت کے الفاظ صریحاً یاد رکھنے کا زیادہ اہتمام کیا اس لیے کہ یہ قاعدہ ہے جو شخص جس کام سے زیادہ شغف رکھتا ہے اس کام کے متعلق احکام دوسروں سے بڑھ کر یاد رکھتا ہے اور اس کے لیے وہ بلیغ اہتمام کرتا ہے جو دوسرے نہیں کرتے۔

شدھین حدیث کی اس تعبیر کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت ایسی بھی ہے جس میں انہوں نے خود کھیتی کے کتے کی اجازت نقل کی ہے اس روایت کو امام مسلم نے کتاب المساقات والمزارعہ میں بروایت ابوالحکم بیان کیا ہے۔ اگر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کھیتی کے کتے کی اجازت کو حدیث ابوہریرہؓ میں اضافہ آور فرماتے تو خود اس اجازت کو کیوں روایت کرتے معلوم الیا ہوتا ہے کہ انہوں نے جب حضرت ابوہریرہؓ سے یہ الفاظ سنے تو یا تو ان پر اعتماد کامل کی بنا پر یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تحقیق کر لینے کے بعد خود بھی وہ الفاظ روایت کرنے لگے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو خود کسی وقت یہ یاد آیا ہو کہ میں نے آپؐ سے یہ الفاظ سنے تھے اور پھر ان کو بیان کرنا شروع کر دیا ہو بہر حال وجہ کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ الفاظ خود بھی روایت کیے ہیں اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انہیں ابوہریرہؓ کے ان الفاظ کی روایت پر قطعاً کوئی شک نہ تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ منکرین حدیث کا یہ اعتراض بھی قطعاً بے بنیاد ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو صحابہ کے درمیان اعتماد کا درجہ حاصل نہ تھا۔

۸۔ امام ابوحنیفہؒ پر حدیث سے بے نیازی کا الزام

اب منکرین حدیث کا صرف آخری اعتراض باقی رہ گیا ہے اس اعتراض کا لب لباب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے صرف سترہ یا اٹھارہ

حدیثوں کو اس قابل سمجھا ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی احکام و مسائل فقہی کا انہوں نے استنباط کیا ہے ان کے لیے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں کو بنیاد بنایا ہے ورنہ ان کے مستنبط تمام مسائل کا مدار قرآن پر ہے۔ انہوں نے علمی حقائق کی روشنی میں تیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول اور نظریات مرتب کئے ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرز عمل جہاں اس بات کا ثبوت ہے کہ حدیث کا تمام تر ذخیرہ سوائے محدود سے چند حدیثوں کے ناقابل اعتماد ہے وہاں اس طرز عمل میں ہمارے لیے یہ دلیاں بھی ہے کہ قرآن کی تعبیر حدیث کی مدد کے بغیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں

کی جا سکتی ہے۔

امام ابو حنیفہ کا سرمایہ حدیث | یہ اعتراض ہی دراصل ایک غلط مفروضے پر مبنی ہے یہ بات کہ امام ابو حنیفہ نے استنباط

مسائل میں صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر اکتفا کیا ہے ایک مفروضے سے زیادہ کچھ نہیں۔ امام ابو حنیفہ نے اگرچہ دیگر محدثین کی طرح حدیث نبوی کی تدریس کے لیے کوئی حلقہ درس قائم نہیں کیا اور نہ ہی امام مالک کی طرح حدیث کی کوئی کتاب مرتب کی تاہم آپ کے تلامذہ نے آپ کی روایت کردہ احادیث کو کتب و مسانید میں جمع کیا ہے ان کتب و مسانید کی تعداد سترہ کے قریب ہے۔ ان میں سے امام ابو حنیفہ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسف کی مرتب کردہ کتاب الآثار تو آج بھی شائع شدہ حالت میں مل جاتی ہے اس کی کتاب میں ہی ایک ہزار سے زیادہ احادیث امام ابو حنیفہ کی روایت کردہ موجود ہیں اس کے علاوہ روایات ابی حنیفہ پر مشتمل کتب میں سے مشہور ترین کتب حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب الآثار المرفوعہ از امام محمد بن حسن

(۲) الآثار المرفوعہ والموقوفہ از امام محمد بن حسن

(۳) مسند امام حسن بن زیاد اللؤلؤی

(۴) مسند حماد بن امام ابی حنیفہ

ان کے علاوہ مسند ابی حنیفہ کے نام سے اور بھی متعدد علماء نے کئی کتابیں مرتب کیں ان علماء میں امام وہبی، امام بخاری، حارثی، ابن المنظر، محمد بن جعفر، ابو نعیم اصبہانی، قاضی ابوبکر انصاری، ابن ابی الحوام اور ابن خروزمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مسانید کو بعد میں قاضی القضاة ابوالمؤید محمد بن محمود خوارزمی المتوفی ۶۶۵ھ نے ایک ضخیم کتاب میں یکجا کر دیا اور اسے جامع مسانید الاما الاعظم کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب فقہی ابواب پر مرتب ہوئی ہے اور ہر کتاب کو اس میں حدت کر دیا گیا ہے۔ اسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ مذکورہ مسانید کے علاوہ خطیب بغدادی، دارقطنی، ابن شاہین اور ابن خثعمہ جیسے نامور علماء نے حدیث کی مرتب کردہ

مختلف ”مسند ابی حنیفہ“ کا ذکر بھی کتابوں میں ملتا ہے۔ حطیب بغدادی نے جب دمشق کا سفر اختیار کیا تو دارمطینی اور ابن شاہین کی مرتب کردہ ”مسند ابی حنیفہ“ ان کے ہمراہ تھیں علاوہ انہیں ان کی اپنی تالیف ”مسند ابی حنیفہ“ بھی ان کے پاس موجود تھی۔ اسی طرح ابن عقہہ کی مسند کے بارے میں علامہ بدر الدین عینی نے اپنی تاریخ کبیر میں ذکر کیا ہے کہ اس میں ایک ہزار سے زیادہ روایات موجود تھیں۔ امام ابو حنیفہ کے ایک والد شاگرد رشید امام زعفرانے بھی ایک کتاب ”آلہ اشارہ“ کے نام سے مرتب کی تھی اس میں بکثرت روایات امام ابو حنیفہ کی تھیں۔ اس کا ذکر حاکم نے اپنی کتاب ”معرفۃ علوم الحدیث“ میں کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثیں قابل اعتماد تھیں تو پھر یہ ہزاروں کی تعداد میں وہ کونسی احادیث روایت کرتے رہے۔ ان احادیث کو وصحیح اور قابل اعتماد سمجھتے ہی تھے تو روایت کرتے تھے۔ علم حدیث میں امام ابو حنیفہ کے شیوخ کی تعداد جن سے انہوں نے روایات لی ہیں چار ہزار تک پہنچتی ہے امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں آپ کو ثقہ اور حافظ حدیث کے لقب سے یاد کیا ہے آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ ثبوت ہے اس بات کا کہ منکرین حدیث نے جس دعوے پر اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے وہ ایک خلاف واقعہ فسانے اور غلط مفروضے سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

منکرین حدیث جو بات کہتے ہیں اس کا کسی معتبر کتاب میں ہمیں کوئی ذکر نہیں ملتا صرف ابن خلدون نے اس کو ذکر کیا ہے لیکن ایک تو اس کی کوئی سند نہیں بتائی دوسرے اس کی عبارت مبہم و مجمل ہے اس عبارت سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی روایات کی تعداد ہی اتنی ہے حالانکہ ان مساند کی موجودگی میں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کوئی عقل سے عاری ہی ہوگا جو اس بات کو درست جانے لگا۔

استنباط کا مبنیٰ احادیث | اب رہی یہ بات کہ اگر بکثرت احادیث امام ابو حنیفہ کے نزدیک صحیح تھیں تو انہوں نے مسائل و احکام

فہمی کے استنباط کے لیے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر کیوں اکتفا کیا تو یہ بات بھی پہلی بات کی طرح قطعاً غلط و خلاف واقعہ اور مبنیٰ بر کذب ہے کوئی شخص فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں سے اگر صرف امام طحاوی کی شرح معانی الآثار، ابو بکر جصاص کی احکام القرآن اور امام سرخسی کی المبسوط ہی دیکھ لے تو اسے کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہو کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث بے نیاز ہو کر صرف تیس اور قسائن پر اپنے مسائل فقہی کے استنباط کی بنیاد رکھی تھی۔ شارح قاموس سید مرتضیٰ زبیدی نے ایک کتاب ”الذمہما للحنیفہ فی ادلتہ ابی حنیفہ“ کے نام سے مرتب کی ہے اسی ایک کتاب کو دیکھ لیا جائے تو منکرین حدیث کا جھوٹ پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب موافق و مخالف اس پر متفق ہیں کہ امام ابو حنیفہ ایک مجتہد امام تھے مجتہد کی لازمی شرائط میں سے کون نہیں جانتا کہ ایک یہ شرط بھی ہے کہ وہ احادیث احکام پر حاوی ہو اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ لسی احادیث ہزاروں کی تعداد میں ہیں بعض قابلہ کا قول بھی اگر لیا جا۔ئے تو احادیث احکام کی تعداد کئی سو سے تو متجاوز ہے ہی پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ایک ایسا شخص منہ اجتہاد پر فائز ہو جاتا اور امت مسلمہ اس کو مجتہد تسلیم کر لینی جو صرف سترہ یا اٹھارہ احادیث کو مدار احکام بنائے ہوئے تھا۔ کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا سرایہ حدیث صرف سترہ یا اٹھارہ روایات ہوں مسلمانوں کے ایک ایسے عظیم امام کا درجہ حاصل کرے جس کا فقہی مسلک تمام دیگر فقہی مذاہب و مذاہب سے وسیع تر شمار کیا جائے اور کائنات ارضی کے لاکھوں مسلمان جس کے حلقہ بدامان ہوں۔ یہی نہیں بلکہ آنے والے زمانوں میں جس کے اجتہاد و فقہ برائے کونین اعتمد کرتے اور اسے نقل و روایت کرتے چلے آئے ہوں۔

امام ابو حنیفہ سے جو مسائل مروی ہیں ان کی کم از کم تعداد تراسی ہزار بتائی جاتی ہے بعض روایات کے مطابق ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اس حقیقت کو ذہن میں رکھیے اور ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ محدث ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب ”مصنف“ میں

ایک باب باندھا ہے جس میں وہ مسائل گنائے ہیں جن میں امام ابو حنیفہ نے بقول ان کے احادیث صحیحہ کی خلافت و رزی کی ہے ان کی کل تعداد ایک سو پچیس ہے اگرچہ احادیث صحیحہ کی خلافت و رزی کے اس قول میں علمائے فقہ کو کلام ہے اور انہوں نے تفصیل سے اس کی اصل حقیقت بھی واضح کی ہے تاہم فقہ طبری دیر کے لیے اس قول کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ ایک سو پچیس کے علاوہ باقی تمام مسائل یعنی تقریباً بیاسی ہزار سے زائد مسائل جو امام ابو حنیفہ سے منقول ہیں وہ سب کے سب احادیث صحیحہ کے موافق ہیں قطع نظر اس کے کہ ان کے بارے میں کوئی حدیث صریحاً مردی ہو یا نہ ہو۔ اگر ان سب مسائل کی بنیادینے والی احادیث کو تلاش کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ امام ابو حنیفہ کے یہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں احادیث کا وجود ثابت ہو جائیگا۔

غرض یہ خیال بھی قطعاً غلط ہے کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث سے بے نیاز ہو کر صرف قیاس اور قرآن پر اپنے مسائل فقہی کی بنیاد رکھی۔ حدیث سے استناد کے معاملے میں امام ابو حنیفہ کا جو مسلک تھا اسے خود انہی کے الفاظ میں سنئے :

”جوابات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو وہ سرائیکھوں پر میرے ماں باپ آپ پر خدا ہوں ہم آپ کی مخالفت نہیں کر سکتے جوابات صحابہ سے منقول ہو ہم اس میں سے اپنا پیستیدہ قول چن لیتے ہیں اور جوابات صحابہ کے علاوہ دوسروں سے منقول ہو تو ہم بھی آدمی ہیں اور وہ بھی آدمی ہیں۔“ (میزان شرعی بلدا ص ۶۱)

اسی سے ملتا جلتا مگر ذرا تفصیل کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا ایک اور قول خلیب نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں :

”مجھے جب کوئی حکم خدا کی کتاب میں مل جاتا ہے تو میں اسی کو تھا ملتا ہوں اور جب اس میں نہیں ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے ان صحیح آثار کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے سے معروف ہیں پھر جب نہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے نہ سنت رسول اللہ میں تو میں اصحاب رسول کے قول (اجماع صحابہ) کی

بیروی کرتا ہوں اور ان کے اختلافات کی صورت میں جس صحابی کا قول جاتا ہوں قبول کرتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں مگر ان سب کے اقوال سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں لیتا۔ رہے دوسرے لوگ تو جس طرح اجتہاد کا حق انہیں ہے مجھے بھی ہے۔

(تاریخ بغداد جلد ۱۲ ص ۲۴۸)

ایک مرتبہ خلیفہ منصور نے بعض لوگوں کے اکسائے پر امام ابو حنیفہ کو لکھا کہ میں نے سنا ہے آپ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ جواب میں امام صاحب نے لکھا:

امیر المؤمنین آپ تک جو بات پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر پھر ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین کے فیصلوں پر پھر باقی صحابہ کے فیصلوں پر البتہ جب صحابہ میں اختلاف ہو تو پھر قیاس کرتا ہوں۔ (میزان شروانی جلد ۱ ص ۶۲)

یہ اور اسی طرح کے دیگر متعدد اقوال ہیں جن میں امام صاحب کے اپنے الفاظ میں وہ مسلک ہمارے سامنے آتا ہے جو حدیث سے استناد کے معاملے میں امام ابو حنیفہ نے اختیار کیا ہوا تھا کسی کے کلام کی کوئی تعبیر و تفسیر درست اور صحیح سمجھی جاتی ہے جو منکمل نے خود بتلائی ہو ان اقوال کی موجودگی میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث سے بے نیاز ہو کر مسائل فقہی کا محض قیاس کی بنیاد پر استنباط کیا کرتے تھے وہ امام صاحب پر افترا پردازی کرتا ہے۔ ایک مرتبہ جب امام ابو حنیفہ کے سامنے کسی کا لگایا ہوا یہ الزام نقل کیا گیا کہ آپ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں تو اس پر آپ نے فرمایا:

جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں وہ بخدا جھوٹا کہتا ہے اور افترا پردازی سے کام لیتا ہے نص کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(میزان شروانی جلد ۱ ص ۶۱)

حقیقت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث کے مقابلے میں قیاس کو ہرگز ترجیح نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے یہاں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ انہوں نے ضعیف احادیث تک کو قیاس کے مقابلے میں قابل ترجیح سمجھا ہے مثال کے طور پر حالت سفر میں بنیذ کے ساتھ وضو کرنے کی

اجازت پر مشتمل حدیث کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام صاحب نے اس حدیث کو قیاس پر ترجیح دی ہے اسی طرح جب چودس درہم سے کم چرائے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا حالانکہ اس کے بارے میں وارد شدہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ امام ابن قیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں:

”اصحاب ابی حنیفہ کا اس امر پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک ضعیف حدیث قیاس و رائے سے افضل ہے۔“ (اعلام الموقعین)

غرض اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی کہ منکرین حدیث کی نہ یہ بات صحیح ہے کہ امام ابو حنیفہ نے مسائل فقہی کے استنباط کے لیے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر اعتماد کیا ہے اور نہ ان کی یہ بات ہی درست ہے کہ امام صاحب حدیث سے بے نیاز ہو کر محض قیاس اور قرآن پر اپنے مسائل کا مدار رکھتے تھے اس طرح امام ابو حنیفہ کے بارے میں انکا

سارا اعتراض ہی بے بنیاد ہے۔ اس کے ساتھ ہی الحمد للہ منکرین حدیث کے ان تمام اعتراضات کا جواب مکمل ہو جاتا ہے جن کا زیر نظر عنوان کی ابتدا کرتے وقت ہم نے حوالہ دیا تھا اور اسی کے ساتھ ہی الحمد للہ یہ کتاب اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو مصنف تاثرین اور تائین سب کے لیے ہدایت کا ذریعہ اور ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد عیسیٰ

۳ مارچ ۱۹۷۹ء عیسوی

۴ ربیع الثانی ۱۳۹۹ء ہجری

مصادر و ماخذ

کنز العمال شیخ علی متقی برهان پوری
مطبوعہ حیدرآباد دکن
الادب المفرد للبغاری مطبوعہ قاہرہ مصر
معالم السنن للخطابی مطبوعہ حلب
صحیح ابن حبان
مشکل الآثار امام طحاوی مطبوعہ حیدرآباد دکن
صحیفہ ہمام ابن مینہ مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ
طبع حیدرآباد دکن
مجمع الزوائد للیثی مطبوعہ قاہرہ
کتاب العلل امام ترمذی
فتح الباری ابن حجر عسقلانی مطبوعہ مصر
عمدة القاری علامہ عینی مطبوعہ قاہرہ مصر
شرح مسلم امام نووی طبع قاہرہ
مشوٰی شرح مؤطا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
مطبوعہ ممکنہ مکرمہ
تذکرۃ الموضوعات محمد بن طاہر المقدسی
طبع مصر ۱۳۲۳ھ
معرفة علوم الحديث للحاکم طبع قاہرہ
الموافقات امام شافعی طبع تونس ۱۳۰۲ھ
تطبیق ابن جوزی

القرآن الکریم
تفسیر قرطبی
تفسیر طبری مطبوعہ مصر
تفسیر محاربات القرآن مفتی محمد شفیع طبع کراچی
الاتقان فی علوم القرآن لیسوطی
مطبوعہ سیمیل اکیڈمی پاکستان
احکام القرآن ابوبکر حصّاص
الاحکام فی اصول الاحکام لابن حزم
طبع قاہرہ ۱۳۲۵ھ
صحیح بخاری
صحیح مسلم
جامع ترمذی
سنن ابوداؤد
سنن نسائی
سنن ابن ماجہ
سنن دارمی
مؤطا امام مالک
مسند امام احمد بن حنبل
مشکوٰۃ المصابیح للخطیب
مستدرک حاکم مطبوعہ حیدرآباد دکن

صید الخواطر ابن جوزی

تہذیب التہذیب

شروط الائمۃ الخمسہ للحازمی طبع قاہرہ

المیزان للشعرانی طبع قاہرہ

المحدث اغااصل رامہرمزی

زاد المعاد ابن قیم مطبوعہ مصر

تاویل مختلف الحديث ابن قیثم طبع قاہرہ

الرسالۃ للإمام الشافعی طبع اول ۱۳۵۸ھ

فتح المغیث امام سخاوی طبع قاہرہ ۱۳۵۵ھ

تہذیب التہذیب ابن حجر عسقلانی طبع جدید آبادی

۱۳۲۵ھ

اعلام الموقعین ابن قیم طبع ۱۳۷۳ھ

توجیہ النظر شرح ظاہر البحر انری طبع مصر ۱۳۲۸ھ

تقیید العلم خطیب بغدادی طبع دمشق ۱۹۲۹ھ

جامع بیان العلم ابن عبد البر مطبوعہ مصر

السنۃ قبل التدوین محمد عجاج الخطیب طبع مصر

الرسالۃ المستطرفہ للکافی کارخانہ کتب کراچی

قواعد التحدیث شیخ ابوالحسن حبیبی طبع دمشق ۱۳۵۲ھ

علوم الحديث ومصطلحہ داکٹر محمد صبحی صالح طبع دمشق ۱۳۷۹ھ

السنۃ وما کانہما فی التشریح الاسلامی داکٹر مصطفیٰ سباعی

حجیت حدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی طبع لاہور

ترجمان السنۃ مولانا بدر عالم طبع کراچی

تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی طبع کراچی

ترجمان القرآن منصب سالت نمبر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

طبع لاہور

تقییمات مولانا ابوالاعلیٰ مودودی طبع لاہور

تاریخ الحديث مولانا عبد الصمد صدام طبع لاہور

تشرح پنج ابلاعة ابن ابی الحدید طبع مصر

انزالہ اعفا شاد ولی اللہ محدث دہلوی طبع کراچی

تذکرۃ الحفاظ للذہبی مطبوعہ دمشق

تدریب الراوی للیسوطی مکتبہ قاہرہ مصر ۱۳۷۹ھ

اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن اثیر جزوی طبع قاہرہ ۱۲۸۶ھ

الاصابہ فی تمیز الصحابہ حافظ ابن حجر مطبوعہ مصر

طبقات ابن سعد مطبوعہ بیروت

لسان المیزان حافظ ابن حجر مطبوعہ جدید آباد دکن

البدایۃ النہایۃ ابن کثیر مطبوعۃ السادۃ قاہرہ ۱۳۵۱ھ

ذیات الاعیان ابن خلکان مطبوعۃ المہینۃ مصر

سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر

کشف الظنون حاجی خلیفہ طبع مصر ۱۲۷۷ھ

انساب الاشراف علامہ بلاذری

الکامل فی تاریخ ابن اثیر جزوی مطبوعہ مصر

جوامع السیر ابن حزم

تاریخ البکیر امام بخاری مطبوعہ جدید آباد دکن

معجم صغیر اوسط البکیر طبرانی - تاریخ طبری مطبوعہ مصر

تاریخ بغداد خطیب بغدادی مطبوعہ مصر ۱۳۲۹ھ

تاریخ دمشق حافظ ابن عساکر